کاروانِ معیشت

(قوموں کی دولت کی داستان)

یعنی

لیو ہیوبرمین کی مشہور کتاب "مینز ورلڈلی گڈس" کا ترجمہ

از

نجم الدین شکیب ایم اے

شائع کردہ

انجمن ترقی اُردو (ہند) علی گڑھ

بار اول جنوری ۱۹۵۳ء

قیمت غیر مجلد چھ روپے مجلد چھ روپے آٹھ آنے

کتابت و طباعت زیر اہتمام

دانش محل، امین الدولہ پارک لکھنؤ

سرفراز قومی پریس لکھنؤ

فہرست

حصۂ اوّل

جاگیرداری سے سرمایہ داری تک

حصّہ دوم

سرمایہ داری سے...... تک ۲۲۹

عرضِ مترجم

لیوہیوبرمین کی یہ کتاب سب سے پہلے اپریل ۱۹۳۷ء میں شائع ہوئی تھی۔ ہندوستان میں اس کا پہلا اڈیشن ۱۹۴۶ء میں اور دوسرا اڈیشن ۱۹۴۸ء میں بلاترمیم و اضافہ شائع ہوا۔ یہ اسی دوسرے اڈیشن کا ترجمہ ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب جنگ عالمگیر (۱۹۳۹ء لغایتہ ۱۹۴۵ء) شروع نہیں ہوئی تھی لیکن مسولینی اور ہٹلر کے جنگی نعرے ایک ہلاکت خیز مستقبل کی طرف اشارہ کر رہے تھے۔ دوسرے ترقی یافتہ ممالک بھی، جو اگرچہ ان جنگی نعروں میں شریک نہ تھے لیکن جنگی معیار پر اپنی تنظیم سے غافل نہ تھے۔ لیوہیوبرمین نے اسی قسم کی فضا میں اپنی کتاب کا آخری باب ختم کیا تھا۔ اور ان معاشی حالات کے پورے تجزیے کے بعد جو دنیا کی بعض اقوام کو ایک نئے نظام کی جستجو پر مجبور اور بعض اقوام کو اپنے اندوختے کی حفاظت پر آمادہ کر رہے تھے، اُس فیصلہ کن کشاکش کی طرف اشارہ بھی کیا، جو دنیا کو پیش آنے والی تھی۔

یہ جنگ آئی اور گذر گئی۔ مسولینی اور ہٹلر جو مصنف کے نزدیک سرمایہ داری کا ایک بہروپ تھے اپنا پارٹ ادا کرکے اسٹیج سے اتر گئے لیکن جس معاشی کشاکش نے جنگ عالمگیر کو جنم دیا تھا وہ نہ صرف ابھی تک موجود ہے بلکہ اُس کا حلقہ پہلے سے زیادہ وسیع ہوگیا ہے۔

مصنف نے اس معرکتہ الآرا کتاب میں جاگیرداری زمانے سے لے کر ۱۹۳۷ء تک کے معاشی حالات کا تاریخی ارتقاء کی روشنی میں مطالعہ کیا ہے۔ اس کتاب کے پہلے جزو میں جاگیرداری نظام کی ابتداء سے لے کر سرمایہ داری نظام کی ابتداء تک کے معاشی حالات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ دوسرے جزو میں سرمایہ داری نظام کی پیدائش سے لے کر موجودہ زمانے تک کے معاشی ارتقاء سے بحث کی گئی ہے مصنف نے معاشی طاقتوں کو، جو اُبھر کر ایک جہانِ نو کی تخلیق کرتی رہتی ہیں، تاریخ کی عینک سے دیکھا ہے اور تاریخ ہی کے اوراق میں ان کی پیدائش کے اسباب و علل کی جستجو کی ہے۔ وہ انسان کے سماجی ارتقاء میں معاشی ارتقاء کے جراثیم چھپے ہوئے پاتا ہے اور انسان کے معاشی ارتقاء میں دنیا کے تاریخی انقلابات کی جڑیں جمتے، بڑھتے اور پھیلتے ہوئے دیکھتا ہے۔ اس کی یہ کتاب نہ تنہا معاشیات کی تاریخ کہی جا سکتی ہے اور نہ اس کو صرف سماجی تاریخ کا نام دیا جا سکتا ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ ان دونوں کے تانے بانے سے مصنف نے یہ جامہ تیار کیا ہے۔ معاشیات کو اگر تاریخ کے پس منظر سے الگ کرلیا جائے اور حالات کا پتہ

نہ لگایا جائے جو ان خاص نظریات کی تخلیق کا ایک خاص زمانے میں باعث ہوئے تو معاشی نظریات نہ صرف بے مزہ اور بے ربط معلوم ہوں گے بلکہ ان کے سمجھنے میں بھی بڑی دشواری محسوس ہوگی انسان اپنے ماحول سے کٹ کر الگ نہیں ہو سکتا، اس کے طرزِ فکر اور اخذ نتائج کے طریقے پر اس سماج کے طرزِ فکر اور اخذ نتائج کے طریقے کا بڑا گہرا اثر پڑتا ہے جس میں وہ پیدا ہوا اور پروان چڑھا ہے اور جس کے ساتھ اس کا اور اس کی جماعت کا مفاد وابستہ ہے۔ لیو ہیوبرمین نے ہر معاشی نظریے کو تاریخ کے اسی پس منظر میں رکھ کر غور کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کتاب میں معاشیات ایک خشک جامد اور بے مزہ چیز نہیں معلوم ہوتی ہم کو مصنف ان حالات سے روشناس کراتا ہے جو عامل کی حیثیت سے معاشی نظاموں پر اثر ڈالتے اور نئے نظاموں کی تخلیق کا باعث ہوتے رہتے ہیں۔ ان عوامل سے روشناس ہونے اور ان کے عمل کے اصولوں سے واقفیت حاصل کرنے کے بعد ہم کو معاشیات کی زندگی کا علم اور سماجی ارتقاء کے قدم بقدم اس کے ارتقا کا احساس ہوتا ہے۔

مختلف معاشی نظریے جو اپنے زمانے میں پیدا ہوئے اپنا ایک تاریخی پس منظر رکھتے ہیں لیو ہیوبرمین ان کو اسی چوکھٹے میں رکھ کر دیکھتا ہے۔ صلیبی جنگیں جو بظاہر مذہبی لڑائیاں معلوم ہوتی ہیں مصنف کی توجیہ کے بعد معاشی عوامل کا نتیجہ نظر آتی ہیں۔ لوتھر اور اس کے ساتھیوں کی تجدید و اصلاح کی تحریک بظاہر ایک مذہبی عقلیت کے سوا کچھ اور نہیں معلوم ہوتی لیکن لیو ہیوبرمین نے مذہبی پردے چاک کر کے ان معاشی عوامل کا پتہ لگایا ہے جو رومن کیتھولک چرچ کی مسیحی بین الاقوامیت کے حلقے سے یوروپی قومیت کو خاص مقاصد کے ماتحت آزاد کرا رہے تھے۔

مصنف نے ان تمام معاشی نظریات کے اخلاص کی بھی جانچ کی ہے جو عالمِ انسانیت کی معاشی فلاح کے لئے وجود میں آتے رہتے ہیں۔ اس نے ان کو بھی تاریخی حالات کی کسوٹی پر کسا اور ان کے کھوٹے اور کھرے ہونے کا پتہ لگایا ہے۔

لیو ہیوبرمین کا انداز بیان بہت دلکش ہے۔ ترجمے میں اصل عبارت کے تسلسل اور استدلال کے زور کا باقی رکھنا بہت مشکل تھا لیکن اپنی بے بضاعتی کے باوجود میں نے کوشش کی ہے کہ مصنف کا انداز بیان بڑی حد تک ترجمے میں بھی باقی رہے۔ میں کہاں تک کامیاب ہوا ہوں اس کا فیصلہ آپ کے ہاتھ میں ہے۔ ترجمہ بڑی حد تک لفظی ہے لیکن اس قسم کی علمی اور فنی کتابوں کے ترجمے میں الفاظ کی حدود سے تھوڑا سا گریز ناگزیر ہو جاتا ہے جن لوگوں کو اس قسم کی کتابوں کے ترجمے کا تجربہ ہے

وہ میری اس مجبوری کو محسوس کریں گے۔

کتاب اور زیادہ مفید بنانے کے لئے ضرورت ہے کہ اس کتاب کے آخر میں ایک ایسے باب کا اضافہ کیا جائے جس میں جنگ عظیم اور اُس کے بعد کے حالات کی روشنی میں دنیا کی معاشیات کا جائزہ لیا جائے اور معاشی امکانات کے متعلق ایک جنچی تلی رائے پیش کی جائے۔ اگر حالات نے موقع دیا تو اس حصّے کی تکمیل کی بھی کوشش کی جائے گی۔

احسان ناشناسی ہوگی اگر میں انجمن ترقی اردو ہند (علی گڈھ) کا شکریہ نہ ادا کروں جس نے اتنی بڑی کتاب کے ترجمے کی اشاعت کا بار اس زمانے میں برداشت کیا اور اُردو داں طبقے کو بھی لیو ہیوبرمن کے زاویہ نگاہ سے، جو دراصل دنیا کے ایک بڑے آزاد علمی حلقے کا زاویہ نگاہ ہے روشناس ہونے کا موقع دیا۔

میں محترمی سید احتشام حسین صاحب لکچرر لکھنؤ یونیورسٹی کا بہت ممنون ہوں جنھوں نے سفر امریکہ کی مصروفیت کے باوجود وقت نکال کر مسودہ پر نگاہ ڈالی اور اپنے قیمتی مشوروں سے مجھے فائدہ اُٹھانے کا موقع دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر ان کی رہنمائی شامل حال نہ ہوتی تو کتاب میں بہت سی خامیاں باقی رہ جاتیں۔

میں عبدالمجیب صاحب سہالوی بی۔ اے آنرز۔ ایل، ایل۔ بی اور حبیب اللہ صاحب اعظمی ایم۔ اے، بی۔ ٹی کا بھی شکر گزار ہوں۔ ان دونوں حضرات نے مخلصانہ تنقید اور مفید مشوروں سے اس ترجمے کی تسوید میں بہت مدد دی۔

تو بجان من در آئی دگر آرزو نہ بینی
مگر ایں کہ شبنم تو ئیم بے کنار بادا

لکھنؤ

۷ر جنوری ۱۹۵۳ء

نجم الدین شکیب

دیباچہ مصنف

اس کتاب کی تحریر کے دو مقاصد ہیں، اقتصادی نظریات کی روشنی میں تاریخی واقعات کی توجیہ اور تاریخ کی مدد سے اقتصادی نظریوں کی تشریح کا فرض ادا کیا جائے۔ یہ تلازم صرف اہم ہی نہیں ہے بلکہ ضروری بھی ہے۔ تاریخ کی تعلیم مکمل نہیں ہوتی اگر اس کے معاشی پہلو کو بالکل نظر انداز کر دیا جائے۔ اسی طرح معاشی نظریہ کھوکھلا معلوم ہوتا ہے اگر اس پر غور کرتے وقت اس کا تاریخی پس منظر سامنے نہ رکھا جائے۔ معاشیات جب تک تاریخی خلا میں پڑھی اور پڑھائی جائے گی بے مزہ معلوم ہو گی۔ ریکارڈو کا نظریہ لگان بہت مشکل اور غیر دلچسپ معلوم ہوتا ہے لیکن اس کو تاریخ میں اپنی موزوں جگہ پر رکھ کر دیکھا جائے تو انگلستان کے مالکان زمین اور مالکان کارخانہ جات کے درمیان انیسویں صدی عیسوی کی ابتدا میں جو کشاکش برپا تھی یہ نظریہ بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی معلوم ہو گا۔ یہ سمجھ لینے کے بعد اس نظریہ میں جان پڑ جاتی ہے اور یہ بہت ہیجان خیز اور پر معنی معلوم ہونے لگتا ہے۔

یہ کتاب جامعیت کی مدعی نہیں ہے۔ یہ نہ تو معاشی تاریخ ہے اور نہ معاشی نظریات کی تاریخ۔ لیکن پھر بھی اس میں دونوں کا تھوڑا بہت ذکر پایا جاتا ہے۔ اس کتاب میں کوشش کی گئی ہے کہ معاشی اداروں کی ارتقا کی اصطلاح میں تشریح کی جائے۔ تاکہ معلوم ہو سکے کہ بعض خاص نظریات کا بعض خاص زمانوں میں کیوں ظہور ہوا اور سماجی زندگی کے اس ماحول میں وہ کیسے پیدا ہوئے۔ انھوں نے کس طرح ترقی کی، ان میں تغیرات کی نوبت کس طرح آئی اور جب سماج کا ڈھانچہ بدل گیا وہ کس طرح ٹھکرا دئے گئے۔

میں حسب ذیل حضرات کا بہت مشکور ہوں:-

میری بیوی نے متعدد طریقوں سے، جن کا شمار کرنا محال ہے، میری مدد کی۔ ڈاکٹر میئر شپیرو (DR. MEYER SCHAPIRO) نے مسودہ پر بڑی ناقدانہ نگاہ ڈالی اور اپنے حوصلہ افزا مشوروں سے مجھے فائدہ پہونچایا۔ مس سبل مے (MISS SYBIL MAY) اور مسٹر میکائیل راس (MR. MICHAEL ROSS) نے مسلسل مشوروں اور تعمیری تنقیدوں سے مجھے واقعات اور اخذ نتائج کی بہت سی غلطیوں سے بچایا۔ میں مس جین ٹیبرسکی (MISS JANE TABRISKY) کا خاص طور سے بہت شکر گذار ہوں جن کی محتاط تحقیق تاریخ اور معاشیات کی وسیع معلومات نے مجھ کو بہت قیمتی مدد پہونچائی۔ ان کی مدد کے بغیر اس کتاب کا لکھنا ممکن نہ تھا۔

نیو یارک جولائی ۱۹۳۶ء

لیو ہیوبرمین

حصّۂ اوّل

جاگیرداری سے سرمایہ داری تک

پرورشِ جنگ آزما اور محنت کش

پرانی متحرک تصویروں کے ڈائرکٹر اکثر "عجیب" باتیں دکھایا کرتے تھے۔ ان عجیب باتوں میں وہ منظر سب سے زیادہ حیرت انگیز ہوتا تھا جس میں لوگ ٹیکسیوں میں بے تکلف گھومتے، خرید و فروخت کرتے اور غریب ڈرائیور کو "مزدوری" دئے بغیر چلتے پھرتے دکھائے جاتے تھے۔ وہ پورے شہر کی سیاحت ٹیکسی ہی میں بیٹھ کر کرتے، تفریح بھی کرتے، کاروبار بھی نبٹاتے اور سفر ختم کر کے آگے بڑھ جاتے لیکن ٹیکسی ڈرائیور کی اتنی دوڑ دھوپ کا کوئی معاوضہ دینا ضروری نہ سمجھتے۔ ان مناظر میں قرونِ وسطیٰ کے سورماؤں (KNIGHTS) اور بیگمات (LADIES) کی ان زرق برق زرہوں اور زرنگار ملبوسوں کی پوری طرح جھلک نظر آتی ہے جو وہ اُس زمانے کی کتابوں کے سیکڑوں صفحات پر کھیل اور تماشے کے موقعوں پر پہنے ہوئے نظر آتے ہیں۔ وہ ہمیشہ عالی شان قلعوں میں رہتے ہیں اور ان کے یہاں کھانے پینے کی چیزوں کی بہتات ہوتی ہے۔ لیکن محلوں کی ان بھری پُری آبادیوں میں کہیں کوئی ایسا نشان نہیں ملتا جس سے ایک لمحہ کے لئے "اُس" کام کرنے والے" (WORKER) کی طرف دھیان جائے جس کے ان تھک بازوؤں کی بدولت عیش و نشاط کے یہ سامان مہیا ہوئے ہیں۔ زرہیں درختوں میں نہیں پھلتیں۔ غذا جو زمین سے اُگتی ہے جوتنے، بونے اور دیکھ بھال کرنے والے کی محتاج ہے جس طرح آج تمہیں ٹیکسی ڈرائیور کو اُس کی محنت کا معاوضہ ادا کرنا پڑتا ہے اسی طرح دسویں، گیارھویں اور بارھویں صدیوں میں بھی کسی نہ کسی شخص کو ان تمام تفریحات اور سامانِ تعیش کی قیمت ادا کرنی پڑتی تھی جس سے اُس وقت کے امرا، بیگمات اور ان کے ہم جلیس لطف اُٹھاتے تھے۔ کسی نہ کسی

شخص کو اس وقت بھی پادریوں کے لئے غذا پیدا کرنی پڑتی تھی اور لباس تیار کرنا پڑتا تھا پادریوں اور امیروں کے فرائض میں ضروریاتِ زندگی اور سامانِ تعیش کی پیدائش شامل نہ تھی۔ پادری صرف دعا کا کام کرتے اور امرا صرف جنگ آزمائیوں کے فرائض انجام دیتے تھے۔ ان دعا گو اور جنگ آزما طبقوں کے علاوہ قرونِ وسطیٰ میں ایک تیسرا گروہ بھی تھا۔ یہ "کام کرنے والے اور پیدا کرنے والے" لوگوں کا گروہ تھا۔

جاگیرداری سماج انہیں تین جماعتوں پر مشتمل تھا۔ "دعا کرنے والے"، "لڑنے والے" اور "کام کرنے والے"۔ یہی تیسری کام کرنے والی جماعت پہلی دونوں جماعتوں کے کھلانے پلانے، پہنانے اور ان کے لئے سامانِ تعیش فراہم کرنے کی ذمہ دار تھی۔ سماج کی یہ تقسیم اور فرائض کی اس قسم کی حد بندی ممکن ہے اُس وقت کے عوام کے سامنے کچھ زیادہ نمایاں نہ رہی ہو لیکن کم از کم ایک شخص جس نے یہ شعر کہا ہے اس تقسیم کو ضرور محسوس کرتا تھا۔

"امرا اور پادری
اُن کے سہارے جیتے ہیں جو کام کرتے ہیں"

یہ کام جو یہ "محنت کش" کرتے تھے کس قسم کا تھا؟ کیا یہ فیکٹریوں اور ملوں کا کام تھا؟ فیکٹریوں اور ملوں کا تو اُس وقت وجود بھی نہ تھا۔ یہ کام کرنے والے زمینوں پر محنت کرتے تھے۔ بونا اور فصلیں کھڑی کرنا، جانوروں کی پرورش کرنا اور اُن کے دودھ اور اون سے غذا اور لباس تیار کرنا یہی ان کے کام تھے۔ یہ ایک طرح کے فارموں کا کام تھا لیکن اُس زمانے کے فارم اِس وقت کے فارموں سے اتنے مختلف تھے کہ اب ہم ان کے کام کی نوعیت کا کوئی صحیح اندازہ نہیں کر سکتے۔

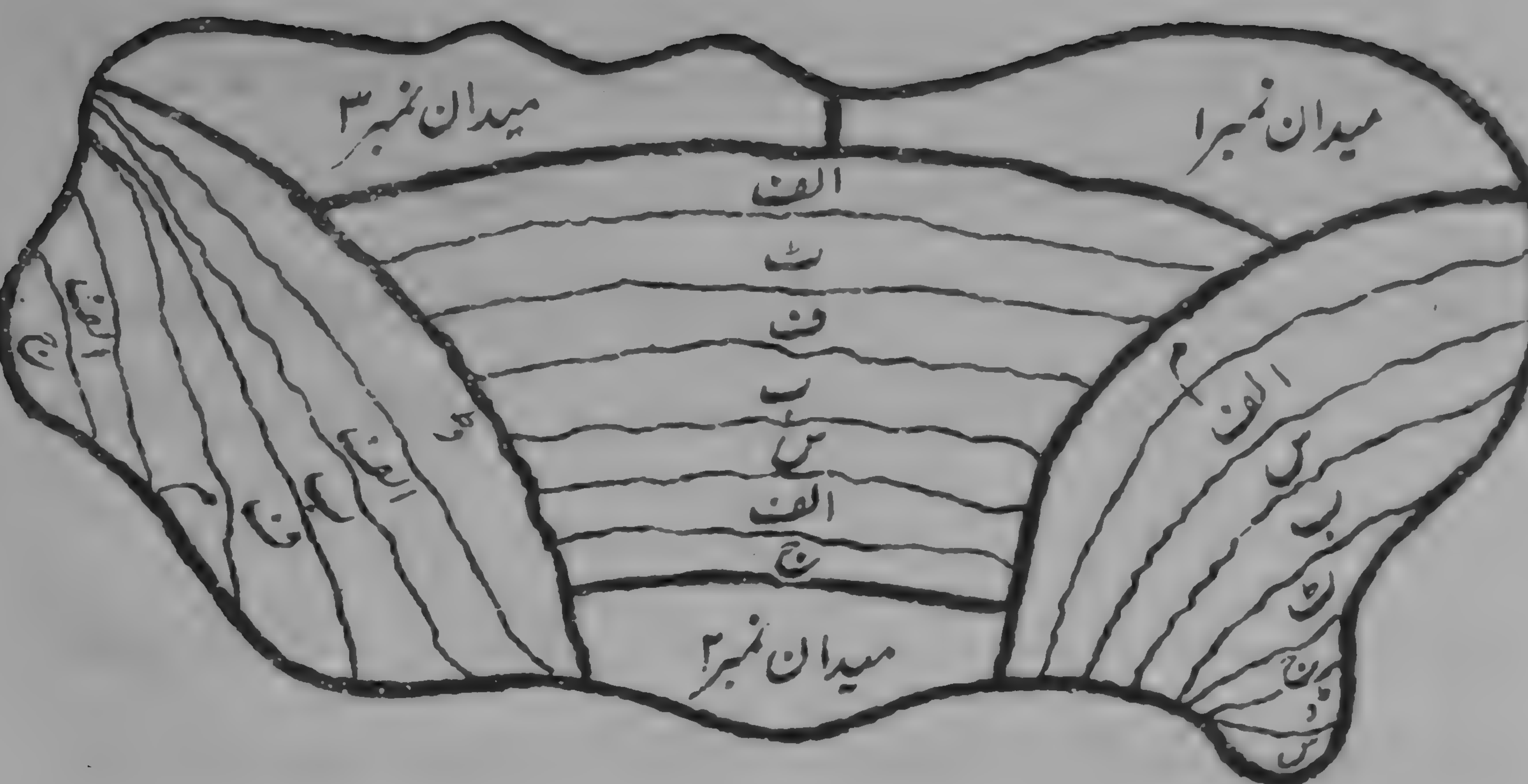
مغربی اور وسطی یورپ کی زمینیں بہت سے قطعوں میں بٹی ہوتی تھیں۔ یہ قطعے تعلقہ یا جاگیر (MANOR) کہلاتے تھے۔ ایک جاگیر ایک گاؤں اور اُس کے متعلق سیکڑوں ایکڑ قابلِ کاشت آراضی پر مشتمل ہوتی تھی۔ اس زمین پر وہ لوگ جو اس گاؤں میں آباد ہوتے تھے،

کام کرتے تھے۔ اس قابل کاشت زمین کے کنارے پر عام طور سے سبزہ زار، بنجر زمینیں، چراگاہیں اور جنگلات ہوتے تھے مختلف مقامات پر یہ جاگیریں رقبے اور تنظیم کے لحاظ سے ایک دوسرے سے مختلف ہوتی تھیں۔ ان جاگیروں میں بسنے اور کام کرنے والوں کے باہمی تعلقات کی نوعیت بھی اکثر مختلف ہوتی تھی لیکن بحیثیت ان کے درمیان بنیادی قدریں مشترک تھیں۔

ہر جاگیر ایک جاگیردار (LORD) کی ملکیت ہوتی تھی۔ جاگیرداری زمانے کے لئے یہ کہاوت عام تھی کہ کوئی زمین بغیر جاگیردار کے اور کوئی جاگیردار بغیر زمین کے نہیں پایا جاسکتا۔ تم نے قرونِ وسطیٰ کے کسی جاگیردار کے محل کی تصویر دیکھی ہوگی۔ ان محلوں کا پہچاننا کچھ زیادہ دشوار نہیں، یہ عالی شان محل ہوں یا کشادہ فارم ہاؤس، عام طور سے محفوظ ہوتے تھے۔ ان قلعہ بند مکانوں میں جاگیر کا مالک رہتا تھا یا کبھی کبھی آکر اپنے خاندان والوں، نوکروں اور عہدہ داروں کے ساتھ ٹھہرا کرتا تھا۔ بعض بعض جاگیردار متعدد جاگیروں کے مالک تھے بعضوں کی جاگیروں کا شمار تو سیکڑوں تک پہونچتا تھا۔

چراگاہیں، سبزہ زار، جنگلات اور افتادہ زمینیں وہاں بسنے والوں کے عام استعمال میں آتی تھیں لیکن قابل کاشت زمین دو حصوں میں بٹی ہوتی تھی۔ عام طور سے زمین کا تہائی حصہ جاگیردار کی خاص ملکیت سمجھا جاتا تھا۔ ان حصوں کو سیر (DE MIESNE) کہتے تھے زمین کے باقی حصے کاشتکاروں کے قبضے میں ہوتے تھے۔ یہی کاشتکار ان زمینوں پر "اصل کام کرنے والے" ہوتے تھے۔

قدیم جاگیرداری نظام کی یہ بڑی ممتاز خصوصیت تھی کہ کاشتکاروں کی زمینیں جن پر وہ کام کرتے تھے کبھی ایک جگہ نہیں ہوتی تھیں۔ بلکہ یہ ٹکڑے مختلف اطراف کے مختلف حصوں میں واقع ہوتے تھے۔ ذیل کے خاکے سے یہ تقسیم اچھی طرح سمجھ میں آجائے گی۔



دیکھو! کاشتکار الف کی زمین تین حصوں میں پھیلی ہوئی ہے اور ان حصوں میں بھی مختلف پٹیوں میں بٹی ہوئی ہے۔ اس کی زمین کے کوئی دو ٹکڑے پاس پاس نہیں ہیں۔ اسی طرح کاشتکار ب کی زمین بھی بکھری ہوئی ہے یہی صورت حال دوسرے کاشتکاروں کی زمینوں کی بھی نظر آتی ہے۔

جاگیرداری نظام کے ابتدائی دور میں جاگیردار کی سیر کی زمین بھی کسی ایک ٹکڑے میں نہیں ہوتی تھی یہ بھی مختلف ٹکڑوں میں ملی جلی اور چاروں طرف مختلف پٹیوں میں بکھری ہوتی تھی لیکن آگے چل کر سیر کی زمین رفتہ رفتہ یکجا ہونے لگی۔

ٹکڑوں اور پٹیوں میں کاشت جاگیرداری زمانے کی امتیازی خصوصیت تھی۔ یہ طریقہ ظاہر ہے بڑے نقصان کا موجب تھا۔ آخر کار چند صدیوں کے تجربے کے بعد یہ دستور ہمیشہ کے لئے ترک کردیا گیا۔ اس زمانے میں ادل بدل کر فصلیں جوتنے اور بونے کا طریقہ سیکھ لیا گیا ہے نئی نئی مفید اور زیادہ اگانے والی کھادیں بھی ہمارے تجربے میں آگئی ہیں۔ رفتہ رفتہ ہم کو ایسے سیکڑوں نئے طریقے معلوم ہوگئے ہیں جن کی مدد سے ہم جاگیرداری زمانے کے مقابلے میں کہیں زیادہ غلہ زمین سے حاصل کرتے ہیں۔ اس زمانے میں ان کے لئے یہی بہت تھا کہ وہ "دوکھیتی طریقے" (TWO FIELD SYSTEM) کے مقابلے میں "سہ کھیتی طریقہ" (THREE FIELD SYSTEM) دریافت کرلیں!

جاگیرداری زمانے کے کاشتکاروں کو اگرچہ ابھی تک یہ معلوم نہ تھا کہ کس فصل کے بعد کس غلے کی کاشت زمین کی توانائی بڑھانے اور اس کو کمزوری سے بچانے کے لئے زیادہ مفید ہے۔ وہ صرف اتنا سمجھ سکے تھے کہ صرف ایک ہی طرح کے غلے کی ہر سال کاشت مفید نہیں ہوتی اس لئے وہ ہر سال ادل بدل کر مختلف فصلیں مختلف رقبوں پر بویا کرتے تھے۔ اگر پہلے سال الف ٹکڑے میں گیہوں یا رئی (RYE) کی کاشت کی جاتی تھی تو اسی کے ساتھ ب ٹکڑے میں جو بوئی جاتی تھی اور ج ٹکڑا اس سال خالی چھوڑ دیا جاتا تھا۔

تکھیتی (THREE FIELD FARMING) کا انتظام تقریباً حسب ذیل ترتیب کیا جاتا تھا۔

	پہلے سال	دوسرے سال	تیسرے سال
الف قطعہ	گیہوں	جو	×
ب قطعہ	جو	×	گیہوں
ج قطعہ	×	گیہوں	جو

قدیم زمانے میں جاگیرداری نظام کی حسب ذیل دو اہم شکلیں ہوتی تھیں

اول۔ قابل کاشت آراضی دو حصوں میں تقسیم کی جاتی تھی۔ پہلا حصہ جاگیردار کی ملکیت ہوتا تھا اور اسی کی منفعت کے لئے بویا جاتا تھا۔ دوسرا حصہ بہت سے کاشتکاروں میں تقسیم ہوتا تھا۔

دوم۔ زمین یکجائی طور پر جیسا کہ آج کل دستور ہے، زیر کاشت نہیں لائی جاتی تھی بلکہ مختلف ٹکڑیوں اور پٹیوں میں بٹ کر جوتی اور بوئی جاتی تھی۔ یہ امتیاز بھی اسی زمانے کے ساتھ خاص تھا کہ کاشتکار کو صرف اپنی ہی زمین پر نہیں بلکہ اپنے جاگیردار کی زمین پر بھی کام کرنا پڑتا تھا۔

کاشتکار بہت ہی برے قسم کے ٹوٹے پھوٹے جھونپڑوں میں رہا کرتا تھا۔ وہ اپنی دور افتادہ اور بکھری ہوئی آراضی پر (جو انگلستان میں اوسطاً پندرہ سے تیس ایکڑ تک

ہوتی تھی اور فرانس میں چالیس سے پچاس ایکڑ تک) دن رات ان تھک محنت کے بعد بھی یہ مشکل اتنا پیدا کر پاتا تھا کہ جسم و جان کا تعلق کسی نہ کسی طرح باقی رکھ سکے۔ وہ پھر بھی مر کھپ کر اپنی زندگی نسبتہً اچھی طرح بسر کر سکتا تھا لیکن اُس کو جاگیردار کے فارم پر بھی بغیر کسی معاوضہ کے ہفتہ میں دو تین دن محنت کرنی پڑتی تھی۔ اس مستقل بیگار کے علاوہ فصل کی تیاری کے موقع پر اُس کو سب سے پہلے جاگیردار کا کھیت کاٹنا اور غلہ تیار کرنا پڑتا تھا۔ اس کی یہ فصلی محنت ہفتہ وار بیگار کی معیت سے مل کر اُس کی کمر بالکل ہی توڑ دیتی تھی۔ کاشتکار کی نگاہ میں اُس کے کھیتوں کی کچھ بھی اہمیت کیوں نہ ہوتی لیکن وہ جوتنے اور بونے کے مہینوں میں ان کو چھوڑ کر سب سے پہلے جاگیردار کے فارم میں ہل چلانے پر مجبور تھا۔ سب سے پہلے اُس کو وہیں تخم ریزی کرنی پڑتی تھی اور سب سے پہلے وہیں کی فصل کاٹ کر غلے کے انبار لگانے پڑتے تھے۔ اگر کٹائی کے وقت فصل جلد کاٹنے میں مصلحت ہوتی تو کاشتکار کو اپنا کھیت چھوڑ کر جاگیردار کی فصل کاٹنی پڑتی اور غلہ تیار کرنا ہوتا تھا۔ اگر مقامی چھوٹے بازار میں پیداوار کی فروخت کا وقت ہوتا تو کاشتکار کو اپنا مال چھوڑ کر مالک کے غلے کے بورے اور اُس کی شراب کے مٹکے لاد کر بازار پہونچانے اور بیچنے ہوتے تھے۔ اگر کوئی سڑک قابل مرمت ہوتی یا پل ٹوٹ جاتا تو کاشتکار کو اپنا کام چھوڑ کر سڑک بنانی اور پل ٹھیک کرنا پڑتا تھا۔ اگر کاشتکار کو گیہوں پسوانے ہوتے یا انگور کا عرق نکلوانا ہوتا تو جاگیردار کی چکی کے سوا اُس کے لئے کوئی دوسرا ٹھکانا نہ ہوتا تھا۔ وہ اُن چکیوں سے اپنا کام لیتا لیکن اُس کا معاوضہ مالک کی نذر کرتا تھا۔ معاوضہ کی بھی کوئی شرح مقرر نہ تھی۔ یہ تو مالک کا حق تھا وہ جو چاہتا طلب کرتا اور منھ مانگی رقم وصول کرتا۔ بارھویں صدی عیسوی کے ایک اہل قلم کے مشاہدے کے بموجب کسان اپنے انگوروں کے رس کا حقدار نہ تھا۔ اچھی غذا کا کوئی لقمہ اُس کی قسمت میں نہ لکھا تھا۔ وہ بڑا خوش قسمت تھا اگر اُسے کالی روٹی کے ٹکڑے تھوڑے مکھن اور پنیر کے ساتھ حلق کے نیچے اتارنے کو میسر آجاتے تھے۔ اُس زمانے کے شاعر نے اُس کی حالت کی کتنی صحیح تصویر کھینچی ہے:۔

"اگر اُس کے پاس موٹی بطیں اور مرغیاں ہیں"

"اگر اُس کی ٹوکری میں سفید آٹے کے کیک ہیں"

"تو ان کا حقدار تو اُس کا مالک ہے"

اگر صورت حال یہ تھی تو کیا اُس وقت کا کاشتکار غلام تھا؟ یہ ایک حقیقت ہے کہ اُس زمانے کے کاشتکار سرف (SERFS) کہلاتے تھے۔ سرف لاطینی لفظ سیروس "SERVUS" سے نکلا ہے۔ سیروس لاطینی زبان میں غلام کو کہتے ہیں لیکن غلام کا وہ تصور جو ہمارے ذہن میں ہے ان پر صادق نہیں آتا۔ اگر قرون وسطیٰ میں اخبارات چھپتے ہوتے تو اس قسم کا اشتہار جو ۱۲ اپریل ۱۸۲۸ء کے چارلس ٹن کوریر (CHARLES TUN COURIER) کے صفحات پر شائع ہوا، ان اخبارات میں ہرگز نہ چھپتا۔ یہ اشتہار حسب ذیل ہے:۔

"ایسا قیمتی خاندان، جو شاید ہی کبھی فروخت کے لیے پیش کیا گیا ہو ایک باورچی عورت عمر ۳۵ سال، اُس کی لڑکی عمر ۱۴ سال اور ایک لڑکے ۸ سال پر مشتمل ہے۔ پورا خاندان یکجائی بھی فروخت ہو سکتا ہے اور علیحدہ علیحدہ کر کے بھی ۔۔۔ خریدار کی جیسی خواہش ہو"

ایک نیگرو خاندان کے افراد کی طرح اپنے مالک کی مرضی کے بموجب اپنے کنبے سے بچھڑ بچھڑ کر بکنا ایک سرف خاندان اور اُس کے افراد کے لئے ممکن نہ تھا، ایک سرف خاندان کو اپنے افراد کے یکجا رکھنے کا پورا حق تھا۔ اُس کے مالک کی مرضی اُن کے ساتھ رہنے کے حق میں خلل انداز نہیں ہو سکتی تھی۔ غلاموں کی طرح وہ مالک کی جائداد کا کوئی ایسا جزو نہ تھا جسے ہر وقت، ہر طرح اور ہر موقع پر بیچا اور خریدا جا سکتا۔ سرف اپنی زمین کا ایک ایسا لازمی حصہ تھا جسے زمین سے الگ کر کے فروخت نہیں کیا جا سکتا تھا۔ جاگیر کا مالک اپنی زمین کسی دوسرے کے نام منتقل کر سکتا تھا، لیکن اس کا اثر سرف پر صرف اتنا ہی پڑتا تھا کہ وہ انتقالِ ملکیت کے ساتھ دوسرے مالک کی ماتحتی میں آجاتا تھا لیکن اپنی زمین سے اُس کا تعلق بدستور باقی رہتا تھا۔ یہ ایک اہم امتیاز تھا۔ اس سے سرف کی حیثیت غلام

کے مقابلے میں زیادہ محفوظ ہو جاتی تھی۔ سرف کے ساتھ مالک کا برتاؤ کتنا ہی خراب ہوتا لیکن وہ ایک کنبے کا مالک ہوتا تھا۔ وہ اپنے گھر میں رہتا اور اپنی زمین پر کام کرنے کا مجاز ہوتا تھا۔ سرف بڑی حد تک ایک محفوظ حیثیت کا مالک ہوتا تھا۔ اس لئے اکثر ایسے آزاد لوگ جو بے خانماں اور بے روزگار ہوتے تھے گلے میں رسی ڈال کر، سر پر ایک پینی کا نذرانہ رکھے جاگیردار کے پاس سرف بننے کی خواہش لے کر آتے تھے۔

سرفوں کی بھی کئی قسمیں ہوتی تھیں لیکن اب صحیح طور پر ان کی مختلف قسموں کے درمیان امتیازی فرقوں کا پورا پتہ لگانا بہت دشوار ہے۔ کچھ ایسے سرف بھی تھے جو مستقل طور پر جاگیرداروں کے محلوں اور فارموں میں ہمیشہ کام کرتے رہتے تھے۔ یہ بہت غریب کاشتکار ہوتے تھے۔ ان کو بورڈرز (BORDARS) کہتے تھے۔ گاؤں کے کنارے دو یا تین ایکڑ اراضی ان کی کل کائنات ہوتی تھی۔ سرفوں کی ایک اور قسم کاٹر[1] (COTTERS) کہلاتی تھی۔ یہ غریب ایک جھونپڑے کے سوا اور کوئی ملکیت نہ رکھتے تھے۔ یہ صرف پیٹ کی روٹی کے سہارے جاگیردار کی خدمت میں اپنی زندگی بسر کر دیتے تھے

سرفوں کی ایک اور جماعت بھی تھی جو ویلین (VILLEINS) کہلاتی تھی۔ یہ لوگ اپنے ان بدقسمت بھائیوں کے مقابلے میں، جن کا ذکر اوپر آ چکا ہے، کچھ زیادہ ترقی یافتہ تھے، ان کو کچھ معاشی آزادیاں بھی حاصل تھیں۔ وہ اپنے کاروبار میں جاگیردار کے کچھ زیادہ پابند نہ تھے۔ ان کے فرائض بھی مقرر تھے۔ جاگیردار اپنی مرضی کے مطابق ان سے ہر کام لینے کا مجاز نہ تھا ان میں سے بعض فصلوں کی کٹائی کے وقت بھی "عام خدمات" سے مستثنیٰ تھے۔ کچھ ایسے بھی تھے جو کسی قسم کی خدمت کے پابند نہ تھے بلکہ صرف اپنی پیداوار کا ایک حصہ مالک کو ادا کرتے تھے۔ کچھ ایسے لوگ بھی تھے جو نہ کسی قسم کی خدمت انجام دیتے تھے اور نہ پیداوار کا کوئی حصہ مالک کی خدمت میں پیش کرتے تھے بلکہ اس کے بجائے ایک مقررہ رقم ادا کیا کرتے تھے۔ یہ طریقہ زمانے کے ساتھ ساتھ

---

[1] اسکاچستان کا کسان جو جھونپڑیاں ڈال کر کھیتوں میں رہتا اور طلبی پر معین رقم لے کر کام کرتا تھا۔

جڑ پکڑتا گیا اور آگے چل کر اُس نے بہت اہمیت حاصل کر لی۔

بعض ولین (VILLEINS) کچھ زیادہ فارغ البال ہوتے تھے۔ یہ عام آزاد آدمیوں کی طرح کھاتے پیتے لوگ تھے۔ وہ اکثر اپنی مقبوضہ زمینوں کے علاوہ جاگیردار کی سیر کے بعض قطعے بھی کرایہ پر لیا کرتے تھے۔ کچھ ایسے آزاد لوگ بھی تھے جو اپنی زمینوں کے مالک تھے۔ وہ جاگیردار کے فارم پر کسی قسم کی خدمت کے پابند نہ تھے۔ وہ صرف زمین کا ٹیکس اپنے مالکِ اعلیٰ (OVER LORD) کو ادا کرتے تھے۔ اس قسم کے آزاد کاشتکار ولین اور سرف رفتہ رفتہ آپس میں مل جل گئے۔ اب ان کی شاخوں کا پتہ لگانا اُن کی جماعتی حد بندی کرنا اور ہر جماعت کی الگ حیثیت کا متعین کرنا بہت مشکل کام ہے۔

جاگیرداری نظام کا کوئی صحیح خاکہ کھینچنا آسان نہیں ہے۔ یہ نظام ہر جگہ یکساں نہ تھا مختلف جگہوں پر مختلف دستور رائج تھے لیکن پھر بھی غیر آزاد طبقوں کے حالات میں کچھ باتیں بنیادی طور پر مشترک تھیں۔

کسان کم و بیش ہر جگہ جاگیردار کے پابند تھے۔ یہ خیال کہ کاشتکار صرف زمین کے مالک کیلئے زندہ ہے ایک عام عقیدے کی حیثیت سے صحیح تسلیم کیا جاتا تھا۔ آقا اور سرف کے درمیان مساوات کا سوال کبھی پیدا ہی نہ ہوتا تھا۔ سرف زمین پر کام کرتا تھا اور مالک سرف کے کاندھوں پر سوار رہتا تھا۔ جہاں تک مالک کے حقوقِ ملکیت کا سوال تھا سرف اور اُس کے محل کے دوسرے جانوروں میں کوئی فرق نہ تھا۔ گیارھویں صدی عیسوی میں فرانس میں ایک گھوڑے کے دام ۱۰۰ سُو (SOUS) ہوتے تھے لیکن ایک سرف کی قیمت صرف ۳۸ سُو (SOUS) ٹھہرتی تھی۔ مالک کو جس طرح اپنے گھوڑوں کے نقصان سے جو اُس کے کھیتوں میں کام کرتے تھے رنج ہوتا تھا اسی طرح وہ ان انسانی چوپایوں کے نقصان سے بھی جو اُس کی زمین پر کام کرتے تھے فکر مند ہوتا تھا۔ نہ کسی سرف کا زمین سے علیحدہ ہو کر بکنا ممکن نہ تھا اور نہ اُس کا زمین چھوڑ کر چلا جانا جائز تھا۔ جو زمین اُس کی کاشت میں ہوتی تھی اُس کو ملکیت (TENURE) کہتے تھے (لاطینی زبان میں

TENERE مالک ہونے کو کہتے ہیں لیکن دراصل یہ ملکیت سرف کی مالک ہوتی تھی۔ سرف کو اُس پر حقوقِ مالکانہ حاصل نہ تھے۔ اگر کوئی سرف بھاگ نکلنے کی کوشش کرتا اور بھاگنے میں پکڑ لیا جاتا تو اُسے بہت سخت سزا دی جاتی تھی۔ اس کے لیے اس کے سوا اور کوئی شکل نہ ہوتی کہ وہ پھر اپنی ریاست پر لوٹ آئے۔ براڈ فورڈ (BRAD FORD) کی جاگیر کی یادداشت (مشتملہ ۱۳۴۹ء تا ۱۳۵۸ء) میں ہم کو یہ اندراج ملتا ہے:-

"یہ کہا گیا ہے کہ ولیم چائلڈ یانگ (WILLIAM CHILDYONG) کی لڑکی ایلس (ALICE) جو مالک کی لونڈی (BOND WOMAN) ہے یارک (YARK) میں رہتی ہے اس لئے اس کو پکڑ لاؤ۔"

جاگیردار کبھی پسند نہیں کرتا تھا کہ اس کے مزدوروں کی تعداد میں کوئی کمی آجائے اس لئے سرفوں کے لڑکوں اور لڑکیوں کی شادیوں پر بھی پابندیاں عائد کی گئی تھیں۔ وہ جاگیر کے باہر کسی دوسری جگہ مالک کی خاص منظوری کے بغیر شادی نہیں کر سکتے تھے کسی سرف کے مرنے کے بعد اُس کا جائز وارث ایک ٹیکس ادا کرنے کے بعد اُس کی ملکیت کا وارث بن سکتا تھا۔ براڈ فورڈ کی جاگیر کی یادداشت میں جس کا حوالہ اوپر آچکا ہے، ایک واقعہ کا اندراج ملتا ہے۔ یہ واقعہ حسب ذیل ہے:-

"رابرٹ ولد راجر ولد رچرڈ جس کے پاس مکان اور آٹھ ایکڑ زمین (BONDAGE LAND) تھی مرگیا ہے اس کا بھائی اور وارث جان آیا ہے۔ جاگیر کے رواج کے موجب وہ مالک کو ۳ شلنگ کا ٹیکس ملکیت پر تصرف حاصل کرنے کے لئے ادا کرتا ہے۔"

مذکورہ بالا اقتباس میں "جاگیر کے رواج کے بموجب" کے الفاظ بہت اہم ہیں۔ ان الفاظ سے جاگیرداری نظام کی ساخت پر روشنی پڑتی ہے۔ اُس زمانے میں "جاگیر کے رواج" کی اہمیت ان قوانین سے کم نہ تھی جو آج ڈسٹرکٹ یا میونسپل بورڈوں کی طرف سے جاری ہوتے رہتے ہیں۔ جاگیرداری نظام میں رواج کی وہی اہمیت تھی جو بیسویں صدی عیسوی میں قوانین کو

حاصل ہے۔ قرون وسطیٰ میں کوئی ایسی مضبوط حکومت نہ تھی جو اُس وقت کے سماجی نظام کے ہر پہلو پر حاوی ہوتی۔ اُس وقت کا پورا نظام نیچے سے اوپر تک چند پابندیوں اور خدمتوں پر منحصر تھا۔ جاگیرداری دور میں زمین پر قبضہ کے معنی یہ نہ تھے کہ تم اِس زمانے کی طرح آزادی سے اُس زمین پر جو چاہتے کرتے۔ اُس زمانے میں قبضہ نام اُن چند ذمہ داریوں کا تھا جو تم کو ایک خاص شخص کے مفاد کے لئے اپنے اوپر عائد کرنی تھیں۔ اگر تم ان ذمہ داریوں سے پوری طرح عہدہ برآنہ ہوسکتے تو زمین تم سے واپس لے لی جاتی۔ سرف کے اوپر مالک کی خدمات کی ذمہ داریاں عائد ہوتی تھیں اور مالک جنگ کے زمانے میں سرف کی حفاظت کا ذمہ دار ہوتا تھا۔ یہ تمام باتیں باہمی طور پر طے تھیں اور رواج کے بموجب ان پر عمل ہوتا تھا۔ لیکن جس طرح آج قوانین اکثر ٹوٹتے رہتے ہیں اسی طرح اُس زمانے میں بھی رواجوں میں قطع و برید ہوتی رہتی تھی۔ دو سرفوں کے درمیان کی نزاعیں جاگیردار کی عدالت میں طے ہوتی تھیں ـــ اُس وقت کا یہی دستور تھا۔ سرف اور مالک کے درمیان جب کوئی اختلاف ہوتا تو وہ بھی فیصلہ کے لئے جاگیردار ہی کے سامنے پیش کیا جاتا تھا۔ جاگیردار عدالت کا حاکم ہوتا اس لئے اس جھگڑے کا فیصلہ بھی اُسی کے حق میں ہوتا۔ پرانی یادداشتوں میں ہم کو ایسے واقعات بھی ملتے ہیں جن میں کسی جاگیردار نے بعض رواجوں کو توڑا اور ان کی جوابدہی کے لئے اُس ماتحت جاگیردار کو اپنے مالک اعلیٰ کے سامنے پیش ہونا پڑا۔ انگلستان میں کاشتکاروں کی شکایتیں اکثر بادشاہ کے دربار تک پہونچتی تھیں اور وہاں ان کی شنوائی بھی ہوتی تھی۔

جب دو جاگیردار آپس میں کسی معاملہ پر جھگڑتے تھے تب کیا ہوتا تھا؟ یہ سوال ہمیں جاگیرداری نظام کے دلچسپ مطالعہ پر مجبور کرتا ہے۔ جاگیردار بھی سرفوں کی طرح اپنی زمین کا مالک نہ ہوتا تھا بلکہ وہ بھی ایک بڑے جاگیردار کے سامنے ایک کاشتکار کی حیثیت رکھتا تھا، سرف، ولین یا آزاد کاشتکار جاگیردار سے زمین حاصل کرتے تھے۔ وہ جاگیردار ایک امیر (کاؤنٹ) کی طرف سے اپنی جاگیر کا مالک بنتا تھا۔ یہ امیر بھی کسی ڈیوک کی جانب سے اپنی مملکت پر فرمانروائی

کرتا تھا سب سے اوپر بادشاہ تھا جو ڈیوک کے اوپر کلی اختیارات رکھتا تھا۔ یہ سلسلہ کبھی اور بھی دراز ہوتا اور بعض بادشاہ بھی کسی دوسرے بادشاہ کی طرف سے اپنی مملکت پر حکومت کرتے تھے۔ ذیل کے اقتباس سے جو ایک انگریزی عدالت کے ریکارڈ (۱۲۷۹ء) سے حاصل کیا گیا ہے، زینہ بزینہ مالکوں کی ترتیب اچھی طرح سے واضح ہو جاتی ہے:۔

"سینٹ جرمین (ST. GERMAIN) کا روجر (ROGER) بیڈ فورڈ (BED FORD) کے رابرٹ کی طرف سے ایک قطعہ اراضی پر قابض ہے اور اس کے لئے ۳ پنس رابرٹ کو جس سے اُس نے زمین حاصل کی، ادا کرتا ہے اور چھ پنس رچرڈ ہلچسٹر (RICHARD HYLCHESTIR) کو رابرٹ کی طرف سے جس نے اُس سے زمین حاصل کی ادا کرتا ہے۔ رچرڈ مذکور نے یہ زمین آلن ڈی چارٹرس (ALAN DE CHATRES) سے دو پنس سالانہ کے معاوضہ پر حاصل کی ہے۔ الن اس زمین پر ولیم ڈی بٹلر کی طرف سے قابض ہوا ہے۔ ولیم مذکور نے یہ زمین لارڈ گلبرٹ ڈی نیول (LORD GILBURT DE NE-VILLE) سے حاصل کی ہے اور گلبرٹ نے لیڈی ڈی ورجیلا ڈی بارلل (DEVORGAI-LLA DE BALLIOL) سے پائی ہے۔ ڈی ورجیلا شاہ اسکاٹ لینڈ کی طرف سے متصرف ہے اور شاہ اسکاٹ لینڈ کو شہنشاہ انگلستان نے یہ آراضی عطا کی ہے۔"

اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ زمین کا صرف یہی ٹکڑا الن، ولیم یا گلبرٹ کی کل ملکیت تھا۔ کبھی صرف ایک ہی جاگیر کسی امیر کے قبضے میں ہوتی تھی اور کبھی وہ جاگیر کسی بڑے علاقہ کا ایک چھوٹا سا جزو ہوتی تھی بعض امیروں کے قبضے میں چند جاگیریں ہوتی تھیں بعض امرا متعدد جاگیروں کے مالک ہوتے تھے۔ بعض رئیس متعدد تعلقوں پر متصرف ہوتے تھے۔ کچھ رؤسا ایسی بہت سی جاگیروں کے مالک ہوتے تھے جو مختلف علاقوں میں پھیلی ہوتی تھیں۔ انگلستان میں ایک دولت مند امیر ایک ایسی جائداد کا مالک تھا جو سات سو نوے (۷۹۰) ملکیتوں پر مشتمل تھی۔ اٹلی میں چند ایسے امرا تھے جن کے تصرف میں دس ہزار سے زیادہ جاگیریں تھیں۔

بادشاہ جو برائے نام پوری مملکت کا مالک سمجھا جاتا تھا۔ خاص جاگیردار، جو پوری مملکت میں پھیلی ہوتی تھیں متصرف ہوتا تھا۔ جو لوگ براہ راست بادشاہ سے اراضی حاصل کرتے تھے، خواہ وہ امراء کے طبقے سے تعلق رکھتے ہوں یا معمولی آزاد آدمی ہوں "لگان دار خاص" (TENANT IN CHIEF) کہلاتے تھے۔

جتنا وقت گذرتا گیا بڑی بڑی جائدادیں ٹوٹ ٹوٹ کر چھوٹی چھوٹی جاگیروں میں بٹتی گئیں یہ جاگیریں کبھی ایک طبقے کے امیروں کے تصرف میں ہوتی تھیں اور کبھی کسی دوسرے کے قبضہ میں آجاتی تھیں ایسا کیوں ہوتا تھا؟ صرف اس لئے کہ ہر امیر چاہتا تھا کہ اپنے حلقۂ اثر میں جتنے افراد کا اضافہ کرسکے کرلے حلقہ بگوشوں کا یہ گروہ صرف اُسی صورت میں جب امیر اپنی زمین کا کچھ حصہ ان کے تصرف میں دیتا، بڑھ سکتا تھا۔

آج کل اراضی، کارخانے، ملیں، کانیں، ریلیں، کشتیاں اور طرح طرح کی مشینیں۔ اُس پیداوار کے بڑھانے میں جو ہم استعمال کرتے ہیں کام آتی ہیں کسی آدمی کے تصرف میں یہ وسائل جس قدر زیادہ ہوتے ہیں اسی قدر وہ زیادہ دولت مند سمجھا جاتا ہے لیکن جاگیرداری نظام میں صرف زمین ہی ضرورت کی تمام چیزیں پیدا کرتی تھی اس لئے زمین ہی انسانی دولت کا واحد ذریعہ سمجھی جاتی تھی۔ انسان کی دولت کا اندازہ زمین کے رقبہ کی وسعت سے کیا جاتا تھا۔ اسی لئے اُس زمانے میں زمین کے لئے مسلسل ہنگامے برپا ہوتے رہتے تھے۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ جاگیرداری زمانہ دراصل مسلسل جنگوں کا دور تھا۔ ان لڑائیوں کو جیتنے کے لئے اپنے ساتھ آدمیوں کی ایک بڑی جماعت کا رہنا بہت ضروری تھا۔ یہ بھیڑ بھاڑ اُسی وقت ساتھ رہ سکتی تھی جب اُس کو ساتھ رکھنے کے لئے کچھ خرچ کیا جاتا۔ ان لوگوں کی خدمات اس لئے حاصل کی جاتی تھیں کہ وہ مالک کو کچھ ادا بھی کریں اور ضرورت کے وقت اُس کے کام بھی آئیں۔ ان ضروریات کو پورا کرنے کے لئے ان کو زمین کا ایک حصہ دیا جاتا تھا۔ ہم کو فرانس کی ایک پُرانی یادداشت میں، جو ۱۲۰۰ء میں لکھی گئی تھی حسب ذیل عبارت ملتی ہے :-

"میں تھیبالٹ (THIEBAULT) ٹرائس (TROYES) کا کاؤنٹ، موجودہ نسل کو اور جو اُن کے بعد آنے والے ہیں مطلع کرتا ہوں کہ میں جوسلین ڈی اوالن (JOCELYN D. AVALON) اور اُس کے ورثا کو بطور صلۂ خدمت گلن کورٹ (GILLON COURT) کی جاگیر عطا کرتا ہوں۔ جوسلین اس جاگیر پر متصرف ہونے کی وجہ سے ہمارے وابستگان دولت میں شمار ہوگا۔"

وابستۂ دولت (LIEGE MAN) ہونے کی حیثیت سے جوسلین سے غالباً یہ توقع ضرور کی جاتی ہوگی کہ وہ ضرورت کے وقت اپنے آقا کی فوجی خدمت سے گریز نہ کرے گا۔ بہت ممکن ہے اُس کو مسلح سپاہیوں کی کوئی خاص تعداد، کچھ معین وقت کے لئے آقا کی خدمت میں حاضر رکھنی پڑتی ہو۔ ایک امیر (KNIGHT) کو انگلستان اور فرانس میں عام طور سے چالیس دن کی "خدمات" ادا کرنی پڑتی تھیں لیکن یہ بھی ممکن تھا کہ یہ خدمات کسی خاص معاہدہ کے ماتحت آدھی یا چوتھائی کر دی جاتیں ۱۲۷۲ء میں شاہ فرانس کو ایک جنگ لڑنی پڑی۔ اُس نے اُن امیروں کو جو فوجی خدمات کے لئے جاگیروں پر قابض تھے شاہی فوج میں شرکت کے لئے طلب کیا۔ بعض امیروں نے پوری مدت تک فوجی خدمات انجام دیں، کچھ لوگوں نے اپنے قائم مقام بھیجے۔ یادداشت میں لکھا ہے:-

"امیر ریجنالڈ ٹریہن (REGINALD TRIHAN KNIGHT) خود حاضر ہو کر فوج میں شامل ہوا۔ امیر ولیم ڈی کوئنرز (WILLIAM DE COYNERS KNIGHT) نے اپنی جگہ پر تھامس کاکٹ (THOMAS CHOCQUET) کو دس روز کے لئے بھیجا۔ امیر جان ڈی چینٹلیو (JOHN DE CHANTELEU KNIGHT) نے حاضر ہو کر بیان کہ وہ اپنی طرف سے دس دن تک شریک رہے گا اور پھر امیر گوڈرڈس ڈی گوڈرڈوول (GODARDUS DE GODARDVILLE KNIGHT) کی طرف سے جس کو چالیس روز خدمات انجام دینی ہیں شریک ہوگا۔"

شاہزادے اور دوسرے امراء جن کو فوجی خدمات کے لئے زمینیں ملتی تھیں، دوسرے لوگوں کو انھیں خدمات کی ادائگی کی شرط پر آراضی عطا کیا کرتے تھے۔ حقوق و خدمات کی ظاہری نوعیت مختلف حصوں اور حالات میں بدلتی رہتی تھی لیکن مغربی اور وسطی یورپ میں بنیادی طور پر ان میں کوئی فرق نہ تھا۔ ان لوگوں کو، جو ان زمینوں پر قابض ہوتے تھے اپنے مالکِ اعلیٰ کی رضامندی کے بغیر ان زمینوں کو بیچنے کا اختیار نہ تھا۔ اگر ان کو انتقال آراضی کی اجازت مل جاتی تو وہ کچھ مطالبات ادا کرنے کے بعد اپنی جائداد کسی دوسرے کے نام منتقل کر سکتے تھے۔ جس صورت سے کسی سرف کے وارث کو ٹیکس ادا کئے بغیر متوفی کی جائداد پر قبضہ نہ ملتا تھا اسی طرح کسی امیر کو بھی کسی جائداد میں وراثت کا حق حاصل کرنے کے لئے مالک اعلیٰ (OVER LORD) کو وراثت کا ٹیکس ادا کرنا پڑتا تھا۔ اگر کوئی زمیندار فوت ہوجاتا اور اس کے وارث بالغ نہ ہوتے تو مالکِ اعلیٰ ان کے بلوغ تک جائداد کا متولی رہتا تھا۔ اس لازمی تولیت کے لئے جس کا حق مالک اعلیٰ حاصل کرتا تھا، یہ دلیل تھی کہ وہ ذمہ داریاں جن کی ادائگی کے لئے متوفی کو یہ زمین دی گئی تھی، ان نابالغوں سے ادا نہ ہوسکیں گی اس لئے ان فرائض کی بجا آوری کے لئے مالک اعلیٰ انتظام سنبھالتا ہے تولیت کے اس زمانے میں جو کچھ آمدنی ہوتی تھی وہ مالکِ اعلیٰ کے تصرف میں آتی تھی۔

وارث عورتیں اپنی شادی کے لئے مالکِ اعلیٰ کی منظوری کی پابند تھیں ۱۲۲۱ء میں نرورس (NERVERS) کی کاؤنٹس نے اس حقیقت کا اعتراف ان الفاظ میں کیا ہے:۔

"میں ٹیلڈا (MATILDA) نرورس کی کاؤنٹس ان سب کے سامنے جو اس تحریر کو پڑھیں گے، اعلان کرتی ہوں کہ میں نے مقدس صحیفوں کی قسم کھائی ہے کہ میں اپنے پیارے آقا فلپ کی خدمات تمام زندہ مردوں اور عورتوں کے خلاف بجالاؤں گی اور بغیر اس کی منظوری کے شادی نہ کروں گی۔"

اگر کوئی بیوہ شادی کرنا چاہتی تھی تو اُسے اپنے مالک اعلیٰ کو ایک ٹیکس ادا کرنا پڑتا

تھا۔ ایک انگریزی یادداشت سے جو ۱۲۱۶ء میں ایک بیوہ لگاندار خاص (TENANT IN-CHIEF) کے لئے لکھی گئی تھی اس کا ثبوت ملتا ہے۔ اس تحریر کے الفاظ ہیں :۔

"بادشاہ کی طرف سے تمام لوگوں کو مبارک ہو۔ ٹیکس کی رقم سو شلنگ جو جون (JOAN) کے لئے (جو سائمن ڈارچیس (SIMON DARCHES) کی جو دالنگ فورڈ (WALLING FORD) میں ہمارا لگان دار خاص تھا، بیوہ ہے) ادا کئے گئے ہیں۔ ہم نے جون کو اجازت دیدی ہے کہ وہ جس سے چاہے شادی کرلے لیکن شرط یہ ہے کہ وہ جس شخص سے شادی کرے وہ ہمارا مطیع و فرمانبردار ہو۔"

اگر کوئی بیوہ شادی نہیں کرنا چاہتی تھی تب بھی اُس کو شادی سے بچنے کے لئے مالکِ اعلیٰ کو ایک رقم ادا کرنی پڑتی تھی جسب ذیل تحریر سے اس کا ثبوت ملتا ہے :۔

"وارو ک (WARWICK) کی کاؤنٹس ایلس (ALICE) ایک ہزار پاؤنڈ اور دس گھوڑے پیش کرتی ہے تاکہ اُس کو بیوہ رہنے کی اجازت دی جائے اور اُسے بادشاہ کی طرف سے دوسری شادی پر مجبور نہ کیا جائے۔"

یہ وہ چند ذمہ داریاں تھیں جو ان حلقہ بگوشوں کو اُس زمین اور حمایت کے عوض میں جو وہ مالکِ اعلیٰ سے حاصل کرتے تھے۔ پوری کرنی پڑتی تھیں۔ ان حلقہ بگوشوں کے فرائض صرف ان ذمہ داریوں کی ادائگی تک محدود نہ تھے۔ اگر مالکِ اعلیٰ کہیں گرفتار ہوجاتا تو ان لوگوں کو زرِ فدیہ ادا کرکے اس کو رہا بھی کرانا پڑتا تھا۔ اگر مالکِ اعلیٰ کا لڑکا نائٹ بنایا جاتا تو ان حلقہ بگوشوں کو امداد کے طور پر نذرانے پیش کرنے پڑتے تھے تاکہ اس تقریب کے سلسلے میں جشن کے جو مصارف ہوں، برداشت کئے جاسکیں۔

۱۲۲۵ء میں ایک شخص بالڈون (BALDWIN) نے اِس دستور کے خلاف آواز اُٹھائی تھی۔ اُس نے کہا تھا کہ بادشاہزادہ جو امیر (KNIGHT) بنایا جارہا ہے میرا "براہِ راست" امیر نہیں ہے۔ بالڈون اس عذر کی بنا پر اس مطالبہ کی ادائگی سے مستثنیٰ

ہو گیا۔ انگریزی خزانے کی یادداشت میں اس واقعہ کے متعلق درج ہے :-

"ورسسٹر (WORCESTER) کے شیرف (SHERIFF) کو حکم دیا جاتا ہے کہ اگر بالڈون ڈی فری ول (BALDWIN DE FRIVILL) اپنی زمین پر بادشاہ کی طرف سے متصرف نہیں ہے بلکہ وہ، جیسا کہ اُس کا دعویٰ ہے اس زمین پر الکزنڈر ڈی ایبٹ- ALEXENDER-(DE ABETOT) کی طرف سے قابض ہے اور الکزنڈر کو اس زمین پر تصرف ولیم ڈی بیچمپ (WILLIAM DE BEAUCHAMP) کی طرف سے ملا ہے۔ ولیم ورسسٹر کے بشپ کی طرف سے قابض ہے، اور بشپ نے یہ زمین بادشاہ سے کاشتکار خاص کے طور پر حاصل کی ہے۔ اگر بالڈون کا یہ بیان صحیح ہے تو اُس کو اُس قرقی سے بری کیا جائے جو شاہزادے کے نائٹ (KNIGHT) بنائے جانے کے سلسلے میں امداد لینے کے لئے اُس کے خلاف جاری کی گئی ہے۔"

بالڈون اور شاہ انگلستان کے درمیان میں مالکانِ اعلیٰ کی ایک زنجیر تھی۔ اس زنجیر کی ایک کڑی ورسسٹر کا بشپ بھی تھا۔ بشپ کے نام کو ذرا غور سے پڑھنے کی ضرورت ہے اس واقعہ سے یہ حقیقت اچھی طرح روشن ہو جاتی ہے کہ چرچ بھی جاگیرداری نظام کا ایک لازمی جزو تھا۔ بعض حالات میں یہ جزو بادشاہ کے برابر اہم ہوتا تھا لیکن بعض صورتوں میں اس کا اثر و اقتدار بادشاہ سے کہیں زیادہ بڑھ جاتا ہے۔ چرچ ایک ایسا نظام تھا جو عیسائی دنیا کے ایک ایک گوشے پر حاوی تھا۔ اس کی طاقتیں بے پناہ تھیں۔ بڑے بڑے حکمراں اس کی عالم گیر طاقت کا لوہا مانتے تھے۔ وہ مذہب کا دور تھا اس لئے چرچ کے روحانی اثر و رسوخ کی کوئی انتہا نہ تھی لیکن چرچ کی دولت بھی اُس زمانے کے دستور کے مطابق، زمین ہی تھی جاگیرداری نظام میں زمین کا سب سے بڑا حصہ اسی کے قبضے میں تھا۔ وہ لوگ جو اپنی بے راہ رو زندگی سے مطمئن نہیں ہوتے تھے۔ مرنے سے پہلے جوارِ رحمت میں جگہ حاصل کرنے کے لئے چرچ کو زمینیں نذر کرتے تھے۔ کچھ لوگ چرچ کو بیماروں کی دیکھ بھال اور غریبوں کی

خبر گیری کرتے ہوئے دیکھتے اور اس کے نیک کام میں حصہ لینے کے لئے اس کے نام زمین وقف کرتے تھے بعض امرا اور بادشاہ جب جب کوئی نئی فتح حاصل کرتے تھے چرچ کو بھی مفتوحہ علاقوں میں حصہ دیتے تھے۔ اس طرح رفتہ رفتہ چرچ کی قلمرو وسیع ہوتی گئی اور ایک وقت آیا جب مغربی یورپ کی تقریباً نصف آراضی اس کے تصرف میں آگئی

بشپ اور صدر خانقاہ (ABBOT) بھی کاؤنٹوں اور ڈیوکوں کی طرح جاگیرداری نظام میں اپنی خاص جگہ رکھتے تھے۔ وہ فرمان جس کے بموجب بیوویس (BEAUVAIS) کے بشپ کو ۱۱۶۷ء میں جاگیر عطا ہوئی تھی دیکھنے کے لائق ہے۔ اس فرمان کے الفاظ ہیں :-

"میں لوئس شاہ فرانس۔ ان تمام لوگوں کے سامنے جو موجود ہیں اور جو آنے والے ہیں اعلان کرتا ہوں کہ ہمارے سامنے منٹے (MANTE) میں شیمپین (CHAMPAGNE) کے کاؤنٹ ہنری نے سیوگنی (SAVIGNY) کی جائداد بیوویس (BEAUVAIS) کے بشپ بارتھالیومو (BARTHOLOMEW) اور اس کے جانشینوں کے نام منتقل کی اس جاگیر کے لئے بشپ موصوف نے وعدہ کیا ہے اور ایک امیر (KNIGHT) مقرر کیا ہے تاکہ انصاف قائم رکھے اور کاؤنٹ ہنری کی مدد کرے۔ اس نے وعدہ کیا ہے کہ کہ اس کے بعد ہونے والے بشپ بھی اس معاہدہ پر قائم رہیں گے۔"

چرچ جس طرح مالکانِ اعلیٰ سے زمینیں حاصل کرتے تھے اسی طرح وہ مالکانِ اعلیٰ کی حیثیت سے دوسروں کے نام زمینیں منتقل بھی کرتے تھے۔ اس کے ثبوت میں ذیل کی تحریر مطالعہ کے لائق ہے۔

"ایبٹ فاریٹیس (FAURITIUS) نے بھی ولیم ماڈٹ (W. MAUDUIT) کے بیٹے رابرٹ کو ویسٹن (WESTON) میں ایک آراضی جس کا رقبہ چار سو اسی ایکڑ ہے بطور جاگیر عطا کی تھی اور اس کو پابند کیا تھا کہ جب ابنگڈن (ABINGDON) کے چرچ کو نائٹ (KNIGHT) کی خدمات انجام دینی ہوں گی تو وہ نصف نائٹ کے فرائض

چرچ کی طرف سے انجام دے گا۔"

جاگیرداری نظام کی ابتدا میں چرچ سماج کا ایک ترقی پسند اور زندہ جزو تھا اُس نے رومن امپائر کی تہذیب کی بڑی حد تک حفاظت کی۔ علوم و فنون کی ترقی اور اشاعت میں حصہ لیا اور اس مقصد کے لئے درسگاہیں قائم کیں، اس نے غریبوں کی مدد کی۔ یتیم خانوں کا انتظام کیا اور بیماروں کے لئے شفا خانے کھولے۔ اُس کی ان خدمات پر نگاہ کرتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ اُس نے اپنی ریاست کا انتظام دوسرے دنیوی رئیسوں کے مقابلے میں بہت اچھی طرح کیا لیکن تصویر کا ایک دوسرا رخ بھی ہے

عام امرا اپنے حلقہ بگوشوں کی تعداد بڑھانے کے لئے اپنی مقبوضہ جاگیروں کو بانٹتے اور ٹکڑے ٹکڑے کرتے رہتے تھے لیکن چرچ کی ریاست کا رقبہ دن بدن بڑھتا جاتا تھا۔ پادریوں کو شادی کی اجازت نہ تھی۔ غالباً اس کی وجہ بھی جائداد کو تقسیم سے بچانے کا خیال تھا۔ چرچ کے ذمہ دار عہدہ دار پسند نہیں کرتے تھے کہ چرچ کی جائداد ان کی اولاد میں بطور وراثت تقسیم ہو کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے۔

چرچ کی مقبوضہ زمینوں میں اضافے کی ایک اور وجہ عشر (TITHE) کی آمدنی تھی۔ ہر شخص کو اپنی آمدنی کا دسواں حصہ چرچ کی نذر کرنا پڑتا تھا۔ ایک مشہور مورخ عشر کے متعلق لکھتا ہے۔

> "عشر میں زمین، آمدنی اور موت کے ٹیکس شامل تھے۔ موت کا ٹیکس ان تمام ٹیکسوں سے جن سے موجودہ زمانہ واقف ہے زیادہ سخت تھا۔ کاشتکار اور چھوٹے چھوٹے کاریگر اپنی آمدنی کا دسواں حصہ ادا کرنے پر مجبور تھے، اُون کا محصول بھی جانور پالنے والوں کو، خواہ ان کی ملکیت میں بطوں کے سوا اور کچھ نہ ہو ادا کرنا پڑتا تھا، گھاس بھی ٹیکس سے مستثنیٰ نہ تھی۔ کسان جو کھیتی کے مصارف نکال کر صرف بچت پر دسواں حصہ نکالتا تھا، عذاب جہنم کی وعید کا مستحق قرار دیا جاتا تھا۔"

چرچ کی دولت جتنی بڑھتی گئی اُس کی روحانی حیثیت ختم ہوتی گئی اور معاشی حیثیت نمایاں ہوتی گئی۔ مورخین کی بڑی تعداد کا خیال ہے کہ ایک جاگیردار کی حیثیت سے وہ دنیوی مالکان زمین سے کسی حال میں بہتر نہ تھے۔ بعض حالات میں تو انھوں نے ان جاگیرداروں کو بھی مات کر دیا تھا۔ یہ مورخین لکھتے ہیں :-

سینٹ لوئیس (ST. LOUIS) کے زمانے میں نوٹری ڈیم ڈی بیرس کی خانقاہ کے عہدہ داروں نے سرفوں کو کچھ اس بری طرح لوٹا کھسوٹا کہ ملکہ بلینشے (BLANCHE) نے بہت ادب کے ساتھ ان کی ظالمانہ حرکات کے خلاف احتجاج کیا لیکن چرچ پر اس احتجاج کا صرف اتنا اثر ہوا کہ خانقاہ کے راہبوں نے لاپروائی سے جواب دیا کہ ہم مختار ہیں اگر ہم چاہیں گے تو اپنے سرفوں کو بھوکوں مار بھی ڈالیں گے۔"

بعض مورخوں کے نزدیک چرچ کے نیک اور خیراتی کاموں کا اندازہ حقیقت سے کہیں زیادہ کیا گیا ہے۔ وہ تسلیم کرتے ہیں کہ چرچ نے غریبوں اور بیماروں کی خدمات انجام دیں لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ قرونِ وسطیٰ میں وہ سب سے بڑی دولت مند جماعت تھے انھوں نے جو کچھ کیا وہ بہت ہی لیکن پھر بھی ان کے مجموعی کام کی حیثیت ان بے شمار وسائل کے مقابلے میں جو ان کو حاصل تھے کچھ نہیں ٹھہرتی۔ ان وسائل پر نگاہ ڈالنے کے بعد کہنا پڑتا ہے کہ ان سے تو اتنا بھی نہیں بن پڑا جو عام دنیوی امراء کر گزرتے۔ انھوں نے دولت مندوں سے بیماروں اور غریبوں کے نام پر بڑے بڑے مطالبات کیے لیکن اس کا انھوں نے ہمیشہ خیال رکھا کہ اُن کے راس المال پر بہت کم آنچ آنے پائے۔ جو لوگ کلیسا کے طرز زندگی پر کڑی تنقید کرتے ہیں ان کا خیال ہے کہ اگر کلیسا نے اپنے سرفوں اور کسانوں کا خون چوس نہ لیا ہوتا تو خیرات خانوں کی ضرورت ہی پیش نہ آتی۔

چرچ اور امراء حکمراں طبقے تھے وہ زمینوں پر بھی قابض تھے اور وہ طاقت بھی ان کے ہاتھ میں تھی جو زمین کے ساتھ آتی تھی۔ چرچ روحانی امداد کا سرچشمہ تھا اور امراء

فوجی مدافعت کے ذمہ دار تھے۔ اپنی ان خدمات کے صلے میں وہ "محنت کش" طبقوں سے "محنت کا نذرانہ" وصول کرتے تھے۔ ایک فاضل مورّخ پروفیسر لوائسن دے (BOISSON-WAY) نے کہا ہے۔

"جاگیرداری سماج نے آخر کار ایسے نظام کا سہارا پکڑا، جس نے محافظت کے نام سے، چاہے وہ کتنی ہی موہوم کیوں نہ ہوتی محنت کش طبقوں کو بغیر محنت کئے کھانے والی جماعتوں کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا۔ اس نظام نے زمین ان کو نہ دی جو زمین پر محنت کرتے تھے بلکہ ان کے حوالے کر دی جو زمین چھین سکتے تھے۔"

تجارت کا زمانہ

آج شاید ہی کوئی ایسا دولت مند آدمی ہو جو سونے اور چاندی کے سکوں سے اپنے صندوقوں کو بھر ارکھتا ہو۔ جن لوگوں کے پاس دولت ہے وہ اُس کو اپنے پاس رکھنا پسند نہیں کرتے۔ وہ چاہتے ہیں کہ ان کا سرمایہ ان کے لئے کچھ پیدا کرے۔ اس لئے وہ اپنے روپے کے لئے نفع بخش ذرائع ڈھونڈتے ہیں۔ وہ ایسی جگہیں تلاش کرتے ہیں جہاں وہ اپنا روپیہ لگاکر اچھا نفع کمائیں اور زیادہ سے زیادہ سود پائیں۔ ان کا روپیہ تجارتی کاروبار میں لگ سکتا ہے۔ لوہے کی کمپنیوں میں، اس روپئے سے حصے خریدے جاسکتے ہیں۔ سرکاری بانڈ بھی لئے جاسکتے ہیں۔ ان ذریعوں کے علاوہ بھی ہزاروں راہیں ہیں جنھیں اختیار کرکے بے شمار دولت سمیٹی جاسکتی ہے۔

لیکن قرونِ وسطیٰ کی ابتدا میں روپیہ سے نفع کمانے کے امکانات نہ تھے۔ لوگوں کے پاس استعمال کے لئے دولت بہت کم تھی۔ جن لوگوں کے پاس کچھ تھا بھی وہ اُس سے بہت کم نفع اٹھاسکتے تھے۔ اہلِ کلیسا کی تجوریاں سونے اور چاندی سے لبریز تھیں۔ یہ دولت یا تو آہنی تجوریوں میں بند پڑی رہتی تھی یا قربان گاہ کے مزید زیورات کی خریداری کے کام آتی تھی۔ ان کے پاس سرمائے کی انتہا نہ تھی لیکن یہ سرمایہ جامد تھا آج کل کی طرح متحرک نہ تھا۔ چرچ کا روپیہ مزید دولت کمانے کے کام میں نہیں لگایا جاسکتا تھا۔ اُس زمانے میں روپئے سے دولت کمانے کے ذرائع ناپید تھے۔ یہی صورت اُس سرمائے کے ساتھ بھی تھی جو امراء کے تہہ خانوں میں بند پڑا ہوا تھا۔ اگر محصولات اور جرمانوں کے نام سے کوئی رقم ان کے

پاس آتی تو وہ کہیں لگائی نہیں جا سکتی تھی۔ اُس زمانے میں ایسے تجارتی کاروبار نا پید تھے جو دولت کو نفع کمانے کے کام میں لگا سکیں۔ پادریوں اور جنگ آزما امیروں کے پاس جتنی بھی دولت تھی وہ بے کار، جامد اور غیر متحرک تھی

کیا اُس زمانے میں روزمرہ کی ضرورت کی چیزیں خریدنے کی حاجت نہ ہوتی تھی ؟

نہیں اُس زمانے میں قریب قریب چیزوں کی خریداری کا رواج ہی نہیں تھا، تھوڑے سے نمک اور شاید کچھ لوہے کی ضرورت پڑتی ہو، دوسری چیزیں خاص طور سے غذا اور استعمالی کپڑے، جن کی لوگوں کو ضرورت پڑتی تھی علاقے سے حاصل کیے جاتے تھے۔ قدیم جاگیرداری نظام میں انسان کی معاشی زندگی روپیہ کے استعمال سے بے نیاز تھی۔ ضرورت کی چیزوں کے معاملے میں، جاگیر کا ہر گاؤں خود کفیل ہوتا تھا۔ اِس زمانے میں اگر کوئی تم سے پوچھے کہ تم نے اپنا نیا اوورکوٹ کتنے میں خریدا ہے تو تمہارا جواب یقیناً روپیوں اور آنوں میں ہوگا۔ لیکن اگر یہی سوال قرونِ وسطیٰ کے ابتدائی زمانے میں کیا جاتا تو جواب ملتا "میں نے خود تیار کیا ہے" سرف اور اُس کے خاندان کے دوسرے افراد اپنی خوراک خود پیدا کرتے تھے۔ جس قسم کے فرنیچر کی ضرورت ہوتی تھی وہ اپنے ہاتھ سے بنا لیتے تھے۔ جاگیردار، ان سرفوں کو جو اچھے کاریگر ہوتے اپنے محل سے وابستہ کر لیتا۔ وہ اُس کی ضرورت کی چیزیں اُس کی مرضی کے مطابق تیار کرتے رہتے تھے۔ اس طرح ایک جاگیرداری گاؤں اپنی تمام ضروریات میں عموماً خود کفیل ہوتا تھا۔ اُس کو جس چیز کی ضرورت ہوتی وہ خود بناتا اور جو بناتا خود ہی استعمال کرتا تھا۔

کوئی شبہ نہیں بعض اشیاء کے تبادلے کا رواج تھا۔ بہت ممکن ہے تم کو اپنا اوورکوٹ تیار کرنے کے لئے اُون نہ ملتا یا تمھارے گھر میں کوئی ایسا ہوشیار آدمی نہ ہوتا جو تمھارے لئے اوورکوٹ تیار کر سکتا یا ایسے آدمیوں کے ہوتے ہوئے بھی اوورکوٹ کی تیاری کیلئے وقت نہ نکالا جا سکتا۔ ایسی صورت میں اوورکوٹ کے سوال پر تمھارا جواب ہوتا کہ "میں نے

پانچ گیلن شراب کے عوض میں خریدا ہے"۔

اشیاء کا یہ مبادلہ بڑی حد تک ان بازاروں میں ہوتا تھا جو ہفتہ میں ایک بار کسی خانقاہ یا امیر کے محل کے باہر یا کہیں اور قرب وجوار میں لگا کرتے تھے۔ یہ بازار وہاں کے امیر یا بشپ کے ماتحت ہوتے تھے۔ یہاں ان امیروں کے سرفوں کی پیدا کی ہوئی فاضل پیداوار، یا ان کے کاریگروں کی تیار کی ہوئی فاضل چیزیں تبادلہ کے لئے آتی تھیں لیکن چونکہ تجارت ابھی تک بالکل ابتدائی حالت میں تھی اس لئے بہت زیادہ فاضل سامان کی پیداوار کی بھی کوئی ضرورت نہ تھی۔ لوگ اپنی ضرورت سے زیادہ سامان اُسی وقت پیدا کرتے یا بناتے ہیں جب بازار میں اُس کی مسلسل طلب ہو لیکن جب طلب ناپید ہو مزید اور فاضل اشیا کی پیداوار کا حوصلہ پیدا نہیں ہوتا۔ اس لئے ان مقامی بازاروں میں تجارت بہت محدود پیمانہ پر ہوتی تھی اور اپنے حلقے سے آگے نہ بڑھتی تھی۔

دوسری خرابی جو تجارت کی توسیع میں سب سے زیادہ حارج تھی وہ اُس زمانے کی سڑکوں کی حالت تھی۔ جاگیرداری زمانے میں سڑکیں تنگ، ناہموار اور خام ہوتی تھیں۔ ان پر سفر آسان نہ تھا۔ ڈاکوؤں کی تاخت نے ان راستوں کو اور بھی مخدوش بنا دیا تھا۔ معمولی رہزن دستوں کے علاوہ خود امرا بھی تاجروں کو روکتے اور ان سے ان قابل نفرت سڑکوں پر سفر کا محصول وصول کرتے تھے۔ اُس زمانے میں سڑکوں کے محصول کی وصولی کوئی نئی بات نہ تھی البتہ اگر کوئی امیر ان سڑکوں پر بلا محصول لئے سفر کی اجازت دیتا تھا تو اُس کی یہ روش ضرور دستور کے خلاف سمجھی جاتی تھی اور اس پر تعجب کا اظہار کیا جاتا تھا:۔

"جب ٹورس (TOURS) کے اود (ODO) نے گیارھویں صدی عیسوی میں دریائے لوائر (LOIRE) پر پل تعمیر کرایا اور بلا کسی محصول کے ہر شخص کو اُس کے استعمال کی اجازت دے دی تو اس کی اس روش نے عوام کو حیرت میں ڈال دیا"۔

تجارت کی توسیع کی راہ میں بعض اور دشواریاں بھی تھیں۔ اُس زمانے میں روپیہ

بہت کم تھا۔ ایک جگہ کے سکّے دوسری جگہ کے سکّوں سے بہت مختلف ہوتے تھے؛ ناپ تول کے باٹ اور پیمانے بھی مختلف جگہوں میں یکساں نہ تھے۔ ان حالات میں تجارتی سامان کا ایک جگہ سے اٹھا کر دوسری جگہ پہونچانا بڑی دشواریوں کا موجب تھا، خطرات اور سفر کی دوسری صعوبتوں کے علاوہ مصارف بھی حوصلہ شکن حد تک بڑھ جاتے تھے یہی اسباب تھے جن کی وجہ سے جاگیردارانہ نظام میں مقامی بازاروں کی تجارت اپنے محدود حلقے سے آگے نہ بڑھتی تھی۔

لیکن تجارت کی یہ حالت بہت دنوں تک رہ نہ سکی۔ ایک وقت آیا جب تجارت نے وسعت اختیار کی اور قرونِ وسطیٰ کے سماج پر اس نے گہرے اثرات ڈالے۔ گیارھویں صدی عیسوی میں تجارت نے اپنے قدم آگے بڑھانے شروع کئے اور بارھویں صدی عیسوی میں اس نے مغربی یورپ کی کایا پلٹ دی۔

مذہبی لڑائیوں (CRUSADES) نے تجارت میں ایک نئی روح پھونک دی۔ یورپ کے ہزاروں اور لاکھوں باشندوں نے مسلمانوں سے بیت المقدس چھیننے کے لئے، پورے براعظم کا بری اور بحری سفر کر ڈالا۔ ان کو اپنے پورے سفر میں ضروریاتِ زندگی کی فراہمی کی ضرورتیں محسوس ہوتی رہیں، تجارتی قافلے رسد رسانی کے انتظامات کے ساتھ ان مجاہدوں کے ہم رکاب تھے۔ یہ عیسائی محاربین جب مشرق کے سفر سے لوٹے اپنے ساتھ عیش و نشاط کے سامان، لذیذ و خوش ذائقہ غذاؤں اور نفیس اور پرتکلف لباسوں کی ہوس بھی لائے۔ یہ چیزیں انھوں نے اپنے سفر کے دوران میں دیکھی بھی تھیں اور انھوں نے ان کو استعمال بھی کیا تھا۔ ان کی ان نئی خواہشوں نے ان اشیاء کے لئے بازار پیدا کر دیا۔ علاوہ ازیں دسویں صدی عیسوی کے بعد آبادی میں بھی غیر معمولی اضافہ ہوا اور ضروریاتِ زندگی کی چیزوں کی طلب اور بڑھ گئی اس بڑھی ہوئی آبادی میں ایسے لوگوں کی تعداد بہت کافی تھی جن کو رہنے کے لئے گھر بھی نصیب نہ تھے۔ ان کو ان مذہبی محاربات میں اپنی زندگی کی بہتری کی ایک جھلک دکھائی پڑتی تھی۔

مسلمانوں کے خلاف بحیرۂ روم میں سرحدی لڑائیوں اور مشرقی یورپ کے بعض قبائل

کے خلاف جنگ آزمائیوں کو مذہبی محاربات (CRUSADES) کے نام سے عزت بخشی گئی حالانکہ درحقیقت یہ لڑائیاں محض لوٹ کھسوٹ اور مزید زمین کے حصول کے لیے چھیڑی گئی تھیں کلیسا نے ان غارت گرانہ مہموں کو مذہبی رنگ دے کر بڑی شان سے لڑایا اور ایک جہان کو یقین دلایا کہ یہ جنگیں اعلاء کلمۃ الحق کے لئے اور کافروں کو تباہ کر کے بیت المقدس کو بچانے کے لئے چھیڑی گئی تھیں۔

ارض مقدس کی زیارت کا سلسلہ ایک عرصہ سے جاری تھا۔ آٹھویں صدی عیسوی سے لے کر دسویں صدی عیسوی تک چونتیس[۳۴] قافلوں نے اور گیارھویں صدی عیسوی میں ایک سو سترہ قافلوں نے ارض مقدس کی زیارت کی۔ ارض مقدس کو مسلمانوں سے آزاد کرانے کی سعی اخلاص کے ساتھ جاری تھی۔ اس تحریک کے مددگار وہ لوگ بھی تھے جن کا ان ہنگاموں میں کوئی فائدہ نہ تھا۔ لیکن ان محاربات کی اصل قوت یہ مذہبی جذبات نہ تھے بلکہ بڑی حد تک ان منافع کی توقع تھی جو ان فتوحات میں بعض گروہوں کو حاصل ہونے والے تھے۔

ان گروہوں میں کلیسا سب سے پیش پیش تھا۔ کوئی شبہ نہیں ان کے مقاصد نیک تھے لیکن وہ اس حقیقت سے بھی خوب واقف تھے کہ وہ زمانہ جنگی ذہنیت کا زمانہ تھا۔ اور عوام کے دماغوں پر اسی قسم کے خیالات کی حکومت تھی۔ انھوں نے کوشش کی کہ لڑنے والوں کے جنگ جویانہ جذبات کا رخ ایسی زمینوں کی طرف پھیر دیا جائے جہاں مفتوح اقوام کو غلبہ کے بعد عیسائی بنایا جا سکے۔ ۱۰۹۵ء میں فرانس کے شہر کلرمانٹ (CLERMONT) میں پوپ اربن دوم (URBAN II) آیا۔ مجمع اتنا بڑا تھا کہ کسی عمارت میں اُس کے لئے جگہ نہ پیدا کی جا سکی اور یہ پوپ نے ایک کھلے میدان میں ان سے خطاب کیا۔ اُس نے عوام کو صلیبی جنگوں میں شریک ہونے کی ترغیب دی۔ چارٹرس (CHARTRES) کے فلشر (FULCHER) نے جو اس جلسہ میں موجود تھا پوپ کی تقریر کا خلاصہ حسب ذیل الفاظ میں بیان کیا ہے۔

جو لوگ ابھی تک آپس کی شیطانی لڑائیوں میں ایمان والوں کا خون بہاتے رہے ہیں،

ان کو کافروں کے مقابلے پر نکلنا چاہیئے۔ جو لوگ اب تک رہزنی کرتے رہے ہیں۔ ان کو سپہگری کے جوہر دکھانے چاہئیں۔ جن کے ہاتھ ابھی تک اپنے بھائیوں اور عزیزوں کے خون سے رنگین رہے ہیں ان کو اب اپنی تلوار کا رخ وحشیوں کے سینوں کی طرف پھیرنا چاہیئے۔ جن لوگوں نے ابھی تک حقیر معاوضوں کے لئے اپنا پسینہ بہایا ہے اب ان کو دائمی انعام کے لئے جدوجہد کرنی چاہیئے۔"

دراصل کلیسا اپنے اقتدار کی توسیع کی فکر میں تھا۔ عیسائیت دنیا کے جتنے حصے پر چھا جاتی تھی کلیسا کے اقتدار کا حلقہ اتنا ہی بڑھ جاتا تھا اور اس کی دولت کے وسائل بھی اُتنے ہی وسیع ہو جاتے تھے۔

دوسری طاقت جس نے ان صلیبی محاربات میں حصہ لیا، بازنطینی سلطنت اور بازنطینی کلیسا پر مشتمل تھی۔ اس کا صدر مقام قسطنطنیہ میں تھا۔ یہ شہر اسلامی خلافت کے ایشیائی مرکز سے بہت قریب تھا۔ بازنطینی سلطنت اور بازنطینی کلیسا نے محاربات صلیبی میں اپنے حلقۂ اثر کی توسیع کا خواب دیکھا۔ بازنطینی بادشاہ اور کلیسا نے جن کو ہر وقت مسلمانوں کے اقدام کا خطرہ لگا رہتا تھا۔ ان جنگوں کے ذریعہ سے اسلامی فوجوں کو اپنی سلطنت کی حدود سے دور رکھنا چاہا۔

مذکورہ بالا دونوں طاقتوں کے علاوہ تیسرا گروہ ان امیروں اور سرداروں پر مشتمل تھا جو مالِ غنیمت کے بھوکے تھے اور ان لڑائیوں کی آمدنی سے اپنے پچھلے قرضوں کا حساب چکانا چاہتے تھے۔ اس گروہ میں قدیم امیروں کے وہ لڑکے بھی شامل تھے جن کو باپ دادا کی جائداد میں کوئی حصہ نہ ملا تھا۔ ان سب کو یقین تھا کہ یہ جنگیں ان کے لئے نئی جاگیروں کے دروازے اور بے اندازہ دولت کے تہہ خانے کھول دیں گی۔

چوتھی جماعت جس نے ان محاربات میں حصہ لیا، ان تاجروں کی تھی جو اطالوی شہروں وینس (VENICE) جینوا (GENOA) اور پیسا (PESA) میں آباد تھے۔ کوئی شہر جو چند جزیروں کے جھرمٹ میں آباد ہوتا آسانی سے تجارتی اہمیت حاصل کر لیتا تھا۔ وینس (VENIEC)

اپنی جائے وقوع کی وجہ سے ہمیشہ ایک اہم مقام رہا ہے۔ ایسے شہر میں جہاں نہریں سڑکوں کا کام کرتی ہوں بری اور بحری زندگی میں کوئی بڑا فرق نہیں ہوتا۔ وینس کے رہنے والے بحری سفر میں بھی اتنے ہی ماہر تھے جتنے بری سفر میں۔ وہ مشرقی ممالک کی تجارت کا زمانہ تھا۔ بحیرۂ روم ہی وہ سمندر تھا جہاں سے ہوکر مشرقی سامانِ تجارت یورپی ممالک کی طرف آگے بڑھتا تھا۔ نقشے کے سرسری مطالعہ سے یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آجاتی ہے کہ وینس اور دوسرے اطالوی شہروں کی اہمیت ان وجوہ کی بنا پر اُن حالات میں بالکل قدرتی تھی۔

ایک اور حقیقت، جو اگرچہ نقشہ سے واضح نہیں ہوتی لیکن اُس کے حقیقت ہونے میں کوئی شبہ نہیں اور یہی تھی قسطنطنیہ چند برسوں سے بحیرۂ روم کا سب سے بڑا شہر تھا اس لئے وینس کے تعلقات قسطنطنیہ اور دوسرے مشرقی ممالک سے اُس وقت بھی قائم رہے جب مغربی یورپ نے اُن سے اپنا ناتہ توڑ لیا تھا۔ وینشی تاجر مشرقی ممالک سے مصالہ، ریشم، ململ اور قالین مغربی ممالک تک پہونچاتے تھے۔ وینس جینوا اور پیسا شروع ہی سے تجارتی شہر تھے اس لئے وہ ایشیائے کوچک کے ساحلی شہروں سے اپنے تجارتی تعلقات باقی رکھنا چاہتے تھے۔ ایشیائے کوچک کے یہ ساحلی علاقے، قابلِ نفرت مسلمانوں سے، جو عیسائیوں کے دشمن تھے، آباد تھے لیکن اس دشمنی کا ان وینشی تاجروں پر کوئی اثر پڑا؟ بالکل نہیں۔ اٹلی کے تجارتی شہروں نے ان صلیبی جنگوں سے تجارتی منافع حاصل کئے۔ یہی وجہ تھی تیسری صلیبی جنگ نے ارضِ مقدس کی باریابی نہیں بلکہ اطالوی شہروں کے لئے تجارتی منافع کے حصول کو اپنا مقصد قرار دیا۔ یہ صلیبی مجاہد یورشلم نہیں ایشیائے کوچک کے ساحلی شہروں کو جن سے ان کے تجارتی تعلقات وابستہ تھے اپنے تصرف میں لانا چاہتے تھے۔

چوتھی صلیبی جنگ سنہ ۱۲۰۱ء میں شروع ہوئی۔ اس مرتبہ وینس نے بہت اہم اور نفع بخش حیثیت اختیار کرلی۔ ولے ہارڈوین (VILLE HARDOVIN) ان چھ قاصدوں میں سے تھا جو وینس کے صدر مجسٹریٹ کے پاس ان صلیبی مجاہدین کے لئے نقل وحمل کی سہولتیں مانگنے آئے

تھے۔ اسی سال مارچ میں اس سلسلے میں جو معاہدہ ہوا اُس کے بارے میں ان لوگوں کا مکالمہ سننے کے لائق ہے۔

ولیم ہارڈومن "جناب والا! میں فرانس کے امراء کی طرف سے جنھوں نے صلیب کی حمایت کی قسم کھائی ہے، درخواست کرتا ہوں کہ خدا کے لیے ان مجاہدوں کے لئے سواریوں اور جہازوں کا انتظام فرما دیجیے۔"

صدر مجسٹریٹ "کن شرائط پر؟"

ولیم "ہر شرط پر جو آپ تجویز کریں، اور وہ لوگ اسے پورا کر سکیں۔"

صدر مجسٹریٹ "ہم جہاز مہیا کریں گے (ایسے جہاز جن میں ایک دروازہ ہوگا اور اس کے عقب میں بھی گھوڑوں کے سوار کرنے کی گنجائش ہوگی) ان میں ۴۵۰۰ گھوڑے اور ۹۰۰۰ آدمی ہوں گے اور جہاز بھی جس میں ۴۵۰۰ نائٹ اور بیس ہزار پیدل فوج ہوگی۔ شرط یہ ہوگی کہ نو مہینے تک ان تمام آدمیوں اور گھوڑوں کی غذا کے انتظام کی ذمہ داری لی جائے۔ کم سے کم معاوضہ جو ہم قبول کر سکتے ہیں یہ ہوگا کہ ہم کو ہر گھوڑے کے لئے چار مارکس اور ہر آدمی کے لئے دو مارکس ادا کئے جائیں۔ ہم خدا کی محبت میں اس کے علاوہ کچھ اور بھی کر سکتے ہیں، ہم پچاس مسلح بادبانی جہاز اور دیں گے۔ شرط یہ ہوگی کہ جب تک ہمارے درمیان یہ معاہدہ باقی رہے، ہر خطۂ زمین کی فتح میں، یا دولت کے حصول میں خواہ وہ زمین ہو یا سمندر میں ہمارا حصہ نصف ہوگا۔"

ولیم اور دوسرے قاصد "جناب والا! ہم کو آپ کی شرطیں منظور ہیں۔"

تم نے دیکھا وینشین خدا کی محبت میں ان صلیبی مجاہدوں کی مدد کرنے کے لئے تیار تھے لیکن ان کی آنکھیں مال غنیمت کے انبار کی طرف سے بھی مطلق غافل نہ تھیں۔ وہ پکے تاجر تھے مذہبی نقطۂ نظر سے یہ جنگیں کچھ زیادہ دیرپا نتائج نہ دکھا سکیں۔ مسلمانوں نے بہت جلد یروشلم پر قبضہ کر لیا۔ لیکن تجارتی نقطۂ نظر سے یہ محاربات بہت اہم ثابت ہوئے۔ ان ہنگاموں نے

مغربی یورپ کو جاگیردارانہ غفلت سے بیدار کر دیا۔ کلیسا کے پادریوں، جنگجو سپاہیوں، کام کرنے والے لوگوں اور تاجروں کی بڑھتی ہوئی جماعتیں تمام براعظم پر چھا گئیں۔ انھوں نے بیرونی مال کی طلب بڑھا دی۔ انھوں نے بحیرۂ روم کا راستہ مسلمانوں سے چھین لیا اور انھوں نے ایک مرتبہ پھر اس زبردست تجارتی راستے کو، جو قدیم زمانے سے مشرق اور مغرب کے تجارتی حلقوں کو ملاتا تھا کھول دیا۔

گیارھویں اور بارھویں صدیوں میں بحیرۂ روم میں پھر جنوبی ممالک کی تجارت کو فروغ ہوا۔ اسی زمانے میں شمال میں بھی تجارتی امکانات کچھ زیادہ نمایاں نظر آنے لگے۔ شمالی سمندروں میں اس سے پہلے کبھی تجارت کی گرم بازاری نہیں ہوئی تھی۔ تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا کہ شمالی سمندروں میں بھی تجارتی نقل و حرکت کی لہریں اٹھنے لگیں۔

بحیرۂ بالٹک اور شمالی سمندروں میں تجارتی جہاز عمارتی لکڑی، چربی، مچھلی اور رینچھ کی کھالیں اور سمور لے کر ایک جگہ سے دوسری جگہ آنے جانے لگے۔ شمالی سمندروں کی تجارت کا مرکز فلینڈرس (FLANDERS) کے شہر برجز (BRUGIS) میں تھا۔ وینس جنوب میں یورپ اور مشرقی ملکوں کی تجارت کا مرکز تھا اور برجز شمال میں روسی اور اسکنڈینوی تجارت کا اہم مقام تھا۔ شمال اور جنوب کے دور دراز ملکوں کو ابھی تک اپنا ایک مواصلتی مرکز بنانا باقی تھا۔ جہاں شمالی ممالک کے سامان تجارت کا مشرقی ممالک کے قیمتی تجارتی سامان سے مبادلہ ہو سکے۔ تجارت اگر ایک مرتبہ ڈھنگ سے شروع کر دی جائے تو برف کے تودے کی طرح جو پھسل کر پہاڑ کے نیچے پہونچ جاتا ہے اپنی جگہ خود بخود بنا لیتی ہے۔ تاجر جو شمالی ملکوں کا تجارتی سامان لے کر جنوب کی طرف بڑھتے تھے۔ جنوبی قافلوں سے جو مشرقی ملکوں کا سامان لے کر شمال کی طرف جاتے تھے، اپنس کے شمپین (CHAMPEGNE) کے میدانوں میں ملنے لگے بہت سے مقامات پر بڑے بڑے میلے لگنے لگے۔ ان میلوں میں لگنی (LAGNY) پراونس (PROVINES) بارسوراوبے (BAR-SUR-AUBE) اور ٹرائس (TROYES) کے

میلوں کو خاص اہمیت حاصل تھی۔ اسی ٹرائس کے نام سے سونا چاندی تولنے کا باٹ "ٹرائے باٹ" نکلا ہے۔ یہی باٹ صدیوں پہلے ان بڑے بڑے میلوں میں تولنے کے لئے استعمال کیا جاتا تھا

آج کل تجارت ہر وقت اور ہر جگہ ہمارے چاروں طرف ہوتی رہتی ہے۔ ہمارے نقل وحمل کے ذرائع اتنے مکمل ہیں کہ دنیا کے دور دراز گوشوں کی چیزیں بھی بڑے بڑے شہروں میں برابر پہنچتی رہتی ہیں ہمیں ان چیزوں کے خریدنے کے لئے صرف دو کانوں تک جانے اور اپنی پسند کی چیز منتخب کرنے کی زحمت اٹھانی پڑتی ہے لیکن بارھویں اور تیرھویں صدی عیسوی میں نقل وحمل کے ذرائع اتنے مکمل نہ تھے اور نہ اس وقت ان اشیا کی اتنی مسلسل طلب تھی کہ لوگوں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے باقاعدہ دوکانوں کے ہر وقت اور ہر جگہ کھلے رہنے کی ضرورت محسوس ہوتی۔ یہی وجہ تھی کہ بہت سے شہروں میں مستقل تجارت کا کوئی سلسلہ نہ تھا۔ انگلستان۔ فرانس، بلجیم، جرمنی اور اٹلی کے میلے جو مقررہ اوقات میں ہوتے تھے۔ مستقل تجارت کا پیش خیمہ تھے مقامی ہفتہ وار بازار جو اب تک آس پاس کے لوگوں کی ضروریات کے کفیل تھے۔ بڑھتی ہوئی طلب کے پیش نظر کچھ تنگ معلوم ہونے لگے۔ پوائکس (POIX) فرانس کا پہلا ایسا مقام تھا جس نے تجارت میں وسعت کی ضرورت محسوس کی۔ اس مقام کے لوگوں نے بادشاہ سے ہفتہ وار مقامی بازار اور سال میں دو میلے لگانے کی درخواست کی۔ نیچے شاہی فرمان کی کچھ سطریں جو اس درخواست کے متعلق ہیں درج کی جاتی ہیں۔

"ہم کو پوائکس (POIX.) اور کناپلس (CANAPLES) کے محبوب رئیس جہان ڈی کریکی (JEHAN DE CREQUY) کی درخواست ملی۔ ہم کو اس درخواست سے معلوم ہوا کہ پوائکس اور اس کے مضافات ایک زرخیز اور اچھے علاقے میں واقع ہیں اور موضع مذکور اور اس کے مضافات بہت اچھی طرح تعمیر کئے گئے ہیں۔ وہاں عام لوگ، تاجر اور دوسرے باشندے وقتاً فوقتاً آتے جاتے رہتے ہیں۔ وہاں سے آس پاس کے تاجر سامان تجارت لے کر گذرتے رہتے ہیں۔ اس لئے یہ ضروری ہے کہ وہاں ہر ہفتہ ایک بازار اور

سال میں دو میلے ہوا کریں۔ اس لئے ان کی درخواست پر ہم سال میں دو میلے اور ہفتہ وار
مقامی بازار قائم کرتے ہیں۔"

یہ واقعہ ہے کہ شیمپین کے میلے کچھ اس ترتیب سے لگائے جاتے تھے کہ پورے سال چلتے رہتے تھے جب ایک میلے کے ختم ہونے کا وقت آتا تھا تو دوسرا شروع ہو جاتا تھا اور تاجر جو اپنا سامان لاتے تھے ایک میلے سے اٹھ کر دوسرے میلے میں جا پہونچتے تھے۔

قرون وسطیٰ کی ابتدائی صدیوں کے مقامی ہفتہ دار بازار اور بارھویں صدی سے لے کر پندرھویں صدی عیسوی تک کے میلوں کا فرق غور کرنے کے لائق ہے۔ ابتدائی صدیوں کے یہ ہفتہ وار مقامی بازار بالکل ابتدائی حالت میں تھے، مقامی چیزوں کے علاوہ جن میں زیادہ تر زرعی ضرورت کی چیزیں آتی تھیں اور کوئی سامان نظر نہ آتا تھا۔ ان میلوں میں جو بارھویں صدی عیسوی سے شروع ہوئے صورت حال بالکل بدل گئی۔ بازاروں کا مقامی رنگ ان بازاروں میں آفاقی بن گیا اور دنیا کے دور دراز گوشوں کا تجارتی سامان بڑے پیمانہ پر ان میلوں میں آنے اور بکنے لگا۔ ان میلوں میں چھوٹے پھیری کرنے والے خوردہ فروشوں اور کاریگروں کی جگہ بڑے بڑے تاجروں نے لے لی۔ یہ میلے بڑے تجارتی مرکز بن گئے۔ یہاں سے بیرونی ملکوں کا مال جو دنیا کے ہر حصہ سے آتا تھا، بڑے بڑے تاجروں کے ذریعہ سے مختلف ملکوں میں پہونچنے اور بکنے لگا۔

شیمپین کے میلے کے متعلق ۱۳۴۹ء میں جو اعلان ہوا تھا وہ دیکھنے کے لائق ہے اس اعلان میں کہا گیا ہے:۔

تاجروں کی تمام جماعتیں اور تمام تاجر افراد، خواہ وہ اطالوی ہوں یا اسپینی یا اور ناورنس کے رہنے والے یا ملانیز، لیچیس، جنوویس، ونیشین، جرمن اور پرووانکل ہوں اور وہ لوگ جو دوسرے ملکوں سے آتے ہوں اور ہماری سلطنت کے رہنے والے

---

۱ MILANESE, LUCCHESE ۲ PROVENCAL

نہ ہوں لیکن وہ ہمارے یہاں تجارت کرنا چاہتے ہوں۔ ان سب کو معلوم ہو کہ اگر وہ ہلے یہاں تجارت کرنا اور میلہ مذکور کے تمام منافع، دستور اور حقوق سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں تو وہ پورے اطمینان اور حفاظت سے آسکتے ہیں۔ رہ سکتے ہیں اور جا سکتے ہیں، وہ، ان کا سامان تجارت اور ان کے رہنما سب محفوظ رہیں گے، ہم ان سب کی حفاظت اور ان کے سامان کی نگرانی کا ذمہ لیتے ہیں، میلے کے نگران کارکنوں کے سوا کسی کو اختیار نہ ہوگا کہ ان کو روکے، گرفتار کرے یا ان سے بازپرس کرے۔"

اس اعلان میں شمپین کے بادشاہ نے ہر جگہ کے تاجروں کو اس میلے میں شرکت کی دعوت ہی نہیں دی بلکہ آنے جانے کی سہولتیں اور آنے جانے میں ان کے قافلوں کی حفاظت کا ذمہ بھی لیا ہے، اُس زمانے میں جب سفر کے راستے رہزنوں سے بھرے پڑے تھے، اس قسم کے انتظامات کتنے ضروری تھے! اس میلے میں شریک ہونے والے تاجر اکثر ان ٹیکسوں اور محصولوں سے بھی جو راستے میں مختلف جاگیروں پر طلب کیے جاتے تھے، مستثنیٰ کیے جاتے تھے، یہ تمام انتظامات اُس صوبہ کا امیر، جہاں یہ میلہ ہوتا تھا کیا کرتا تھا۔

لیکن اگر ان انتظامات کے باوجود تاجروں کا کوئی قافلہ رہزنوں کی لوٹ کھسوٹ کا شکار ہو جاتا تھا تو اُس کے کیا نتائج نکلتے تھے؟ اس صورت میں اس علاقے کے تمام تاجر جہاں یہ حادثہ پیش آتا میلے میں شرکت اور وہاں تجارت کے تمام حقوق سے محروم کر دئے جاتے تھے یہ بڑی خوفناک سزا تھی۔ اس صورت میں اس علاقے کی تجارت بالکل ختم ہو جاتی تھی۔

اس علاقے کا رئیس جہاں یہ میلے لگتے تھے، اس قسم کے خاص انتظامات کی زحمت کیوں برداشت کرتا تھا؟ صرف اس لئے کہ یہ میلے اُس کی دولت اور آمدنی کا بڑا ذریعہ تھے۔ تاجر جو ان میلوں میں تجارت کرتے تھے، ان سہولتوں کے عوض میں محصول ادا کیا کرتے تھے میلے میں آمد اور روانگی دونوں کے محصول مقرر تھے۔ گودام میں سامانِ تجارت رکھنے کا کرایہ بھی پڑتا تھا۔ بکری کے محصول کے علاوہ میلے میں جو عارضی دوکانیں کھڑی کی جاتی تھیں۔

ان کا کرایہ بھی مالک کو ملتا تھا۔ تاجروں کو ان محصولوں پر کوئی اعتراض نہ ہوتا تھا۔ یہ محصول دستور میں شامل تھے اور ایک عرصہ سے مقررہ رقم کی شکل میں وصول ہوتے آئے تھے۔ یہ محصول اس نفع کے مقابلے میں، جو تاجروں کو ان میلوں میں حاصل ہوتا تھا، بہت کم ہوتے تھے۔

یہ میلے اتنے بڑے ہوتے تھے کہ شہر کی مقامی پولیس سے ان کا انتظام ممکن نہ تھا اس لئے میلے کے انتظامات اور دیکھ بھال کے لئے خاص پولیس مقرر کی جاتی تھی میلے کے نگران بھی خاص ہوتے تھے اور ان کی عدالتیں بھی خاص طور سے اسی مقصد کے لئے قایم کی جاتی تھیں۔ ان میلوں میں اگر کوئی واقعہ پیش آتا یہی خاص پولیس اس کا انتظام کرتی اور خاص عدالتوں میں ان نزاعوں کے فیصلے ہوتے۔ ہر کام بہت احتیاط، خوش اسلوبی اور قابلیت کے ساتھ انجام دیا جاتا تھا۔

میلے کا پروگرام بھی عام طور سے ہمیشہ یکساں رہتا تھا۔ میلے کے ابتدائی انتظامات کے بعد سامان کھولا جاتا، عارضی دوکانیں کھڑی کی جاتیں، محصولات ادا کئے جاتے اور تمام متعلق امور کی دیکھ بھال اور خبر گیری کی جاتی اور میلے کا افتتاح ہو جاتا۔ میلے میں تفریح اور دلچسپی کے بیسیوں سامان ہوتے۔ دل بہلاؤ کی خاص جماعتیں مسلسل حرکت میں رہتیں اور ایک دوکان سے دوسری دوکان تک تفریحی کھیل دکھاتی پھرتی تھیں۔ کبھی بھی اسی ہما ہمی میں جاری رہتی تھی۔ قریب قریب ہر قسم کے سامان کی تجارت ہر وقت ہوتی رہتی تھی لیکن پھر بھی بعض خاص چیزوں کی فروختگی کے لئے، جس میں کپڑے، پکا ہوا چمڑا اور رنگی کھالیں شامل ہوتی تھیں، خاص وقت مقرر کیا جاتا تھا۔

للی (LILLE) کے متعلق ۱۴۲۹ء میں ایک تحریر لکھی گئی تھی۔ اس تحریر سے ہم کو ان میلوں کے متعلق جو اس زمانے کے زبردست تجارتی مرکز تھے، ایک خاص بات اور معلوم ہوتی ہے۔ اس تحریر کے الفاظ ہیں۔

"جہاں ڈی لینٹیس (JEHAN DE LANSTAIS) کے ادھر ہم اپنی خاص مہربانی

کرتے ہیں اور اُسے حق دیتے ہیں کہ وہ ہمارے شہر للی میں جہاں جہاں "مبادلہ زر" ہوتا ہو اپنے خاص انتظامات کرے مبادلۂ زر کا مرکز قائم کرے اور سکّوں کے تبادلے کا کام کرے اور جب تک ہم یہ انتظام جاری رکھیں۔ یہ اس کے معاوضہ میں ہم کو ہر سال ہمارے محصل کے ذریعہ سے جو للی میں رہتا ہے۔ بیس ہیریس لیور ادا کرتا رہے گا۔"

اُس زمانے کے میلوں میں سکّہ بدلنے والے لوگ بڑی اہمیت رکھتے تھے۔ کپڑے اور چمڑے کی خرید و فروخت کے لئے خاص دن مقرر کئے جاتے تھے اور ان دنوں کے خاتمہ پر لین دین کے حسابات چکانے کے دن مقرر کئے جاتے تھے۔ یہ میلے صرف خرید و فروخت کے نقطہ نظر ہی سے اہم نہ تھے بلکہ مالی مبادلے کی وجہ سے بھی ان کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ میلے کے مرکز دن میں "مبادلہ زر" کے دفتر قائم کئے جاتے تھے۔ وہاں مختلف قسم کے سکّے آتے، تولے جاتے، ان کی قیمتیں لگائی جاتیں اور وہ دوسرے سکّوں سے بدلے جاتے تھے۔ قرضوں کے متعلق بات چیت ہوتی، پرانے قرضے ادا کئے جاتے، ہنڈیاں بھنائی جاتیں اور آزادی سے مبادلہ زر کے ڈرافٹ بھیجے جاتے۔ اُس زمانے میں اِن مقامات پر بڑے بڑے بینکر آتے اور بڑی بڑی رقموں کے معاملے طے کرتے تھے، یہ لوگ آپس میں مل جل کر بڑے مالی وسائل پر قابو حاصل کر لیتے تھے۔ اِن کا تجارتی لین دین پورے براعظم یورپ میں لندن سے لیونٹ تک جاری تھا۔ ان کے گاہکوں میں پوپ، بادشاہ شہنشاہ، شاہزادے، جمہوریتیں اور بڑے بڑے شہر سبھی شامل تھے۔ روپئے پیسے کے اس کاروبار نے رفتہ رفتہ ایسی اہمیت حاصل کرلی کہ آخرکار یہ پیشہ ایک مستقل تجارتی شاخ کی حیثیت سے منظم ہوگیا۔

اب تک روپیہ کے بغیر تجارتی کاروبار کا دستور تھا۔ لیکن تجارت کے فروغ نے رفتہ رفتہ قدیم قدرتی معاشیات کی راہیں بدل دیں۔ قرونِ وسطیٰ کی ابتدائی صدیوں میں "مبادلۂ اشیا" کا رواج تھا۔ لیکن تجارت کے اس طریقے میں بڑی دشواریاں تھیں۔ بظاہر اس میں کوئی مشکل نہیں معلوم ہوتی کہ پانچ گیلن شراب کے عوض میں ایک اوورکوٹ خرید لیا گیا۔ لیکن دراصل

یہ کام آسان نہ تھا، تم کو اس خرید و فروخت کے لیے ایک ایسے آدمی کی ضرورت ہوتی جس کے پاس اوورکوٹ بھی ہوتا اور اُس کو تمھاری پانچ گیلن شراب کی ضرورت بھی ہوتی۔ تبادلہ اشیاء کے اس طرز کو بدل دو اور کاروبار میں روپیہ کو "ذریعہ مبادلہ" کی حیثیت سے روشناس کرو۔ دیکھو اب کیا ہوتا ہے؟ روپیہ کی ضرورت کس کو نہیں؟ اس سے تو ہر چیز خریدی جا سکتی ہے۔ اب ہم کو ایسا آدمی تلاش کرنے کی جس کے پاس ہماری ضرورت کی چیز ہو اور اُسے ہماری چیز کی حاجت بھی ہو، کوئی ضرورت نہیں۔ جب روپیہ کا استعمال ہر طرف ہونے لگا تم کو اپنی پانچ گیلن شراب لے کر اُس آدمی کی کھوج میں نکلنے کی ضرورت نہ رہی جو اُس کے عوض میں تم کو اوورکوٹ دے۔ اب تم اپنی شراب بیچ ڈالو۔ اُس کے عوض میں روپیہ لو اور اوورکوٹ خرید لو۔ اگرچہ اب لین دین کی منزل میں ایک مبادلے کے بجائے دو مبادلوں کی ضرورت پڑنے لگی لیکن پھر بھی وقت اور دوڑ دھوپ کی بڑی بچت ہو گئی۔ اس صورت سے روپیہ نے اشیا کا تبادلہ بہت آسان کر دیا اور اس آسانی کی وجہ سے تجارت کو غیر معمولی فروغ ہوا تجارت کے فروغ نے مُبادلہ زر کے حلقے کو غیر معمولی طور پر وسیع کر دیا۔ اور اس طرح بارھویں صدی کے بازار کی معاشیات جو کوئی بازار نہیں رکھتی تھی، بیسیوں بازاروں کی مالک بن بیٹھی اور تجارت کے فروغ نے قرونِ وسطیٰ کی قدرتی خود کفیل جاگیردارانہ معاشیات کی جگہ "معاشیاتِ زر" کو دے دی جس نے تجارتی دنیا میں ایک انقلاب برپا کر دیا۔

شہروں کی جانب

تجارت کی بے قاعدہ پھواروں نے رفتہ رفتہ ایک بڑے دریا کی شکل میں جنم لیا۔ اور کاروباری زرعی اور صنعتی زندگی کی کونپلوں نے اس سرچشمہ سے سیراب ہو کر ایک بڑے درخت کی شکل اختیار کرلی۔ تجارت کی گرم بازاری کا ایک خاص اور اہم اثر شہروں کی آبادکاری کی شکل میں ظاہر ہوا۔

اس میں کوئی شبہ نہیں تجارت کے دور سے پہلے بھی یہاں ایک قسم کے شہر آباد تھے۔ ملک کے فوجی اور عدالتی مرکزوں میں اور ان مقامات میں جہاں بادشاہ کا دربار ہوتا تھا لوگوں کی اچھی خاصی تعداد آتی جاتی رہتی تھی۔ یہ مقامات اپنی حیثیت کے لحاظ سے ایک طرح کے قصبے ہوتے تھے۔ ان کو کسی قسم کا اور کوئی امتیاز حاصل نہ ہوتا تھا لیکن اب تجارتی ترقی کی وجہ سے جو نئے شہر آباد ہوئے تھے یا پرانے شہر تجارتی محرکات سے نیا جنم پا کر ایک خاص انداز پر بس رہے تھے، ان کی زندگی کا طرز ہی دوسرا تھا۔

شہر بالعموم وہیں آباد ہوتے ہیں جہاں تجارتی کاروبار تیزی سے وسعت اختیار کرلیتا ہے۔ قرون وسطیٰ میں بھی تم کو نیدرلینڈ اور اٹلی میں شہر بستے ہوتے نظر آتے ہیں۔ درحقیقت یہی وہ ممالک ہیں جہاں سب سے پہلے شہروں کے وجود کا پتہ چلتا ہے۔ تجارت جتنی ترقی کرتی گئی شہروں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا۔ یہ شہر زیادہ تر وہاں آباد ہوئے جہاں مختلف سمتوں سے آنے والی سڑکیں ملتی تھیں۔ دریاؤں کے دہانوں پر بھی، جہاں تجارتی کشتیوں اور جہازوں کی آمد و رفت میں سہولت تھی، شہری آبادی بڑھی۔ وہ جگہیں بھی جہاں زمین ہموار تھی اور آمد و رفت میں

کوئی دشواری نہ تھی شہری طرز اختیار کرنے لگیں۔ یہی وہ مقامات تھے جن کو تاجر تلاش کیا کرتے تھے۔ ایسے مقامات پر عام طور سے کوئی گرجا یا بڑا محفوظ مقام جس کو اس زمانے میں برگ (BURG) کہتے تھے، ہوا کرتا تھا۔ یہ جگہیں پریشانی کے وقتوں میں جائے پناہ کا کام دیتی تھیں تاجروں کی گشتی جماعتیں، دو لمبی منزلوں کے درمیان یہیں قیام کرتی تھیں۔ یہ جماعتیں کبھی کبھی منجمد دریاؤں کی روانی کے انتظار میں عرصے تک مقیم رہتی تھیں۔ کبھی دلدلی راستے ناقابل گذر ہوتے اور ان کو عرصہ تک ان کے خشک ہونے کا انتظار کرنا پڑتا۔ آرام اور انتظار کے یہ دن انھیں گرجوں کی دیواروں کے سائے میں یا قلعے کی فصیلوں کی آڑ میں بسر ہوتے تھے۔ ایسے مقامات پر تاجروں کی آمد و رفت زیادہ بڑھ جانے کی وجہ سے قرب و جوار میں ایک آبادی خود بخود بس جاتی تھی۔ رفتہ رفتہ یہ مضافاتی آبادیاں خود ان مقامات سے، جن کے سائے میں یہ پیدا ہوئی اور بڑھی تھیں زیادہ اہمیت اختیار کرنے لگیں۔ مضافات میں بسنے والے تاجروں نے حفاظت کے خیال سے ان نئی آبادیوں کے چاروں طرف دیواریں کھڑی کرلیں۔ یہ دیواریں ابتدا میں غالباً امریکہ کے نوآبادکاروں کے جنگلوں سے مشابہ رہی ہوں گی۔

ان آبادیوں کے بس جانے کے بعد پرانی دیواروں کی جن کے سائے میں یہ بستیاں بسی تھیں، ضرورت ختم ہو جاتی تھی اور وہ گر گرا کر صاف ہو جاتی تھیں۔ پرانے شہر (BURG) اب آگے نہ بڑھتے اور نئی مضافاتی بستیوں میں، جہاں زندگی کے تازہ ہنگامے جاری ہوتے تھے جذب ہو جاتے تھے۔ لوگوں نے اپنے قدیم جاگیرداری گاؤں کو چھوڑنا شروع کیا اور ان نئے بڑھنے اور ترقی کرنے والے شہروں میں آباد ہونے لگے۔ تجارت کی بڑھتی ہوئی وسعت نے نئے لوگوں کے لئے نئے نئے کام پیدا کئے اور لوگ رزق کی تلاش میں، یہ نئے فرائض سنبھالنے آگے شہروں کی طرف بڑھنے لگے۔

ہم نہیں کہہ سکتے جو داستان ہم نے اوپر بیان کی ہے وہ حرف بحرف صحیح ہے۔ ہمارے بیان کی بنیاد بعض خاص مورخین کے قیاسات پر ہے۔ ان مورخوں میں ہنری پائرنی

(HENRI PIRENNE) خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اُس کی کتاب میں وہ تمام معلومات موجود ہیں جن کی بنا پر ہماری رسائی ان قیاسات تک ہوئی۔ اس کی کتاب بڑی دلچسپ ہے اور اُس کے طرز تحریر میں وہی لطف ہے جو کسی سراغ رسانی کی کتاب میں ہوتا ہے۔ اُس نے اپنی کتاب میں دعویٰ کیا ہے کہ شہر اسی طرح آباد ہوئے! اور ابتدا میں تاجر ہی ان شہروں میں رہا کرتے تھے۔ اپنے اس دعویٰ کی دلیل میں وہ کہتا ہے کہ بارھویں صدی عیسوی تک مرکیسٹر (MERCATOR) جس کے معنی تاجر (MERCHANT) کے ہیں برگنسز (BURGENSIS کا مرادف تھا۔ برگنسز اُن لوگوں کو کہتے تھے جو شہروں میں رہا کرتے تھے۔ یہ دونوں لفظ ادل بدل کر مرادف کے طور پر تاجر کے لئے استعمال ہوتے تھے۔

اب اگر تم جاگیرداری نظام کی ساخت پر غور کرو تو تمہاری سمجھ میں اچھی طرح آجائے گا کہ تجارت کی ترقی نے بڑے بڑے شہروں کی بنیادیں قائم کر کے ایک بڑی کشاکش کا دروازہ کھول دیا تھا۔ شہروں میں ہر لحظہ بڑھنے اور اُبھرنے والا کاروباری طبقہ آباد ہو رہا تھا جاگیرداری نظام کا ڈھانچہ رسم و رواج کی بندشوں سے کسا ہوا تھا اور اس میں کسی قسم کی آزادی کی گنجائش نہ تھی لیکن شہروں میں کاروباری زندگی نے، جو برابر آگے بڑھ رہی تھی، یہ بندشیں توڑ دی تھیں۔ جاگیرداری نظام کی قید و بند کے بجائے اس کاروباری ماحول میں آزادانہ نقل و حرکت کی کارفرمائی تھی۔ شہروں کی زمینیں، جاگیردار امرار، بشپ، شرفا اور بادشاہوں کی ملکیت تھیں۔ یہ زمیندار اپنی شہری ملکیت کو بھی اُسی نگاہ سے دیکھتے تھے جس نگاہ سے اپنی عام جاگیروں کو دیکھتے آئے تھے۔ ان کو شہروں سے بھی محصولوں کی وصولی کی توقع تھی، وہ یہاں بھی اجارہ داری کے دعویدار تھے۔ وہ ان شہروں میں بھی ٹیکس لگانا اور مزدوروں سے جسمانی محنت کا حق وصول کرنا چاہتے تھے۔ اپنی عدالتیں قائم کرنے کی فکر ان کو یہاں بھی تھی لیکن شہروں کی زندگی بدل چکی تھی اور جاگیردارانہ ریاستی نظام اب شہروں میں نہیں قائم کیا جا سکتا تھا۔ قدیم نظام کی بنیاد زمین کی ملکیت کے تصور پر قائم تھی۔ جہاں تک شہروں

کا تعلق ہے۔ وہاں اس نظام کی نوعیت میں تغیر اب ضروری ہو گیا تھا۔ جاگیرداری قوانین اور عدالتوں کی بنیاد، ایسی مقررہ رسموں پر تھی، جن کا بدلنا ممکن نہ تھا۔ لیکن تجارت اپنی فطرت کے لحاظ سے متحرک ہے۔ ہر گھڑی اس کے اصول بدلتے رہتے ہیں اور وہ اپنی رفتار میں کسی قید و بند کی پروا نہیں کرتی۔ قدیم جاگیرداری نظام میں جو بالکل جامد اور غیر متحرک تھا، اس کے لئے کوئی گنجائش نہ تھی۔ شہری زندگی جاگیرداری زندگی سے بالکل مختلف تھی۔ اس لئے اب شہروں میں، زندگی کے نئے تقاضوں کے بموجب، نیا ماحول پیدا کرنے کی ضرورت تھی۔

تاجروں نے آخر کار نئے نقطۂ نظر سے سوچنا شروع کیا۔ تاجر ایک حوصلہ مند جماعت تھے اس لئے ان کی فکر نے بہت جلد عملی شکل اختیار کر لی۔ وہ اچھی طرح تجربہ کر چکے تھے کہ جماعتی یکجہتی میں ان کی طاقت پوشیدہ ہے۔ وہ جب سڑکوں پر اپنا تجارتی سامان لے کر چلتے تھے۔ ان کو رہزنوں کی تاخت و تاراج سے بچنے کے لئے مل جل کر چلنا پڑتا تھا۔ سمندری سفروں میں بھی بحری قزاقوں سے بچنے کے لئے اس قسم کے اتحاد کی ضرورت محسوس ہوتی تھی، بازاروں اور میلوں میں بھی اپنے تجارتی سامان پر اچھی طرح نفع کمانے کے لئے، ان کو مل جل کر تجارت کرنے کی ضرورت کا احساس ہوتا تھا۔ اب جاگیرداری نظام کی بندشوں سے آزادی حاصل کرنے کے لئے بھی ان کو اپنے اسی تجربے سے کام لینا پڑا۔ انھوں نے اپنی انجمنیں (GILDS OR HANSES) بنائیں اور شہری آزادی کے لئے جس کے بغیر کاروباری وسعت ممکن نہ تھی۔ جد وجہد شروع کر دی، جہاں ان کو شہری آزادی کا حق بغیر لڑے بھڑے مل گیا وہ مطمئن ہو گئے۔ لیکن جہاں ان کو اس حق کیلئے لڑنا پڑا وہ لڑے اور لڑ بھڑ کر انھوں نے یہ حق حاصل کیا۔

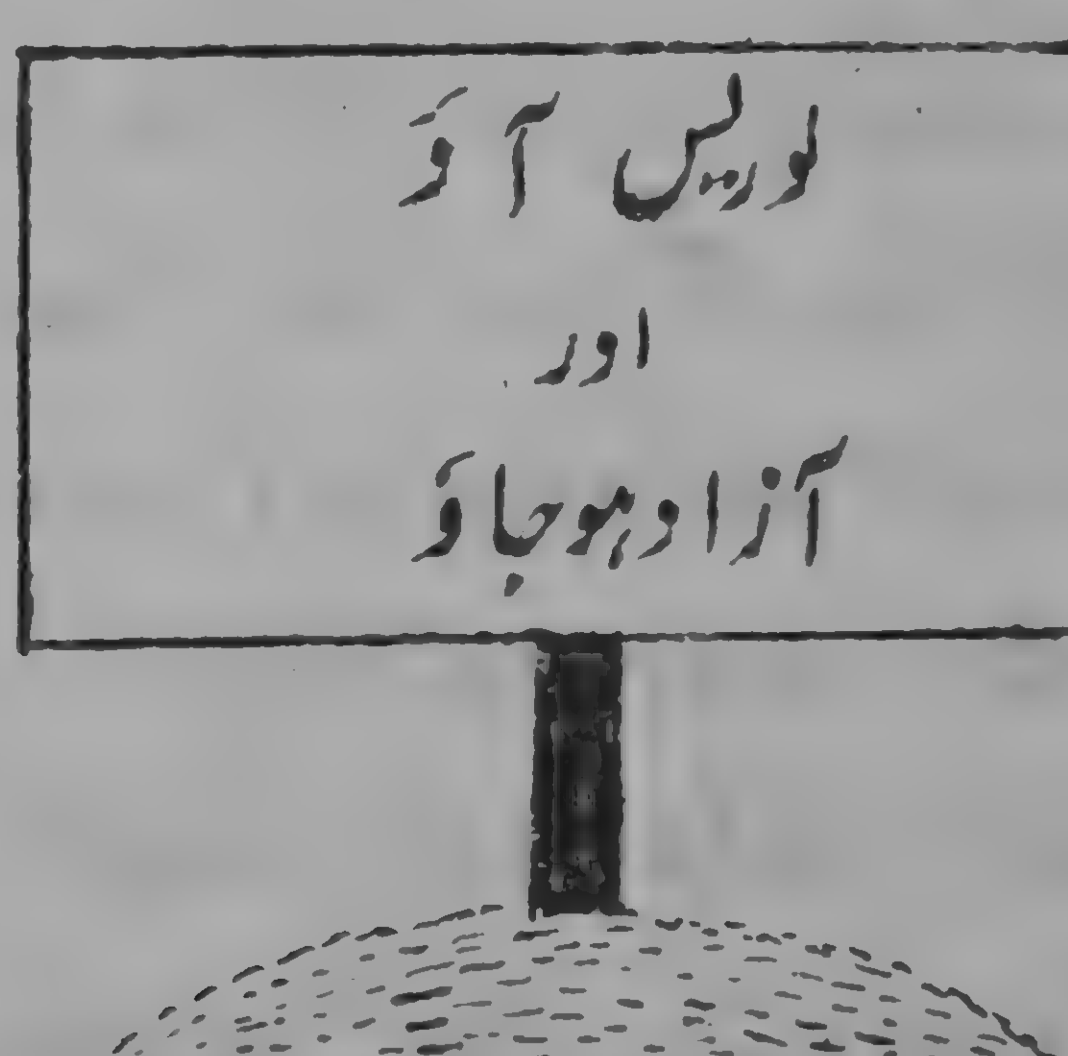
آخر یہ ہنگامے کیوں گرم تھے؟ یہ تجارت پیشہ لوگ کیا چاہتے تھے؟ ان بڑھتے ہوئے شہروں میں ان کے مطالبات کی نوعیت کیا تھی؟ وہ کونسا مقام تھا جہاں ان کے مقاصد کی ٹکر قدیم جاگیرداری نظام سے ہوتی تھی؟

شہر کے لوگ اپنی آزادی کے خواستگار تھے، وہ اپنی نقل و حرکت پر کسی قسم کی پابندی

پسند نہیں کرتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ جہاں چاہیں بے روک ٹوک آئیں جائیں۔ قدیم جرمن مثل (شہر کی ہوا آزاد بناتی ہے۔) (STATLUFT MACHT FREI) تمام مغربی یورپ کے لئے صحیح ثابت ہو رہی تھی، در اصل یہ مثل ان کے مقاصد کا صحیح اظہار تھی۔ اس مثل کی صحت ہم کو بارہویں اور تیرھویں صدی کے ان منشوروں میں بھی نظر آتی ہے جو شاہ لوئس ہفتم نے ۱۱۵۵ء میں شہر لوریس کے لئے نافذ کیا تھا۔ اس فرمان میں آیا ہے۔

"جو شخص ایک سال سے ایک دن زیادہ لوریس (LORRIS) کے کلیسائی حلقے میں قیام کرے گا اور اس عرصہ میں اس کے خلاف کوئی بات نہ پیدا ہوگی، اور وہ کبھی ہمارے میر بلدہ کے سامنے آنے اور اپنی عرضداشت پیش کرنے سے گریز نہ کرے گا اُس کو ہمارے یہاں آزادی سے رہنے کا پورا حق ہوگا اور اُس کی عزت آبرو پوری طرح محفوظ ہوگی۔"

اگر لوریس اور دوسرے شہر بیسویں صدی کے فن تشہیر اور سڑکوں کے کنارے اشتہار دلں کے آویزاں کرنے کی ٹکنیک سے واقف ہوتے تو انھوں نے ذیل کا پوسٹر کسی کھمبے پر ضرور چسپاں کر دیا ہوتا۔



شہر کے لوگ صرف اپنی ذاتی آزادی ہی کے خواستگار نہ تھے۔ وہ کچھ اور بھی چاہتے تھے۔ ان کو زمین کی آزادی کی بھی فکر تھی جاگیرداری نظام کا قدیم طرز جس میں "فلاں شخص فلاں اور فلاں کی طرف سے" زمین پر قبضہ پاتا تھا اور "فلاں فلاں اشخاص" فلاں فلاں امرا کی طرف سے

زمین کے حقدار ٹھہرتے ہیں، انھیں پسند نہ تھا۔ شہر کے رہنے والے زمین اور اس پر بنے ہوئے مکانات کو اس نگاہ سے نہیں دیکھتے تھے جس نگاہ سے جاگیروں کے مالک اب تک ان کو دیکھنے کے عادی تھے۔ شہر کے لوگوں کو کسی کاروبار کے سلسلے میں اکثر فوراً روپئے کی ضرورت پڑ جاتی تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ اپنی جائداد فوراً رہن یا بیع کر کے مطلوبہ رقم حاصل کر لیں اور اس خرید و فروخت میں ان کو مالکوں کے لمبے سلسلے کی منظوری حاصل کرنے کی ضرورت نہ ہو۔ اسی منشور میں جس کا اقتباس اوپر آ چکا ہے، درج ہے:-

"ہر شہری (BURGHER) کو جو اپنی جائداد بیچنا چاہے، ایسا کرنے کا حق ہوگا"

تم نے اس کتاب کے پہلے باب میں زمین کے نظام کے متعلق کچھ رواجوں اور دستوروں کا حال پڑھا ہوگا۔ تجارت اور شہری آبادیوں نے ان دستوروں اور رواجوں میں کتنا انقلاب پیدا کر دیا!

شہروں کے لوگوں نے اپنے مقدمات کے فیصلوں کے لئے بھی اپنی ہی عدالتوں کا مطالبہ کیا۔ ان کو جاگیرداری نظام کی سست رفتار عدالتیں پسند نہ تھیں۔ یہ قدیم عدالتیں ایک ٹھہرے ہوئے سماج کے لئے قائم کی گئی تھیں، وہ تجارتی شہروں کے نئے مسائل طے کرنے کے لئے جو زندگی کی جدتوں سے معمور تھے، موزوں نہ تھیں۔ جاگیرداری نظام کا ایک امیر رہن ہنڈی اور تجارت کے دوسرے قاعدوں سے بالکل بے خبر تھا۔ اگر وہ ان مسائل سے واقف بھی ہوتا تب بھی وہ اپنے اثر، اختیارات، معلومات اور اپنی امتیازی حیثیت کو اپنے مفاد کے لئے استعمال کرتا۔ اس کو شہر کے لوگوں کے مفاد سے کوئی ہمدردی نہ ہوتی اس لئے شہر کے لوگوں کو خود اپنی عدالتوں کی ضرورت محسوس ہوئی۔ ایسی عدالتیں جو اس ابھرتے ہوئے سماج کے مزاج سے واقف ہوں۔ اس کے مسائل کو سمجھتی ہوں اور اس کے مفاد کی حفاظت کرنے کے لائق ہوں۔ انھوں نے یہ عدالتیں اپنے بنائے ہوئے تعزیری قوانین کے بموجب چلانی چاہیں۔ جاگیرداری گاؤں میں قیام امن کا مسئلہ اتنا پیچیدہ نہ تھا۔ ان ابھرتے ہوئے شہروں

میں جہاں دولت کی بہتات اور آبادی کے ہجوم نے صورت حال بالکل بدل دی تھی۔ قیام امن کا سوال بھی غیر معمولی طور پر پیچیدہ ہو گیا تھا۔ شہروں کے رہنے والے لوگ ان مسائل سے خوب واقف تھے اس لئے وہ اپنے شہری امن کے لئے نئے مطالبات پیش کر رہے تھے۔

شہر کے لوگ اپنی اجتماعی ضرورتوں کے لئے محصولات عائد کرنے، وصول کرنے اور ان کے خرچ کرنے کے اختیارات چاہتے تھے۔ ان کو ان گنت جاگیرداری مطالبوں پر اعتراض تھا۔ ان کو ایسی لاتعداد رقمیں ادا کرنا، امدادی چندے دینا اور جرمانے ادا کرنا بہت ناگوار تھا۔ بدلتے ہوئے حالات میں اس قسم کے مطالبات تکلیف دہ سمجھے جانے لگے تھے۔ شہر کے لوگ تجارت پیشہ تھے، انھوں نے ہر قسم کے محصولوں کے خلاف جو ان کی تجارت کی راہ میں دشواری پیدا کرتے تھے۔ جد و جہد شروع کی۔ وہ ان محصولوں سے پوری طرح چھٹکارا تو نہ پا سکے لیکن انھوں نے بڑی حد تک ان کی اصلاح کرا لی۔ ان کو محصول اب بھی ادا کرنے پڑتے تھے لیکن اصلاح کے بعد اب وہ اتنے قابل اعتراض نہیں رہ گئے تھے۔

شہروں کے رہنے والے اپنی آبادیوں پر پورا اختیار چاہتے تھے لیکن ان کو اس مطالبہ میں یکبارگی پوری کامیابی نہ ہو سکی۔ رفتہ رفتہ ان کے حقوق تسلیم کئے گئے۔ مالک اپنی شروع میں ان کے ہاتھ میں تھوڑے سے اختیارات فروخت کرتا تھا کچھ دنوں کے بعد کچھ اور حقوق شہر والوں کو مل جاتے تھے، یہاں تک کہ رفتہ رفتہ شہروں نے اپنے آپ کو مالکوں کی گرفت سے پوری طرح آزاد کرا لیا۔ جرمنی کے شہر ڈارٹمنڈ (DART MUND) میں غالباً یہی صورت پیش آئی ۱۲۴۱ء میں ڈارٹمنڈ کے کاؤنٹ نے شہریوں کے ہاتھ اپنے چند جاگیردارانہ حقوق فروخت کئے۔ اس نے اس سلسلے میں جو دستاویز لکھی اس کے بعض اقتباسات یہ ہیں :-

"میں ڈارٹمنڈ کا کاؤنٹ کانراڈ (CONROD)، میری بیوی جیسل ٹرڈ (GISEL TRUDE) اور میرے تمام جائز وارث سب اپنا گھر جو بازار کے قریب واقع ہے ڈارٹمنڈ کے

شہریوں کے ہاتھ بیچتے ہیں اور ان کی طرف دائمی حقوق منتقل کرتے ہیں۔ ہم ان کو وہ حقوق بھی دیتے ہیں جو ہم کو رومن امپائر سے مذبح، چرم سازی کے کارخانے، تنورخانے اور اُس گھر میں جو دارالعدالت کے اوپر ہے حاصل ہیں۔ ہم اس کے عوض میں مذبح کیلئے دو دناری (DENARIE) اور چرم سازی کے کارخانے کے لئے دو دناری اور تنورخانے، اور دارالعدالت کے اوپر کی عمارت کے لئے ایک پاؤنڈ کالی مرچ سالانہ لیں گے۔"

اسّی سال کے بعد ڈارٹمنڈ کے ایک دوسرے کاؤنٹ کانراڈ نے سالانہ کرایہ کے عوض میں ڈارٹمنڈ کے شہریوں کی مجلس کے نام، ڈارٹمنڈ کی آدھی ریاست فروخت کر دی۔ اس نصف ریاست میں، عدالتیں، چنگی کے محصولات، مالگذاری اور وہ چیزیں جو فصیل کے اندر ہوتی تھیں شامل تھیں۔ اس دستاویز میں کاؤنٹ کا ذاتی مکان، اُس کے ذاتی غلام اور سینٹ مارٹن کا گرجا شامل نہ تھا۔

یہ بات آسانی سے سمجھ میں آسکتی ہے کہ اُس زمانے کے بشپ اور امراء ان تبدیلیوں سے جو اُس وقت کے سماج میں ہو رہی تھیں بے خبر نہ تھے۔ ان میں سے کچھ لوگ یہ ضرور محسوس کرنے لگے تھے کہ ان تاریخی قوتوں کے مقابلے میں اب ان کا قدم جمانا آسان نہیں ہے لیکن اگر کچھ لوگوں نے یہ محسوس کر لیا تھا تو اکثر لوگ اب بھی ایسے تھے جو ابھی تک حالات کی رفتار کا صحیح اندازہ نہیں کر سکے تھے۔ جو لوگ تیز فہم تھے، انھوں نے جو کچھ پیش آرہا تھا اُس کا صحیح مطالعہ کیا۔ وقت سے فائدہ اُٹھایا اور آخر کار ان آزمائشوں سے اپنا دامن خوبصورتی سے بچالے گئے لیکن یہ تمام معاملات عام حالات میں بالکل پُر امن طریقے سے طے نہیں ہوتے تھے۔ یہ تجربہ تاریخ کے ہر دور میں صحیح ثابت ہوا کہ جن لوگوں کے ہاتھوں میں طاقت ہوتی ہے وہ آسانی سے اس طاقت سے دست کش نہیں ہوتے۔ بلکہ اُسے بچانے کے لئے ان کے بس میں جو کچھ ہوتا ہے کر گزرتے ہیں۔ کتا اپنی ہڈی کے لئے جو اُس کے قبضہ میں آچکی ہے ضرور لڑے گا، جاگیردار

امرا اور بشپ (خاص طور سے بشپ) نے ان ہڈیوں میں اپنے دانت پیوست کر رکھے تھے وہ اُن کو اُس وقت تک چھوڑنے کے لئے تیار نہ تھے جب تک جبر و قوت سے ترک کرنے پر مجبور نہ کر دئے جاتے بعض لوگوں کے نزدیک یہ جنگ صرف ان حقوق اور اختیارات کو بچانے کیلئے کی جا رہی تھی جو اب تک ان کا حصہ رہے تھے لیکن ان کا ایمانداری سے یہ خیال تھا کہ اگر انھوں نے پامردی سے قدم نہ ٹیکے اور انقلاب کا سیلاب آگے بڑھ گیا تو پورا سماجی نظام درہم برہم ہو جائے گا۔ تاریخ میں یہ واقعہ اکثر پیش آیا ہے۔ اطمینان اور فراغت سے زندگی گزارنے والے لوگ انقلابات کے موقعوں پر اسی طرح سوچنے کے عادی رہے ہیں جسٹس وینڈل ہومز کا یہ بیان کتنا صحیح ہے کہ جب اختلافات کی بنیادیں بہت گہری ہو جاتی ہیں تو ہم دوسرے اشخاص کو قتل کر دینا تو پسند کرتے ہیں لیکن یہ پسند نہیں کرتے کہ وہ بھی اپنی راہ پر چلتے رہیں۔

یہ حقیقت بھی ناقابل انکار ہے کہ شہروں کی جنگ آزما منظم تاجر جماعتیں اپنی جگہ پر (اُن معنی میں جو آج ہم سمجھتے ہیں) انقلاب پسند نہ تھیں۔ انھوں نے یہ ہنگامے جاگیرداری نظام کا جوا اتار پھینکنے کے لئے نہیں برپا کئے تھے۔ ان کی غرض تو صرف اتنی تھی کہ وہ ان قدیم جاگیردارانہ رسموں اور رواجوں میں کچھ آسانیاں پیدا کرالیں جو ان کی بڑھتی ہوئی تجارت کی راہ میں رکاوٹ ثابت ہوتی رہتی تھیں۔ انھوں نے امریکی انقلاب پسندوں کی طرح یہ نہیں لکھ رکھا تھا کہ "تمام انسان آزاد اور برابر پیدا کئے گئے ہیں"۔ ان کا ہرگز یہ عقیدہ نہ تھا۔

> "انھوں نے ذاتی آزادی کا فطری حق کے طور پر کوئی مطالبہ نہیں کیا۔ وہ ذاتی آزادی چاہتے تھے لیکن محض ان سہولتوں کے لئے جو خود بخود اس کے ساتھ پیدا ہوتی ہیں۔ یہ واقعہ نظر انداز کرنے کے لائق نہیں کہ انھوں نے ایرس (ARRAS) میں سینٹ واسٹ (ST. VAST) کی خانقاہ میں اپنے آپ کو سرفوں میں شمار کرایا۔ غرض صرف اتنی تھی کہ وہاں کے بازار میں چنگی کے محصول سے، جس سے وہاں کے سرف مستثنیٰ تھے، بچ جائیں۔"

شہروں کے باشندے صرف تجارتی توسیع کی آزادی چاہتے تھے اور اس سلسلے میں کسی قسم کی مداخلت پسند نہیں کرتے تھے۔ چند صدیوں کے بعد، وہ جو کچھ چاہتے تھے، انھیں مل گیا لیکن اس آزادی کی نوعیت کا، جو انھوں نے حاصل کی تھی، تعین کرنا بہت مشکل ہے۔ یہ بتانا آسان نہیں کہ کن کن جماعتوں نے کب اور کہاں کیا کیا حقوق حاصل کیے! اٹلی اور فلنڈرس کی شہری جمہوریتوں کی طرح مکمل آزاد شہر بھی تھے۔ وہاں کچھ مجالس بلدیہ بھی تھیں، جو اپنی آزادی کی نوعیت میں ایک دوسرے سے مختلف تھیں۔ کچھ ایسے شہر بھی تھے جنھوں نے اپنے امرا سے حقوق چھین لیے تھے لیکن پھر بھی بڑی حد تک انھیں کے ماتحت تھے۔

شہروں نے اس جد و جہد میں جو حقوق حاصل کیے ان کی مضبوطی کے لیے فرمان بھی لکھوا لیے تھے۔ یہ فرمان اس وقت، جب کوئی مالکِ اعلیٰ یا اس کا کارندہ ان حقوق کے متعلق کوئی بات فراموش کر دیتا، کام آتے تھے۔ پان تھیو (PONTHIEU) کے کاؤنٹ نے ۱۱۸۴ء میں ایبے ویلے (ABBE VILLE) کے شہر کو ایک فرمان عطا کیا تھا۔ اس فرمان کی کچھ ابتدائی سطروں میں کاؤنٹ نے خود ان وجوہ کا ذکر کیا ہے جن کی وجہ سے شہر کے لوگ ان فرامین کو بے انتہا قیمتی سمجھتے تھے اور ان کو ہمیشہ منتقل رکھتے تھے۔ بعض اوقات تو یہ فرامین سونے کے حروف میں شہر اور چرچ کی دیواروں پر کندہ کرا دیے جاتے تھے۔ کاؤنٹ وجوہ بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے:-

> "چونکہ جو چیز لکھدی جاتی ہے، وہ انسان کے حافظے میں آسانی سے محفوظ ہو جاتی ہے اس لئے میں جین (JEAN) پان تھیو کا کاؤنٹ، ان لوگوں کو جو اس وقت موجود ہیں، اور جو ان کے بعد آنے والے ہیں مطلع کرتا ہوں کہ میرے دادا کاؤنٹ گلیوم تلواس (GUILLAUME TALVAS) نے ایبے ویلے کے شہریوں کے ہاتھ یہ حق بیچ دیا تھا کہ وہ مجلسِ حکومت (COMMUNE) بنائیں لیکن شہریوں کے پاس اس کیلئے کوئی باقاعدہ تحریر نہ تھی اس لئے میں نے ان کو یہ تحریر اس غرض سے عطا کی ہے کہ

وہ مجلس بلدیہ بنائیں اور اس حق کو ہمیشہ استعمال کریں۔"

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک سو چھیاسی ۱۸۶ برس کے بعد ۱۳۷۰ء میں ایبے ویلے براہِ راست ایک دوسرے فرمانروا شاہ فرانس کی ملکیت میں آگیا تھا۔ یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ اس عرصہ میں شہری آزادی کی تحریک برابر چلتی اور تیزی سے آگے بڑھتی رہی، غالباً یہی وجہ ہے کہ بادشاہ اپنے فرمان میں، جو اس نے اپنے افسروں کے نام جاری کیا تھا، بہت بڑے بڑے وعدے کئے تھے۔ وہ لکھتا ہے :۔

"ہم نے ان لوگوں کو کچھ خاص حقوق عطا کئے ہیں۔ ان حقوق سے یہ اچھی طرح ظاہر ہوتا ہے کہ ہم کسی وجہ سے کسی موقع پر بھی نہ ان پر جرمانہ عائد کریں گے اور نہ کسی اور صورت سے ان پر کوئی جرمانہ عائد ہونے دیں گے۔ اس طرح کی کوئی بات نہ اپنے شہر ایبے ویلے میں ہوگی اور نہ پان تھیو کی کاؤنٹی کے کسی دوسرے شہر میں پیش آئے گی۔ کوئی جرمانہ، چندہ، یا کوئی اور کسی قسم کی ضمنی رقم جو اس شہر کے لوگوں کے مفاد میں نہیں ہے اور نہ ان کی طرف سے اس کی درخواست کی گئی ہے، وصول نہ کی جائے گی۔ ہم ان درخواست کنندگان کی سچی محبت اور اطاعت کا لحاظ رکھتے ہوئے حکم دیتے ہیں اور تم کو براہ راست پابند بناتے ہیں کہ تم تمام تاجروں اور اس شہر کے تمام رہنے والوں کو تجارت کرنے، بیچنے اور خریدنے کی اجازت دو گے۔ تمام شہروں دیہاتوں اور اس علاقہ کی حدوں سے گزرنے میں کوئی روک ٹوک نہ کرو گے۔ نمک اور دوسرا تمام سامان تجارت ان سے ہمارے لئے اور ہمارے آدمیوں اور افسروں کے لئے کچھ وصول کئے بغیر اور کوئی محصول، کوئی مطالبہ اور کوئی ضمنی رقم عائد کئے بغیر گزرنے دو گے۔"

ٹیکسوں سے استثنیٰ کا یہ حق، جو شاہ فرانس نے اپنی اس تحریر کے ذریعہ سے ان کو عطا کیا تھا ان حقوق میں سے ایک تھا جن کے لئے تاجر ایک عرصہ سے جد و جہد کر رہے تھے۔ شہروں

کی آزادی کی تحریک میں تاجروں نے قیادت اپنے ہاتھوں میں لی۔ وہ شہروں کی سب سے زیادہ طاقتور اور با اثر جماعت تھے۔ انھوں نے اپنی تجارتی جماعتوں کے لئے ہر قسم کے حقوق حاصل کر لئے۔ تاجروں کی یہ جماعتیں اکثر شہر کے پورے کاروبار کی اجارہ دار ہوتی تھیں۔ اگر تم تاجروں کی اس انجمن کے ممبر نہ ہوتے تو تم کو تجارت میں قسمت آزمائی کا کوئی موقع نہ ملتا

سنہ ۱۲۸۰ء میں نیو کیسل (NEW CASTLE) کے شہر میں ایک شخص رچرڈ نے بادشاہ سے شکایت کی کہ بہت سے تاجروں نے اس سے سفید اون کی دس کھالیں زبردستی چھین لیں۔ اس نے بادشاہ سے ان کھالوں کی واپسی کے لئے فریاد کی۔ بادشاہ نے ان تاجروں کو طلب کیا اور ان سے پوچھا کہ "تم نے رچرڈ کا اون کیوں لیا؟" انھوں نے اپنی صفائی میں بیان کیا کہ شاہ ہنری سوم نے ان کے حق میں فرمان نافذ کیا تھا کہ :۔

"شہر مذکور کے تاجر اپنی حدود میں ایک انجمن قائم کریں گے۔ اس انجمن کے ارکان کو ہر قسم کی آزادی حاصل ہوگی، وہ چنگی کے محصول سے مستثنیٰ ہوں گے۔ اس سوال کے جواب میں کہ وہ کیا آزادیاں ہیں جو مذکورہ جماعت تجار کو حاصل ہیں، انھوں نے بیان کیا کہ جب تک کوئی جماعت تجار کے خاص حقوق حاصل نہ کر لے نہ کپڑا قطع کر سکتا ہے اور نہ شہر کی حدود میں اسے بیچ سکتا ہے۔ نہ گوشت کی دوکان رکھ سکتا ہے اور نہ مچھلیاں فروخت کر سکتا ہے۔ نہ وہ تازہ چمڑا خرید سکتا ہے اور نہ بنا ہوا اونی چمڑا۔"

ساوتھیمٹن (SOTHAMPTON) میں معلوم ہوتا ہے، وہ لوگ بھی، جو جماعت تجار کے ممبر نہ تھے چیزیں خرید سکتے تھے لیکن جماعت تجار کو پھر بھی ترجیح کا حق حاصل تھا۔ ایک تحریر کے الفاظ ہیں :۔

"شہریوں اور جماعت تجار سے پہلے کوئی عام باشندہ اور پردیسی کوئی تجارتی کاروبار نہ کر سکے گا اور نہ کوئی سامان جو تجارت کی غرض سے شہر میں آیا ہو، خرید سکے گا جب تک جماعت تجار کے ارکان موجود ہوں اور تجارتی کاروبار کرنا اور خریدنا چاہیں۔ دوسرے

کو خریداری کا حق نہ ہوگا۔ اگر کوئی شخص اس قاعدے کی خلاف ورزی کرتا ہوا پایا جائیگا

تو وہ تمام سامان، جو وہ خریدے گا، بادشاہ کے حق میں ضبط کر لیا جائے گا۔"

اس جماعت تجار نے صرف ان مقامی لوگوں کو ہی جو جماعت کے ممبر نہ تھے خرید و فروخت کے حق سے محروم نہیں رکھا بلکہ بیرونی تاجروں کو بھی اپنی حدود عمل سے باہر نکالنے میں کامیاب ہوگئے، وہ دراصل بازار پر صرف اپنا قبضہ رکھنا چاہتے تھے۔ جو تجارتی سامان شہروں میں آتا یا شہروں سے باہر جاتا تھا ان کے ہاتھوں سے ہوکر گذرتا تھا۔ باہر کے لوگوں کے مقابلے کا کوئی اندیشہ نہ تھا۔ چیزوں کی قیمتیں تاجروں کی جماعتیں ہی مقرر کرتی تھیں۔ بازار کی پوری اجارہ داری انہی کے لئے مخصوص تھی اس لئے تجارت کے ہر میدان میں بازی ان ہی کے ہاتھ رہتی تھی۔

اقتدار اور تجارتی اجارہ داری کی بقا کے لئے تاجروں کی ان منظم جماعتوں (GILDS) کو ارباب اختیار سے ساز باز رکھنی پڑتی تھی۔ یہ صورت صرف ایک ہی شہر تک محدود نہ تھی بلکہ ان کی تجارت کا حلقہ متعدد شہروں تک پھیلا ہوتا تھا۔ ان تمام شہروں کے با اختیار حکام ان کے مددگار ہوتے تھے شہروں میں تاجروں کی جماعت ہی سب سے بڑی با اقتدار اور اہم جماعت ہوتی تھی۔ اس لئے شہروں میں ان کی رائے کا افسروں کے تقرر پر بھی اثر پڑتا تھا۔ بعض شہروں میں تو حکام بالکل ان کے بس میں ہوتے تھے بعض ایسے شہر بھی تھے جہاں حکومت کی باگ ڈور ان تاجروں ہی کے ہاتھوں میں ہوتی تھی۔ چند مقام ایسے بھی تھے جہاں قانون نے بھی صاف صاف تسلیم کر لیا تھا کہ شہر کی حکومت صرف جماعت تجار (GILDS) کے ارکان سنبھالیں گے اور اسی جماعت کے لوگ حکم مقرر کئے جائیں گے۔ یہ صحیح ہے کہ ایسا کم ہوتا تھا لیکن یہ ثابت کرنے کے لئے کہ ایسا بھی ہوتا تھا شہر پرسٹن (PRISTON) کے قانون کا جو ۱۳۲۸ء میں منظور ہوا تھا حوالہ دینا کافی ہوگا۔ اس قانون کے الفاظ ہیں :۔

"ہر طبقے کے شہری، جن کو حقوق شہریت، عدالتی فہرست کے بموجب عطا ہوئے ہیں اور جو جماعت تجار سے تعلق نہیں رکھتے ہیں۔ کبھی میئر، بیل (BALE) یا سرجنٹ مقرر نہیں

کئے جائیں گے۔ صرف وہ شہری جن کا نام جماعت تجار میں ہو میر بیل یا سرجنٹ مقرر کئے جائیں گے۔ کیونکہ بادشاہ نے آزادی صرف ان شہریوں کو عطا کی ہے جو جماعت تجار میں شامل ہیں۔ ان کے سوا کسی دوسرے کو یہ حقوق حاصل نہیں ہیں۔"

تاجروں کی یہ انجمنیں (GILDS) جن کو اجارہ دارانہ اقتدار کی بے انتہا ہوس تھی اپنے حقوق کی حفاظت میں بہت مستعد تھیں انھوں نے قواعد اور قوانین کی زنجیروں سے اپنے ارکان کو کچھ اس طرح جکڑ رکھا تھا کہ کسی شخص کو چون وچرا کی مجال نہ تھی۔ اگر کوئی شخص اس جماعت کا ممبر ہوتا تو اُس کو خاص حقوق حاصل ہوتے تھے لیکن جماعت کی ممبری بھی کچھ آسان نہ تھی۔ اس کی بقا کے لئے انجمن کے قوانین کی پابندی بے انتہا ضروری تھی یہ قوانین متعدد بھی تھے اور سخت بھی۔ اگر کوئی شخص ان قوانین کی خلاف ورزی کرنے کی جرائت کرتا تھا تو جماعت سے نکال دیا جاتا تھا اور اس جرم کی پاداش میں اس کو مختلف قسم کی سزائیں دی جاتی تھیں سزا کا ایک خاص طریقہ، جو چسٹر (CHESTER) کی جماعت تجار (GILD) نے اب سے تین سو برس پہلے اختیار کیا تھا ہمارے لئے خاص طور سے بڑی دلچسپی کا موجب ہے۔ ۱۶۱۴ء میں ریشم فروشوں (MERCERS) اور آہنی اشیا کے تاجروں کو پتہ چلا کہ ٹی۔ الڈرس لے (T. ALDERS-LEY) نے انجمن کے قوانین کی خلاف ورزی کی ہے۔ ان کی انجمن نے اس کو دوکان بند کرنے کا حکم دیا لیکن اس نے اِس حکم کی بھی کوئی پروا نہیں کی۔ اس لئے:-

"دو آدمی دن بھر اس کی دوکان کے سامنے ٹہلتے رہتے تھے۔ اور جو لوگ اس کی دوکان میں سامان خریدنے آتے ان کو سمجھاتے اور سامان خریدنے سے منع کرتے۔"

یہ آسانی سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ الڈرس لے اس پکٹنگ کے خلاف اُس وقت کی عدالت سے کوئی حکم امتناعی (جیسا کہ اس وقت دستور ہے) نہیں جاری کرا سکا۔ اُس وقت جب جماعت تجار کے اثر و اقتدار کی انتہا نہ تھی۔ یہ ممکن نہ تھا۔ یہ حقیقت ہے کہ اُس وقت تاجروں کی یہ انجمنیں صرف اپنی ہی حدود میں غیر معمولی اثر و اقتدار کی مالک نہ تھیں بلکہ ان کی کبریائی کا حلقہ

دور دور تک پھیلا ہوا تھا۔ وہ اپنے اثر و اقتدار کی تکمیل کے لئے اپنے پرانے طریقے "باہمی اتحاد" سے کام لیتی تھیں۔ جرمنی کی مشہور "مرکزی تجارتی انجمن" (HANSEATIC LEAGUE) ایک امتیازی مثال کے طور پر پیش کی جا سکتی ہے۔ اس انجمن کو بہت سے طاقتور تجارتی اداروں نے مل کر قائم کیا تھا۔ اس انجمن نے متعدد مقامات پر اپنے تجارتی گھر بنا رکھے تھے، یہ گھر گودام کے طور پر بھی استعمال ہوتے تھے اور ضرورت کے وقت ان سے محفوظ قلعوں کا بھی کام لیا جاتا تھا۔ ہالینڈ سے روس تک ان عمارتوں کا سلسلہ چلا گیا تھا۔ اس طاقتور انجمن نے اپنے عروج کے زمانے میں سو سے زیادہ شہروں پر اپنا اقتدار قائم کر رکھا تھا۔ مشرقی یورپ کی تجارت جو دنیا کے دوسرے حصوں سے ہوتی تھی اسی انجمن کے قبضہ میں تھی۔ یہ لیگ متعدد امور میں ایک باقاعدہ ریاست کی طرح خودمختار تھی۔ یہ تجارتی معاہدے کرتی، جنگی جہازوں کے ذریعہ سے اپنے تجارتی بیڑے کی حفاظت کرتی، شمالی سمندروں کو بحری قزاقوں کی غارت گریوں سے محفوظ رکھتی اور اپنے کاروبار کے فروغ کے لئے خود ایسے قانون ساز ادارے منتخب کرتی تھی، جو اس کے لئے قانون بنانے کا فرض انجام دیتے تھے

ان تاجروں اور شہریوں نے جو حقوق حاصل کئے، ان سے پتہ چلتا ہے کہ اس زمانے میں تجارت حصولِ دولت کے ایک ذریعہ کی حیثیت سے اہمیت حاصل کر رہی تھی۔ تاجروں نے شہروں میں جو غیرمعمولی اثر و اقتدار حاصل کیا تھا اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس وقت "روپیہ" نے "زمین" کے بجائے دولت کی حیثیت سے اہمیت حاصل کر لی تھی۔

جاگیرداری نظام کی ابتدا میں زمین ہی ایک آدمی کی دولت کا واحد ذریعہ سمجھی جاتی تھی۔ تجارت کے فروغ کے ساتھ ساتھ ایک نئی دولت "روپیہ" کی جلوہ نمائی ہوئی۔ جاگیرداری نظام کی ابتدا میں روپیہ ایک مردہ، غیرمتحرک اور جامد وجود رکھتا تھا۔ لیکن اب وہ زندہ، متحرک اور رواں تھا۔ گذشتہ زمانے میں اربابِ کلیسا اور نائٹ زمینوں کے مالک تھے۔ اس لئے دولت اور اقتدار کی لگام بھی انھیں کے ہاتھ میں تھی۔ دولت مند طبقے جو محنت کرنے والوں کی گردنوں پر سوار تھے، اس وقت کے سماج کا "اونچا طبقہ" سمجھے جاتے تھے۔ نیچا طبقہ محنت کش غلاموں (SERFS)

پر مشتمل تھا۔ اب ان دونوں کے درمیان میں ایک تیسرا متوسط طبقہ (مڈل کلاس) نظر آ رہا تھا اس کی زندگی کا انداز ان دونوں سے الگ تھا۔ یہ خریدنے اور بیچنے والا طبقہ تھا۔ جاگیرداری نظام میں، حکومت کا اقتدار، جو زمین سے وابستہ تھا، ارباب کلیسا اور امراء کے ہاتھ میں تھا۔ لیکن اب "روپیہ" نے جو دولت کا ایک نیا ذریعہ تھا اپنے ساتھ ابھرنے والے درمیانی طبقہ (مڈل کلاس) کے لئے حکومت میں گنجائش پیدا کر لی۔

نئے خیالات کی حکومت

آج کل تجارت زیادہ تر قرض کے روپے سے کی جاتی ہے۔ اس روپیہ پر قرض خواہ کو سود ادا کیا جاتا ہے۔ اگر ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی اسٹیل کمپنی، لوہے کے کسی دوسرے کارخانے کو جس سے اُس کا مقابلہ رہتا ہو خریدنا چاہے گی تو غالباً اس خریداری کے لئے جتنے سرمائے کی ضرورت ہوگی، وہ کہیں سے قرض ہی لیا جائے گا۔ وہ اس مطلوبہ سرمایہ کی فراہمی کے لئے بانڈ جاری کرے گی، بانڈ کا مطلب اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ کمپنی وعدہ کرتی ہے کہ وہ روپیہ مع سود قرض خواہ کو ادا کرے گی۔ اگر تمہارا کوئی پڑوسی مٹھائی کا دوکاندار، دوکان کے پاس کسی گوشے میں کوئی ٹکڑا دوکان کی توسیع کے لئے خریدنا چاہتا ہے تو وہ بینک سے روپیہ حاصل کرے گا۔ بینک اُس کو مطلوبہ رقم قرض دے گا اور اس رقم پر سود وصول کرے گا۔ اگر کوئی کسان کچھ زمین جو اُس کے فارم سے ملی ہوئی ہے، خریدنا چاہے گا تو اپنے فارم کی کفالت پر قرض روپیہ کا انتظام کرے گا۔ یہ کفالتی قرض سالانہ سود کی شرط پر کسانوں کو ملتا ہے۔ ہم قرض کی رقم پر سود دینے کے اتنے عادی ہو چکے ہیں کہ اب ہم کو یہ طریقہ غیر فطری نہیں معلوم ہوتا۔ اور ہم یہ سمجھتے ہیں کہ یہ طریقہ دنیا میں ہمیشہ سے چلا آرہا ہے لیکن حقیقت کچھ اور ہے۔ ایک وقت تھا جب تم کوئی رقم قرض دے کر اُس پر سود مانگتے تو گنہگار ٹھہرائے جاتے۔ قرونِ وسطیٰ کی ابتدائی صدیوں میں ایک طاقت تھی جس کے نزدیک قرض کی رقم پر سود وصول کرنا سخت گناہ تھا۔ یہ وہ طاقت تھی جس کے احکام پوری عیسائی دنیا کے لئے قانون کے برابر اہم اور واجب التعمیل سمجھے جاتے تھے۔

یہ طاقت کلیسا کے سوا کوئی دوسری نہ تھی۔ قرض دے کر روپیہ پر نفع لینا اہل کلیسا کے

نزدیک سود خوری کہلاتا تھا۔ اور سود خوری گناہ تھی۔ گناہ کا لفظ میں نے جلی قلم سے لکھا ہے اس سے میرا مطلب اُس طرزِ بیان سے واقفیت پیدا کرانا ہے جو اُس زمانے میں اربابِ کلیسا استعمال کرتے تھے۔ ایسا اعلان جس میں کلیسا کے احکام کی خلاف ورزی کرنے والے کو عذابِ جہنم کی وعید سنائی گئی ہو، بہت اہم سمجھا جاتا تھا۔ جاگیرداری زمانے میں عوام کے دماغوں پر کلیسا کا اثر چھایا ہوا تھا لیکن اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ صرف کلیسا ہی سود خوری پر چیں بجبیں ہوتا تھا شہروں کی حکومتیں بھی سود کے موافق نہ تھیں۔ بعد کو ملکی حکومتوں نے بھی سود خوری کے خلاف قوانین جاری کر دیئے تھے۔ سود خوری کے خلاف انگلستان میں جو بل پاس ہوا تھا اُس کے الفاظ یہ ہیں:۔

"سود خوری خدا کے حکم سے بالکل حرام قرار دی گئی ہے۔ خدا کے احکام اور مذہبی تعلیمات ایسے شخص کے دل میں، جو دولت کی ہوس سے خراب ہو چکا ہو، جڑ نہیں پکڑ سکتیں۔ ایسے شخص کے دل میں نیکی قبول کرنے کی صلاحیت باقی نہیں رہتی۔ اس لئے اس سلطنت کے لئے قانون بنایا جاتا ہے کہ اس ریاست کا کوئی شخص یا اشخاص جو کسی مرتبہ کے ہوں، ان کا کوئی منصب ہو اور وہ کسی صنعت اور حالت کے مالک ہوں، وہ کسی شعبدہ کسی ذریعہ کسی قاعدے سے کوئی رقم یا رقمیں کسی قسم کے سود پر نہیں دے سکتے اور نہ سود لے سکتے ہیں اور نہ سود لینے کی امید کر سکتے ہیں۔ کوئی اضافہ اُس رقم پر، جو انھوں نے قرض دی ہے نہیں لے سکتے۔ اگر وہ اس حکم کی خلاف ورزی کریں گے تو ان کی رقم یا رقمیں اور ان کا سود سب ضبط کر لیا جائے گا اور وہ قید کر لئے جائیں گے۔"

اس حکم سے اچھی طرح اندازہ ہو جاتا ہے کہ قرونِ وسطیٰ میں عوام کی بڑی تعداد کا خیال سود خوری کے متعلق کیا تھا۔ وہ سود کی برائی کے قائل تھے لیکن آخر وہ سود کے مخالف کیوں تھے؟ وہ کیا وجوہ تھے جن کی بنا پر سود خوری کے خلاف رائے قائم کی گئی تھی ہم کو اس سوال کے جواب کے لئے جاگیرداری نظام کے تانے بانے پر اچھی طرح سے نگاہ ڈالنی چاہیے۔

جاگیرداری زمانے میں تجارت بہت چھوٹے پیمانے پر ہوتی تھی۔ اُس زمانے میں نفع کی نیت سے کہیں روپیہ لگانا ممکن نہ تھا۔ اگر کوئی شخص قرض چاہتا تو کبھی یہ خیال نہ ہوتا کہ وہ اپنی دولت بڑھانے کے لئے قرض لے رہا ہے۔ اُس کو صرف زندگی کی ضرورتیں پوری کرنے کے لئے قرض کی حاجت ہوتی تھی۔ وہ صرف اُسی وقت، جب اُس کو کوئی ناگہانی آفت مجبور کردیتی تھی، قرض لیتا تھا۔ اُس کی گائے مرجاتی، یا کثرت باراں سے فصل تباہ ہوجاتی اور وہ ان حالات سے کچھ ایسا مجبور ہوجاتا کہ دوسروں سے مدد مانگے بغیر کام نہ چلا سکتا تو قرض کے لئے ہاتھ پھیلاتا تھا۔ قرونِ وسطیٰ میں یہ ایک عام خیال تھا کہ ان حالات میں، جب انسان مصیبتوں میں گرفتار ہوجائے، اُس کی مدد کرنی چاہئے اور اُس کی مجبوری سے فائدہ اُٹھاکر اپنے نفع کی فکر نہ کرنی چاہئے۔ نیک عیسائی نفع کا خیال کئے بغیر اپنے پڑوسی کی مدد کرتا تھا۔ اگر اس زمانے میں کوئی شخص کسی کو ایک بورا آٹا قرض دیتا تھا تو اُسی قدر آٹے کی واپسی کی امید کرتا تھا۔ اس کے سوا اُس کو کسی قسم کے نفع کی توقع نہ ہوتی تھی۔ اگر کوئی ایک بورے آٹے سے زیادہ وصول کرتا تو سمجھا جاتا اُس نے اپنے پڑوسی کو دھوکا دیا۔ جو کسی صورت سے مناسب نہ تھا۔ بس اتنا ہی کافی تھا کہ جتنا دیا گیا تھا اتنا واپس مل جاتا۔ نہ اصل وزن میں کچھ کمی ہوتی اور نہ اس میں کوئی اضافہ ہوتا

کلیسا کا خیال تھا کہ انسان کی عملی زندگی کے نیک اور بد دو پہلو ہوتے ہیں۔ انسان کے مذہبی اعمال بھی قدرتی طور پر اچھے بُرے پہلوؤں سے خالی نہیں لیکن کلیسا نے ان پہلوؤں کی تعین کے لئے اپنے علیحدہ اصول نہیں بنائے تھے بلکہ سماجی زندگی کی اچھائی بُرائی کے معیار اور معاشی زندگی کے نیک و بد پہلو جانچنے کے جو پیمانے عام طور سے تسلیم کئے جاتے تھے کلیسا نے بھی انھیں کو اپنا لیا تھا۔

آج کل ایک تاجر کسی اجنبی کے ساتھ تجارتی معاملات میں کچھ ایسی باتیں کرسکتا ہے جو وہ اپنے دوست اور ہمسائے کے ساتھ روا نہیں رکھ سکتا۔ ہم نے تجارت اور زندگی کے دوسرے معاملات کے لئے علیحدہ علیحدہ دو معیار بنا رکھے ہیں۔ ایک کارخانہ دار اپنے حریف

کارخانہ دار کو پچھاڑنے کے لئے جو کچھ اُس کے امکان میں ہو سب کچھ کر سکتا ہے۔ وہ چیزیں کم قیمت پر فروخت کرے گا۔ تجارتی جنگ شروع کرے گا۔ اپنے کاروبار کے لئے خصوصی رعایتیں چاہے گا اور ہر طرح کوشش کرے گا کہ اپنے رقیب کو ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دے۔

اُس کی یہ حرکتیں دوسرے کارخانہ دار کی تباہی کا سبب بن سکتی ہے۔ وہ ان نتائج سے بے خبر نہیں ہے لیکن "کاروبار کاروبار ہے"۔ اس لئے وہ اپنی جارحانہ حرکات سے باز نہیں آئے گا۔ وہ اپنے رقیب کی مکمل تباہی سے بالکل دل گرفتہ نہ ہو گا۔ لیکن یہی شخص اپنی گھریلو زندگی میں اپنے پڑوسی یا دوست کی ایک وقت کے ناقے کی مصیبت بھی دیکھ نہ سکے گا۔ اس نے اپنی کاروباری زندگی کے لئے کچھ اور اصول بنائے ہیں اور غیر کاروباری زندگی میں کچھ اور اصولوں پر کاربند ہے۔ قرونِ وسطیٰ میں اہل کلیسا کے نزدیک زندگی کے یہ دوہرے اصول جو آپس میں ایک دوسرے سے متضاد ہوں درست نہ تھے۔ چرچ کی تعلیمات دراصل وہی تھیں جو اُس زمانے کی اکثریت سوچتی اور یقین کرتی تھی۔

اہل کلیسا کا خیال تھا کہ جو عمل انسان کی جیب بھرنے کے لئے موزوں تھا وہی اُس کی روحانی صحت کے لئے مضر تھا۔ روحانی تندرستی اور ارتقا کلیسا کے نزدیک انسان کا اولین فرض تھا۔ اگر کوئی شخص اپنی روحانی کیفیتوں کے لحاظ سے پسماندہ ہوتا اور مادی دولتوں کے لحاظ سے پوری دنیا کا مالک بن جاتا تو کلیسا کے نزدیک اُس کی یہ مادی ترقی اُس نقصان کا کوئی بدل نہ ہو سکتی جو روح کے معاملہ میں وہ اُٹھا چکا تھا۔ اگر کوئی شخص کاروبار میں اُس رقم سے زیادہ حاصل کرتا جو اُس نے لگائی تھی تو یہی زیادتی دراصل دوسرے شخص کے حق میں کمی ہوتی۔ کاروبار کا یہی پہلو کلیسا کے نزدیک درست نہ تھا۔ قرونِ وسطیٰ کے ایک بڑے مذہبی مفکر سینٹ تھامس اکوناس (ST. THOMAS AQUINAS) نے "نفع کی ہوس" کی سخت مذمت کی ہے۔ کلیسا تجارت کا بالکل مخالف نہ تھا۔ بے دلی سے سہی لیکن وہ اُس کے افادے کا قائل تھا۔ وہ تاجروں کو صرف بقدرِ محنت نفع لینے کی اجازت دیتا تھا۔ قرونِ وسطیٰ

میں ارباب کلیسا اُس "درمیانی آدمی" (MIDDLE MAN) کو جو چند صدیوں کے بعد عام ہو گیا کبھی پسند نہ کرتے۔ ڈزرائیلی (DISRAELI) اس درمیانی آدمی (MIDDLE MAN) کی صفت بیان کرتا ہے :-

"یہ وہ آدمی ہے جو ایک جماعت کو جھانسا دیتا ہے اور دوسری کو لوٹتا ہے۔"

اس زمانے کا یہ خیال کہ ہر تجارتی معاملت اُس منزل تک جہاں تک ہم نباہ سکیں جائز ہے، قرونِ وسطیٰ میں قابلِ تسلیم نہ سمجھا جاتا۔ آج کل وہ تاجر سب سے زیادہ کامیاب سمجھا جاتا ہے جو کم سے کم لاگت لگا کر مال خریدے اور زیادہ سے زیادہ قیمت بڑھا کر اُسے فروخت کرے۔ قرونِ وسطیٰ میں خرید و فروخت کے اس قسم کے اصول نفرت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ وہ تاجر کو اس خدمت کے بدلے میں، جو وہ سماج کے لئے انجام دیتا تھا "مناسب معاوضہ" کا حق دیتے تھے لیکن اس "مناسب معاوضہ" کی ایک حد تھی۔ اس حد سے بڑھنا ان کے نزدیک ہرگز جائز نہ تھا۔

قرونِ وسطیٰ میں دولت کے انبار جمع کرنا اخلاقی نقطۂ نظر سے درست نہیں سمجھا جاتا تھا۔ صرف اتنا روپیہ جو زندگی کی ضروریات کے لئے کفالت کر سکے کافی سمجھا جاتا تھا۔ بائبل میں اس کے بارے میں کھلے ہوئے احکام موجود ہیں۔

"یہ ممکن ہے کہ ایک اونٹ سوئی کے ناکے سے گذر جائے لیکن یہ ہرگز ممکن نہیں کہ ایک دولتمند خدا کی بادشاہت میں حصہ پا سکے۔"

قرونِ وسطیٰ کے ایک اہلِ قلم نے لکھا ہے :-

"جس شخص کے پاس اپنی ضروریات کی کفالت کے لئے روپیہ موجود ہو اور وہ پھر بھی دولت کی طلب میں مسلسل ہاتھ پیر مارتا رہے صرف اس لئے کہ اپنی دولت کے زور سے سماج میں زیادہ اونچا درجہ حاصل کرے یا آئندہ بغیر ہاتھ پیر ہلائے زندگی کی ضرورتیں آسانی سے پوری کرتا رہے یا اتنی دولت چھوڑ جائے کہ اس کے لڑکے ایک صاحبِ دولت اور صاحبِ عزت آدمی کی حیثیت سے رہ سکیں، وہ قابلِ نفرت حد تک حریص ہے نفس

پرستی اور غرور کا بندہ ہے۔"

وہ لوگ معاشیات کے قدرتی اصولوں کے قائل تھے۔ وہ اس بدلتی ہوئی دنیا میں بھی جہاں "معاشیات زر" کے تغیر پذیر اصولوں کی کارفرمائی شروع ہو چکی تھی، انھیں قدیم اور جامد اصولوں کو جاری رکھنا چاہتے تھے۔ ان کے نزدیک اگر کسی شخص کو سو پونڈ قرض دئے جاتے تو قرض دینے والے کو صرف سو ہی پونڈ واپس لینے کا اخلاقی حق تھا۔ سو پونڈ سے زیادہ جو رقم بھی نفع یا سود کے طور پر لی جاتی وہ اس وقت کی قیمت تصور کی جاتی جو ادائے زر اصل کی واپسی تک صرف ہوتا لیکن وقت خدا کی ملکیت تھا اور کسی انسان کو حق نہ تھا کہ وہ خدا کی ملکیت میں تصرف کرتا اور اسے بیچ ڈالتا۔

مذکورہ بالا دلیل کے علاوہ ایک دلیل اور بھی تھی۔ وہ کہتے تھے کہ کچھ روپیہ قرض دینا اور زر اصل کے علاوہ بھی کوئی مقررہ رقم سود کے طور پر وصول کرنا کاہلی کو دعوت دینا تھا۔ بغیر ہاتھ پیر ہلائے رزق تلاش کرنا اچھا نہ تھا (قرونِ وسطیٰ میں امراء (KNIGHTS) اور ارباب کلیسا بھی ان طبقوں میں سمجھے جاتے تھے جو ان جگہوں پر جن کے لئے وہ سب سے زیادہ موزوں تھے، کام کر رہے تھے) یہ کہنا کہ قرض دینے والے کا روپیہ اُس کے لئے کام کر رہا ہے۔ ارباب کلیسا کے نزدیک نہ صرف ناقابل قبول تھا بلکہ اس طرح کی دلیلیں ان کو بڑھانے کا موجب ہوتی تھیں اور فوراً جواب دیتے تھے کہ روپیہ عقیم ہے اور اُس سے کوئی چیز پیدا نہیں ہو سکتی اس لئے زر قرض پر سود لینا ہر حال میں ناجائز ہے۔

یہ تو اربابِ کلیسا کا قول تھا لیکن ان کا عمل ان کے قول سے بالکل مختلف تھا، ارباب کلیسا اور بادشاہوں نے سود کی مخالفت کی اور اُس کی روک تھام کے لئے قوانین بنائے لیکن یہی لوگ ان لوگوں میں، جنھوں نے ان قوانین کو توڑا، سب سے پیش پیش رہے۔ انھوں نے خود قرض دیا اور زر قرض پر سود لیا۔ اور یہ سب کچھ اُس وقت کیا جب یہ خود سود خوروں کی تلاش میں سرگرداں تھے، اور ہر طرح ان کو ڈھونڈھ نکالنے کی فکر میں تھے۔ یہودی جو عام طور سے سودی کاروبار

کرتے تھے سب سے زیادہ نفرت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ یہ چھوٹی رقمیں قرض دیتے تھے اور چونکہ ان کو روپیہ ڈوب جانے کا اندیشہ ہر وقت لگا رہتا تھا اس لئے وہ ان چھوٹی رقموں پر معمول سے کہیں زیادہ سود لیتے تھے۔ اطالوی بینکرس بڑے وسیع پیمانہ پر مہاجنی کرتے تھے۔ ان کی تجارت کا حلقہ بہت وسیع تھا۔ اگر کہیں ان کے سود کا روپیہ وصول نہ ہوتا تو پوپ خود قرضدار کو روحانی عذابوں کی دھمکیاں دے دے کر ان کے سود کا روپیہ وصول کراتا تھا۔ اگرچہ کلیسا خود ان پابندیوں میں سب سے بڑا پاپی تھا لیکن پھر بھی سود خوروں کے خلاف آواز بلند کرنے میں اس نے کوئی کمی نہیں کی تھی۔

یہ نظریہ کہ "سود لینا گناہ ہے" ان تاجروں کے لئے جو نئے انداز پر تجارت کر رہے تھے بڑی تکلیف کا موجب تھا۔ وہ پورے یورپ میں اپنا تجارتی کاروبار پھیلانا چاہتے تھے لیکن "سود کی ممانعت" ان کی راہ کا بڑا پتھر تھی۔ "روپیہ" اس وقت کے اقتصادی نظام میں اہمیت حاصل کر چکا تھا اور دن بدن تجارتی پھیلاؤ کے ساتھ ساتھ اس کی اہمیت بڑھتی جا رہی تھی اس لئے اس قسم کے نظریات جو روپیہ کی حدودِ عمل میں تنگی پیدا کریں، بڑی دشواری کے موجب سمجھے جانے لگے تھے۔

اُبھرتا ہوا متوسط طبقہ اپنا روپیہ تجوریوں میں نہیں رکھتا تھا۔ (یہ طریقہ تو جاگیرداری نظام کے ساتھ جب روپیہ لگانے کی کوئی جگہ نہ تھی مخصوص تھا) اس کو تو جتنا روپیہ ملتا وہ کاروبار میں لگا دیتا۔ وہ موجودہ حالت پر قناعت کرنے کے بجائے اپنا کاروبار زیادہ سے زیادہ وسیع کر کے زیادہ سے زیادہ نفع کمانا چاہتا تھا۔ اس لئے اس کو ہر وقت روپیہ کی ضرورت لگی رہتی تھی لیکن وہ روپیہ کہاں سے لاتا؟ وہ مہاجنی کرنے والے یہودیوں کے پاس جاتا۔ جیسے مرچنٹ آف وینس کا انٹونیو شائلاک یہودی کے پاس گیا تھا، وہ بعض ایسے تاجروں سے بھی روپیہ لیتا تھا جنھوں نے چیزوں کی خرید و فروخت چھوڑ کر روپیہ کے لین دین کو اپنا پیشہ بنا لیا تھا۔ یہی طبقہ اُس وقت کا سب سے بڑا مہاجن تھا لیکن قرض کا ملنا اتنا آسان نہ تھا

قرض دینے اور قرض لینے کی راہ میں کلیسا کے قوانین، جو سود لینے کی ممانعت کرتے تھے حائل تھے۔ کلیسا کے قوانین قدیم سماج کے اقتصادی نظام کے لئے موزوں تھے۔ اب متوسط طبقہ اُبھر رہا تھا اور تجارتی حلقے نئے رجحانات کے ساتھ آگے بڑھ رہے تھے۔ ان قدیم قوانین کی ٹکر ان نئے رجحانات سے ہوئی۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اس کشاکش میں قدیم نظریوں کی جیت ہوئی یا میدان ان رجحانات کے ہاتھ رہا جو ایک تاریخی طاقت کی حیثیت سے قدامت سے نبرد آزما ہو رہے تھے۔

قدیم نظریات نے ان نئے رجحانات سے شکست کھائی اور سودی کاروبار جو کبھی سرتاپا گناہ سمجھا جاتا تھا "بعض حالات" میں "بعض شرائط" کے ساتھ جائز سمجھا جانے لگا۔ لیکن یہ تغیر یکبارگی نہیں ہوا۔ رفتہ رفتہ اس قسم کے قوانین بننے لگے۔

"سودی لین دین گناہ ہے" لیکن "بعض حالات" میں درست ہے"۔

اسی سلسلے میں ایک دوسرے فتوے کے الفاظ بھی مطالعہ کے لائق ہیں :-

"سود کا روپیہ وصول کرنا گناہ ضرور ہے لیکن" خاص حالات" میں جائز ہے"

"خاص حالات" جنھوں نے "سود کے قوانین" میں ترمیم کرادی بہت بصیرت افروز ہیں۔ اگر بینکر ب تاجر ھ کو قرض دیتا تو کلیسا کے فتوے کے بموجب اس کو اس رقم پر کسی قسم کا سود نہ لینا چاہیے تھا لیکن اب کلیسا نے فتویٰ دیا کہ تاجر ھ اس روپیہ کو جو اس نے بینکر ب سے قرض لیا ہے ایک تجارتی مہم میں لگانے جا رہا ہے اور یہ اندیشہ ہے کہ یہ پورا روپیہ ضائع ہو جائے، اس لئے مناسب یہ ہے کہ تاجر ھ بینکر ب کو صرف زرِ اصل ہی واپس نہ کرے جو اس نے ب سے قرض لیا ہے بلکہ کچھ مزید روپیہ ب کو دے تاکہ اُس خطرہ کا کچھ معاوضہ ہو سکے جو ب نے ھ کو روپیہ دے کر برداشت کیا ہے۔

یہ بھی کہا جانے لگا کہ اگر بینکر ب، روپیہ کسی کو قرض نہ دیتا بلکہ خود کسی کاروبار میں لگاتا تو اُسے نفع ملتا۔ اس لئے یہ بالکل مناسب ہے کہ وہ تاجر ھ سے اُس روپیہ کے استعمال کے عوض میں جو

ب نے اُسے دیا ہے کچھ مزید رقم وصول کرے۔

اس طرح سودی لین دین کے متعلق قدیم نظریات مختلف طریقوں سے بدلتے ہوئے حالات سے مناسبت پیدا کرنے لگے، چارلس ڈومولن (CHARLES DUMOLIN) ایک فرانسیسی اہلِ قلم وکیل نے سولھویں صدی عیسوی میں تجارتی ضروریات کیلئے محدود پیمانہ پر سودی لین دین کے لئے قانون سازی کی سفارش کی تھی، وہ لکھتا ہے:-

روزمرہ کے تجارتی کاروبار میں ہم کو اچھی طرح محسوس ہوتا ہے کہ تجارت میں ایک معقول رقم کا استعمال اپنے اندر اچھا خاصا افادہ رکھتا ہے۔ یہ خیال کہ روپیہ کوئی پھولنے پھلنے والی چیز نہیں معقول نہیں ہے۔ اسی طرح زمین کے لئے بھی کہا جا سکتا ہے۔ آراضی کا کوئی ٹکڑا، جب تک آدمی اُس پر اپنی محنت اور روپیہ صرف نہ کرے، کچھ پیدا نہیں کر سکتا، اسی طرح روپیہ بھی ایک عرصہ تک کسی کام میں لگے رہنے کے بعد، آدمی کی محنت اور صناعی کی بدولت خاصی پیداوار کا موجب ہوتا ہے، اور کبھی کبھی قرضدار کو اس زرِقرض سے جو منافع ملتے ہیں اُس سے روپیہ کا اصل مالک بالکل محروم رہ جاتا ہے، اس لئے سودی لین دین کی عام مخالفت، اس سے نفرت اور اس کے سلسلے میں سزاؤں کے قوانین شاید صرف اُس سودی لین دین کے لئے خاص ہیں جو اپنی حد سے اتنا بڑھ جائے کہ اس میں کوئی معقولیت باقی نہ رہے لیکن محدود سودی لین دین اور معقول شرح سود پر جو قابلِ قبول ہو ان کا اطلاق نہیں ہوتا۔

اس طرح رفتہ رفتہ اربابِ کلیسا کے نظریات جو اُنھوں نے سودی لین دین کے بارے میں قائم کر رکھے تھے ختم ہونے لگے اور روزمرہ کا تجارتی تعامل راہ پانے لگا۔ عقائد، قوانین طرزِ معاشرت اور ذاتی تعلقات پر ان بدلے ہوئے حالات کا اثر پڑنے لگا اور سماج نے زمانے کی اس نئی منزل پر پہونچ کر اپنا رنگ روپ بالکل بدل دیا۔

کسان قدیم بندھن توڑتا ہے

قرون وسطیٰ میں جاگیردارانہ سماج ایک جامد نظام کا پابند تھا۔ سرف اور ان کے آقا دونوں کچھ مقررہ رسموں پر چلتے تھے۔ اس لئے جب تک یہ بندھن نہ ٹوٹتے، ان کی زندگی میں کسی تغیر کی کوئی امید نہ تھی، اُس وقت کا اقتصادی جال کچھ ایسے آہنی تاروں سے بنایا گیا تھا کہ سرفوں کے لئے اُس سے نکل بھاگنا ممکن نہ تھا لیکن تجارت کی ترقی اور روپیہ کے رواج نے زمانے کی کایا پلٹ دی۔ شہر اُبھرے، آزادی کی راہیں کھلیں اس انقلاب کا جو اس وقت ہر طرف برپا تھا سب سے زیادہ اثر کسانوں کی حیثیت پر پڑا، انھوں نے وہ قدیم بندھن جو اب تک ان کو جکڑے ہوئے تھے توڑنے شروع کر دئے۔

شہروں نے تجارتی مرکزوں کی حیثیت اختیار کرلی، شہروں میں بسنے والے اپنے وقت کا بڑا حصہ تجارت اور صنعتی کاروبار پر صرف کرنے لگے لیکن شہر غذائی نقطۂ نظر سے خود کفیل نہ تھے، اس ضرورت کے لئے وہ دیہاتوں کے محتاج تھے۔ اس لئے قدرتی طور پر شہروں اور دیہاتوں میں کاموں کی تقسیم ہوگئی۔ شہروں نے تجارتی اور صنعتی پیداوار کا فرض سنبھالا اور دیہات زرعی پیدائش کی افزائش کی طرف، جس کی ضرورت میں دن بدن اضافہ ہو رہا تھا پوری طرح متوجہ ہوگئے۔ شہری آبادی میں غیر معمولی اضافے کی وجہ سے بازاروں میں اُس مال کی طلب جو شہروں میں نہیں پیدا ہوتا تھا، بے انتہا بڑھ گئی۔ تاریخ کے مختلف دوروں میں ہم نے مشاہدہ کیا ہے کہ بازار کی وسعت اور اشیاء کی بڑھی ہوئی طلب پیداوار کے عمل کو بھی بہت بڑھا دیتی ہے لیکن آخر زرعی پیداوار کے اضافے کے لئے کیا شکلیں اختیار کی جا سکتی تھیں۔

زرعی پیداوار میں اضافے کے لئے صرف دو شکلیں اختیار کی جا سکتی تھیں :۔

۱۔ پیداوار کے ذرائع کو ترقی دی جاتی۔

۲۔ پیداوار کے رقبوں میں اضافہ کیا جاتا۔

پیداوار کے ذریعوں کو ترقی دے کر پرانے رقبوں سے بھی پہلے کے مقابلے میں زیادہ پیداوار حاصل کی جا سکتی تھی۔ اچھی کھاد، جتائی کے ترقی یافتہ طریقوں کا استعمال اور فنی اصولوں کے مطابق محنت، عام طور سے پیداوار میں اضافے کا موجب ہو سکتی تھی۔ پیداوار کے ذرائع میں ترقی کے علاوہ کاشت کے رقبے میں اضافہ کر کے بھی زیادہ پیداوار حاصل کی جا سکتی تھی۔ وہ رقبے جو اُس وقت تک زیر کاشت نہیں آئے تھے، جوتے اور بوئے جا سکتے تھے، اُس زمانے میں پیداوار کی بڑھتی ہوئی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے یہ دونوں طریقے استعمال کیے گئے۔

امریکہ میں محنت کشوں کے ہراول دستوں نے اپنی حالت سدھارنے کے لئے پچھم کی ان نئی زمینوں کی طرف، جو ابھی تک نہیں جوتی گئی تھیں، نظریں اُٹھائی تھیں۔ بارھویں صدی عیسوی میں بھی مغربی یورپ کے کسانوں نے اپنا بوجھ ہلکا کرنے کے لئے، ایسی نئی زمینوں کی تلاش شروع کی تھی جو ابھی تک کاشت میں نہیں آئی تھیں۔ ایک جرمن اہلِ قلم نے بارھویں صدی عیسوی کے آخر میں لکھا تھا :۔

"غریب اور کسان دولت مندوں اور زبردستوں کی حریصانہ لوٹ کھسوٹ کا شکار ہو رہے ہیں۔ وہ نامنصفانہ فیصلوں سے تنگ آ کر اپنے باپ دادا کی املاک کو بیچ کر دور دراز علاقوں کو بھاگے جا رہے ہیں۔"

امریکہ کے حوصلہ مند محنت کشوں نے تو اپنی آبادی کے لئے پورے براعظم کے دروازے کھلے ہوئے پائے لیکن بارھویں صدی میں رزق کی تلاش یورپین ممالک کے ان غریبوں کو کہاں لے گئی؟ اُس زمانے میں مملکت فرانس کی آدھی زمین، جرمنی کا تہائی علاقہ اور انگلستان کا صرف پانچواں حصہ زیر کاشت تھا۔ ان ممالک کی باقی زمینوں پر بڑے بڑے جنگل کھڑے تھے بعض مقامات

پر دلدل تھے اور کہیں کہیں بڑے بڑے میدان بے کار پڑے ہوئے تھے، تھوڑی سی مزروعہ زمین کو غیر مزروعہ علاقے جو آبادکاری کے لئے بہت موزوں تھے، گھیرے ہوئے تھے۔ بارھویں صدی عیسوی کے یورپین ممالک بھی ویسی ہی قابلِ تسخیر سرحدیں رکھتے تھے جیسی سترھویں صدی عیسوی کے محنت کشوں کے سامنے آئی تھیں۔

وہ قدیم بندھنوں کو توڑ کر آزادی کے لامحدود امکانات کی سراغ رسانی میں مصروف ہوگئے۔ وہ غلامی کی تنگ حدود سے باہر نکل آئے تھے۔ اب وہ ایسی زمین کی تلاش میں تھے جو خود ان کی ملکیت ہو۔ ان حوصلہ مند کسانوں نے ان جنگلوں، افتادہ ٹکڑوں اور دلدلوں کو کارآمد بنانے میں اپنے مردانہ بازوؤں کے جوہر دکھائے۔ انھوں نے گھنی جھاڑیوں اور خودرو بیلوں کو جلا دیا۔ بڑے بڑے جنگلوں کو اپنی کلہاڑیوں سے کاٹا اور اپنی کدالوں سے ان کی جڑیں اکھاڑ کر زمینیں ہموار کرلیں۔ اس طرح یورپ میں مجہول کی طرف ان محنت کشوں کے قافلوں نے قدم بڑھائے امریکہ میں اس طرح کی تحریک ان کے پانچ سو سال کے بعد شروع ہوئی جب امریکہ کے نوآبادکاروں نے سترھویں صدی عیسوی سے لے کر انیسویں صدی عیسوی تک امریکہ کے جنگلوں میں اپنی کلہاڑیوں سے جنگلوں کے درخت کاٹے تو ان کو پانچ صدیوں کے بعد انھیں کلہاڑیوں کی صدائے بازگشت سنائی پڑی جو ان کے بزرگوں نے مغربی یورپ کے جنگلوں میں اسی قسم کے حالات میں ان زمینوں کے صاف کرتے وقت چلائی تھیں جس طرح امریکہ کے ان مہم جو ہراول دستوں نے بنجر زمینوں کو لہلہاتی ہوئی کھیتیوں سے بدل دیا تھا، اسی طرح ان سے پہلے یورپ کے ان حوصلہ مند محنت کشوں نے دلدلوں کو پاٹا اور بند باندھ باندھ کر سمندر کی باڑھ کے خلاف مضبوط مورچہ قائم کیا، جنگلوں کو صاف کیا، اور بیکار پڑی ہوئی زمینوں کو اپنے پسینے کے فیض سے نہال کرکے زرخیز کھیتوں سے تبدیل کر دیا تھا۔ بارھویں صدی عیسوی کے ان حوصلہ مندوں کا کام بھی آسان نہ تھا۔ ان کو بھی سترھویں صدی عیسوی کے امریکی مہم جو محنت کشوں کی طرح ایک عرصے تک سختیاں جھیلنی پڑی تھیں اور حوصلہ شکن حالات کا اپنے مردانہ عزم سے مقابلہ کرنا پڑا تھا لیکن

اس پوری آزمائش میں یہ خیال اُن کی حوصلہ افزائی کرتا رہا تھا کہ اگر وہ اس امتحان میں پورے اترے تو آزادی کی دیوی ان کے قدم چومے گی اور وہ غلامی کی تنگ گھاٹیوں سے نکل کر آزادی کے وسیع میدانوں میں سانس لے سکیں گے۔ زمین جسے وہ توڑ کر کاشت کے قابل بنائیں گے ان کی ملکیت ہوگی یا کم سے کم اس کا کوئی حصّہ بلا شرکت غیر ان کے تصرف میں آئے گا اور اُن کی یہ زمین اُس تکلیف دہ بیگار کی قید سے آزاد ہوگی جو ساری زندگی ان کے گلے کا طوق بنی رہی تھی۔ کوئی شبہ نہیں کسانوں کی اچھی خاصی تعداد نے اس موقع سے فائدہ اُٹھایا۔ اُنھوں نے بہت عاجزی سے ان افتادہ زمینوں کے لئے دست سوال دراز کیا۔ ہیمبرگ کا بشپ ۱۱۰۶ء کے ایک چارٹر کے ذریعہ سے ہمیں مطلع کرتا ہے کہ :-

۱۔ "ہم چاہتے ہیں کہ اطلاع عام کے لئے اس معاہدے کو جو ان کے اس طرف کے بعض باشندوں نے جو ہالستانی کہلاتے ہیں، ہم سے کیا ہے مشتہر کردیں۔"

۲۔ "یہ لوگ ہمارے پاس آئے اور اُنھوں نے ہم سے بہت عاجزی سے التجا کی کہ ہم ان کو اپنے کلیسائی علاقے سے کچھ خاص زمینیں، جو غیر مزروعہ، دلدلی اور ہماری رعایا کیلئے ناقابل استعمال ہیں، عطا کریں۔ ہم نے اپنی رعایا سے اس مسئلہ میں مشورہ لیا اور یہ یقین کرکے کہ یہ معاہدہ ہمارے اور ہمارے جانشینوں کے لئے نفع بخش ہوگا، ہم نے ان کی درخواست منظور کرلی۔"

۳۔ "ہمارے درمیان یہ طے ہوا ہے کہ یہ ہم کو ہر ایک سو بیس ایکڑ زمین کے لئے ایک دینار (روحی) سالانہ ادا کرتے رہیں گے۔ ہم ان کو وہ چشمہ بھی جو اس زمین سے ہوکر گزرتا ہے عطا کرتے ہیں۔"

۴۔ "وہ تسلیم کرتے ہیں کہ وہ ہمارے فیصلے کے بموجب ہم کو عشر یعنی گیہوں کا ہر گیارھواں گٹھا ہر دسویں بھیڑ، ہر دسواں سور، ہر دسویں بکری، ہر دسویں بطخ، شہد اور کتان کا دسواں حصہ، دیتے رہیں گے۔"

۵۔ یہ وعدہ کرتے ہیں کہ تمام کلیسائی امور میں ہمارے فرماں بردار رہیں گے۔"

۶۔ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ وہ ہر سو ہائڈ[۱] زمین کے لئے ہم کو دو مارک سالانہ ادا کرتے رہیں گے اور اس کے عوض میں دنیوی امور کے فیصلوں کے لئے اپنی عدالتیں قائم کرنے کے مجاز ہوں گے ...."

ہمبرگ کے بشپ نے ہالستانیوں سے یہ معاہدہ صرف یہ سمجھ کر کر لیا تھا کہ " یہ ہمارے اور ہمارے جانشینوں کے لئے نفع بخش ہوگا" دوسرے کلیسائی اور دنیوی حلقوں کے مالکان زمین نے بھی یہ محسوس کر لیا تھا کہ اگر ان کی بیکار زمینیں، ان محنت کشوں کے ذریعے کارآمد بن جائیں تو یہ بہت نفع بخش ہو جائیں گی اور یہی محنت کش ان کو ان زمینوں کا محصول بھی ادا کریں گے۔ ان مالکوں میں سے بہت سے منچلے اور عاقبت اندیش مالکوں نے اس کا راستہ نہیں دیکھا کہ یہ مہم جو آئیں اور ان سے ان زمینوں کے لئے " عاجزی سے بھیک مانگیں"۔ انھوں نے خود اعلان کیا اور چاروں طرف اشتہار دیا کہ وہ اپنی زمینیں ان لوگوں کو محصول پر دیں گے جو ان کو صاف کر کے قابلِ کاشت بنا لیں گے۔ بعض حوصلہ مند مالکانِ زمین نے اپنی اس طرح کی زمین کو، جو اب تک بیکار سمجھی جاتی تھی، لگان پر اٹھا کر بہت نفع کمایا۔ ان میں سے بعض لوگوں نے ان زمینوں پر جن کو اب تک کسی نوآبادکار کے ہاتھوں نے چھوا بھی نہ تھا گاؤں بسا بسا کر اچھا خاصا نفع کما لیا۔ نوآبادکاری کی اس مہم نے ایسی ہزاروں ایکڑ زمین، جو ابھی تک کسی کام نہ آئی تھی، کارآمد بنا دی اور وہ کاشتکاری کے کام آنے لگی۔ ۱۳۵۰ء تک سلیشیا میں پندرہ سو بستیاں بسیں۔ ان بستیوں میں ڈیڑھ دو لاکھ نوآبادکار فارم کرتے تھے۔ یہ غیر معمولی توسیع بہت اہم تھی۔ یہ حقیقت بھی کچھ کم اہم نہ تھی کہ اب سرفوں کو ایسی زمینیں مل سکتی تھیں جو آزاد تھیں اور جن کے ساتھ بیگار کے نذرانے کی قید نہ تھی۔ بلکہ سالانہ محصول ادا کر کے ان پر کاشت کی جا سکتی تھی۔ آزادی کی یہ نئی لہر اپنی نوعیت میں بالکل نئی تھی اس کا

---

[۱] ہائڈ = ایک سو بیس ایکڑ زمین جو ایک خاندان کی گذر بسر کے لئے کافی ہو۔

پھیلنا اور یہیں گرہ پرانے جاگیرداری نظام کے سرفوں تک جا پہونچنا بالکل یقینی تھا۔ یہ لہر سرفوں تک پہنچی اور اس نے ان کو متاثر بھی کیا۔

برسہا برس سے کاشتکار اپنی بدقسمت زندگی پر قناعت کرتا چلا آرہا تھا۔ وہ ایسے نظام میں پیدا ہوا تھا جس میں سماج کی طبقہ وار تقسیم بہت واضح تھی۔ اس کو یہی سکھایا گیا تھا کہ وہ آسمان کی بادشاہت میں اسی وقت داخل ہو سکے گا جب وہ سماج کی، جو پروہتوں، جنگ آزماؤں اور محنت کشوں پر مشتمل تھا۔ پوری خدمات بلا حیل و حجت انجام دے سکے، وہ اپنا یہ خدمتی فریضہ حرف شکایت زبان پر لائے بغیر انجام دیتا رہا تھا۔ اُس کے لئے اپنی جگہ سے ابھر کر آگے بڑھنا ممکن نہ تھا۔ اس کی ترقی کے راستے ہمیشہ بند رہے تھے اس لئے اس کے دل میں کبھی کوئی آرزو پیدا ہی نہ ہوتی تھی۔ وہ صرف اتنا کام کر کے بیٹھ رہتا تھا جو اُس کی زندگی باقی رکھنے کے لئے کافی ہو۔ وہ دستور کے مطابق اپنے فرائض انجام دیتا رہتا تھا، اس کو کوئی ضرورت نہ تھی کہ وہ بیجوں کے متعلق کوئی نیا تجربہ کرتا یا زیادہ فصل پیدا کرنے کی تدبیریں سوچتا۔ اس وقت کا بازار بہت محدود تھا اس لئے وہ اپنی پیداوار بیچنے کہاں جاتا اور اگر وہ کچھ پیدا بھی کرتا تو پیداوار کا سب سے بڑا حصہ بٹانے کے لئے زمین کا مالک اُس کے سر پر سوار ہو جاتا تھا۔

لیکن اب صورتِ حال بالکل بدل گئی تھی۔ اب بازار نے وسعت اختیار کر لی تھی۔ اب اپنی ضرورت اور مالک کے حق سے زیادہ جو بھی پیدا کیا جاتا وہ بازار میں بک سکتا تھا۔ اور اس کے بدلے میں کاشتکار کو روپیہ مل سکتا تھا۔ وہ ابھی تک روپیہ کے استعمال کا عادی نہ تھا لیکن رفتہ رفتہ اس کے استعمال سے آگاہ ہونے کے بعد وہ سمجھنے لگا تھا کہ تاجروں کا ایک طبقہ وجود میں آگیا ہے جو پرانے زمانے کے نظام میں پوری طرح کھپتا ہوا نظر نہیں آتا تھا۔ لیکن وہ پھل پھول رہا تھا۔ اس طبقے کے شہر، جو اس کے آس پاس بسے ہوئے تھے، حیرت انگیز مقام تھے، وہاں اس کو کبھی کبھی اپنے جیسے سرف چلتے پھرتے نظر بھی آتے تھے۔ اس بدلی ہوئی

دنیا میں اب اُس کے جیسے لوگوں کے لئے بھی اُبھرنے کے مواقع پیدا ہو رہے تھے۔ اب اگر وہ پہلے سے زیادہ محنت کرتا۔ اور اپنی ضرورت سے زیادہ فصل پیدا کرتا تو وہ اس قابل ہو سکتا تھا کہ زیادہ غلہ بیچ کر کچھ رقم پس انداز کر لیتا اور اپنے مالک کو اپنی غلامی کی کچھ قیمت ادا کر کے اپنی محنت کے کچھ حصے آزاد کرا لیتا۔ اگر اُس کا مالک اُس کا کچھ بوجھ ہلکا نہ کرتا تو اب شہروں کے راستے کھلے ہوئے تھے وہ بھاگ کر وہاں جا سکتا تھا۔ اب اُس کی نگاہ میں کچھ ایسے غیر مزروعہ علاقے بھی تھے جہاں اُس کے جیسے سرف جنگل کاٹ کاٹ کر زمینیں صاف کر رہے تھے اور اپنی محنت کے معاوضے میں زمین کے ایسے ٹکڑے پا رہے تھے جو ہر طرح کے تکلیف دہ مطالبات سے آزاد تھے۔

اب زمین کے مالک بھی تیار ہو رہے تھے کہ اپنے سرفوں سے ان کی محنت کا معاوضہ لے کر ان کو آزاد کر دیں۔ یہ مالک بھی روپے کے استعمال سے آگاہ ہو چکے تھے۔ وہ اب جان گئے تھے کہ اس بدلتی ہوئی دنیا میں روپئے سے بہت کچھ کیا جا سکتا تھا۔ ان کو مشرق کے ان خوبصورت کپڑوں کے لئے جو انھوں نے پچھلے میلے میں چند مہینے پہلے خریدے تھے، روپیہ ادا کرنا تھا، ان کو اس خوبصورت زرہ کا بل بھی ادا کرنا تھا جو انھوں نے پچھلی جنگی مہم کے موقع پر خریدی تھی۔ مالک کو اُس روپئے کی جو سرف اپنا پیٹ کاٹ کاٹ کر جمع کرتا تھا، ہزاروں چیزوں کے لئے ضرورت تھی اس لئے وہ خوشی سے تیار تھا کہ اُس کا سرف جان جون اُس کو ہر ایکڑ کے لئے ہفتے میں دو تین دن کام کرنے کے بجائے چار پنس سالانہ ادا کیا کرے۔ مالک کے لئے اب کوئی دوسرا چارہ کار نہ تھا۔ اگر وہ اب اپنے سرفوں کا بوجھ ہلکا نہیں کرتا تھا تو اُس کا پورا اندیشہ تھا کہ ان میں سے بعض بھاگ جاتے اور نہ اُس کے پاس کوئی کام کرنے والا رہتا اور نہ روپیہ دینے والا۔ اور وہ بیٹھے بٹھائے بڑی مشکل میں پڑ جاتا۔ اس لئے اب مصلحت یہی تھی کہ پرانے طریقہ کی جگہ پر اب سرف سے محنت کے بجائے سالانہ محصول پر مصالحت کر لی جاتی۔

مالکان زمین پر یہ حقیقت بھی اچھی طرح روشن ہو گئی تھی کہ آزاد مزدور غلام مزدور کے مقابلے میں زیادہ پیدا کر سکتے تھے۔ اُن کو اچھی طرح معلوم ہو گیا تھا کہ جو مزدور اپنی زمین

سے ہٹا کر مالک کی زمین پر بیگار کرنے کے لئے بلایا جاتا ہے وہ جی لگا کر کام نہیں کرتا اور جتنا کام اُس سے ہو سکتا ہے اُس سے بھی گریز کرتا ہے۔ اس لئے یہ کہیں بہتر تھا کہ ان پرانے طریقوں سے نجات حاصل کی جاتی اور بیگار کے دستور کے بجائے مزدوروں کو اجرت دے کر کام پر لگایا جاتا۔

یہی وجہ ہے کہ ہم کو تیرھویں اور چودھویں صدی عیسوی میں مغربی یورپ کے بہت سے دیہاتوں کے ریکارڈوں میں اس طرح کے اندراجات بکثرت ملتے ہیں۔ یہ اندراج اسٹونج کے ریکارڈ سے لیا گیا ہے:۔

"مالک نے یہ منظور کر لیا ہے کہ ایس۔ جی، تمام خدمتوں اور رسموں کی بجا آوری کے بجائے مذکورہ بالا زمین پر تیرہ سالڈی اور چار دینار محصول کے عوض میں قابض رہے گا۔"

اسی زمانے کے دوسرے ریکارڈوں کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ بہت سے سرفوں نے زمینوں کی آزادی کے ساتھ ساتھ اپنی ذاتی آزادی بھی خریدی تھی، ہم نیچے ولسٹن کی ایک یادداشت کا اقتباس پیش کرتے ہیں۔ یہ ریکارڈ ایک ولیم سرف کے متعلق ہے۔

۔اس ولیم نے:۔

"آزاد ہونے کے لئے تاکہ وہ یہ مملکت چھوڑ سکے اور آزادوں میں اُس کا شمار کیا جا سکے دس سالڈی ادا کئے۔"

لیکن ان تحریروں سے یہ غلط فہمی نہ ہونی چاہئے کہ تمام مالکوں کی سمجھ میں یہ بات آگئی تھی کہ اب سرفوں کو آزاد کرنے کا وقت آگیا تھا۔ نہ تمام مالکوں کی سمجھ میں وقت کی یہ مصلحت آئی تھی اور نہ تمام مالک یہی محسوس کر سکے تھے کہ اس بدلے ہوئے زمانے میں اب ان بڑھتے ہوئے شہروں کو جاگیردارانہ طرز سے دبانے اور دبا دبا کر لوٹنے کھسوٹنے کا وقت نہیں رہا تھا۔ دنیا کی تاریخ کے ہر دور میں ایسے لوگوں کی کثرت رہی ہے جو نہ یہ سمجھتے ہیں اور نہ سمجھ سکتے ہیں کہ جو آج ہے وہ کل نہ ہوگا۔ بعض لوگ تو ضروری تغیرات کے وقت اپنے ماضی

سے بہت بُری طرح چمٹ جاتے ہیں۔ اب بھی ایسے مالکوں کی کمی نہ تھی جو اپنے سرفوں کو کسی طرح آزاد کرنے کے لئے تیار نہ تھے۔

تم خیال کرتے ہوگے کہ کلیسا نے سرفوں کی آزادی کی تحریک کی علمبرداری کی ہوگی! نہیں، صورت حال یہ نہ تھی شہروں اور دیہاتوں میں ہر جگہ اس تحریک آزادی کی مخالفت میں اربابِ کلیسا عام مالکانِ زمین سے کہیں آگے بڑھ گئے تھے۔ اُس وقت بھی اربابِ کلیسا سرفوں کی آزادی کے سخت دشمن تھے جب ان مالکوں کی بڑی اکثریت نے یہ محسوس کرلیا تھا کہ خود ان کی مالی منفعت کا تقاضا یہی ہے کہ وہ سرفوں کو تو آزاد کردیں اور مزدوروں کو اُجرت دے کر کام پر لگائیں۔ کلونیک (CLUNIAC) کی کتاب القوانین کا جو ایک مذہبی یادداشت ہے، ایک اقتباس ذیل میں دیا جاتا ہے اس سے اندازہ ہوگا کہ اربابِ کلیسا اس تحریکِ آزادی کی مخالفت میں کتنے پیش پیش تھے۔

"ہم کلیسا کے حلقے سے ان لوگوں کو خارج کرتے ہیں جو سرفوں، غلام مردوں، غلام عورتوں یا ایسی غلام عورتوں کو جو کلیسائی حلقے سے متعلق ہیں، آزاد کرتے ہیں۔"

مذکورہ بالا فرمان ۱۳۳۰ء میں نافذ کیا گیا تھا۔ ایک سو اٹھائیس سال کے بعد بھی ۱۴۵۸ء میں کلونیک نے فرمان نافذ کیا کہ :۔

"تمام صدر راہب، نائب صدر راہب، گرجوں کے افسرانِ اعلیٰ اور دوسرے انتظامی شعبوں کے عہدہ دار، جو سرف اور غلام رکھتے ہوں، صاف صاف قسم کھائیں کہ وہ ان سرفوں کو جو ان کے قبضے میں ہوں ہرگز آزاد نہ کریں گے۔"

دو مشہور انگریزی مورخین ان دستاویزوں کے مطالعے کے بعد اس نتیجے پر پہنچے ہیں

"...... اس امر کی بے شمار شہادتیں موجود ہیں کہ تمام مالکوں میں اربابِ کلیسا سب سے زیادہ سخت گیر تھے۔ وہ صرف مستبد ہی نہیں تھے بلکہ اپنے حقوق اور دستور سے بری طرح چپٹے رہنے کے عادی تھے وہ اس پر تلے ہوئے تھے کہ زرعی غلاموں کی ملکیت سے

دستنبردار نہ ہوں گے۔ وہ ان کو اپنا ذاتی غلام سمجھتے تھے۔ مذہبی لیکن بے روح ہیئت اجتماعی پرانی یادداشتوں کی بے شمار دولت کے ساتھ اپنی جگہ پر اڑی رہے گی اور ایک انچ پیچھے نہ ہٹے گی کسی سرف کو آزاد کرے گی اور نہ کسی آراضی کو عملی طور پر دنیوی مالک ان روحانی پیشواؤں کے مقابلے میں زیادہ خدا ترس اور رحمدل تھے۔ شاید اس کی وجہ یہی تھی کہ وہ انسان تھے، لاابالی تھے، ان کو ہر وقت نقد روپئے کی ضرورت رہتی تھی اور ان کو مرنے کا بھی دھڑکا لگا رہتا تھا۔ .... ہم کو پتہ چلتا ہے کہ کسانوں نے زیادہ تر انہیں مذہبی پیشواؤں کے خلاف پکار پکار کر فریادیں کی ہیں"۔

کسانوں نے صرف فریادوں ہی پر اکتفا نہیں کیا، انھوں نے اکثر کلیسا کی جائداد پر حملہ کیا۔ کھڑکیوں پر پتھر پھینکے، دروازوں کو جلا کر خاک کر دیا اور پادریوں کو مار پیٹا۔ اس مقابلے میں ان کی مدد شہر کے تاجر بھی کرتے تھے۔ ان تاجروں کو بھی اکثر اپنے مالکان اعلیٰ کے خلاف، وہ ارباب کلیسا ہوں یا دنیوی امرا، صف آرا ہونا پڑتا تھا۔

آزادی کا آفتاب طلوع ہو چکا تھا۔ کرنیں افق سے ابھر رہی تھیں۔ کسان جو اس کی روشنی سے فائدہ اُٹھانے کے لئے بے چین تھے کہیں رُکے نہیں، جہاں ان کو یہ آزادی خوشی سے نہیں ملی اُنھوں نے لڑ بھڑ کر حاصل کی۔ دنیوی امرا اور ارباب کلیسا نے ان کی مخالفت میں ہاتھ پیر مارے لیکن ان کی کوششیں کامیاب نہ ہوئیں معاشی رجحانات کا دباؤ بہت سخت تھا اُسے روکا نہیں جا سکتا تھا۔ اس کشاکش میں آخر کار آزادی ہی کو جیت ہونے والی تھی۔

طاعون کی وبائے عام نے جو سیاہ موت (BLACK DEATH) کے نام سے مشہور ہے انقلاب کی رفتار اور تیز کر دی۔ ہم لوگ ایک ترقی یافتہ دور میں پیدا ہوئے ہیں اور مہذب ملکوں میں جہاں دواسازی کے فن نے حیرت انگیز ترقی کر لی ہے اور جہاں حفظان صحت کے اصول بڑھائے اور عمل میں لائے جاتے ہیں، رہتے ہیں۔ ہم اس زمانے میں اُس طاعون کی شدت کا اندازہ نہیں کر سکتے جس نے قرونِ وسطیٰ میں پورے براعظم کو اپنی لپیٹ میں لے لیا

تھا۔ ہم زیادہ سے زیادہ لال بخار اور انفلوئنزا سے واقف ہیں جو کبھی کبھی وبائی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ اگر ان امراض میں بھی اموات کی تعداد سینکڑوں تک پہنچ جاتی ہے ہم گھبرا جاتے ہیں لیکن اس سیاہ موت کی گرم بازاری نے چودھویں صدی عیسوی میں مقتولین جنگ عظیم کی دوگنی تعداد کو موت کی نیند سلا دیا تھا۔ جنگ عظیم میں قتل و غارت کی یہ منظم مہم چار سال تک بیسویں صدی عیسوی کے ترقی یافتہ مہلک ہتھیاروں کی مدد سے چلتی رہی لیکن اتنے آدمیوں کی جان نہ لے سکی۔ اس وبا کے چند سال کے بعد بوکے کیو (BOCCACCIO) ایک مشہور اطالوی اہل قلم نے اس وبا کے متعلق لکھا تھا۔

فلورنس میں، جو اٹلی کا حسین ترین شہر ہے ۱۳۴۸ء میں ایک بہت ہی ہولناک طاعون پھوٹ پڑا۔ یہ ستاروں کی گردش کا اثر ہو، یا خدا نے ہمارے گناہوں کی سزا میں یہ عذاب نازل کیا ہو، یہ چند سال پہلے لیونٹ (LEVANT) میں شروع ہوا اور ایک مقام سے دوسرے مقام تک ہوتا ہوا مغربی یورپ تک ناقابل یقین تباہی پھیلاتا ہوا پہنچا ان تمام تدبیروں کے باوجود جو انسانی علم اور تجربہ کے بس میں تھیں یہ وبا قابو میں نہ آئی گھر بھی گندگیوں سے صاف کرائے گئے، بیماروں اور مشتبہ مریضوں کو عام آبادیوں سے علیحدہ رکھا گیا۔ حفظان صحت اور بچاؤ کی تدبیروں کے متعلق بڑے بڑے پمفلٹ شائع کئے گئے، بڑے تضرع اور زاری کے ساتھ دعائیں کی گئیں اور جلوس نکالے گئے۔ یہ وبا سال مذکور کے موسم بہار میں ایک عجیب اور درد انگیز انداز سے شروع ہوئی۔ اس بیماری کے علاج میں نہ طب کا علم کام آیا اور نہ دواؤں کی تاثیر نے کوئی نتیجہ دکھایا۔ وجہ کوئی رہی ہو، جو مبتلا ہوا بچ نہ سکا، علامات شروع ہونے کے بعد تیسرے دن مریض کی موت کا پیغام آجاتا تھا۔ جس طرح آگ آتش گیر مادے کو بھڑکاتی جاتی ہے یہ بیماری، بیماروں سے تندرستوں تک پہونچتی اور طوفانی آگ کے شعلوں کی طرح بستیوں کا صفایا کرتی ہوئی آگے بڑھتی جاتی تھی۔ وبا کے زہر کا وہ زور تھا کہ انسان

ے انسان کا متاثر ہونا تو الگ رہا اگر کوئی جانور کسی مریض کی کوئی چیز چھو لیتا تھا تو وہ بھی متاثر ہوئے بغیر نہ بچتا تھا اور تھوڑی ہی دیر میں موت کے ظالم پنجے میں دم توڑ دیتا تھا۔ اس طرح کی ایک مثال میری نگاہ سے گذری ہے، ایک غریب آدمی کا ایک کمبل جو پہلے مرچکا تھا پڑا ہوا تھا۔ دو سور آئے اور انھوں نے اس کمبل کو الٹا پلٹا اور اپنے منھ سے جھٹکا، ایک گھنٹہ بھی گذرنے نہ پایا وہ دونوں اسی جگہ ختم ہو گئے۔"

سوروں کی داستان کی حقیقت کچھ بھی رہی ہو لیکن یہ واقعہ ہے کہ لوگ اس وبا کے ہاتھوں ہر جگہ مکھیوں کی طرح مر رہے تھے۔ فلورنس میں جس کا تذکرہ بوکے کیو نے کیا ہے، ایک لاکھ موتیں ہوئیں۔ لندن میں دو سو جانیں روز جاتی تھیں اور پیرس میں آٹھ سو موتوں کا روزانہ اوسط تھا۔ فرانس، انگلینڈ، بلجیم، ہالینڈ اور جرمنی کی تہائی یا نصف آبادی صاف ہو گئی۔ یہ وبا ۱۳۴۸ء سے ۱۳۵۰ء تک تمام یورپی ملکوں میں پھیلی اور بعد کو بھی یہ بعض ملکوں میں گھوم گھوم کر آتی رہی اور اُن خوش قسمتوں کو جو ابتدائی حملوں میں بچ گئے تھے اپنا شکار بناتی رہی۔ وبا کے ہاتھوں قتل عام کی انتہا ہو چکی تھی کسی کو اپنی زندگی کی امید باقی نہ رہی تھی۔ آئرستان کے ایک پادری نے اسی زمانے میں مایوسی کے عالم میں ذیل کی تحریر اپنی یادگار چھوڑی تھی۔

"صرف اس خیال سے کہ یہ تحریر بھی اپنے لکھنے والے کے ساتھ ختم نہ ہو جائے میں اپنا چرمی کاغذ یوں ہی ناتمام چھوڑتا ہوں تاکہ شاید آدم کی نسل کا کوئی آدمی کہیں بچ جائے اور میرے اس ادھورے کام کو جسے میں نے شروع کر دیا ہے کبھی پورا کر سکے۔"

اس وبا کا جس میں موت کی گرم بازاری دیکھ کر ایک فاضل اہل قلم کو اندیشہ ہو چلا تھا کہ شاید کوئی زندہ نہ بچ سکے گا، کیا اثر ہوا ہوگا؟ اس طاعون نے مغربی یورپ کے کسانوں کی حالت پر کیا اثر ڈالا ہوگا؟

لوگوں کی اتنی بڑی تعداد کے ختم ہو جانے کے بعد، یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ جو لوگ باقی بچ گئے تھے، ان کی قیمت بڑھ گئی تھی۔ مزدور اب اپنی محنت کی اجرت پہلے کے مقابلے میں

زیادہ طلب کرتا تھا اور زیادہ ہی پاتا بھی تھا۔ زمین پر ابھی تک ہل نہیں چلے تھے لیکن اپنی زرخیزی کی وجہ سے اُس کی قیمت بڑھی ہوئی تھی لیکن اس زرخیزی کے خواب کو عملی جامہ پہنانے والا مزدور ہی تھا لیکن چونکہ مزدوروں کی تعداد کم ہو چکی تھی اس لیے اسی مناسبت سے ان کی طلب بڑھ گئی تھی کسان کے کام کی بھی اہمیت اور ضرورت بڑھ گئی تھی۔ وہ بھی اس حقیقت سے اچھی طرح واقف تھا۔

مالکان زمین بھی صورت حال کی اہمیت سے بے خبر نہ تھے، جن مالکوں نے ابھی تک سرفوں کی آزادی جائز نہ سمجھی تھی وہ اب پہلے سے بھی زیادہ اپنی گرفت مضبوط رکھنے پر تُلے ہوئے تھے، وہ اب کسی طرح کوئی تغیر برداشت کرنے کے لیے آمادہ نہ تھے۔ جن مالکوں نے اپنے سرفوں کو بیگار کی رسم سے آزاد کر دیا تھا اور اُس کے بجائے اُنھوں نے اُن سے سالانہ لگان لینا شروع کیا تھا وہ بھی اب محسوس کر رہے تھے کہ مزدوروں کی اجرت بڑھ جانے کی وجہ سے اب وہ اتنی رقم سے اُتنے مزدور نہ لگا سکیں گے۔ مزدوری کی جو شرح اس وبائے عام سے پہلے تھی وہ اب پچاس فی صدی بڑھ کر ڈیوڑھی ہو گئی تھی۔ اس کا یہ مطلب تھا کہ جو مالک پہلے اس رقم سے تیس مزدور لگایا کرتا تھا اب وہ اتنی رقم سے صرف بیس مزدوروں کی اجرت ادا کرنے کے لائق رہ گیا تھا۔ اب ان دھمکیوں کا شائع کرنا کہ اگر کوئی مالک زمین کسی جوتکار، گڈریے یا سوروں کی رکھوالی کرنے والے کو اُس مزدوری سے زیادہ دے گا جو وبائے عام سے پہلے دی جاتی تھی تو مستوجب سزا قرار پائے گا، کوئی اثر نہیں رکھتا تھا۔ اُس وقت کی حکومت کے بنائے ہوئے قوانین اور ان کے نفاذ سے معاشی طاقتوں کا دھارا بدلا نہیں جا سکتا تھا۔

اب وہ وقت قریب آگیا تھا جب مالکان زمین اور ان محنت کشوں کے درمیان جو زمینوں پر کام کرتے تھے، صف آرائی ہونے والی تھی۔ یہ محنت کش آزادی کی نعمتوں سے واقف ہو چکے تھے اور اب ان کو فکر تھی کہ ان نعمتوں سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھائیں پچھلے دنوں میں اُس نفرت نے، جو جبر و استبداد کا لازمی نتیجہ ہوتی ہے، سرفوں کو بغاوت پر آمادہ کر دیا تھا۔

لیکن وہ بغاوتیں مقامی تھیں اور سرفوں کے انتہائی غیظ و غضب کے بعد بھی وہیں فرو کی جا سکتی تھیں لیکن چودھویں صدی عیسوی کے کسانوں کی بغاوت کا انداز ہی دوسرا تھا، محنت کشوں کی غیر معمولی کمی نے زرعی مزدوروں کی اہمیت بڑھا دی تھی اور ان مزدوروں کو بھی اب اپنی طاقت اور اہمیت کا پورا احساس ہو چلا تھا۔ بغاوتوں کا ایک سلسلہ پورے مغربی یورپ میں پھیل گیا۔ کسانوں نے ان ہنگاموں میں وہ تمام مطالبات بہ زور و قوت منوا لیے جو اب تک وہ کسی طرح حاصل نہ کر سکے تھے۔

مورخین ان بغاوتوں کے وجوہ و اسباب کے بارے میں متفق الرائے نہیں ہیں کچھ لوگوں کی تحقیق ہے کہ مالکانِ زمین نے کسانوں کو مجبور کرنا شروع کیا تھا تاکہ وہ پھر سرفوں ہی کی طرح ان کے کھیتوں میں کام کریں۔ کچھ اور مورخین اس نتیجے پر پہونچے ہیں کہ مالکان زمین نے اُس زمانے میں بھی جب کسانوں میں اپنی طاقت کا احساس ترقی کر رہا تھا۔ ان کو رسمی بیگار سے آزاد نہیں کیا اور آخر کار ان ہنگاموں کی نوبت آئی۔ غالباً یہ دونوں گروہ اپنی اپنی جگہ پر دو حقیقتیں بیان کرتے ہیں۔ اُن دستاویزوں سے جو ہمارے مطالعہ میں آئی ہیں ہم کو پتہ چلتا ہے کہ مالکان زمین اور کسان دونوں جماعتوں نے ایک دوسرے کے خلاف تشدد کرنے میں کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھی۔ ریکارڈ تباہ کیے گئے۔ جائدادیں جلائی گئیں۔ کسان بھی قتل ہوئے اور ان پر جبر و استبداد کرنے والے بھی بغاوت کی تلوار کے گھاٹ اتارے گئے اور ان انقلاب پسند کسانوں کا جو اپنی بدقسمتی سے دشمنوں کے چنگل میں پھنس گئے "قانونی ذبیحہ" بھی ہوا۔ انھیں ذبح ہونے والے بدنصیب کسانوں میں ایک شخص آدم کلیم (ADAM CLYMME) بھی تھا۔ ایلی کی ایک یادداشت میں آیا ہے:-

"ایلی (ELY) کے جزیروں میں کیمبرج کی کاؤنٹی (COUNTY) میں ججوں کے سامنے، جو باغیوں کو ان کی بداعمالیوں کی سزا دینے کے لئے متعین کئے گئے، ۲۰ر جولائی کو عذرات پیش ہوئے۔

"آدم[1] اسمتھ ایک غدار باغی کی حیثیت سے گرفتار کیا گیا اُس نے غداری سے اپنا پیمان وفاداری توڑا اور دوسروں سے مل کر ایلی پر حملہ آور ہوا۔ یہ تھامس سومنر کے احاطے میں مجرمانہ ارادے سے داخل ہوا اور وہاں سے بہت سے سرکاری کاغذات کے بستے اٹھالے گیا۔ بادشاہ اور ایلی کے بشپ کی مہریں غائب کردیں اور ان کو صرف تاج کو نقصان پہونچانے کی غرض سے پھونک دیا۔"

"یہی آدم دوسرے دن اتوار کو اور اس کے بعد دوشنبہ کو اعلان کرتا پھرا کہ کوئی شخص یا کوئی سرکاری عہدہ دار جس کے سپرد حکومت کی جانب سے کوئی فرض کیا گیا ہوگا اپنی گردن سلامت نہ لے جاسکے گا۔"

"یہی آدم اس بغاوت کے دن اور اس سے پہلے مسلح گھومتا پھرتا تھا اور ہتھیاروں کی نمائش کرتا تھا، یہ ایک جھنڈا بھی لئے رہتا تھا اور باغیوں کو دعوت عام دے دے کر اپنے جھنڈے کے نیچے اکٹھا کرتا تھا اور ان کو ورغلاتا تھا کہ کوئی آزاد یا غلام اپنے مالک اور آقا کی اطاعت ہرگز نہ کرے اُن کے ہر حکم سے روگردانی کرے اور ان کے جملہ فرائض کی ادائگی سے باز رہے، نہ کسی قدیم دستور کی پرواکرے اور نہ کسی رسم کی بجاآوری کی فکر کرے۔ یہ آدم یہ بھی اعلان کرتا تھا کہ اگر کوئی شخص اس کے ان احکام کی تعمیل نہ کرے گا تو اُس کی گردن اُڑادی جائے گی۔ اُس نے بڑے باغیانہ انداز سے اختیاراتِ شاہی پر قبضہ کیا۔ وہ آیا۔ اُس کو شیرف کے پیش کیا اور اُس کے خلاف مذکورہ بالا الزامات عائد کئے گئے۔ وہ کہتا ہے کہ اُس کے اوپر جتنے الزام لگائے گئے ہیں وہ سب بے بنیاد ہیں اور اُس نے کوئی بات خلاف قانون نہیں کی ہے۔ اُس کے بیان کے بعد فوراً ہی جوری کا تقرر عمل میں آیا اور بادشاہ کی طرف سے بارہ اچھے اور مجاز آدمیوں کا انتخاب عمل میں آیا۔ انھوں نے مقدمے کی سماعت کی اور حلف اُٹھایا۔ یہ بہ حلف اپنی رائے

---

[1] THOMAS SOMENOUR

لکھتے ہیں کہ آدم مذکور کے خلاف جتنے الزام عائد کیے گئے ہیں وہ سب صحیح ثابت ہوگئے ہیں اس لئے اب انصاف کا تقاضا یہی ہے کہ آدم مذکور کو پھانسی دے دی جائے۔ یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ اس شہر میں آدم کا کچھ سامان بھی جس کی قیمت بتیس شلنگ ہوگی، موجود ہے۔ اس کو سرکاری ضبط کنندہ رالف ایٹ ویک (WYKE) نے بحق سرکار ضبط کر لیا ہے۔"

آدم کلیم کو پھانسی دیدی گئی۔ اس کے علاوہ بھی ہزاروں کسانوں کو موت کے گھاٹ اتارا گیا اور کسانوں کی بغاوت ایک مرتبہ ٹھنڈی کر دی گئی لیکن زرعی انقلاب کی رفتار رو کی نہ جا سکی جاگیردار مالکانِ اعلیٰ نے اپنی کوششوں میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی لیکن زرعی تحریک کے ارتقا نے اپنے قدم جہاں جما دئے تھے وہاں سے اکھڑ نہ سکے، قدیم جاگیرداری تنظیم بڑھتے ہوئے معاشی دباؤ کے سامنے پائدار ثابت نہ ہوئی اور اس کی آہنی زنجیر کی ایک ایک کڑی ٹوٹ کر رہی پندرھویں صدی عیسوی نے اپنے سفر کی آدھی منزل ہی پوری کی تھی کہ مغربی یورپ کے بڑے حصے میں قدیم رسمی، اور دستوری بیگار کی جگہ نقد لگان نے لے لی اور کسانوں کی اچھی خاصی تعداد نے کسی نہ کسی طرح مکمل آزادی حاصل کر لی اسرفوں کا وجود زیادہ تر انہیں علاقوں میں باقی رہا جو تجارت کی شاہراہ عام سے دور تھے اور شہروں کے حریت پسند رجحانات کی زد سے باہر تھے۔ زرعی مزدور اب صرف لدو گھوڑا نہ تھا، اب وہ اس لائق ہو گیا تھا کہ اپنا سر بلند رکھے اور ایک خود دار آدمی کی طرح تن کر کھڑا ہو سکے۔

جاگیرداری سماج میں زرعی زمین کا کاروبار ایک نامانوس عمل تھا لیکن اب بدلے ہوئے حالات میں یہ کاروبار عام ہو گیا، پرانے زمانے میں باہمی خدمات کی بنیاد پر زمین کبھی عطا کی جاتی تھی اور کبھی کسان اُسی طرح کے شرائط پر حاصل کرتا تھا لیکن اب صورت حال بالکل بدل گئی اور زمینی جائداد کا ایک نیا تصور پیدا ہو گیا تھا۔ اب کسانوں کی بہت بڑی تعداد آزادی سے گھوم پھر رہی تھی۔ وہ زمین خریدتے تھے، بیچتے تھے اور وصیت کے ذریعہ سے اُسے دوسروں تک اپنی مرضی سے منتقل کرتے تھے۔ اگرچہ ان کو ایسا کرنے کے لئے ایک

خاص رقم ادا کرنی پڑتی تھی۔

اسٹیونج کی ۱۳۹۵ء کی ایک سرکاری یادداشت میں آیا ہے کہ ایک زرعی غلام:۔

"جو نصف ورگیٹ[۱] (VIRGATE) زمین اور ایک مکان مع آراضی کا حین حیاتی مالک ہے اور جو ان تمام خدمات کے لئے جو اس پر واجب ہیں، دس سالیڈیور (SOLIDIO) ادا کرتا ہے، کچہری میں آیا اور اس نے مذکورہ بالا زمین ایک دوسرے شخص کو اس کی زندگی بھر کے لئے دے دی۔ اس نے سرکار کو اس کاروبار کی رجسٹری کے لئے ۲ دناری فیس ادا کی۔"

اب زمین بھی ایک تجارتی چیز کی طرح آزادی سے خریدی، بیچی اور بدلی جانے لگی تھی اس صورت حال نے قدیم جاگیرداری نظام کی آخری سانسیں پوری کر دیں۔ انقلابی طاقتیں مغربی یورپ پر چھا چکی تھیں اور اب ان کے اثر سے دنیا نیا چولا بدلنے جا رہی تھی۔

---

[۱] زمین ناپنے کا قدیم پیمانہ جو عموماً چوتھائی ایکڑ کا ہوتا تھا۔

اجنبی کو نکال دو

اس زمانے میں صنعتی دنیا میں بھی بڑا انقلاب ہوا۔ پہلے زمانے میں تھوڑی بہت جو بھی صنعت تھی وہ کسان کے گھر میں جاری رہتی تھی۔ کسان کے خاندان کے ارکان کو اپنا کام چلانے کے لئے کسی اعلیٰ قسم کے فرنیچر کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ اس لئے اس کو آج کل کی طرح بڑے بڑے فرنیچر گھروں کی جستجو بھی نہیں ہوتی تھی اور وہ اپنی میز کرسی کی مرمت اور رنگائی کے لئے ماہر بڑھئیوں کی تلاش میں مارا مارا نہیں پھرتا تھا۔ اس کو اپنا کام چلانے کے لئے جس قسم کے فرنیچر کی ضرورت پڑتی تھی اُسے وہ خود گڑھ گڑھا اور کاٹ چھانٹ کر تیار کر لیتا تھا۔

کسانوں کو اپنے اور اپنے متعلقین کے استعمال کے لئے کپڑوں کی ضرورت بھی پڑتی تھی۔ وہ اپنے کپڑوں کے لئے سوت کاتتے، اس سوت کو بنتے، تھان بناتے، اُسے قطع کرتے اور اپنے استعمال کے لئے کپڑے تیار کرتے تھے، یہ سارے کام گھر ہی پر ہوتے تھے۔ یہ صنعت جو گھر کے اندر جاری رہتی تھی، صرف اپنے گھر والوں کی خانگی ضروریات کے پورا کرنے کے لئے اختیار کی جاتی تھی۔

مالکان اعلیٰ (LORDS) کے خانگی غلاموں (SERFS) میں کچھ ایسے لوگ بھی ہوتے تھے جو صرف اسی قسم کی خدمات انجام دیتے تھے، ان کے علاوہ وہ دوسری جماعت بھی ہوتی تھی جو فارموں پر کھیتی کسانی کے فرائض انجام دیتی تھی۔ کلیسا کی خانقاہوں اور ان کے متعلق گھروں میں بھی کچھ ایسے صناع رہتے تھے جو اس قسم کی کسی نہ کسی صنعت میں ماہر ہوتے تھے اور بنائی سلائی یا لکڑی اور لوہے کا کام پوری مہارت سے انجام دیتے تھے لیکن یہ پوری صنعت تجارتی نقطۂ نظر سے انجام نہ پاتی تھی اور ان متعلقی گھروں کا بنا ہوا مال بازار کی وسعتوں میں نہ آتا تھا۔ اس سے صرف اسی گھر کے افراد

جہاں یہ بنتا رہتا تھا، فائدہ اُٹھاتے تھے۔ ان صناعوں کی محنتوں اور ان کی کاریگریوں کو آزادی سے پھلنے پھولنے اور بڑھنے کے لئے آزاد بازاروں کی ضرورت تھی۔ یہ بازار ابھی تک ترقی کی اس منزل تک نہیں پہونچے تھے۔

شہروں کی آبادکاری اور روپے کے استعمال نے ان صناعوں کے لئے ایک نیا موقع مہیا کیا اور ان کے لئے یہ گنجائش نکل آئی کہ وہ فارموں کو چھوڑ کر باہر نکلیں اور اپنی صنعت سے آزاد روزی کا بندوبست کریں۔ ہر قسم کے صناع شہروں میں جا بسے اور انھوں نے وہاں اپنی دوکانیں کھول لیں۔ اب وہ صرف اپنے گھر والوں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے محنت نہیں کرتے تھے بلکہ دوسروں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے گرم عمل تھے۔ وہ ایک بڑھتے ہوئے ترقی پذیر بازار کے لئے، چھوٹے اور محدود پیمانے پر سہی لیکن ضروری سامان تیار اور مہیا کر رہے تھے۔

ان کو اپنی تجارتی صنعت کی ترقی کے لئے بڑے سرمایے کی ضرورت نہ تھی۔ اُس گھر کا ایک کمرہ جس میں یہ صناع رہتا تھا، اُس کے کارخانے کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ اُسے صرف اپنے کام میں مہارت اور اپنے بنائے ہوئے سامان کے لئے کچھ خریداروں کی ضرورت ہوتی تھی۔ اگر وہ اچھا کاریگر ہوتا، اُس کی شہرت شہر میں پھیل جاتی اور اُس کی بنائی ہوئی چیزوں کی طلب بڑھ جاتی، وہ اس بڑھی ہوئی طلب کو پورا کرنے کے لئے اپنے چھوٹے سے کمرے میں دو ایک مددگاروں کو اور لگا لیتا اور بازار کی بڑھی ہوئی طلب کو بقدرِ ضرورت پورا کرنے لگتا۔

یہ مددگار جنھیں یہ اپنی مدد کے لئے لگاتا تھا۔ دو طرح کے ہوتے تھے، کام سیکھنے والے مبتدی اور اجرت پر کام کرنے والے کاریگر۔ مبتدی نئی عمروں کے جوان ہوتے تھے۔ یہ مالک صناع کے ساتھ رہتے، کام کرتے اور صنعت سیکھتے تھے۔ ان مبتدیوں کی امیدواری کی مدت صنعت کی اہمیت کے لحاظ سے مختلف ہوتی تھی۔ یہ کبھی کبھی صرف سال بھر ہی میں ختم ہو جاتی تھی اور کبھی بارہ بارہ سال تک ان مبتدیوں کو اپنے استاد کی خدمت میں حاضر رہنا پڑتا تھا لیکن عام طور سے یہ مدت دو سال سے کم اور سات سال سے زیادہ نہ ہوتی تھی لیکن امیدوار بننا ایک بڑا مشکل کام تھا۔

امیدوار نوجوان اور اس کے سرپرست کو مالک صناع کے ساتھ ایک معاہدہ کرنا پڑتا تھا معاہدہ میں امیدوار کو ایک برائے نام معاوضہ یا خوراک کے عوض میں سخت محنت مکمل اطاعت اور پوری فرماں برداری کا وعدہ کرنا پڑتا تھا۔ اس معاہدہ کے بعد امیدوار مالک صناع کے ساتھ رہتا، کھاتا اور صنعت کے راز اور اس کی باریکیوں پر عبور حاصل کرتا تھا۔

امیدواری کی مدت ختم کرنے کے بعد، اگر امیدوار آخری امتحان میں کامیاب ہو جاتا اور اس کے پاس ضروری سرمایہ بھی ہوتا، تو وہ اپنے استاد کی طرح خود اپنی مستقل دوکان کھول لیتا تھا اگر اس کے پاس ضروری سرمایہ نہ ہوتا تو وہ مالک کے یہاں اجرت پر کام شروع کر دیتا، یا کسی دوسرے مالک کے یہاں اجیر کاریگر (JOURNEY MAN) کی حیثیت سے اجرت پر کام کرنے لگتا سخت محنت اور کفایت شعاری کے ساتھ چند سال گذارنے کے بعد وہ اکثر اپنا مستقل کاروبار شروع کرنے کے لائق ہو جاتا تھا۔

اس زمانے میں کوئی نیا کاروبار شروع کرنے کے لئے کسی بڑے سرمائے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ قرونِ وسطیٰ میں مالک اور اس کے ملازم کاریگر ایک ہی کارخانے میں دوش بدوش برابر کام کرتے ہوئے نظر آتے تھے۔ مالک صناع بیچنے والا سامان پیدا ہی نہیں کرتا تھا بلکہ اکثر اس کو خود ہی بیچتا بھی تھا۔ کارخانے کی ایک دیوار میں ایک کھڑکی ہوتی تھی۔ یہ کھڑکی سڑک یا شہری آبادی کی طرف کھلتی تھی۔ اسی کھڑکی کے سامنے یہ بنی ہوئی چیزیں نمائش کے لئے رکھ دی جاتی تھیں اور وہیں کھڑکی کے تختے پر جو کاونٹر (COUTER) کے طور پر استعمال ہوتا تھا بیچ دی جاتی تھیں۔

اس زمانے کے صنعتی نظام کو سمجھنے کے لئے یہ نگاہ میں رکھنا بہت ضروری ہے کہ اب وہ عہد آگیا تھا جب صنعتی پیداوار صرف خانگی ضروریات کی تکمیل تک محدود نہ تھی بلکہ اب بازار کھل گئے تھے اور کھلے ہوئے بازار میں دوسروں کی ضروریات پوری کرنے کے لئے بھی یہ چھوٹے چھوٹے صنعتی کارخانے کام کرنے لگے تھے۔ ان کاریگروں کو اپنا صنعتی کام اور پیداوار جاری رکھنے کے لئے خام مال اور اوزار دونوں کی ضرورت پڑتی تھی (اب ہمارے زمانے میں حالات بالکل

بدل گئے ہیں آج کے صنعتی مزدور کے پاس نہ خام مال ہوتا ہے اور نہ اوزار۔ وہ اپنا پیدا کیا ہوا مال بھی نہیں فروخت کرتا ہے۔ وہ صرف اپنی محنت کا مالک ہے اور وہ اسی کو فروخت بھی کرتا ہے)

ان کاریگروں نے ان تاجروں کی، جو ان سے پہلے جماعت تجار (GILDS) کے نام سے اپنی جماعتی تنظیم کر چکے تھے، پیروی کی۔ تمام کاریگروں نے جو ایک ہی شہر میں رہتے تھے اور ایک ہی طرح کی صنعت میں لگے ہوئے تھے "کاریگروں کی انجمنیں" بنا لیں۔ آج کل اگر کوئی سیاسی لیڈر یا صنعتوں کا مالک سرمایہ اور محنت کے اشتراک اور تعاون کا مشورہ دیتا ہے تو پرانے اور تجربہ کار مزدور اس کے اس مشورہ پر ناک بھوں چڑھاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ "ایسا ممکن نہیں" ان کو اس مشورہ کی صحت پر اعتبار نہیں ہوتا۔ وہ اچھی طرح سمجھ گئے ہیں کہ اس مالک میں جو مزدوروں کو ان کی محنتوں کا معاوضہ ادا کرتا ہے اور ان مزدوروں میں جو اس سے اپنی محنتوں کا معاوضہ وصول کرتے ہیں بڑا فرق ہے۔ وہ خوب سمجھتے ہیں کہ ان دونوں کے مفاد ایک دوسرے سے مختلف ہیں اور ایسی ہر گفتگو جو ان دونوں کو اشتراک مقاصد پر آمادہ کرنے کے لئے چھیڑی گئی ہو۔ بیکار ہے۔ اس طرح کے مشورے صورت حال میں کسی قسم کی بہتری نہیں پیدا کر سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کمپنی کی بنائی ہوئی انجمنوں سے دور بھاگتے ہیں۔ یہ انجمنیں اگر ان کا کام بھی کریں، تب بھی وہ ان کو پسند نہیں کرتے۔ وہ ان انجمنوں کو جن میں مالکوں کو بھی دخل در معقولات کا حق ہو، شبہ کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

لیکن قرون وسطیٰ کے دستکاروں کی انجمنیں (CRAFT GILDS) آج کل کی انجمنوں سے مختلف تھیں۔ تمام دستکار، جو ایک ہی طرح کے پیشے میں لگے ہوئے تھے، ایک ہی جماعت کے ممبر ہوتے تھے۔ مالک دستکار، امیدوار اور اجیر دستکار سب ایک ہی جماعت دستکاراں (CRAFT GILDS) میں شامل ہوتے تھے اور ایک ہی طرح کے مقاصد کے لئے دوش بدوش جد و جہد کرتے تھے۔ اس زمانے میں مالک اور مزدور میں بڑا فرق نہ تھا۔ اس لئے اس طرح کا اتحاد ممکن تھا۔ اجیر دستکار اپنے مالکوں کے ساتھ رہتے تھے، وہی کھانا جو ان کے مالک کھاتے تھے ان کے سامنے بھی آتا تھا جس طرح

ان کے آقا نے کام سکھا تھا۔ یہ بھی سیکھتے تھے۔ وہ دونوں ایک ہی طرح کی باتوں میں یقین بھی رکھتے تھے اور ایک ہی قسم کے خیالات ان کی زندگیوں میں ارتباط قائم رکھتے تھے۔ اُس زمانے میں یہ عام دستور رہی تھا۔ امیدوار مبتدی کام سیکھ کر اجیر دستکار بن جاتے تھے اور یہی اجیر دستکار دستور کے مطابق آگے چل کر کاروبار کے مالک ہو جاتے تھے۔ جب تک اس دستور کی حکومت رہی، مالک اور مزدور سب ایک ہی جماعت کے ارکان بن سکتے تھے لیکن آگے چل کر یہ دستور ٹوٹ چلا اور برائیوں نے اس سیدھے سادھے نظام میں ابتری پیدا کرنی شروع کر دی، اجیر دستکاروں نے ان جماعتوں سے غیر مطمئن ہو کر اپنی انجمنیں علیحدہ بنانی شروع کیں لیکن بالکل ابتدائی دور میں تمام ہتھیار ڈھالنے والے ایک ہی جماعت کے ممبر ہوتے تھے اور تلواروں پر پالش کرنے والے ہر طرح کے دستکار ایک ہی جماعت میں شامل ہو کر اپنی تنظیم کرتے تھے۔ ہر امیدوار وہی حقوق رکھتا تھا جو اُس کے دوسرے ساتھی امیدواروں کو حاصل تھے۔ ہر اجیر دستکار اپنے ساتھی دوسرے اجیر دستکاروں کے برابر حقوق کا مالک تھا اور مالک دستکار بھی اپنے ہم پیشہ دوسرے مالک دستکاروں کے برابر حقوق کا مدعی تھا۔ الغرض ایک طبقے کے تمام افراد اپنے تمام حقوق میں اُس طبقے کے دوسرے افراد کے برابر سمجھے جاتے تھے اور برتاؤ میں پوری مساوات برتنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ ان جماعتوں کے اندر طبقے ضرور تھے لیکن طبقوں کے اندر تمام افراد کے حقوق برابر تھے۔ مبتدی امیدوار سے لے کر مالک دستکار تک ایک زینہ لگا ہوا تھا اور ہر مبتدی کے لئے راستہ کھلا ہوا تھا کہ وہ زینہ بزینہ ترقی کر کے مالک دستکار کے درجے تک پہونچ جائے۔

کبھی تم نے کسی ٹائر (TAWYER چمڑہ کمانے والے) کے متعلق کچھ سنا ہے؟ یہ لفظ اب دقیانوسی سمجھا جانے لگا ہے۔ یہ پیشہ بہت پرانا اور پرانے زمانے کی خیالی یادگار ہے۔ شاید یہی وجہ ہے ہم اس لفظ کو، جو اس قدیم پیشے کی طرف اشارہ کرتا ہے، دقیانوسی سمجھتے ہیں ٹائر (TAWYER) اُس آدمی کو کہتے تھے، جو چودھویں صدی عیسوی کے لندن میں سفید چمڑہ بنانے اور گھوٹنے کا کام کرتا تھا۔ یہ ایک بہت بڑا پیشہ تھا اور اس پیشے والوں نے اپنی تنظیم کے لئے ایک بڑی جماعت بنائی

تھی۔ اسی جماعت کے ضابطوں کی کتاب میں۔ ہم کو حسب ذیل آرڈیننس جو ۱۳۴۶ء میں جاری ہوا تھا، ملتا ہے:۔

۱۔۔۔۔ اگر کسی وجہ سے کسی ممبر کا کاروبار بگڑ جائے گا اور وہ غریب ہو جائے گا یا بڑھاپے کی وجہ سے کام نہ کرسکے گا یا کسی اور وجہ سے محنت کے لائق نہ رہ جائے گا تو اُسے ہر ہفتے، شلنگ زندگی بسر کرنے کے لئے اگر اُس کی شہرت خراب نہ ہوئی دئے جائیں گے۔"

۲۔ اور کسی اجنبی کو جو اس کاروبار میں امیدوار (APPRENTICE) کی حیثیت سے کام نہ کر رہا ہو گا یا اُس کو اس شہر میں حق رائے دہندگی حاصل نہ ہو گا، کام کرنے کی اجازت نہ دی جائے گی۔

۳۔ کوئی شخص کسی دوسرے شخص کے "کام کرنے والے آدمی (SERVING MAN) کو جب تک اُس کی میعاد ختم نہ ہو جائے اپنے ساتھ کام کرنے کے لئے نہ لگائے گا۔ اگر کوئی شخص ایسا کرے تو اُس کو مالک سے اجازت حاصل کرلینی چاہئے۔ اگر کوئی شخص اپنے گھر میں اتنا کام رکھتا ہے جو وہ پورا نہیں کرسکتا تو یہ جماعت اُس کی مدد کرے گی تاکہ وہ کام نامکمل نہ رہ جائے۔

۴۔ اگر کوئی کام کرنے والا آدمی اپنے آقا کے ساتھ نامناسب رویہ اختیار کرے گا یا اُس کے احکام کی خلاف ورزی کرے گا اور باغیانہ طرزِ عمل اختیار کرے گا تو جماعت کا کوئی آدمی اُس کو، تاوقتیکہ وہ میر بلدہ اور نائب میر بلدہ کے سامنے حاضر ہو کر اپنے گناہوں کا کفارہ ادا نہ کرے، کسی کام سے نہ لگائے گا۔"

۵۔ جماعت دستکاراں کے ذمہ دار لوگ سال میں ایک مرتبہ دو آدمیوں کا انتخاب کریں گے۔ یہ لوگ تجارت اور تجارت کے متعلق تمام اُمور کی نگرانی کریں گے۔ یہ لوگ میر بلدہ اور نائب میر بلدہ کے سامنے حلف وفاداری اُٹھائیں گے اور عہد کریں گے کہ وہ پوری بیدار مغزی اور ذہانت سے واقعات کی تحقیقات کریں گے اور میر بلدہ اور نائب میر بلدہ کے سامنے ان تمام واقعات کی رپورٹ پیش کریں گے۔ جو تجارتی امور سے

متعلق ہوں اور اپنے ان فرائض کی انجام دہی میں ان پر دوستوں کی محبت اور دشمنوں کی نفرت کا کوئی اثر نہ ہوگا۔"

"اور تمام وہ کھالیں جو جھوٹ اور فریب سے حاصل کی جائیں گی ضبط کر لی جائیں گی۔"

"۶۔ جس شخص نے امیدواری نہیں کی ہے یا اس نے اپنی امیدواری کی مقررہ مدت نہیں پوری کی ہے، اس کاروبار سے آزاد کر دیا جائے گا۔"

اس قسم کی ہزاروں تحریروں اور دستاویزوں کے مطالعہ کے بعد مورخین اس لائق ہوئے ہیں کہ سیکڑوں سال پیچھے کے دستکاروں کی انجمنوں کے حالات دریافت اور مرتب کر سکیں۔

مذکورہ بالا تحریر کی دفعہ ۲ سے پوری طرح ظاہر ہوتا ہے کہ جماعتِ دستکاراں کو اپنی جماعت کے ارکان کی بہبودی کا بڑا خیال تھا۔ وہ باہمی بھائی چارے اور دوستی کے رشتے میں پوری طرح بندھے ہوئے تھے اور اپنے گرے پڑے ارکان کی فکر جماعتی حیثیت سے لیتے رہتے تھے بہت سی جماعتیں صرف اس مقصد سے کہ ایک دوسرے کی مصیبت کے اوقات میں مدد کر سکیں، وجود میں آئی تھیں ضمنی طور پر یہ بتا دینا بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ بیروزگاری اور بڑھاپے کا بیمہ جو اس زمانے کی امتیازی خصوصیت سمجھا جاتا ہے چھ سو سال پہلے بھی دستکاروں کی جماعتوں (CRAFT GILDS) میں باقاعدہ رائج تھا۔

تیسری دفعہ سے اس حقیقت پر مزید روشنی پڑتی ہے کہ ان جماعتوں کی تنظیم کچھ اس انداز سے کی جاتی تھی کہ باہمی دوستی کا جذبہ ترقی پائے اور آپس میں ایک دوسرے سے تجارتی مقابلے کا جذبہ ختم ہو جائے۔ یہ بات خاص طور سے مطالعہ کے لائق ہے کہ ایک چمڑے کا صاف کرنے اور گھونٹنے والا (TAWYER) اگر اپنے کام میں پچھڑ جائے، اپنے ساتھیوں سے مدد کا مستحق تھا تاکہ وہ اپنے کاروبار میں پیچھے نہ رہ جائے۔ اس دفعہ کے مطالعہ سے یہ بات اچھی طرح صاف ہو جاتی ہے کہ جماعت کے ہر ممبر کے مفاد کی حفاظت جماعت کے اولین فرائض میں شامل تھی۔

جماعت کے تمام افراد ایک لڑی میں پروئے ہوئے تھے تاکہ جماعتی صنعت ان کے قابو سے

باہر نہ نکلنے پائے۔ دفعہ نمبر۲ کا پھر مطالعہ کرو یہ دفعہ بہت اہم ہے۔ جماعتِ دستکاراں نے بھی تاجروں کی جماعتوں کی طرح شہر کی صنعت کا ایک طرح سے اجارہ حاصل کر لیا تھا۔ اگر تم کسی قسم کا کاروبار کرنا چاہتے تو تم کو شہر کی جماعت کا ممبر بننا پڑتا۔ کوئی شخص جو جماعت کا باقاعدہ ممبر نہ ہوتا، جماعت سے اجازت لئے بغیر کاروبار نہیں کر سکتا تھا۔

جماعتی تنظیم کا یہ احساس اس حد تک بڑھ گیا تھا کہ باسلے (BASLE) اور فرینک فرٹ (FRANK FURT) کے گداگروں نے بھی اپنی جماعتیں (GILDS) منظم کر لی تھیں اور ان کی جماعتیں سال میں دو دنوں کے سوا باہر کے کسی سائل کو شہر میں بھیک مانگنے کی اجازت نہیں دیتی تھیں۔ باہر کی کوئی مداخلت جو ان کی اجارہ داری میں خلل انداز ہوتی، ان جماعتوں کے لئے قابل برداشت نہ تھی۔ ان کا فائدہ اسی میں تھا کہ یہ اجارہ داری قائم رہتی اس لئے وہ اس کے قیام اور بقا کے لئے لڑتے بھڑتے رہتے تھے۔ چرچ بھی جو اُس زمانے کی بڑی طاقتور جماعت تھا۔ ان جماعتوں کے ضابطوں سے ہم آہنگی ہی میں مصلحت سمجھتا تھا۔

۱۲۴۸ء میں جرمن کے چرچ سینٹ جوہن (ST. JOHANN) کے سرداروں نے اُس گیہوں اور رئی کی روٹیاں چاہیں، جو ان کی زمینوں میں پیدا ہوتا تھا۔ ان کو اپنے ارادے کی تکمیل کے لئے نان بائیوں کی جماعت (BAKERS GILDS) کی منظوری حاصل کرنی پڑی یہ منظوری ایک مصلحت کی بنا پر بڑی فیاضی اور دریا دلی سے عطا کر دی گئی۔ اس اجازت نامہ کا ضروری اقتباس یہ ہے:—

"جماعت کے سردار اور تمام ارکان پوری خوش دلی سے اجازت دیتے ہیں کہ مہتمم صدقات چرچ (DEACONS) اور ارکان مجلس کلیسا (CANONS) اپنی روٹیاں پکوانے کا انتظام جماعت کے حلقے سے باہر کریں تاکہ ان کو اُس جو، گیہوں اور رئی کی روٹیاں مل سکیں جو اُن کی زمینوں میں پیدا ہوتی ہے۔ اور اب جماعت کے ارکان ان کے ہاتھ روٹیاں نہ فروخت کریں گے اور چونکہ جماعت کا یہ نقصان ہے اس لئے اس کے معاوضہ میں

جرمنی اُس کو ۱۶ مارک ادا کرتا ہے۔"

ان جماعتوں نے پوری کوشش کی کہ ان کی صنعت کی اجارہ داری پورے شہر میں ان کے ہاتھ سے باہر نہ جانے پائے۔ انھوں نے کسی اجنبی کو اپنے شہر کے بازار میں قدم نہیں رکھنے دیا۔ جب تم قرونِ وسطیٰ کی ان خوفناک لڑائیوں کا حال پڑھو، جو ایک شہر، دوسرے شہر کے خلاف لڑتا رہتا تھا تو ضرور یاد رکھو کہ یہ جنگیں اکثر صرف اس لئے لڑی گئی تھیں کہ صناعوں اور تاجروں کی یہ انجمنیں باہر کے صناعوں اور تاجروں کی جماعتوں سے تجارتی مقابلے میں پیش نہ لے جاسکیں اور محض اپنے حقوق کی حفاظت کے لئے انھوں نے مجبور ہو کر دوسرے شہروں کے خلاف ہتھیار اُٹھائے۔

آج ایک موجد چیزیں تیار کرنے کا کوئی اچھا طریقہ دریافت کرتا ہے۔ وہ اپنی اس دریافت کی رجسٹری (PATENT) کرالیتا ہے۔ اب کوئی دوسرا شخص اِس کی اِس رجسٹری شدہ دریافت کو اپنا نہیں سکتا لیکن قرونِ وسطیٰ میں رجسٹریشن کے قوانین نہ تھے۔ یہ جماعتیں جو اپنی اجارہ داری قائم اور محفوظ رکھنے کے لئے بے چین رہتی تھیں۔ دوسروں سے اپنے تجارتی راز چھپایا کرتی تھیں لیکن آخر وہ ان رازوں کی حفاظت کس طرح کرتے تھے؟ آخر وہ دوسروں کو ان کی تجارت اور صنعت کے گر سمجھنے اور سیکھنے سے کیسے باز رکھ سکتے تھے؟ ہم کو وینس کا ایک قانون، جو ۱۴۵۴ء میں نافذ ہوا تھا ملا ہے۔ اس تحریر کے مطالعہ سے ہم کو کم سے کم ایک ایسے طریقے کا ضرور پتہ چل جاتا ہے جس پر عمل کرکے وہ اپنے تجارتی اور صنعتی رازوں اور گروں کی حفاظت کیا کرتے تھے۔

"اگر کوئی کام کرنے والا کسی دوسرے ملک میں صنعت کا کوئی گر لے جائے گا اور اس طرح جمہوریہ کے مفاد کو نقصان پہونچنے کا اندیشہ پیدا ہوگا تو اُس کو لوٹنے کا حکم دیا جائیگا اگر وہ اس حکم کی تعمیل نہ کرے گا تو اُس کے قریبی عزیز گرفتار کرلئے جائیں گے تاکہ خاندان کی حفاظت کا خیال اس کو واپسی پر مجبور کرسکے۔ اگر وہ اب بھی اپنی نافرمانی پر جما رہے گا تو جہاں وہ ہوگا وہاں بعض خفیہ طریقے اختیار کرکے اُسے قتل کرادیا جائے گا۔"

ان جماعتوں (GILDS) کے ارکان نے صنعتی اجارہ داری کو بیرونی حملوں سے پوری طرح محفوظ کرلیا۔ انھوں نے صرف بیرونی تحفظ ہی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ایسی تدبیریں بھی اختیار کیں جن سے باہمی مناقشات کا خطرہ بھی کم ہوگیا۔ انھوں نے آپس میں ایسی صورتیں جو ساتھی ممبروں کے نقصان کا موجب ہوں، حتی الامکان پیدا نہ ہونے دیں۔ مذکورہ بالا آرڈیننس کی تیسری دفعہ کے الفاظ تمام ممبروں کو ایک دوسرے کی گردن کاٹنے سے باز رکھتے ہیں۔ ایک جماعت کا ممبر اپنے کسی ساتھی ممبر کے اجیر کاریگر کا اغوا نہیں کرسکتا، کھلا پلا اور بہلا پھسلا کر گاہکوں کو دوسروں سے توڑ کر اپنی طرف راغب کرلینے کی رسم جو آج ہر طرف عام ہے، اس زمانے میں بھی رائج تھی۔ گاہک کو کسی نہ کسی طرح کچھ دے دلا کر اپنی طرف متوجہ کرلیا جاتا تھا۔ ۱۳۴۳ء میں فرانس کے نان بائیوں کی جماعت (CORBIE) نے اس قسم کے دستوروں کا قلع قمع جس قانون سے کیا تھا اس کے الفاظ یہ ہیں :-

"کوئی شخص کسی کو اپنی روٹیاں بیچنے کی نیت سے نہ شراب پلائے گا اور نہ کسی قسم کی اور خاطر مدارات کرے گا۔ اس قانون کی خلاف ورزی کرنے والے پر ساٹھ سال (SOL) جرمانہ ہوگا۔"

مذکورہ بالا آرڈیننس کی دفعہ ۵ اور ۶ کو ایک مرتبہ پھر پڑھو۔ ان دفعات سے یہ حقیقت اچھی طرح صاف ہو جاتی ہے کہ اس اجارہ داری کے معاوضے میں جماعت (GILD) کے ممبران بہترین پیداوار پیش کرنے کا اہتمام کرتے تھے۔ اس قانون کے نفاذ سے انھوں نے ہر کام کرنے والے کے لئے امیدواری کی مدت لازمی قرار دی تھی۔ اس طرح وہ اچھی طرح اطمینان کرلیتے تھے کہ جو لوگ صنعت میں لگے ہوئے تھے وہ تربیت یافتہ لوگ تھے۔ وہ ان کارکنوں کے کام کی اچھی طرح نگرانی کرتے تھے تاکہ گاہک کو گھٹیا مال کی خریداری سے بچایا جا سکے۔ جماعت اپنے اچھے نام اور اپنی قابل تعریف شہرت پر فخر کرتی تھی۔ ہر چیز کے ساتھ جو جماعت کی نگرانی میں تیار ہوتی تھی ایک تصدیق نامہ بھی دیا جاتا تھا۔ اس تصدیق نامے میں مال کے اچھے اور معیاری ہونے

کی تصدیق کی جاتی تھی۔

دستکاروں کی ان جماعتوں نے کام کی خرابی سے بچنے کے لئے لاتعداد قوانین بنا رکھے تھے۔ اُنھوں نے بے انتہا قواعد وضع کر کے یہ انتظام کیا تھا کہ چیزیں بے انتہا بہتر اور معیاری تیار کی جائیں، جو کارکن ان قواعد و ضوابط کی خلاف ورزی کرتے تھے۔ ان کو سخت سزائیں دی جاتی تھیں۔

لندن کے اسلحہ سازوں کی انجمن نے ۱۳۲۲ء میں حسبِ ذیل قانون بنایا تھا:-

"اگر کسی گھر میں کوئی قابل فروخت ہتھیار پایا گیا اور وہ معیاری قسم کا نہ ثابت ہوا تو ایسا ہتھیار فوراً لے لیا جائے گا اور میر بلدہ اور نائب میر بلدہ کے سامنے پیش کیا جائے گا تاکہ وہ اس کا فیصلہ کریں کہ یہ مال اچھا ہے یا بُرا۔"

ان جماعتوں کے نگرانِ کار کام کی نگرانی کے لئے دورے کرتے رہتے تھے۔ وہ کارکنوں کے باٹ اور ان کے پیمانے دیکھتے اور جانچتے رہتے تھے۔ وہ اُس خام مال کا بھی جس سے چیزیں تیار ہوتی تھیں، معائنہ کرتے تھے۔ اور تیار شدہ چیزوں کی نوعیت کے متعلق بھی رائے قائم کرتے تھے۔ ہر چیز پر بڑی گہری تنقیدی نگاہ ڈالی جاتی تھی اور چیز کی نوعیت کی طرف سے پورا اطمینان ہونے کے بعد اُس پر مہر لگا دی جاتی تھی۔ یہ سب تدبیریں صرف اس مقصد سے اختیار کی جاتی تھیں کہ جماعت دستکاراں کی نیک شہرت کو نقصان نہ پہونچے اور ان کی تجارت کے فروغ میں کسی قسم کا کوئی فرق نہ آئے۔ شہر کے ذمہ دار حاکم بھی عام شہریوں کے مفاد کی حفاظت کے لئے اس قسم کی تدابیر کو ضروری سمجھتے تھے۔ عوام کے مزید اطمینان اور ان کے مفاد کی مزید حفاظت کے لئے دستکاروں کی بعض جماعتیں اپنی مصنوعات پر "صحیح قیمت" کی مہریں بھی لگاتی تھیں۔

"صحیح قیمت" سے کیا مراد تھا؟ اس سوال پر غور کرنے کے لئے ہم کو قرونِ وسطیٰ کے ان تصورات پر نگاہ رکھنی ہوگی جو اُس زمانے میں سود خواری کے لئے قائم کئے گئے تھے۔ اور

یہ بھی دھیان میں رکھنا ہوگا کہ جائز و ناجائز کی فکریں اور قیدیں اُس زمانے کے اقتصادی نظام پر اثر انداز تھیں۔ اِس زمانے کا اقتصادی ڈھانچہ ان بندھنوں سے آزاد ہے لیکن اُس زمانے کے تصورات اِس زمانے سے بہت مختلف تھے۔

قرونِ وسطیٰ میں جب خرید و فروخت میں مبادلے (PARTAR) کا طریقہ رائج تھا۔ تجارت صرف اپنے نفع کے خیال سے نہیں کی جاتی تھی بلکہ اُس زمانے کی تجارت میں بیچنے اور خریدنے والے دونوں کا مفاد پیشِ نظر رہتا تھا۔ یہ خیال رکھا جاتا تھا کہ بیچنے اور خریدنے والے دونوں یکساں نفع اُٹھائیں اور یہ نہ ہو کہ اس مبادلہ میں ایک دوسرے کا کچھ حق دبا بیٹھے۔ تم نے ابھی پانچ گیلن شراب کے عوض میں میرا اوور کوٹ خریدا تھا۔ یہ خرید و فروخت دونوں کی برابر قیمت کا اندازہ کرکے ہوئی تھی۔ میرے اوور کوٹ میں جو اون لگا تھا اور میں نے اُس کے کاتنے اور بُننے پر جو محنت صرف کی تھی اُس کی مجموعی قیمت تمہارے انگوروں کی قیمت اور تم نے ان کے نچوڑنے اور شراب بنانے میں جو محنت صرف کی تھی، اُس کی مجموعی قیمت کے برابر ہوتی تھی۔ اشیا کے مبادلے کے بعد جب روپیہ خرید و فروخت کا ذریعہ بن گیا یہی اصول اپنی جگہ قائم رہا۔ کاریگر اچھی طرح جانتا تھا کہ اُس نے اپنی مصنوعات میں جو مال لگایا ہے اور اُس کی تیاری پر اُس کی جو محنت صرف ہوئی ہے اُس کی مجموعی قیمت کیا ہے۔ یہی مال اور محنت کی مجموعی قیمت تیار شدہ مال کی قیمت ٹھہرتی تھی اور اسی قیمت پر وہ اپنی مصنوعات کو بیچ ڈالتا تھا۔ وہ چیزیں جنھیں یہ کاریگر تیار کرتے تھے اور جو بازار میں خریدی اور بیچی جاتی تھیں، اپنی "صحیح قیمت" رکھتی تھیں، یہ صحیح قیمت اتنی ہی ہوتی تھی جتنی ان چیزوں کی تیاری پر واقعی لاگت آتی تھی۔ اس سے ایک پیسہ زائد لینا کاریگر کے لئے جائز نہ تھا۔ سینٹ تھامس اکوناس (ST. THOMAS AQUINAS) نے اس مسئلہ پر بڑے زوردار الفاظ میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے:-

"عوام کے مفاد کے لئے تجارت کا جو طریقہ مقرر کیا گیا ہے۔ اُسے ایک کے لئے زیادہ نفع بخش اور دوسرے کے لئے کم نفع بخش نہ ہونا چاہئے۔ چیز کی قیمت اُس کی اصل لاگت سے بڑھ جائے

یا گھٹ جائے۔ دونوں حالتوں میں انصاف کی مطلوبہ شرط پوری نہیں ہوتی ہے، اس لئے اصل قیمت سے زیادہ پر بیچنا یا اُس کی لاگت سے کم پر خریدنا اپنی جگہ پر بے انصافی ہے اور ایسا کرنا خلاف قانون ہے۔"

اُس زمانے میں ان بے انصاف تاجروں کے ساتھ جو صحیح قیمت سے زیادہ وصول کرنا چاہتے تھے کیا برتاؤ کیا جاتا تھا؟ قرون وسطیٰ کے شہری ان لالچی منافع خوروں کی بڑھتی ہوئی ہوسِ زر سے اپنے مفاد کی حفاظت کس طرح کرتے تھے؟ ایک واقعہ سے ہم کو اس سوال کا پورا اور صحیح جواب مل جاتا ہے؟

"پس جب روٹی کی قیمت بڑھتی ہے یا جب لندن کے پھل بیچنے والے (اس احساس سے مجبور ہو کر کہ وہ محض غریب اور سادہ مزاج ہونے کی وجہ سے نقصان میں ہیں اور اگر وہ نفع اندوزوں کا مشورہ قبول کر کے اقدام کریں تو وہ مالدار اور طاقتور ہو سکتے ہیں) اجتماعی طور پر پھلوں کی قیمت بڑھا دیتے ہیں تو شہری اور کسان محض طلب اور رسد کے اصولوں کے سہارے پاؤں توڑ کر چیزوں کے سستے ہونے کا انتظار نہیں کرتے بلکہ وہ تمام اچھے عیسائیوں کی تائید سے مضبوط ہو کر اُٹھتے ہیں اور آٹے کی چکی کے مالکوں کا عدالت کے کٹہرے میں اور پھل والوں کا میر بلدہ کے اجلاس میں مقابلہ کرتے ہیں۔ کلیسا کے پادری چھٹے حکم ربانی پر وعظ کہتے ہیں اور کتاب الامثال کے الفاظ "کہ نہ مجھے دولت دے اور نہ غربت بلکہ کافی روزی" کو اپنی گفتگو کا موضوع بناتے ہیں۔"

شہریوں کے یہ احتجاج لالچی پھل والوں کو میر بلدہ کی عدالت میں کھینچ بلاتے تھے۔ اس واقعہ سے یہ حقیقت اچھی طرح ثابت ہو جاتی ہے کہ اشیاء کی صحیح قیمتوں کا تقرر صرف جماعت دستکاراں کے ضمیر و ایمان پر نہیں چھوڑا جاتا تھا، اگرچہ چرچ دولت کی ہوس کی برابر بُرائی کرتا رہتا تھا لیکن پھر بھی پھل والوں کو دولت مند بننے کی ترغیب دینے والے دواعی بے شمار تھے، اس لئے تاجروں پر ان معاملات میں پورا بھروسہ نہیں کیا جاتا تھا۔ جرمن لفظ طاشن (TAUSCHEN) کے

جس کے معنی مبادلہ (EXCHANGE) ہیں۔ دوسرے معنی دھوکہ (DECEIVE) بھی ہیں۔ مبادلہ اور دھوکہ دونوں کے لئے ایک ہی لفظ کا استعمال بڑا معنی خیز ہے۔ اس لئے اُس وقت کے حاکموں کے فرائض میں یہ بھی داخل تھا کہ وہ دیکھتے رہیں کہ چیزیں غیر مناسب داموں کے عوض میں نہ فروخت کی جا رہی ہوں۔ کارلسلے (CARLESLE) کے بیلف (BAILIFF) کو عہدہ کا چارج لیتے وقت یہ بھی قسم دی جاتی تھی کہ:۔

"تم دیکھتے رہوگے کہ کھانے پینے کی تمام چیزیں جو اس بازار میں آئیں گی اچھی اور عمدہ ہوں گی اور معقول قیمت پر بکیں گی"

جب کوئی جماعتِ دستکاراں اپنی اجارہ داری کے حقوق کا ناجائز فائدہ اُٹھاتی اور جائز اور مناسب قیمت لینے کے بجائے زیادہ نفع لیتی تو شہر کے حاکموں کو اختیار رہتا کہ وہ اس جماعت کے تمام "امتیازی حقوق" ضبط کر لیں۔

صحیح قیمت کا تصور اُس زمانے کے لئے جب تجارت کا حلقہ زیادہ وسیع نہ تھا اور شہروں کی آبادیاں بھی زیادہ بڑھی نہ تھیں، بالکل قدرتی تھی۔ بازاروں کی توسیع اور بڑے پیمانہ پر اشیا کی پیداوار نے معاشی تصورات میں بھی غیر معمولی تغیرات پیدا کئے "صحیح قیمت" کی جگہ "بازاری قیمت" رواج پانے لگی۔ غور سے دیکھو، معاشی دباؤ نے "سود خوری" کے متعلق نظریات میں کتنا تغیر پیدا کر دیا تھا۔ یہی صورت "صحیح قیمت" کے تصور کے ساتھ بھی پیش آئی اور یہ اقتصادی دباؤ میں کچل کر صفحۂ ہستی سے غائب ہو گئی۔

قرونِ وسطیٰ کے ابتدائی دور میں بازار کی حیثیت صرف مقامی ہوتی تھی اس کا کاروبار صرف شہر اور مضافاتِ شہر تک محدود رہتا تھا۔ دوسرے ملکوں اور بازاروں میں جو واقعات پیش آتے تھے اُن کا اثر ان شہروں اور بازاروں پر بہت کم پڑتا تھا۔ ان بازاروں میں قیمتوں کا فیصلہ صرف مقامی حالات پر منحصر ہوتا تھا لیکن حالات بھی ٹھہرے ہوئے نہ تھے۔ ان میں بھی تغیرات ہوتے رہتے تھے اور ان تغیرات کے ساتھ اشیاء کی قیمتوں میں بھی فرق ہوتا رہتا تھا

اگر آس پاس کے علاقوں میں کوئی بیماری پھیلتی اور اس بیماری کا اثر انگور کی فصل پر پڑتا تو انگور کم پیدا ہوتے اور وہ آس پاس کے مقامات تک اُس مقدار میں نہ بھیجے جاسکتے جس مقدار میں پہلے بھیجے جاتے تھے۔ ان حالات میں جب انگور کی پیداوار کم ہوتی تو اس کے دام بڑھ جاتے اور اس کو وہ لوگ آگے بڑھ کر خرید لیتے تھے جو اس کے زیادہ دام لگاتے تھے قیمتوں کا یہ ہنگامی اضافہ اس اضافے سے مختلف ہوتا تھا جو بعض تجارتی جماعتیں محض زیادہ نفع کمانے کی نیت سے، چیزوں کی معمولی قیمتوں پر کرنا چاہتی تھیں۔ ان قیمتوں میں جو ہنگامی اور قابو میں نہ آنے والے حالات کی وجہ سے بڑھ جاتی تھیں اور ان قیمتوں میں جنھیں بعض حریص اور نفع خور دوکاندار بڑھا کر مقرر کرتے تھے، بڑا فرق ہوتا تھا۔ یہ بات عام طور سے تسلیم کی جاتی تھی کہ قحط کے زمانے میں چیزوں کی قیمتیں بڑھ جاتی ہیں لیکن ان حالات کو غیر فطری سمجھا جاتا تھا اور ان کے وجوہ بھی وہی غیر معمولی حالات قرار دیئے جاتے تھے۔ ان ہنگامی اور غیر معمولی حالات کا اثر "صحیح قیمتوں" پر نہیں پڑتا تھا اور کسی قسم کا مزید نفع کسی حال میں بھی منصفانہ نہیں سمجھا جاتا تھا۔ کاشتکار کے لئے ان سالوں میں جب فصلیں اچھی نہ ہوتی تھیں۔ عام سالوں کے مقابلے میں غلے کی قیمت کچھ شرح بڑھا کر لینا جائز سمجھا جاتا تھا۔ اس کی وجہ صرف یہ ہوتی تھی کہ قحط کے دنوں میں اس غریب کے پاس بیچنے کے لئے غلے کے بورے بھی بہت کم ہوتے تھے۔

"صحیح قیمت" کا تصور صرف چھوٹے، مقامی اور جمے ہوئے بازار کی اقتصادیات کے لئے ممکن تھا لیکن یہ ایسے اقتصادی نظام کے لئے جس کا احاطہ بہت بڑا ہے اور جو اپنے مخصوص حلقے سے باہر بھی پھیلا ہوا ہے، موزوں نہیں ہے۔ اقتصادی حالات کے تغیر نے اقتصادی نظریات میں بھی بڑا تغیر پیدا کر دیا۔ جب بازار صرف مقامی شہروں کے خریداروں اور بیچنے والوں اور آس پاس کی قریبی پیداوار تک محدود نہ رہے اور جب بیرونی تاجر دور دراز ملکوں سے سامان لانے خریدنے اور بیچنے لگے تو دنیا کے دوسرے وسیع حلقوں کے اثرات بھی بازاروں پر پڑنے لگے اور مقامی حالات کا جماؤ بھی اپنی جگہ چھوڑ کر نئے حالات کے لئے گنجائش پیدا کرنے لگا۔ یہ صورت

زیادہ تر میلوں میں جہاں "صحیح قیمت" کے ضابطے عمل میں نہ آتے تھے پیدا ہوتی تھی تجارت جیسی جیسی بڑھتی گئی، ان حالات میں بھی جو بازار پر اثر انداز ہوتے تھے، غیر معمولی فرق ہوتا گیا اور "صحیح قیمت" کا تصور زیادہ عرصے تک "قابل عمل" نہ رہ سکا۔ رفتہ رفتہ "صحیح قیمت" کی جگہ "بازار کی قیمت" نے لے لی۔

اگرچہ یہ تغیر نمایاں طور پر ہو رہا تھا لیکن عوام کو اس کے محسوس کرنے میں کافی وقت لگا اور محسوس کرنے کے بعد بھی انھوں نے اس حقیقت کے تسلیم کرنے میں بڑی دیر لگائی۔

خیالات اور رسوم حالات کے بدل جانے کے بعد بھی عرصے تک انسان کا دامن نہیں چھوڑتے وہ خواہ صورتیں جنھوں نے ان کو جنم دیا تھا ہمیشہ کے لئے بہت پہلے ختم ہو چکی ہوں کسی زمانے میں لوگ پالکی اور تام جھام پر چلا کرتے تھے۔ اس زمانے میں ان سواریوں کو لے کر چلنے والے قلیوں کی وردیوں میں خاص قسم کی پٹیاں لگی رہتی تھیں۔ یہ پٹیاں پالکی کی کرسی سنبھالنے کے کام آتی تھیں لیکن جب پالکی اور تام جھام کا رواج ختم ہو گیا اور اس قسم کی آخری سواری بھی بازار باہر ہو گئی تب بھی قلیوں کی وردیوں میں یہ پٹیاں عرصے تک لگائی گئیں، اور یہ خیال کیا جاتا رہا کہ یہ پٹیاں قلیوں کی وردی کا لازمی جزو ہیں۔ درزیوں نے اس وقت بھی یہ پٹیاں تیار کیں اور قلیوں کے سوٹوں میں لگائیں جب ان کی ضرورت کو ختم ہوئے مدت ہو چکی تھی۔

یہی صورت انسانی خیالات کے ساتھ پیش آتی ہے اور یہی صورت "صحیح قیمت" کے تصور کے ساتھ بھی پیش آئی۔ یہ تصور اس زمانے میں پیدا ہوا تھا جب بازار پر پرانے جمے ہوئے حالات کا قبضہ تھا اور جب ہر چیز جو قیمتوں پر اثر انداز ہوتی تھی اس حلقے کے اندر ہی پیدا ہوتی تھی اور مقامی جماعتیں ان سے خوب واقف ہوتی تھیں لیکن یہ تصور اس وقت بھی باقی رہا جب حالات بدل گئے اور جب بہت دور دراز مقامات کے نامعلوم اثرات مقامی بازاروں میں دبے پاؤں داخل ہونے لگے۔

کوئی شبہ نہیں ان نئے حالات نے زندگی کا ایک نیا طرز پیدا کر دیا تھا۔ یہ نیا طرز حیات

ہم کو جان. بریڈن (JEHAN BURIDAN) کی تحریروں میں. جو چودھویں صدی عیسوی میں پیرس یونیورسٹی کا رکٹر (RECTOR) تھا، ملتا ہے. یہ لکھتا ہے :۔

"کسی چیز کی قیمت اُس کی ذاتی حیثیت (INTRINSIC WORTH) کو دیکھ کر نہیں مقرر کی جا سکتی. بلکہ یہ ضروری ہے کہ اُس کی قیمت کے تعین کے وقت انسانی احتیاج کو بھی پیش نظر رکھا جائے. جو شے جس حد تک انسانی ضروریات کو پورا کرتی ہے اُسی حد تک اُس کی قیمت کو بڑھایا جا سکتا ہے"۔

بریڈن (BURIDAN) یہاں رسد اور طلب کے مسائل پر گفتگو کر رہا ہے. اُس کا خیال ہے کہ اشیاء حالات سے بے نیاز ہو کر اپنی کوئی مقررہ قیمتیں نہیں رکھتی ہیں. یہی طرز خیال تھا جس نے اس منزل پر پہونچ کر "صحیح قیمت" کے تصور کو بازار باہر کر دیا اور اُس کی جگہ "بازار کے بھاؤ" لے لی۔

قیمت کے تصور میں. جو تغیر ہوا تھا اُس نے ان منظم جماعتوں (GILDS) کی تنظیم پر بھی بہت اثر ڈالا. تاریخ تغیرات کی داستان ہے. اس باب کی ابتدا ان حالات کے بیان سے ہوئی ہے. جو ان جماعتوں کی پیدائش اور تنظیم کا باعث ہوئے اور اب یہ داستان ان حالات کے بیان پر ختم ہو رہی ہے جنھوں نے اس نظام کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے یہ دور ہی ختم کر دیا۔

اس جماعتی نظام (GILD SYSTEM) کی دو بنیادی خصوصیات تھیں. اس نظام میں تمام مالک کاریگر آپس میں مکمل مساوات رکھتے تھے. اس کی دوسری خصوصیت وہ آسان دستور تھا جس کے ماتحت معمولی کاریگر اجیر" ترقی کر کے مالک بن سکتے تھے. یہ خصوصیات تیرھویں چودھویں صدی عیسوی تک جو اس جماعتی تنظیم کے شباب کا زمانہ ہے، باقی رہیں. اس زمانے کے بعد حالات نے پلٹا کھایا اور اس قدیم نظام کا تانا بانا بدل گیا۔

اس بدلے ہوئے زمانے میں مالک کاریگروں کی باہمی مساوات پرانی داستان بن گئی. یہ تغیر یکبارگی تمام جماعتوں میں نہیں ہوا، لیکن بعض جماعتوں میں جہاں بعض مالک بہت دولت مند

ہو گئے تھے، یہ قدیم مساوات بہت تیزی سے ختم ہونے لگی۔ ان دولت مند مالکوں نے اپنے بدقسمت غریب مالک کاریگروں کو حقیر سمجھنا شروع کیا۔ اور آگے چل کر ان دولت مندوں نے اپنی علیحدہ جماعتیں بنالیں۔ اب بڑی اور چھوٹی جماعتیں علیحدہ علیحدہ ظاہر ہونے لگیں۔ ان چھوٹی جماعتوں کے مالک کاریگر بھی اپنے اجیر کاریگروں کے ساتھ ان بڑی جماعتوں کے مالکوں کے لئے محنت کرنے لگے۔ جماعت تجار (GILD MERCHANT) تم پچھلے دنوں میں دیکھ چکے ہو، پورے شہر کی تجارت کی اجارہ دار تھی۔ آگے چل کر اس کی جگہ جماعت دستکاراں (CRAFT GILD) نے لے لی تھی۔ دستکاروں کی یہ جماعتیں صرف ان چیزوں کا کاروبار کرتی تھیں جو ان کے کارخانوں میں بنائی جاتی تھیں بعض حالات میں تو بعض تاجروں نے عام اشیار کی تجارت بند کردی اور صرف کسی ایک مخصوص چیز کی تجارت میں ترقی کی اور اس صورت سے ختم ہونے کے بجائے انھوں نے ایک بڑی جماعت تجار کی حیثیت سے خوب ترقی کی۔

بعض دوسری صورتوں میں جماعت کے دولت مند ارکان نے پیداوار کا کام چھوڑ کر اپنی توجہ صرف کاروبار پر مبذول کردی۔ انھوں نے اپنی ایک علیحدہ جماعت بنالی اور اس جماعت میں کام کرنے والے کاریگروں کے لئے کوئی گنجائش نہیں رکھی۔ لندن کی لیوری کمپنیاں (LIVERY COMPANIES) پیرس کی کارپس ڈی میٹیر (CORPS DE METEIR) اور فلورنس کی آرٹی میگیوری (ARTI MAGGOIRI) اس قسم کی نئی جماعتوں کی چند مثالیں ہیں اس قسم کی چند دولت مند اور طاقتور جماعتیں بازار پر حکومت کرنے لگیں۔ پہلے چھوٹے اور بڑے مالک سبھی بلا امتیاز جماعت کے با اختیار عہدہ دار ہو سکتے تھے لیکن اب امیروں اور غریبوں کے درمیان جماعتی امتیاز کے موٹے موٹے پردے پڑ گئے تھے، اور نوبت آگئی تھی کہ:-

"فلورنس کے پرانے کپڑے کے تاجر جو سڑکوں پر پھیری لگا لگا کر اپنے کپڑے بیچتے ہیں اور روٹیوں کے وہ تاجر جو روٹیوں کا ٹوکرا اپنی پیٹھ پر لادے گلی گلی چلاتے پھرتے ہیں جماعت کے صدر نہیں منتخب ہو سکتے۔"

تجارتی جماعتوں پر پورے تسلط کے بعد حکومت بلدیہ کے قلمدان تک دسترس کوئی بڑی بات نہ تھی۔ ان طاقتور جماعتوں کے ارکان نے یہ قدم بھی جلد ہی اُٹھا لیا۔ وہ رفتہ رفتہ شہر کے حکمراں بن گئے اور ہر جگہ زیادہ دولت مند اور با اثر لوگ شہر کی کونسل کے لازمی ممبر سمجھے جانے لگے۔ پوری مملکت میں اونچی پیدائش شرافت کا نشان تھی لیکن شہروں میں دولت شرافت کی لازمی علامت سمجھی جاتی تھی" پندرھویں صدی عیسوی میں ڈورڈرشٹ (DORDRECHT) اور ہالینڈ کے دوسرے شہروں میں ہر جگہ حکومت بلدیہ صرف ان لوگوں کے ہاتھوں میں تھی جنہوں نے اپنی دولت کے بل پر اپنی جماعتِ اشرافیہ بنا لی تھی۔ بلدی حکومت کا پورا اختیار رکجیٹ (RIKJHET) اور روڈس چیپ (VROEDSCHAP) جماعتوں کے ہاتھ میں آگیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے دولت مندی اور دانش وری دونوں لازم وملزوم ہوں۔ ایک چھوٹی سی جماعت جس میں صرف چند مقررہ ممبر تھے، شہر کی حکومت کے لئے عہدہ دار مقرر کرتی تھی وہی میر بلدہ کا انتخاب کرتی تھی اور اس منتخب کی ہوئی جماعت کے ذریعہ سے پورے شہر کی حکومت پر حاوی رہتی تھی۔"

ہالینڈ کے تمام شہروں میں جو صورت حال تھی وہی قریب قریب جرمنی کے شہروں میں بھی پائی جاتی تھی۔ لیوبک (LUBECK) میں تاجر اور دولت مند شہری شہر کی حکومت پر قابض تھے ان کی کونسل مجلس قانون ساز، عدالتِ عالیہ اور مجلس تشخیص محصول پر پوری طرح حاوی تھی اور غیر محدود اختیارات کے ساتھ شہری زندگی کے تمام شعبوں پر چھائی ہوئی تھی۔

ایک دوسری بڑی وجہ جو جماعتی نظام (GILD SYSTEM) کی تباہی کا موجب ہوئی اور تھی۔ مالک کاریگروں اور اجیر کاریگروں میں مرتبے کا فرق دن بدن بڑھنے لگا تھا جماعتی تنظیم کی ابتدا میں امیدوار، اجیر اور مالک، یہ ترقی کے تین زینے تھے۔ لیکن اب یہ درجے امیدوار اور اجیر تک محدود ہو کر رہ گئے تھے۔ اور اب یہ عملی طور پر مشکل ہوتا جا رہا تھا کہ کوئی محنت کش مزدور مالک کے درجے تک ترقی کر سکے۔

اب شہروں کی آبادی بھی بڑھ رہی تھی۔ پرانے مالکوں کو اپنے قدیم حقوق کی حفاظت کی فکر دامن گیر ہو رہی تھی۔ انھوں نے ایسے قوانین وضع کیے کہ ترقی کے آخری زینوں تک پہونچنا زیادہ مشکل ہو جائے اور چند خوش قسمتوں کے علاوہ کوئی شخص دولت اور مرتبے کی دیوی سے ہمکنار نہ ہو سکے۔ مالک بنانے کے جو شرائط تھے وہ اور سخت کر دیئے گئے۔ داخلے کی فیس اتنی بڑھا دی گئی کہ چند خوش قسمت دولت مندوں کے علاوہ کوئی دوسرا ادا نہ کر سکے نچلے طبقے کے مزدوروں کی ذمہ داریاں اور بڑھا دی گئیں تاکہ وہ مالک بننے کی کبھی آرزو ہی نہ کر سکیں لیکن چند خوش قسمتوں کے لئے آسانیوں کی کمی نہ تھی اور ان کے لئے مالک بننا بہت آسان تھا

انس (AMIENS) میں ۱۴۰۶ء کے قوانین کے بموجب مصوروں اور سنگ تراشوں کی انجمن میں امیدواروں کے لئے تربیت کی مدت تین سال مقرر کی گئی تھی۔ اس مدت کی تکمیل کے علاوہ ہر امیدوار کو اپنے ماہر فن استاد کو جس کی نگرانی میں وہ کام سیکھتا تھا پچیس لیور[ل] ادا کرنے پڑتے تھے لیکن اگر مالکوں کے لڑکے یہ کام سیکھنا چاہتے اور اپنے آبائی پیشے میں ترقی کرنے کی نیت رکھتے تو ان کو کام شروع کرنے کے لئے صرف معمولی تجربے کی ضرورت ہوتی تھی۔ ان کے لئے داخلے کی فیس کی شرح بھی گھٹا کر دس لیور کر دی گئی تھی۔

مالکوں کی یہ صف بندی ہم کو ان قوانین اور ضابطوں میں زیادہ صاف اور مکمل نظر آتی ہے جو پیرس کے پارچہ بافوں کی انجمن نے بنائے تھے۔ اس ایکٹ کے الفاظ ہیں۔

"سوا مالک کے لڑکوں کے اور کوئی شخص مالک پارچہ باف نہ ہو سکے گا"

اجیر کاریگروں کے دلوں پر کیا گذر رہی ہوگی جب انھوں نے محسوس کیا ہوگا کہ ان کی ترقی کے تمام راستے مسدود ہو گئے ہیں اور اب اس کا کوئی امکان نہیں کہ وہ ترقی کر کے مالک کارخانہ دار بن سکیں؟ اس صورت حال سے بیزاری ان کے لئے قدرتی بات تھی۔ وہ اب اچھی طرح محسوس کرنے لگے تھے کہ ان کے مفاد اور حقوق مالکوں کے مفاد اور حقوق سے بالکل

ل LIVRE - پرانا فرانسیسی سکہ جو تقریباً دس آنے کے برابر ہوتا ہے۔

متضاد تھے۔ پھر آخر انھوں نے کیا قدم اُٹھایا؟ انھوں نے بھی اجیر کاریگروں کی جماعتی تنظیم کی اور اجیر کاریگروں کی انجمنیں بنا ڈالیں جس طرح مالکوں نے مختلف اقسام کی مصنوعات کی اجارہ داری حاصل کرلی تھی اُسی طرح ان انجمنوں نے بھی کام کی اجارہ داری حاصل کرنے کی کوشش کی۔ پیرس کے کیلیں ڈھالنے والے مزدوروں نے یہ حق تسلیم کرالیا تھا کہ جب تک پیرس کے مزدور مل سکیں باہر کے لوگ کارخانوں میں کام پر نہ لگائے جائیں گے تلاوز (TOULOUSE) کے نان بائیوں، اور پیرس کے جوتے بنانے والوں نے اپنے مالکوں کی منظم جماعتوں کے مقابلے میں اپنی برادریوں کی پوری تنظیم کرلی تھی

ان اجیر کاریگروں کی انجمنوں نے، آج کل کی ٹریڈ یونینوں کی طرح، اپنے ممبروں کے معاوضوں میں اضافے کی کوششیں شروع کیں۔ اور آج کل کی ٹریڈ یونینوں کی طرح اُس زمانے میں بھی مالکوں نے ان کی مخالفت میں کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھی۔ مالکوں نے شہر کے با اختیار حاکموں تک اپنی شکایتیں پہونچائیں اور ان حاکموں نے ان مالکوں کو خوش کرنے کے لئے ان اجیر کاریگروں کی انجمنوں کو خلاف قانون قرار دے دیا۔ ۱۳۹۶ء میں لندن میں زین فروش مالکوں اور ان کے اجیر کاریگروں کے درمیان ایک نزاع اُٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ ہم کو ایک پرانی دستاویز سے پتہ چلا ہے کہ:۔

"ایک بناوٹی فرض کی آڑ لے کر بہت سے نوکروں نے، جو کارخانوں میں کام کر رہے ہیں، اجیر کاریگروں کو جوان کے ساتھ کام کر رہے ہیں اکسایا ہے (ان کو آج کی اصطلاح میں اشتراکی کہنا موزوں ہوگا۔ مصنف) انھوں نے اپنی انجمنیں بنالی ہیں۔ ان کی تحریک کا مقصد اپنی اجرت میں اضافہ کرانا ہے ــــــــــ اس لئے میر بلدیہ اور نائب میر بلدیہ نے فیصلہ کیا ہے کہ آئندہ سے یہ ملازمین تجارت کے مالکین کی براہ راست ماتحتی اور حکومت میں سمجھے جائیں گے۔ آئندہ ان کو جماعت بنانے کی اجازت نہ ہوگی وہ جلسہ بھی نہ کرسکیں گے۔ ان کو کسی قانون کے خلاف حرکت کی اجازت بھی نہ ہوگی۔"

فرانس میں بھی اسی طرح کے واقعات پیش آئے ۱۵۴۱ء میں فرانس کے ارکان حکومت نائب میر بلدہ اور لوائن (LYONS) کے باشندوں نے فرانسس اوّل سے شکایت کی کہ:-

"آخری تین سالوں میں کچھ ملازموں نے اور بعض بُرے چھاپنے والے اجیر کاریگروں نے عام اجیر کاریگروں کی بہت بڑی تعداد کو بغاوت پر آمادہ کر دیا ہے۔ انھوں نے آپس میں جماعت بندی کر کے مطبعوں کے مالکوں کو زیادہ اجرت ادا کرنے اور عمدہ خوراک دینے پر (جو قدیم روایات کے خلاف ہے) مجبور کیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ لوائن میں چھپائی کا کام بالکل بند ہو گیا ہے۔"

ان شکائیت کرنے والوں نے جو غیظ و غضب سے لبریز تھے۔ صرف شکایت ہی پر اکتفا نہیں کیا۔ بلکہ وہ تجویزیں بھی پیش کر دیں جو صورت حال کو قابو میں لانے کے لئے ضروری تھیں فرانسس نے "بڑی مہربانی" سے ان تجاویز کو قانون کی شکل بھی دیدی اور حکم دیدیا کہ:-

"یہ اجیر کاریگر اور مطبع کی ریاست کے امیدوار کارکن کسی امر پر عہد و پیمان نہ کریں گے اور اپنا کسی کو سردار یا لیڈر نہ چنیں گے۔ یہ نہ کوئی جھنڈا رکھیں گے اور نہ نشان۔ یہ اپنے گھروں اور اپنے مالکوں کے باورچی خانوں کے باہر اجتماع نہ کریں گے اور نہ کہیں اور کسی دوسری جگہ پانچ سے زیادہ تعداد میں اکٹھا ہوں گے۔ اگر وہ ایسا کرنا ہی چاہیں تو ان کو دربار کی اجازت اور منظوری حاصل کرنی ہوگی اگر وہ ان احکام کی خلاف ورزی کریں گے تو قید یا جلاوطن کر دئے جائیں گے اور ان کو سزا دیجائیگی ——— یہ اجیر کاریگر کوئی کام شروع کر کے اُسے بغیر ختم کئے ہوئے نہ ہٹیں گے اور کبھی اسٹرائک نہ کریں گے۔"

معاوضہ بڑھانے کی تحریک طاعون کی وبائے عام (BLACK DEATH) کے بعد خوفناک حد تک شدید ہو گئی تھی۔ ان حالات میں یہ صورت حال خلاف توقع بھی نہ تھی۔ "وبائے عام" نے کام کرنے والوں کا قحط پیدا کر دیا تھا اس لئے ان کی جتنی ضرورت تھی اُسی قدر ان کی اجرت کی

شرح بھی بڑھتی جارہی تھی جس طرح دیہاتوں میں مزدوری کی شرح کم رکھنے کے لئے قوانین پاس کئے جارہے تھے۔ اسی طرح شہروں میں بھی اسی مقصد سے نئے نئے ضابطے بنائے جارہے تھے۔ انگلستان میں ۱۳۴۹ء میں لیبر آرڈی ننس پاس ہوا۔ اس آرڈی ننس میں آیا ہے:۔

"کوئی شخص کسی آدمی کو نہ زیادہ اجرت دے گا اور نہ زیادہ اجرت دینے کا وعدہ کرے گا نوکروں کے راتب، ان کی محنت کے معاوضے اور تنخواہیں کسی مد میں بھی دستور سے زیادہ ادا نہ کئے جائیں گے۔ نہ کوئی شخص کسی طرح اور کسی انداز میں معمول سے زیادہ مانگے گا اور نہ دے گا ــــــ اگر کوئی شخص اس آرڈی ننس کی خلاف ورزی کرے گا تو اس کو اس رقم کا جو اس نے ادا کی ہے دوگنا جرمانہ ادا کرنا پڑے گا۔ زین، کھال اور جوتا اور کپڑا بنانے والے، لوہار، بڑھئی، معمار، کھپرے ڈھالنے اور بنانے والے، ملاح اور دوسرے کاریگر اور مزدور ان میں سے کوئی شخص اپنی مزدوری کی وہ شرح نہ طلب کرے گا جو اب تک ان کو نہیں ملتی رہی ہے۔"

۱۳۵۱ء میں فرانس میں بھی ایک اسی قسم کا قانون پاس ہوا تھا:۔

"جن لوگوں نے پچھلے سال انگور چنے تھے وہ اس سال بھی انگور کی بیلوں کی حفاظت کے ذمہ دار ہوں گے۔ اور ان کو طاعون سے پہلے جو شرح ملتی تھی اس سے صرف تہائی زیادہ ملے گا۔ اس سے زیادہ کچھ نہ دیا جائے گا۔ اگر ان سے اس سے زیادہ کا وعدہ کیا گیا ہوگا تب بھی اس وعدہ پر عمل نہ کیا جائے گا۔ اگر کوئی شخص کسی شخص کو ایک دن کی اجرت بھی اس شرح سے جو مقرر کی جا رہی ہے زیادہ ادا کرے گا تو دینے والا اور لینے والا دونوں ساٹھ سال بطور جرمانہ ادا کریں گے۔ اگر ان کے پاس اتنی رقم نہ ہوگی کہ وہ جرمانہ ادا کرسکیں تو ان کو چار دن کے لئے قید کردیا جائے گا۔"

یہ آرڈی ننس بظاہر نرم معلوم ہوتا ہے لیکن جرمانہ نہ ادا کرسکنے کی پاداش میں قید خانے بھی اسی غریب مزدور کو جانا پڑتا جس کے پاس ادا کرنے کے لئے کوئی رقم نہ ہوتی۔ سرمایہ دار

مالک کے لئے ان حالات میں قید بھگتنے کا کوئی امکان نہ تھا لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ پر ہے کہ غریب محنت کشوں سے قید خانہ بھرنے کے بعد بھی محنت کرنے والوں کی کمی کا کوئی علاج ممکن نہ تھا۔

یہ قوانین کامیاب نہ ہوئے۔ مالکوں نے زیادہ ادا کیا اور محنت کشوں نے زیادہ مانگا اور زیادہ ہی وصول بھی کیا۔ مزدوروں کی انجمنیں توڑ دی گئیں۔ ان کے ممبروں پر جرمانے کئے گئے اور وہ قید خانوں میں بند کر دئے گئے لیکن ان سختیوں سے تحریک کا زور کم نہ ہوا۔ پرانی انجمنوں کی جگہ پر نئی انجمنیں پیدا ہو گئیں اور زیادہ معاوضے اور بہتر حالات کے لئے اسٹرائکیں اور ہنگامے جاری رہنے لگے۔

کوئی شبہ نہیں اجیر کاریگر دوسرے محنت کشوں سے کچھ اچھی حالت میں تھے، اس لئے ان کو ان انجمنوں میں شریک ہونے کی اجازت نہیں دی گئی۔ دوسرے محنت کش مزدور دراصل کسی جماعت (GILD) میں کوئی حق نہیں رکھتے تھے۔ ان کی زندگی اپنے سرمایہ دار مالک کے رحم وکرم پر منحصر تھی۔ وہ اپنے اسی دولتمند مالک کے لئے بھوکے رہ رہ کر خون پسینہ ایک کرتے رہتے تھے۔ یہ غریب نہایت خراب اور غیر صحت بخش جھونپڑوں میں رہتے تھے۔ نہ اُن کے پاس خام مال تھا جس پر محنت کر کے وہ کچھ کما سکتے، اور نہ ان کے پاس اوزار تھے جن کی مدد سے وہ کام کر سکتے وہ درحقیقت اس وقت کے پرولتاری طبقوں کے جو اپنی محنت کے سوا کوئی سرمایہ نہیں رکھتے پیش رو تھے۔ وہ اپنی روزی کے لئے موجودہ محنت کش مزدوروں کی طرح اپنے سرمایہ دار مالک اور بازار کے مناسب حالات پر تکیہ رکھنے پر مجبور تھے۔ اُس زمانے کے شہروں میں انتہائی افلاس اور لامحدود امارت کی بے شمار مثالیں موجود تھیں۔ فلورنس میں جب اُس کے عروج و اقبال کا شباب تھا، بیس ہزار محتاجوں سے زیادہ نان شبینہ کے لئے ترس رہے تھے اور ان کے اوپر ایسے دولت مند لوگوں کی ایک جماعت تھی جو زندگی کی ہر نعمت سے بھرپور تھے۔

شہروں کو جاگیرداری نظام سے آزاد کرانے کے لئے، امیر، غریب، تاجر، مالک کارخانہ دار اور محنت کش عوام سبھی نے جدوجہد کی تھی لیکن مالِ غنیمت کی تقسیم کے وقت صرف اونچے طبقوں

کی تھیلیاں بھری گئی تھیں۔ نیچے طبقے کے عوام نے مالکوں کی تبدیلی کے علاوہ اپنے جہاد کا اور کوئی نتیجہ نہیں پایا۔ پہلے ان کی گردن پر جاگیردار سوار تھے اب ان کے بجائے شہر کے دولتمندوں نے ان کی گردنوں میں اپنی غلامی کا طوق ڈال دیا تھا۔ غریب محنت کش طبقوں میں بے چینی بڑھ رہی تھی ان کے ساتھ چھوٹے چھوٹے کاریگر بھی، جو اپنی قسمت سے خوش نہ تھے، شریک تھے۔ یہ سب ان طاقتور حاکموں کے خلاف کمربستہ ہو رہے تھے۔ چودھویں صدی عیسوی کا آخری حصہ، ان بغاوتوں کا زمانہ ہے جو ان غریبوں نے اپنی بے چینیوں کے اظہار کے لئے کی تھیں۔ یہ بغاوت بھی، کاشتکاروں کی بغاوت کی طرح پورے مغربی یورپ میں پھیل گئی، یہ ایک طبقاتی جنگ تھی غریب امیروں کے خلاف اور بدقسمت قسمت وروں کے مقابلے میں صف آرا ہو رہے تھے۔ بعض معرکوں میں غریبوں نے میدان مارا اور تھوڑے عرصے تک وہ شہروں کی سیاست پر قابض رہے اس تھوڑی سی مدت میں انھوں نے بہت مفید اصلاحیں کیں جن کی بڑی ضرورت محسوس کی جارہی تھی۔ بعض دوسرے میدان بھی ان کے ہاتھ رہے لیکن ان کی باہمی پھوٹ نے ان کو ابھرنے نہ دیا۔ اور بہت جلد ان کی جیت اُن کی ہار سے بدل گئی۔ اکثر مقامات پر فتح کی دیوی شروع ہی سے امیروں کے سروں پر سایہ فگن رہی لیکن ان لڑائی کی گھڑیوں میں ایسے لمحے بھی برابر آتے رہے جب بدقسمتی کا گدھ دور سے ان کی بوٹیوں میں تھرتھری پیدا کرتا رہا۔ وہ جیت تو گئے تھے لیکن پسماندہ طبقوں کی متحدہ طاقت نے بھی اپنا لوہا منوالیا تھا۔

غرضکہ اس دور کے بعد پیشہ وروں اور تاجروں کی جماعتیں (GILDS) اپنے زوال کی آخری منزلوں میں آگئیں، آزاد شہروں کی منظم طاقت پارہ پارہ ہوگئی۔ ایک مرتبہ پھر بیرونی طاقتوں نے ان پر قبضہ کیا، کوئی طاقتور نواب، شاہزادہ یا بادشاہ جسے وہ پہلے سے نہیں جانتے تھے اٹھا اور اس نے قومی حکومت کے ان بکھرے ہوئے غیر منظم طبقوں اور جماعتوں کو ملاکر ایک نئی قومی حکومت قائم کردی۔

بادشاہ داخل ہوتا ہے

مصنف کا کام بڑا آسان ہوتا اگر وہ دسویں یا گیارھویں صدی عیسوی میں اس قسم کی کتاب مرتب کر رہا ہوتا معلومات کا بڑا حصہ، جو اس کتاب میں پیش کی جا رہی ہیں، ان تحریروں کے مطالعہ کا نتیجہ ہے جو صدیاں گذریں لکھی گئی تھیں۔ یہ تحریریں زیادہ تر اجنبی اور غیر ملکی زبانوں (لاطینی، جدید یا قدیم فرانسیسی زبان یا جدید یا قدیم جرمن زبان) میں لکھی گئی ہیں لیکن قرونِ وسطیٰ کے ابتدائی دور کا مصنف، جب ماضی کی تحریروں اور دستاویزوں کی چھان بین کرتا تو اُسے پتہ چلتا کہ وہ سب اُسی زبان میں لکھی ہوئی ہیں جس میں اُسے سب سے زیادہ دسترس حاصل تھی۔ وہ لندن کا باشندہ ہوتا یا پیرس کا، ہمبرگ کا رہنے والا ہوتا یا امسٹرڈم اور روم کا اُسے ان تحریروں کے پڑھنے اور سمجھنے میں کوئی دشواری نہ محسوس ہوتی۔ لاطینی اُس زمانے کی عالمگیر زبان تھی اور تمام پڑھے لکھے لوگ اسے پڑھتے اور لکھتے تھے اُس زمانے کے طالب علم انگریزی فرنچ، جرمن، ڈچ اور اطالوی زبان نہیں پڑھتے تھے۔ وہ صرف لاطینی پڑھتے تھے۔ لوگ انگریزی فرانسیسی اور جرمن زبانوں میں باتیں کرتے تھے لیکن ایک زمانے تک یہ زبانیں تحریر میں نہیں لائی گئیں۔ اسپین کا پادری اسپین میں اپنی انجیل کی تلاوت لاطینی زبان ہی میں کرتا تھا۔ وہ اُسی طرح لاطینی الفاظ پڑھتا اور انہیں ادا کرتا تھا جس طرح وہ انگریزی خانقاہ میں پڑھے اور ادا کیے جاتے تھے۔

اگر تم اُس زمانے کی کسی یونیورسٹی میں جاتے تو تم دیکھتے کہ تمام مغربی یورپ کے طالب علم آپس میں بغیر کسی دشواری کے پڑھ لکھ رہے ہیں۔ یونیورسٹیاں درحقیقت بین الاقوامی ادارہ تھیں۔

مذہب بھی عالمگیر حیثیت رکھتا تھا جو شخص اپنے عیسائی ہونے کا مدعی تھا اُس نے لازماً کیتھولک چرچ ہی میں آنکھیں کھولی تھیں۔ اس چرچ کے علاوہ اُس زمانے میں کسی دوسرے چرچ کا وجود ہی نہ تھا۔ تم چاہتے یا نہ چاہتے تم کو چرچ کے محصول ادا ہی کرتے تھے۔ اور تمھارے اوپر چرچ کے قواعد اور ضوابط کا نفاذ ہونا ہی تھا۔ چرچ کی نماز ساؤتھمپٹن (SOUTHAMPTON) اور جنوا (GENOA) ہر جگہ ایک ہی طرح ہوتی تھی۔ اُس زمانے میں مذہب کی قلمرو کی کوئی آخری حد نہ تھی۔

آج کل بعض لوگوں کا خیال ہے کہ بچے بھی قوم پرستی کا فطری جذبہ لے کر پیدا ہوتے ہیں لیکن حقیقت یہ نہیں ہے۔ قوم پرستی کے جذبات دراصل مسلسل مطالعہ اور اپنی قوم کے مشاہیر کے کارناموں کے بار بار سننے اور سنانے سے پیدا ہوتے ہیں۔ دسویں صدی عیسوی کے بچے اپنے اسکول کی کتابوں میں کوئی ایسی تصویر نہیں پاتے تھے جس میں ان کے ملک کے جہاز دشمنوں کے جہازوں کو ڈبو رہے ہوتے۔ اس کی ایک خاص وجہ تھی، اُس زمانے میں ممالک جس طرح ہم آج انھیں پہچانتے ہیں، وجود میں نہ آئے تھے۔

تم پچھلے باب میں پڑھ آئے ہو کہ صنعتوں نے اپنے گھروں کی چار دیواری چھوڑ کر شہروں میں قدم جمائے تھے۔ ان صنعتوں کا رجحان بھی صرف مقامی تھا، قومی نہ تھا۔ چسٹر کی منظم تجارتی اور صنعتی جماعتوں کے لئے لندن کا مال ویسے ہی "بدیسی" تھا جیسے پیرس کا مال ہو۔ لندن سے آنے والا مال چسٹر والوں کی تجارتی اجارہ داری میں ویسے ہی مخل ہوتا تھا جیسے پیرس کا مال ہوتا۔ تھوک فروش تاجر پوری دنیا کو اپنے کاروبار کا میدان سمجھتے اور دنیا کے ہر حصے میں اپنے قدم جمانے کیلئے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیتے تھے۔

لیکن قرونِ وسطیٰ کے آخر میں پندرھویں صدی عیسوی کے ختم ہونے سے پہلے حالات بالکل بدل گئے۔ قومیں وجود میں آگئیں اور قومی تقسیم پوری طرح نمایاں ہونے لگی۔ قومی ادب نے آنکھیں کھولیں اور صنعتوں کی دیکھ بھال نگرانی اور ترقی کے لئے قومی ضابطے بننے اور عمل

میں آنے لگے۔ قومی قوانین بنے اور قومی زبانیں نشو ونما پانے لگیں۔ انتہا یہاں تک ہوئی کہ عالمگیر چرچ نے تقسیم ہو کر قومی چرچوں کی شکل اختیار کر لی۔ لوگوں نے اپنے آپ کو میڈرڈ، کینٹ اور برگنڈی کے باشندوں کے بجائے اسپین، انگلستان اور فرانس کا شہری سمجھنا شروع کیا۔ انھوں نے محسوس کرنا شروع کیا کہ وہ کسی خاص شہر یا کسی خاص جاگیردار کے حلقہ بگوش نہیں ہیں بلکہ وہ اپنے بادشاہ کے جو پوری قوم کا سرپرست ہے فرمانبردار اور مطیع ہیں۔

آخر اس قومی ریاست کا وجود کیسے ہوا؟ اس کے بہت سے اسباب تھے۔ سیاسی، سماجی، مذہبی اور اقتصادی بہت سی وجوہ تھے، جن کے دباؤ سے دنیا نے یہ نئی کروٹ لی تھی۔ بڑی بڑی کتابیں اس دلچسپ موضوع پر لکھی گئی ہیں۔ ہم صرف چند وجوہ کی تشریح کے لئے اپنی اس کتاب میں گنجائش نکال سکیں گے۔ یہ وجوہ جن سے ہم بحث کریں گے صرف اقتصادی ہوں گے۔

سب سے بڑی اہم بات جو گیارھویں صدی عیسوی سے لے کر پندرھویں صدی عیسوی تک پیدا ہوئی، درمیانی طبقوں (MIDDLE CLASSES) کا ابھرنا اور وجود میں آنا ہے۔ رہن سہن کے طریقوں کے تغیرات نے اس نئے طبقے کو جنم دیا اور اس طبقے کے وجود نے سماج کے رہن سہن کے طریقوں میں اور بھی تغیرات پیدا کئے۔ سماج کے قدیم ادارے جنھوں نے پرانے نظام میں کچھ خاص مقاصد کی تکمیل کے لئے کچھ خاص خدمات انجام دی تھیں، اب بوسیدہ ہو کر اپنی زندگی کی آخری سانسیں پوری کر چکے تھے۔ اب نئے ادارے ان کی جگہ لے رہے تھے۔ یہی تغیر، دنیا کی تاریخ کا بنیادی قانون ہے۔

جس آدمی کے پاس دولت کی کثرت ہوتی ہے اسی کو یہ فکر دامن گیر رہتی ہے کہ اس کے علاقے میں جان و مال کی حفاظت کے لئے پولیس کافی تعداد میں موجود ہے یا نہیں، جو لوگ عام سڑکوں کو اپنا سامان یا روپیہ بھیجنے کے لئے استعمال کرتے ہیں وہی گلا پھاڑ پھاڑ کر مطالبہ کرتے ہیں کہ ان راہوں کو ڈاکوؤں اور بدمعاشوں نے محفوظ اور محصول کے اڈوں سے صاف ہونا چاہیے۔ بدامنی اور بے نظامی تجارت کے لئے بہت مضر ہے۔ اس لئے درمیانی

طبقے نظام اور امن کے خواہشمند تھے۔

اپنی اس خواہش کی تکمیل کے لئے وہ کس کے پاس جاتے؟ جاگیرداری نظام میں کون امن عام کی ذمہ داری لے سکتا تھا؟ پرانے زمانے میں جاگیردار اور ان کے مالکان اعلیٰ راستوں کی حفاظت کا انتظام کرتے تھے لیکن انھیں جاگیرداروں اور مالکان اعلیٰ کی لوٹ کھسوٹ کے خلاف یہ لڑ رہے تھے۔ جاگیرداروں کی فوجیں ہی لوٹ مار اور چوری کرتی تھیں۔ امیروں اور نوابوں کے سپاہی جب وقت پر تنخواہیں نہ پاتے، شہروں کو لوٹ لیتے اور جس چیز پر ان کا ہاتھ پڑتا چرا لے جاتے تھے۔ جنگجو امیروں کی باہمی لڑائیاں اکثر مقامی آبادیوں پر تباہیاں لاتی تھیں۔ کوئی بھی جماعت جیتتی نقصان شہر والوں کو برداشت کرنا پڑتا تھا۔ متعدد مقامات میں متعدد امیروں کی موجودگی ہی اس زمانے کے تجارتی راستوں کو غیر محفوظ اور تجارت کو دشوار بناتی رہتی تھی۔ وہ ایک مرکزی طاقت اور ایک قومی حکومت کی ضرورت شدت سے محسوس کر رہے تھے۔ ایک ایسی طاقت جو تمام طاقتوں کے اوپر قابو رکھ سکے اور جو جاگیرداری نظام کی ابتری کو ہمیشہ کے لئے دور کر سکے وقت کی سب سے بڑی ضرورت تھی۔ پرانے مالکانِ اعلیٰ اب اپنے سماجی فرائض کی بجا آوری کے لائق نہ رہے تھے، ان کے دن پورے ہو چکے تھے اور اب ایک مضبوط مرکزی طاقت کے قیام کا وقت آپہونچا تھا۔

قرونِ وسطیٰ میں بھی بادشاہ کو نظری طور پر کلی اختیارات حاصل تھے لیکن عملی طور پر اس کو کوئی بڑی طاقت نصیب نہ تھی۔ بڑے بڑے جاگیردار اپنی جگہ پر خودمختار ہوتے تھے۔ انھیں امیروں کی طاقت توڑنے کی ضرورت تھی اور اب وہی توڑی گئی۔

لیکن مرکزی حکومت یکبارگی نہیں بن گئی، اس کا ارتقا بہت آہستہ آہستہ ہوا اور وہ بہت دنوں میں اس قابل ہوئی کہ اپنی قومی طاقت کو پوری طرح استعمال کر سکے۔ اس کی ترقی کی راہ ایک زینے کی طرح نہ تھی جس میں ہر قدم اوپر کے نیچے پہنچتا اور چڑھنے والا آسانی سے مرکزی طاقت کے بامِ بلند پر پہونچ جاتا۔ یہ راستہ بہت ناہموار تھا اور مسافروں کو بہت سے

موڑوں سے گذر کر منزل تک پہونچنا تھا۔ یہ کام سال دو برس یا پچاس اور سو برس میں نہیں پورا ہوا بلکہ اس کی تکمیل میں صدیاں لگ گئیں لیکن وہ وقت آکر رہا۔ جب مرکزی حکومت پوری طرح قائم ہو گئی۔

امراء رفتہ رفتہ کمزور ہو رہے تھے۔ ان کی زمین کا بڑا حصہ ان کے ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ اور سرفوں کی بڑی تعداد ان کی غلامی سے آزاد ہو چکی تھی، شہر ان کی طاقت کا مقابلہ کر چکے تھے اور بڑی حد تک انھوں نے جاگیرداروں کا زور توڑ بھی دیا تھا۔ بعض مقامات پر ان کی خانہ جنگیوں نے ان کو تباہ کر دیا تھا اور وہ خود آپس میں ایک دوسرے کو نیست و نابود کر چکے تھے۔

بادشاہ نے اس لڑائی میں، جو شہر والوں نے جاگیرداروں کے خلاف چھیڑی تھی، شہر کے باشندوں کا ساتھ دیا۔ جو شکل ان جاگیرداروں کی طاقت کم کرنے کا باعث ہوتی وہی بادشاہ کا اثر و اقتدار بڑھا دیتی، شہر کے لوگ اس مدد کے معاوضے میں، جو وہ بادشاہ سے پاتے تھے، روپیہ قرض دیا کرتے تھے۔ بادشاہ اور شہر والوں کی یہ باہمی امداد بڑی اہمیت رکھتی تھی، اس روپئے کی مدد سے، جو بادشاہ ان شہروں کے تاجروں سے لیتا تھا وہ ان جاگیرداروں کی فوجی امداد سے بے نیاز ہو جاتا تھا، وہ آزادی سے رنگروٹ بھرتی کرتا، ان کو تنخواہیں دیتا اور تربیت دیکر باقاعدہ لشکر تیار کر لیتا۔ اس صورت سے وہ امیروں کی مدد اور ان کی وفاداری سے بالکل بے نیاز ہو جاتا۔ اس طرح بادشاہ جو فوج تیار کرتا تھا وہ امیروں کے فوجی دستوں کے مقابلے میں زیادہ اچھی ہوتی تھی۔ اس فوج کو فوجی خدمات کے سوا کوئی دوسرا کام نہیں کرنا پڑتا تھا، امیروں کے فوجی دستے غیر تربیت یافتہ ہوتے تھے، کوئی ایسا باقاعدہ نظام نہ تھا جو ان کو آپس میں ایک دوسرے سے مل جل کر باقاعدہ کام کرنے کا سلیقہ سکھاتا۔ ایک ایسی فوج جو صرف جنگی ضروریات کے لئے تنخواہ پاتی ہو، اسی غرض سے اس کو تربیت دی گئی ہو اور ان کو ایک نظام میں رہ کر کام کرنے کا سلیقہ سکھایا گیا ہو، وقت کی سب سے بڑی ضرورت تھی۔ ایک ایسی فوج کا قیام جو ہنگامی ضروریات کے لئے مستقل طور پر ہر وقت تیار کھڑی رہے جاگیرداری

نظام پر ایک بڑا اضافہ تھا۔

فوجی ہتھیاروں میں بھی بعض فنی ترقیاں ہو گئی تھیں۔ اب بارود اور توپوں کا زمانہ آگیا تھا۔ ان ہتھیاروں کے موثر استعمال کے لئے خاص تربیت اور اشتراکِ عمل کی ضرورت تھی۔ ایک جاگیردار اپنے پرانے ہتھیار تو میدان میں لا سکتا تھا لیکن اس کے لئے توپ اور بارود کا مہیا کرنا بڑا مشکل تھا۔

بادشاہ ان تجارتی اور صنعتی جماعتوں کا بڑا شکرگذار تھا جنھوں نے اس کو مدد دے کر اس قابل بنا دیا تھا کہ وہ مستقل طور پر ایک تنخواہ دار، تربیت یافتہ اور جدید ترین ہتھیاروں سے مسلح فوج رکھ سکے، بادشاہ بار بار اس ابھرنے والے نئے دولتمند طبقے سے قرض اور چندے کی اپیل کرتا تھا۔ چودھویں صدی عیسوی میں شاہ انگلستان نے لندن کے شہریوں سے مدد مانگی تھی۔ ہم کو اس زمانے کی ایک یادداشت میں ملتا ہے :-

"سر رابرٹ ڈی ایشی جو ہمارے آقا بادشاہ کے منشی ہیں لندن کی جماعتی انجمنوں کے دفتر میں تشریف لائے اور انھوں نے بادشاہ کی طرف سے میر بلدہ انڈریو اوبری کو پیغام پہونچایا کہ وہ اور نائب میر بلدہ ہمارے بادشاہ اور اس کی کونسل کے سامنے حاضر ہوں ——— بادشاہ نے سمندر پار کی لڑائی میں جو مصارف ہوئے ہیں ان کا زبانی ذکر کیا اور جو مصارف آئندہ ہونے والے ہیں ان کی جانب بھی متوجہ کیا اور بیس ہزار اسٹرلنگ کی درخواست کی۔ میر بلدہ وغیرہ نے متفق اللفظ ہو کر پانچ ہزار مارکس دینا طے کیا اور عرض کر دیا کہ وہ اس سے زیادہ نہ دے سکیں گے۔ ہمارے آقا بادشاہ نے یہ پیش کش رد کر دی۔ اور میر بلدہ، نائب میر بلدہ اور مجلسِ عوام کے ارکان کو اس عہد وفاداری اور اطاعت کی بنیاد پر جس کے وہ بادشاہ کے لئے پابند ہیں حکم دیا کہ وہ مذکورہ بالا امر کے متعلق زیادہ عقلمندی سے کام لیں ——— اور اگرچہ یہ بہت سخت کام تھا لیکن پھر بھی ان لوگوں نے طے کیا کہ وہ بادشاہ کی خدمت میں

پانچ ہزار اسٹرلنگ پیش کریں گے۔ بادشاہ نے یہ پیش کش قبول کرلی۔ بارہ آدمی منتخب کئے گئے اور ان کو قسم دی گئی کہ وہ شہر مذکور اور مضافات کے تمام باشندوں پر محصول تشخیص کریں، ہر شخص اپنی حالت کے بموجب ادا کرے تاکہ پانچ ہزار اسٹرلنگ وصول کر کے ہمارے آقا بادشاہ کی خدمت میں پیش کئے جا سکیں۔"

ایک لمحہ کے لئے یہ خیال نہ کرو کہ لوگوں کو روپیہ خرچ کرنے میں کوئی لذت محسوس ہوتی تھی نہیں، یہ کام ان کے لئے پسندیدہ نہ تھا۔ وہ یہ اور اسی طرح کی دوسری رقمیں بادشاہ کو صرف ان منافع کے لئے ادا کرتے رہتے تھے جو وہ وقتاً فوقتاً حاصل کرتے رہتے تھے۔ مثال کے طور پر اُس قانون پر نگاہ ڈالنے کی ضرورت ہے جو ۱۳۸۹ء میں ایک مرکزی طاقت نے تجارت کو فائدہ پہونچانے کی نیت سے نافذ کیا تھا۔ قانون کے الفاظ یہ ہیں:۔

"یہ فرمان نافذ کیا جاتا ہے کہ پورے انگلستان کی سلطنت میں صرف ایک باٹ اور ایک پیمانہ چلے گا، اگر کوئی شخص کوئی دوسرا پیمانہ یا باٹ استعمال کرتا ہوا پایا جائے گا تو اس کو چھ مہینے کے لئے قید کر دیا جائے گا۔"

مذکورہ بالا منفعت کے علاوہ چھوٹے چھوٹے نوابوں کے گشتی فوجی دستوں کی آئے دن کی تاخت و تاراج سے چھٹکارا بھی کوئی معمولی نفع نہ تھا جو اتنا روپیہ خرچ کرنے کے بعد ان شہریوں کو حاصل ہوا تھا، وہ ایک ایسی صاحب اختیار شخصیت کو، جو ان کو جاگیرداروں کی ظالمانہ حرکتوں اور پریشان کن مطالبات سے نجات دلاتی پوری طرح مدد دینے کے لئے تیار تھے۔ اقتصادی نقطۂ نظر سے بھی ان کے لئے یہی اچھا تھا کہ وہ ایک طاقتور رہنما کا ساتھ دیتے جو ان کی ہمدردیوں کے معاوضے میں ایسے قوانین نافذ کر سکتا جو عام لوٹ کھسوٹ کا خاتمہ کر سکتے، اس قسم کا ایک قانون ۱۴۳۹ء میں فرانس میں نافذ ہوا تھا۔ اس قانون کے الفاظ ہیں:۔

(یہ قانون) اس لوٹ مار اور ان بے جا سختیوں اور زیادتیوں کا خاتمہ کرنے کی غرض سے نافذ کیا جاتا ہے جو مسلح دستے برپا کرتے رہتے ہیں۔ یہ غارت گر دستے ایک عرصے سے

غارت گری پر زندگی گذارنے کے عادی ہو گئے ہیں"۔

بادشاہ فرمان نافذ کرتا ہے کہ کوئی شخص خواہ وہ کسی ریاست سے تعلق رکھتا ہو بلا شاہی منظوری فرمان اور اجازت یا پروانہ حاصل کئے ہوئے نہ کوئی فوج بھرتی کرے گا نہ اُس کی سربراہی کرے گا اور نہ کسی مسلح دستے یا آدمیوں سے تعلق پیدا کرے گا۔ اگر وہ اس فرمان شاہی کی خلاف ورزی کا مرتکب ہو گا تو وہ بادشاہ کے خلاف بغاوت کے الزام میں ماخوذ کیا جائے گا اور وہ اور اُس کی اولاد اور ورثا ہر اعزاز، عہدے، اور ملکیت سے محروم کر دئے جائیں گے اور ان سے امارت کے تمام حقوق اور اعزاز چھین لئے جائیں گے"۔

"بادشاہ فوجی سرداروں اور فوجی سپاہیوں کو بھی منع کرتا ہے کہ وہ تاجروں، مزدوروں جانوروں، گھوڑوں اور دوسرے بار برداری کے جانوروں کو خواہ وہ کھیتوں میں ہوں یا گاڑیوں میں لگے ہوئے ہوں، نہ پکڑیں اور نہ انھیں کسی قسم کی تکلیف دیں نہ گاڑیاں پکڑیں، نہ سامان لیں اور نہ سامان تجارت چھینیں اور نہ اُن کو اور اُن کے جانوروں کو تاوان میں پکڑیں بلکہ اُن کو اپنے طور پر کام کرنے اور آنے جانے دیں اور ان کو اپنا سامان تجارت اور چیزیں امن و امان کے ساتھ لانے اور لے جانے دیں، نہ اُن سے کچھ طلب کریں اور نہ کسی طرح اُن کو ستائیں۔ اگر وہ اس فرمان کی خلاف ورزی کریں گے تو اُن کو بھی وہی سزائیں دی جائیں گی جو اوپر بیان کی جا چکی ہیں"۔

گذشتہ زمانے میں بادشاہ کی آمدنی صرف اُسی محصول پر مشتمل ہوتی تھی جو خود اُس کی جاگیر سے وصول ہوتا تھا۔ اُس زمانے میں قومی طور پر تحصیل محاصل کا کوئی طریقہ رائج نہ تھا۔ ۱۴۳۹ء میں فرانس میں بادشاہ نے باقاعدہ محصول وصول کرنے کا طریقہ رائج کیا۔ تم کو یاد ہو گا پرانے زمانے میں امرا کو زمین دے کر ان کی خدمات حاصل کی جاتی تھیں لیکن اب معاشیات زر کے رائج ہو جانے کی وجہ سے اس قسم کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہی تھی۔ اب پوری مملکت میں محصول میں روپیہ

وصول کیا جاتا تھا۔ وصول تحصیل کا کام سرکاری ملازمین جو باقاعدہ تنخواہ زمین کے بجائے روپے کی شکل میں پاتے تھے، کرتے تھے۔ تنخواہ دار عہدہ دار بادشاہ کی طرف سے ملک کے ہر حصے میں مقرر تھے اور بادشاہ کی طرف سے حکومت کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ یہی کام جاگیرداری زمانے میں امرا، جو اپنی خدمات کا معاوضہ روپیے کے بجائے زمین کی شکل میں پاتے تھے، انجام دیتے تھے۔ یہ انقلاب جو اس وقت کی معاشی زندگی میں ہوا تھا بہت اہم اور نتیجہ خیز تھا۔

بادشاہ اس حقیقت سے خوب اچھی طرح واقف تھے کہ ان کی طاقت ان کی مالی حالت کی مضبوطی پر منحصر تھی۔ یہ حقیقت ان کی نگاہوں میں اور بھی واضح ہو چکی تھی کہ دولت کی بارش اسی وقت ممکن ہے جب تجارت اور صنعت کو فروغ کا پورا موقع ملے اس لئے بادشاہوں نے تجارت اور صنعت کی ترقی میں غیر معمولی دلچسپی لی۔ یہ حقیقت بہت جلد واضح ہو گئی کہ تاجروں اور دستکاروں کی جماعتوں کے قوانین، جو انھوں نے خاص خاص شہروں میں ایک چھوٹے سے گروہ کی اجارہ داری قائم رکھنے کے لئے بنائے تھے، تجارت اور صنعت کی ترقی کی راہ میں بڑی روک بنے ہوئے تھے جو شخص قوم پر بحیثیت مجموعی نظر ڈال رہا ہو اس کے نزدیک وہ تمام ضابطے اور قاعدے جو آپس میں ایک دوسرے سے ٹکرا رہے ہوں منسوخی کے لائق تھے اور ان تمام رقابتوں کا جو شہر کے مختلف گروہوں نے آپس میں پیدا کر لی تھیں، ختم کرنا ضروری تھا۔ یہ ایک بڑی احمقانہ بات تھی کہ ۱۴۲۳ء میں ژینک فرٹ کے چمڑے کے میلے میں برلن کے جوتے بنانے والوں کو بلانے کے لئے خاص آرڈی ننس کی ضرورت پڑی تھی۔ قومی بادشاہت کی بڑھتی ہوئی طاقت نے بادشاہوں کو مجبور کیا کہ وہ پوری قوم کے مفاد کے پیش نظر مقامی اجارہ داریوں کو ختم کر دیں۔ مملکت انگلستان کے ۱۴۳۶ء کے ایک قانون کا اقتباس مطالعہ کے لائق ہے:۔

"چونکہ مالک، نگراں اور دستکار انجمنوں کے ارکان، برادریوں اور کمپنیوں نے بہت سے خلاف آئین اور غیر معقول قوانین وضع کئے ہیں ——— اور چونکہ سماعت سزا اور اصلاح کا اختیار صرف بادشاہ کو حاصل ہے اس لئے ہمارا آقا بادشاہ مذہبی

اور دنیوی رہنماؤں کے مشورے اور عوام کی درخواست سے، اُس اختیار کی بنا پر جو پارلیمنٹ کو حاصل ہے یہ فرمان نافذ کرتا ہے کہ کوئی مالک، نگراں اور کسی جماعت کا کوئی رکن، کسی برادری اور کمپنی کا کوئی ممبر آئندہ نہ کوئی قانون یا ضابطہ بنائے گا اور نہ استعمال کرے گا تا وقتیکہ وہ اس کی منظوری عدالت مفصلات سے حاصل نہ کرلے۔ اور اس وقت جو منشور اور ضابطے رائج ہیں ان کو مفصلات کے حاکم عدالت کے سامنے رجسٹری کے لئے پیش کرے گا۔"

مذکورہ بالا قانون سے بھی زیادہ دور رس اور نتیجہ خیز قانون فرانس کے بادشاہ نے نافذ کیا تھا۔ اس قانون سے اچھی طرح پتہ چل جاتا ہے کہ اُس زمانے میں اُس ملک میں بادشاہ کی طاقت کتنی زیادہ بڑھ گئی تھی۔ قانون کے الفاظ یہ ہیں:۔

"چارلس، بادشاہِ فرانس شاہی کونسل کے گہرے غور وخوض کے بعد یہ فرمان نافذ کرتا ہے کہ ہمارے شہر پیرس میں پیشہ وروں اور برادریوں کا کوئی سرگروہ نہ ہوگا، ہم چاہتے ہیں اور حکم دیتے ہیں کہ ہمارا میر بلدہ ہر پیشہ ور برادری میں اُسی برادری کے بڑے لوگوں کو لیڈر چن لے۔ آج سے ان کو منع کیا جاتا ہے اب وہ ہماری یا میر بلدہ کی منظوری اور اجازت لئے بغیر آئندہ کوئی برادری کا اجتماع نہ کریں۔ اگر وہ اس فرمان کی خلاف ورزی کریں گے تو وہ باغی قرار دیئے جائیں گے اور ان کے ساتھ وہی سلوک کیا جائے گا جو تاجِ فرانس کے نافرمانوں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ ایسی صورت میں وہ اپنی جان اور مال کے نقصان کے خود ذمہ دار ہوں گے۔"

بڑے شہروں کی ان اجارہ دارانہ طاقتوں کا ہمیشہ کے لئے کچل دینا کوئی آسان کام نہ تھا یہ بہت بڑی کامیابی تھی جو قومی بادشاہت نے حاصل کرلی تھی۔ جرمنی اور اٹلی میں جہاں شہروں کی طاقت بہت بڑھی ہوئی تھی صدیوں تک کوئی مرکزی طاقت اس قابل نہ ہوسکی کہ شہر والوں سے اپنا لوہا منوائے۔ یہی وجہ ہے کہ قرونِ وسطیٰ کی یہ زبردست اور دولت مند قومیں سب سے آخر

میں اپنے مقاصد میں قومی اتحاد جو بدلتے ہوئے معاشی حالات کے لئے ضروری تھا، پیدا کر سکیں بعض دوسری مملکتوں میں بھی بعض شہروں نے اپنے اوپر کسی قسم کا تسلط برداشت نہ کیا اور انھوں نے اپنے قدیم حقوق کی حفاظت کے لئے جنگ تک کی لیکن حسد اور باہمی منافرت نے ان کو متحد ہو کر قومی طاقت کے سامنے صف آرا ہونے کا موقع نہ دیا۔ اور یہ اُن کی خوش قسمتی تھی کہ وہ جلد ہی شکست کھا گئے۔ انگلستان، فرانس، ہالینڈ، بلجیم اور اسپین میں ریاست نے شہروں کی اقتصادی انفرادیت ختم کر کے ان کو ایک مرکزی طاقت کا جزو بنا دیا۔

یہ سچ ہے کہ بہت سے شہروں اور جماعتوں نے اپنے حقوق کے بچانے کی بڑی کوششیں کیں لیکن وہ پوری طرح آزاد نہ رہ سکے۔ ان کی بڑی سے بڑی کامیابی یہی تھی کہ وہ شاہی اختیار کے ماتحت رہ کر صرف ایک حد تک اپنی آزادی کا استعمال کریں۔ قومی حکومت تمام طبقات کے مفاد سے بالا تھی۔ ایک مضبوط مرکزی حکومت نے اجتماعی طور پر متوسط طبقے کے لئے معاشی ترقیوں کی بہت سی راہیں کھول دی تھیں۔ بادشاہوں کی ساری طاقت اس روپئے میں پوشیدہ تھی جو وہ شہر کے متوسط طبقوں سے وصول کرتا رہتا تھا۔ بادشاہ کی طاقت جتنی بڑھتی گئی وہ اس شہری سرمایے اور شہری طبقوں کے مشوروں پر زیادہ سے زیادہ بھروسہ کرنے لگا۔ اُس کے حاکمانِ عدالت وزرا، اور سرکاری ملازمین عام طور سے اسی متوسط طبقے سے لئے جاتے تھے۔ پندرھویں صدی عیسوی میں فرانس کا جیکس کور (JACQUES COEUR) جو لوائن کا بینکر اور اپنے زمانے کا بڑا دولت مند آدمی تھا شاہِ فرانس کا مشیر بنایا گیا۔ ٹیوڈر خاندان کے زمانۂ حکومت میں ٹامس کرامول جو وکیل تھا اور ٹامس گریشم جو ریشمی پارچہ جات کا تاجر تھا، شاہِ انگلستان کے وزرار مقرر کیے گئے اور:-

"بادشاہ اور شہر کے صنعتی کارخانوں کے مالکوں کے درمیان ایک معاہدہ ہوا۔ صنعتی کارخانوں کے مالکوں نے اپنے سیاسی اور سماجی اثرات، اپنی ذہنی صلاحیتیں اور اپنی دولت کے ذرائع بادشاہ کی مرضی کے ماتحت کر دئے۔ بادشاہ نے اس کے بدلے میں

تمام اقتصادی اور سماجی حقوق ان کے حق میں محفوظ کردیے۔ اس نے عام مزدور پیشہ لوگوں کو ان کی ماتحتی میں دے دیا اور ان کو ان کی اطاعت اور فرمانبرداری کا سخت پابند بنادیا۔"

اس معاہدہ پر یہ مثل کتنی اچھی طرح صادق آتی ہے "کہ تم میری پیٹھ کھجلاؤ، میں تمھاری پیٹھ کھجلاؤں گا۔"

اب تک وینیشین (VENETIANS) اور ہنسٹک لیگ کے تاجر انگلستان میں تجارت کرتے آرہے تھے ہنسٹک لیگ نے اسٹیل یارڈ میں اپنا تجارتی دفتر اور گودام بھی قائم کر رکھا تھا۔ یہ کوئی تعجب خیز بات نہ تھی۔ غیر ملکی لوگ انگلستان کی تجارت درآمد و برآمد پر اکثر چھائے رہے تھے۔ انھوں نے روپیہ پیدا کرنے کے تجارتی حقوق گذشتہ بادشاہوں سے حاصل کر رکھے تھے۔ اب چودھویں اور پندرھویں صدی عیسوی میں انگلستان کے تاجروں نے بھی بر پرزے نکالنے شروع کیے تھے۔ تاجروں کی جماعت ایک حوصلہ مند جماعت تھی۔ غیروں کے ہاتھوں میں جو تجارتی کاروبار تھا اُس میں وہ گھسنا اور اُس پر قبضہ کرنا چاہتے تھے۔ شروع میں اُن کو کوئی خاص کامیابی نہیں ہوئی۔ بادشاہ کو ان رعایتوں کے عوض میں، جو وہ ان تاجروں کو دیتا تھا لمبی رقمیں ملتی تھیں۔ اس کے علاوہ بیرونی تاجروں کے خلاف کوئی سخت قدم اٹھانے میں بیرونی حکومتوں سے تصادم کا بھی اندیشہ تھا۔ لیکن انگلستان کے حوصلہ مند تاجر مستقل مزاجی سے جمے رہے اور ۱۵۳۴ء میں وینیشیوں کو اپنے حقوق سے دست بردار ہونا پڑا۔ چھ سال کے بعد جرمن تاجروں کی انجمن ہنسے (HANSE) نے بھی شاہ انگلستان سے شکایت کی:۔

"ہنسے (HANSE) کے تاجروں کو ایک زمانہ ہوا تجارت کی اجازت عطا کی گئی تھی اور جناب والا نے بھی اس اجازت کی تجدید فرمائی اور (فرمان نافذ فرمایا کہ) کسی قسم کے ناجائز مطالبات اور محصول ہم پر اور ہمارے سامان تجارت پر نہ عائد کیے جائیں گے لیکن ان تمام باتوں کے باوجود لندن کے فلر (FULLER) اور شیرمن (SHEARMEN)

کے حق میں ایسا فرمان نافذ کیا گیا ہے جس کی موجودگی میں ہنسے کا کوئی تاجر کوئی سامان پارچہ اور خام اور بے کتا ہوا اُون ساحلِ انگلستان سے باہر اُس سامان کی ضبطی کے خطرے سے بے نیاز ہو کر نہ لے جاسکے گا۔"

جرمن تاجروں کی انجمن ہنسے انگریزی اون خریدتی اور فلینڈرس (FLANDERS) اور جرمنی میں اُس کے کپڑے بنوایا کرتی تھی۔ انگلستان میں کپڑے کی صنعت اپنے شباب پر آرہی تھی اس صنعت کے مالکوں نے بھی انگلستان کے ان حوصلہ مند تاجروں کی، جو جرمن تاجروں کا مقابلہ کر رہے تھے پوری مدد کی۔ انگلستان کے پارچہ بافوں نے انگریز حوصلہ مند تاجروں سے مل کر لڑائی جیت لی۔ اس لڑائی میں ان کو گریشم سے، جو ریشمی پارچہ جات کا تاجر تھا اور جوان کی خوش قسمتی سے اُس زمانے میں شاہ انگلستان کا وزیر بھی تھا، بڑی مدد ملی

جرمن ہنسے کے حقوق رفتہ رفتہ ختم ہوتے گئے اور ۱۵۹۷ء میں اسٹیل یارڈ (لندن)، جو طاقتور جرمن تاجروں کا تجارتی ایوان تھا ہمیشہ کے لئے بند ہو گیا۔

کسان امن وامان کے ساتھ کھیتی باڑی کرنے کے آرزومند تھے۔ کاریگر یکسوئی کے ساتھ اپنی صنعت کو فروغ دینا چاہتے تھے اور تاجر اپنی ترقی کے لئے امنِ عام کے طلبگار تھے۔ ان سب جماعتوں نے ایک ایسی مرکزی طاقت کو جس کے حلقہ اثر میں ملک کی ساری جماعتیں آسکتی ہوں خوش آمدید کہا۔ ان کو ایسی طاقت کی ضرورت تھی جس کے قوانین مقامی جماعتوں پر، جو درجنوں کی تعداد میں تھیں، یکساں نافذ ہوں اور جوان کی جماعت بندیوں میں بھی ایک طرح کے اتحاد کی موجب ہو سکتی ہو۔ اس زمانے میں متعدد اسباب "قومیت" کے تصور کو جنم دینے کا موجب رہے تھے۔ ان اسباب میں "قومیت کا جذبہ" سب سے زیادہ موثر تھا۔ یہ جذبہ ہم کو جون آف آرک کی زندگی کی کشاکش اور اُس کی موت میں زیادہ نمایاں ملتا ہے۔ فرانس میں جاگیرداری نظام بہت مضبوط تھا۔ صد سالہ جنگ میں جو فرانس اور انگلستان کے درمیان ہوئی تھی، برگنڈی کے طاقتور ڈیوک نے انگریزوں سے مل کر فرانس کے بادشاہ کو متعدد شکستیں دی تھیں۔ جون نے، جو برگنڈی

کو مملکتِ فرانس کا ایک حصہ قرار دینا چاہتی تھی ڈیوک کو لکھا۔

"کنواری جین آرزو مند ہے کہ شاہ فرانس کے ساتھ ایک دیرپا صلح کرلی جائے وہ عاجزی اور خاکساری سے منت کرتی ہے کہ فرانس کی مقدس مملکت کے خلاف اب مزید فوج کشی نہ کی جائے۔"

قومی جذبات فرانسیسی فوج کے دل و دماغ کو متاثر کر رہے تھے اور ان کے دلوں کو ایک نئے اعتماد اور یقین سے بھر کر اُبھار رہے تھے۔ اب ان کو اپنے فرانسیسی ہونے کا احساس پیدا ہو چلا تھا۔ اور وہ شاہ فرانس کے مفاد کو اب اپنا ذاتی مفاد قرار دینے لگے تھے۔ جون نے اپنی خدمات قوم پرستی کے جذبات کی آبیاری کے لئے وقف کر دیں۔ اور اُس نے اپنی طرح بہتوں کو قوم پرستی کے جذبات سے لبریز کر دیا۔

ایک فرانسیسی سپاہی، جو ابھی تک کسی جاگیردار کی ملازمت میں ہوتا، جب جون کو یہ کہتے ہوئے سنتا کہ "میں کسی فرانسیسی کا خون گرتے ہوئے دیکھتی ہوں تو خوف اور دہشت سے میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں"۔ تو سوچنے لگتا کہ اُس کے جاگیردار کی زمینداری کے آگے بھی کوئی زمین ہے اور وہ اُس زمین کا بھی وفادار ہے۔ وہ زمین اُس کی مملکت ہے اُس کے جذبات وفاداری مقام کی قید و بند سے آزاد ہو کر پورے فرانس کو سمیٹ لیتے اور "مقام پرستی" کی جگہ قومیت کا جذبہ لے لیتا اس طرح ایک ایسا دور جس میں مملکت متحدہ کا ایک ذمہ دار با اختیار رئیس جو پوری سلطنت کا بادشاہ ہوتا، وجود میں آجاتا۔

برنارڈ شا اپنے ڈرامے سینٹ جون میں اس اُبھرتی ہوئی قوم پرستی کا تذکرہ کرتا ہے ایک انگریز پادری اور ایک انگریز جاگیردار آپس میں فرانس کے ایک فوجی سردار کی قابلیت پر گفتگو کرتے ہیں

پادری:۔ میرے سردار! وہ صرف ایک فرانسیسی ہے۔

جاگیردار:۔ ایک فرانسیسی؟ آپ نے یہ لفظ کہاں سے سُنا؟ کیا یہ برگنڈی اور برٹنی کے رہنے والے، پکارڈس اور گیسکنز، اب اپنے آپ کو اسی طرح فرانسیسی کہنے لگے ہیں جس طرح

ہمارے یہاں کے لوگ اپنے آپ کو انگریز کہنے لگے ہیں؟ کیا وہ واقعی فرانس اور انگلینڈ کا نام اپنا ملک سمجھ کر لیتے ہیں؟ اپنا ملک ——— اچھا تو بتایئے اگر سوچنے کا یہ طریقہ عام ہو گیا تو ہمارا اور آپ کا کیا حشر ہو گا؟

پادری:۔ کیوں میرے آقا؟ کیا ہم کو اس سے نقصان پہونچے گا؟

جاگیردار:۔ لوگ دو مالکوں کی اطاعت نہیں کریں گے۔ اگر "اپنے ملک کی خدمت کرو" کا نعرہ ایک مرتبہ لوگوں کے دلوں میں بیٹھ گیا تو ہم جاگیردار امرار کے سارے حقوق اور اختیارات ہمیشہ کے لئے ختم ہیں اور کلیسا کی شاہی بھی اپنے دن پورے کر چکی ہے۔"

یہ دور اندیش امیر یقیناً مستقبل کے دھندلے نشانات کو صحیح طریقے سے پڑھ رہا تھا۔ آخری طاقتور رقیب، جو قومی بادشاہت کے راستے میں رہ گیا تھا کلیسا تھا اور یہ لازمی تھا کہ آگے چل کر اس سے بھی ٹکر ہو۔ ان "قومی بادشاہوں" کے دماغوں میں ایک ریاست کے لئے دو رئیسوں کا تصور نہیں آتا تھا۔ پوپ کی طاقت، جاگیردار امیروں کی طاقت سے بھی زیادہ خطرناک تھی۔ پوپ اور بادشاہ میں جھڑپیں شروع ہوئیں اور بار بار ہوتی رہیں۔ سب سے پہلے جس پر بادشاہ اور پوپ میں نزاع ہوئی بشپ اور ایبٹ کے تقرر کے اختیار کا مسئلہ تھا۔ یہ سوال بہت اہم تھا۔ یہ جگہیں مالی اعتبار سے بہت نفع بخش تھیں۔ عوام کلیسا کو محصول ادا کرتے تھے اور اس طرح بڑی لمبی رقمیں چرچ کے خزانے میں آتی تھیں۔ یہ ایک دولت کا ڈھیر تھا جسے بادشاہ اور پوپ دونوں اپنے اپنے آدمیوں کو سونپنا چاہتے تھے۔ بادشاہ بڑی حریصانہ نگاہوں سے دولت پیدا کرنے والی ان جگہوں کو تاک رہا تھا اسی لئے پوپ کا یہ حق کہ وہ ان جگہوں پر اپنے اختیار سے لوگوں کا تقرر کرے ایک نزاعی مسئلہ بن گیا۔

چرچ کی دولت کی کوئی انتہا نہ تھی، یہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ پوری زمین کا نصف یا تہائی حصہ کلیسا کے قبضے میں تھا۔ زمین کے اتنے بڑے رقبے پر قابض ہونے کے بعد بھی وہ حکومت کو کوئی محصول ادا نہیں کرتے تھے۔ بادشاہوں کو روپئے کی ضرورت رہا کرتی تھی۔ وہ چاہتے تھے

کہ مالدار چرچ کی دولت پر بھی، جو برابر بڑھتی رہتی ہے محصول عائد کیے جائیں تاکہ حکومت چلانے کے مصارف پورے کرنے میں مدد مل سکے۔

کلیسا اور بادشاہ کے درمیان نزاع کی وجہ ایک یہ بھی تھی چرچ نے بھی اپنی عدالتیں کھول رکھی تھیں اور کچھ خاص مقدمات، باقاعدہ عدالتوں کے بجائے چرچ کی عدالتوں میں طے کر دیے جاتے تھے، اکثر چرچ کا فیصلہ شاہی عدالتوں کے فیصلوں کے خلاف بھی ہوتا تھا۔ اس سلسلے میں جرمانوں کا مسئلہ اور بھی نزاع کا موجب تھا۔ چرچ جرمانے کی رقمیں اپنے خزانے میں داخل کرنا چاہتا تھا اور بادشاہ ان رقموں کو جو جرمانے اور رشوت میں ملتی تھیں، اپنا حق خیال کرتا تھا۔

پوپ نے ایک اور اختیار بھی حاصل کر لیا تھا۔ وہ ملک کے اندرونی قومی مسائل میں بھی دخل دیتا رہتا تھا۔ اس صورت سے چرچ نے قومی بادشاہت کے ایک طاقت ور رقیب کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔

چرچ ایک فوق قومی (SUPER NATIONAL) طاقت تھا۔ اس کی زمین کی کوئی انتہا تھی اور نہ اس کی دولت کا کوئی شمار تھا۔ شاہی مملکت کی رعایا کی وفاداری کے جذبات چرچ کے ساتھ بھی بندھے ہوئے تھے۔ چرچ کے خزانے میں جو دولت آتی تھی وہ خراج کی شکل میں بادشاہ کے خزانے تک نہیں پہونچتی تھی اور اس طرح چرچ کے خزانے میں جو کچھ آتا تھا وہ "روم کے خراج" کی شکل اختیار کر لیتا تھا۔ بادشاہ کلیسا کا مخالف تھا۔ لیکن اس مخالفت کا صرف وہی ذمہ دار نہ تھا چرچ بھی اس مخالفت میں بادشاہ کا برابر کا حریف تھا۔ پوپ بونی فیس ہشتم (BONIFACE VIII) نے ۱۲۹۶ء میں لکھا تھا:-

> "دنیوی طاقتیں ارباب کلیسا کی بڑی مخالف ہیں، پرانے زمانے سے یہ کچھ دستور سا چلا آرہا ہے، نئے زمانے کے تجربوں نے بھی اس حقیقت کی پوری طرح تصدیق کر دی ہے"۔

چرچ میں جو خرابیاں تھیں وہ بھی لوگوں کی نگاہوں سے پوشیدہ نہ تھیں۔ ارباب کلیسا اپنے وعظوں میں، جو کچھ کہتے تھے اس پر کبھی عمل نہیں کرتے تھے۔ قول اور فعل کا یہ واضح اختلاف ایسا نہ تھا

جسے بیوقوف لوگ بھی محسوس نہ کر لیتے۔ دولت کا جائز اور ناجائز ہر راہ سے بٹورنا۔ ان کی زندگی کا معمول تھا۔ اینس سلویس نے (AENEAS SILVIUS) جو آگے چل کر پوپ پئیس دوم (PIUS II) کے نام سے مشہور ہوا لکھا ہے :۔

"روم میں روپیہ خرچ کئے بغیر کچھ حاصل نہیں ہوتا۔"

پیرے برکوائر (PIERRE BERCHOIRE) جو چوسر (CHAUCER) کے زمانے کا آدمی ہے لکھتا ہے :۔

"کلیسا کی دولت غریبوں کے کام نہیں آتی، بلکہ صرف ارباب کلیسا کے بھائی بھتیجے اس سے پالے جاتے ہیں۔"

قرونِ وسطیٰ کے کسی شاعر نے چودھویں صدی عیسوی میں حسب ذیل نظم لکھی ہے۔ اس نظم میں کلیسا کے ہر طبقے کے لوگوں کے متعلق، ان خیالات کا اظہار کیا گیا ہے جو اس وقت عوام میں پھیلے ہوئے تھے۔

"میں دیکھتا ہوں، پوپ امانت میں خیانت کر رہا ہے
یہ ہمیشہ دولت سمیٹتا رہتا ہے۔
لیکن پھر بھی غریب اس کی نگاہ کرم کے مستحق نہیں ٹھہرتے
یہ ہر طرح سے دولت گھسیٹنا چاہتا ہے
اور عیسیٰ کے پیروؤں کو زبردستی اپنی اندھی تقلید پر مجبور کرتا ہے
تاکہ یہ سنہرے ملبوس میں آرام سے زندگی گزار سکے۔"

ہر معزز صدر کلیسا کی حالت کچھ پوپ سے بہتر نہیں ہے۔
یہ صبح صادق سے لے کر شام کی تاریکی تک
اپنا وقت ان منصوبوں میں گزارتا ہے

کہ جس طرح بن پڑے جائز اور ناجائز ہر شخص کو لوٹ لے"

ہمارے بشپ بھی اسی طرح کے گناہوں میں لتھڑے ہوئے ہیں
وہ بڑی بے رحمی سے کھال کھینچتے ہیں
تاکہ مرغن اڑائیں!
تم اپنے سونے سے ان کی سرکاری مُہر خرید سکتے ہو
کسی فرمان کے لیے، اس سے بحث نہیں کہ اس میں کیا ہوگا۔
صرف سونا ایسی چیز ہے جو اُن کو چوری سے روک سکتا ہے"

جہاں تک تمام پادریوں اور چرچ کے چھوٹے عہدہ داروں کا تعلق ہے
خدا ہی بہتر جانتا ہے، ان میں بہت ایسے ہیں
جن کی روزمرہ زندگی کو ان کے روزمرہ کے اعمال جھٹلاتے ہیں
وہ چاہے جاہل ہوں یا عالم
وہ ہر مقدس نشانی کو بیچ کھانے کا عہد کر چکے ہیں
عوام کی مقدس قربانیاں بھی ان کا مالِ تجارت ہیں"

چھوٹے اور بڑے پادری نمائش کرتے ہیں
ان سخت اور خشک قوانین پر عمل کرنے کی
لیکن یہ ان کی ایک بیکار ریاکاری ہے
وہ جس طرح رہتے ہیں ہم جانتے ہیں
وہ جو کچھ گھر پر کرتے ہیں اپنے عہد و پیمان کے باوجود،

ان کی پرہیز گاری کی ساری نمائش بیکار ہے"۔

مارٹن لوتھر نے ۱۵۱۷ء میں اپنے پچانوے اقوال وٹن برگ کے چرچ کے دروازے پر چسپاں کئے تھے۔ اس سے صدیوں پہلے کلیسا کی بداعمالیاں اور رسوائیاں عوام کی نگاہ میں آ چکی تھیں پروٹسٹنٹ طبقے کی تجدید و اصلاح کی تحریک سے بہت پہلے کچھ مذہبی اصلاحیں ہو چکی تھیں۔ پھر آخر مغربی کیتھولک چرچ کے ٹکڑے اسی زمانے میں کیوں ہوئے اور عالمگیر چرچ کی جگہ قومی چرچ نے اسی زمانے میں کیوں لے لی؟ آخر اس زمانے سے پہلے، جب بیسیوں انقلابات آ چکے تھے، یہ انقلاب کیوں نہ آیا تھا؟ اس انقلاب کے لئے وہی زمانہ کیوں موزوں ثابت ہوا؟

پرانے زمانے کے مصلحین نے لوتھر (LUTHER) کالون (CALVIN) اور ناکس (KNOX) کی طرح اپنی تجدید و اصلاح کی تحریک صرف مذہبی امور تک محدود نہیں رکھی بلکہ انھوں نے مذہبی حدود سے بھی کچھ آگے بڑھ کر قدم جمانے چاہے۔ وکلف (WYCLIFFE) نے انگلستان میں کسانوں کی بغاوت کے روحانی لیڈر کی حیثیت اختیار کر لی۔ ہس (HUS) نے بوہیمیا میں صرف روم ہی کے خلاف بغاوت کی تبلیغ نہیں کی بلکہ اس نے کسانوں کی ایک اشتمالی تحریک شروع کر کے امراء کے حقوق اور اختیارات کے لئے ایک زبردست خطرہ پیدا کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کلیسا کے علاوہ دنیوی طاقتیں بھی ان کے مقابلے پر میدان میں آ گئیں اور انھوں نے ان کو کچل کر رکھ دیا۔

لوتھر اور اس کے بعد آنے والے مذہبی مصلحین نے اس قسم کی کوئی غلطی نہیں کی، انھوں نے کوئی مساوات پسند تحریک جس سے حاکم طبقے کے حقوق کو دھکا لگتا، نہیں شروع کی۔ لوتھر انتہا پسند نہ تھا۔ اس نے پسماندہ اور مظلوم طبقوں کا ساتھ دے کر اپنی کامیابی کے امکانات ختم نہیں کئے بلکہ اس نے جرمنی کے کسانوں کی بغاوت میں بھی جو اس کی تعلیمات سے متاثر ہو کر شروع کی گئی تھی، کسانوں کے بجائے حاکم طبقے کا ساتھ دیا۔ کلیسا کا یہ باغی کہا کرتا تھا:-

"میں ہمیشہ اُن کا ساتھ دوں گا جو بغاوت کو برا کہیں گے اور ان کے خلاف رہوں گا جو بغاوت پیدا کرتے ہیں"۔

یہ مصلح جو کلیسا کی ہیئت حاکمانہ کا شدید مخالف تھا۔ لکھتا ہے:۔

"خدا حکومت کو خواہ وہ کتنی ہی خراب کیوں نہ ہو، باقی رکھے گا۔ لیکن ان باغیوں کو امان نہ دے گا جو کسی منصفانہ مقصد کے لئے بھی حکومت کی مخالفت کریں گے۔"

جب ۱۵۲۵ء میں باغی کسان چلا رہے تھے کہ "حضرت مسیح نے تمام انسانوں کو آزاد قرار دیا ہے" لوتھر امراء کو آمادہ کر رہا تھا اور ان پر جوش الفاظ میں ان کو باغیوں کی مکمل بربادی پر اُبھار رہا تھا:۔

"جو ایک بلوائی کو قتل کرتا ہے وہ بہت صحیح کام کرتا ہے۔ اس لئے جو شخص قتل کر سکے، گلا گھونٹ سکے، یا چھرا بھونک سکے چھپ کر یا علانیہ تو ـــــ اگر تم اس مقابلے میں کام آ جاؤ تو تم مبارکباد کے قابل ہو، اس موت سے زیادہ شریفانہ اور اعلیٰ موت اور کوئی نہیں ہو سکتی"

لوتھر کی کامیابی کی دراصل سب سے پہلی وجہ یہی ہے کہ اس نے ان طبقوں کو جو صاحب اختیار اور طاقتور تھے، چھیڑنے کا ارادہ ہی نہیں کیا۔ تجدید اور اصلاح کی اس تحریک کی کامیابی کی دوسری بہت اہم وجہ یہ تھی کہ لوتھر، کالون اور ناکس نے لوگوں کی قوم پرستانہ جذبات کو اُبھارا تھا۔ اس زمانے میں قوم پرستی اپنے شباب پر آ رہی تھی اس لئے ان کی تحریک نے بہت مناسب فضا میں قدم جمائے۔ روم کے اقتدار اعلیٰ کے خلاف، قومی جذبات کے اُبھارنے کا وقت تھا۔ اس لئے اس کی مذہبی مخالفت نے ایک عام قومی تحریک سے مل کر اس کی کامیابی کے واضح امکانات پیدا کر دئے۔

جس زمانے میں پوپ اعظم کے اقتدار اعلیٰ کے خلاف قومی حکومت کے لئے جدوجہد بہت شدید ہو رہی تھی۔ لوتھر نے جرمن امرا کو لکھا:۔

"چونکہ خدا نے دنیوی طاقت بدوں کی سزا اور نیکوں کی حفاظت کے لئے قائم کی ہے اس لئے ہم کو پوری مسیحی دنیا میں اس کو اپنے فرائض انجام دینے کے لئے سہولتیں دینی چاہئیں۔ وہ اپنے فرائض انجام دے گی اس کا خیال کئے بغیر کہ اس کی زد میں پوپ آ رہے

ہیں یا بشپ، پریسٹ آرہے ہیں یا مانک اور نن۔"

لوتھر نے جرمن امرا کو جو دنیوی حکومت کے ذمہ دار ارکان ہیں بہت ہوشیاری سے یہ فرض بھی یاد دلایا کہ اجنبیوں کے اقتدار کا جوا اتار پھینکا جائے۔ اور یہ اشارہ بھی کیا کہ ان کا اقتدار ختم کر کے کلیسا کی زمین اور خزانے پر قبضہ کر لیا جائے۔ وہ لکھتا ہے:۔

"بعض لوگوں کا خیال ہے کہ ہر سال تین لاکھ گلڈر[1] جرمنی سے روم بھیجے جاتے ہیں لیکن اس کا کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوتا۔ زمانہ ہوا جرمن شہنشاہوں اور شاہزادوں نے پاپائے اعظم کا یہ حق تسلیم کر لیا تھا کہ وہ جرمن اوقاف کی پہلے سال کی نصف آمدنی لے لیا کریں۔ ان رقموں کا چونکہ بہت بے جا استعمال ہو رہا ہے اور وہ بڑی بے شرمی سے خرچ کی جا رہی ہیں، اس لئے جرمن امرا اور شاہزادوں کو اب اپنی زمینوں اور آدمیوں کو مزید تباہی سے بچانا چاہیے۔ کسی شاہی حکم یا قومی قانون کے ذریعہ سے اوقاف کی آمدنی ملک کے اندر ہی روکی یا ہمیشہ کے لئے ختم کی جا سکتی ہے۔"

عوام کی ایک جماعت کو سمجھاؤ کہ یہ تمہارا حق ہی نہیں بلکہ تمہارا فرض بھی ہے کہ طاقتور غیر ملکیوں سے۔ جو تمہارے ملک کے اندر رہ کر تمہارے حقوق و اختیار پر قبضہ کر رہے ہیں نجات حاصل کرو۔ لوگوں کی نگاہوں کے سامنے اغیار کی اس دولت کی تصویر کھینچو اور انھیں یقین دلاؤ کہ اگر تم نے ان کو نکال باہر کیا تو دولت کے یہ سارے انبار تمہاری ملکیت ہو جائیں گے۔ پھر دیکھو تمہاری تحریک کس قدر جلد آگ کی طرح بھڑکتی ہے اور اس کے شعلے کتنی کم مدت میں چاروں طرف پھیل جاتے ہیں!

اگر تجدید اور اصلاح کی تحریک شروع نہ ہوئی ہوتی تب بھی کلیسا اپنے اثر و اقتدار کو بحال نہ رکھ سکتا۔ کلیسا کی افادیت اپنا وقت پورا کر چکی تھی۔ اب اس کی ضرورت دن بدن کم ہوتی جاتی تھی۔ اسی لئے اس کے اقتدار میں کمی شروع ہو گئی۔ پرانے زمانے میں جرنیل لڑنے والے امرا کو "خدا کی صلح" کا پیغام دے کر امن عام کا سبب بنتا اور عوام کے اطمینان اور فراغت کا

[1] GUILDER = ایک سونے کا سکہ

موجب ہوتا تھا۔ اب کلیسا کے اقتدار اعلیٰ کی جگہ بادشاہ کے اختیار کلی نے لے لی تھی اور اب وہ اس قابل تھا کہ امرا کی ان تکلیف دہ خانہ جنگیوں کو قابو میں لا سکے۔ پرانے زمانے میں کلیسا ہی تعلیم کا ذمہ دار ہوتا تھا۔ اب تاجروں نے آزاد اسکول، جن کا چرچ سے کوئی تعلق نہ تھا، قائم کر دیئے تھے۔ پرانے زمانے میں کلیسا کے قوانین سب سے بالا سمجھے جاتے تھے اب ان کی جگہ "رومن لا"، پھر اختیار کر لیا گیا تھا اس وقت کے تجارتی سماج کی ضروریات کے لحاظ سے یہ ہر طرح موزوں بھی تھا۔ پرانے زمانے میں صرف چرچ ہی حکومت کا کام چلانے کے لئے پڑھے لکھے لوگ فراہم کرتا تھا۔ اب بادشاہ نے ایک نئی جماعت پر بھروسہ کرنا شروع کر دیا تھا۔ یہ جماعت تجارتی کاروبار سے خوب واقف تھی اور لوگوں کے صنعتی رجحانات کو بھی خوب سمجھتی تھی۔

اس نئے اُبھرتے ہوئے متوسط طبقے نے اچھی طرح محسوس کر لیا کہ اس کی مزید ترقی کی راہ میں قدیم فرسودہ جاگیرداری نظام حارج ہے۔ اس نئے طبقے نے یہ بھی محسوس کر لیا کہ کلیسا قدیم جاگیرداری نظام کا قلعہ ہے اور جب تک یہ قلعہ قائم ہے اس کی ترقی کی رفتار تیز نہیں ہو سکتی۔ کلیسا خود جاگیرداری نظام کا ایک بڑا طاقتور جزو تھا اور اس نظام کی حفاظت میں اپنی امکانی قوتیں صرف کرتا رہتا تھا۔ یہ پوری زمین کے تہائی حصے پر قابض تھا اور ملک کی دولت کے ایک بڑے حصے کو ہڑپ کرتے رہنے کا عادی تھا۔ قبل اس کے کہ متوسط طبقے ہر ملک میں مقامی جاگیرداری نظام سے ٹکراتے، جاگیرداری نظام کے اس مرکزی قلعے "کلیسا" کا ڈھانا ضروری تھا۔ انھوں نے ایسا ہی کیا۔ اس کشاکش نے مذہبی لبادہ پہن رکھا تھا۔ اس تحریک کا نام بھی پروٹسٹنٹ طبقے کی اصلاحی تحریک تھا لیکن درحقیقت یہ وہ پہلی نتیجہ خیز لڑائی تھی جو اُبھرتے ہوئے متوسط طبقے نے قدیم جاگیرداری نظام کے خلاف جیتی تھی۔

مالدار آدمی

ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے صدر نے ۳۱ جنوری ۱۹۳۴ء کو ۳ بج کر ۱۰ منٹ پر ایک فرمان پر دستخط کئے، جس کے بموجب ڈالر میں سونے کی مقدار ۰۱ ر ۲۵ فی صدی سے گھٹا کر ۴ ر ۱۵ فی صدی کردی گئی۔ اُس کا یہ فرمان اپنی نوعیت کے لحاظ سے نیا نہ تھا۔ قدیم زمانے میں اسپین میں بھی یہ دستور رائج رہ چکا تھا۔ انگلستان، فرانس اور جرمنی بھی اس دستور سے ناواقف نہ تھے سکے کی قیمت میں کمی ایک ایسا عمل ہے جو صدیوں پہلے سے رائج چلا آرہا تھا۔ قرون وسطیٰ کے بادشاہ روپیہ حاصل کرنے کے لئے اپنے سکے میں اکثر سونے اور چاندی کی مقدار گھٹاتے رہتے تھے۔

پریسیڈنٹ روزولٹ نے جب اپنے سکے میں سونے کی مقدار گھٹائی اس کی نیت چیزوں کی قیمتیں بڑھانے کے سوا کچھ اور نہ تھی۔ سونے کی مقدار کی اس کمی سے ریاست ہائے متحدہ امریکہ کو دو ارب اناسی کروڑ ڈالر کا فائدہ ہوا۔ قرون وسطیٰ کے بادشاہ بھی صرف نفع کمانے کی نیت سے اپنے سکوں میں سونے کی مقدار گھٹاتے رہتے تھے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں وہ چیزوں کی قیمتیں بڑھانا نہیں چاہتے تھے لیکن اس کے باوجود سکے کی قیمت کم ہوجانے کی وجہ سے چیزوں کی قیمتیں بڑھ جایا کرتی تھیں۔

سکے کی قیمت میں کمی سے کیا مراد ہے؟ کیا سکے کی قیمت میں کمی سے بادشاہ کو کوئی فوری نفع ہوتا ہے؟ اور کیا اس عمل سے چیزوں کی قیمتیں واقعی بڑھ جاتی ہیں؟

سکے کی قیمت میں کمی سے مراد سکے میں سونے یا چاندی کی مقدار گھٹانا ہے۔ جب ایک سکے کا سونا دو سکوں میں لگا دیا جاتا تھا اور اس سونے یا چاندی کی جگہ پر کوئی کم قیمت یا

بے قیمت دھات بڑھادی جاتی تھی تو ایک سکے کی جگہ، بڑو سکے بن جاتے تھے۔ سکے کی قیمت "برائے نام" اب بھی وہی رہتی تھی اور اب بھی وہ کراؤن اور لور ہی کہلاتا تھا لیکن درحقیقت اب اُس کی قیمت پہلے کے مقابلے میں آدھی ہو جاتی تھی۔ اگر تم بارہ انڈوں کے عوض میں ایک نان پاؤ خریدتے تھے تو تم اب اپنے چھ انڈوں کو ایک درجن قرار دے کر پوری نان پاؤ نہیں خرید سکتے تھے۔ اسی طرح تم اب اپنے سکے کی قیمت گھٹا کر اُس کی وہ قیمت نہیں پا سکتے تھے جو تم پہلے پایا کرتے تھے۔ تم اب کم سونا یا کم چاندی پیش کر رہے تھے اس لئے تم کو اتنی ہی کم نان پاؤ بھی مل رہی تھی۔ سکے کی قیمت دراصل دھات کے ان اجزا کی قیمت ہے جو اُس میں شامل ہیں اس لئے سکے میں چاندی یا سونے کی مقدار جتنی کم ہوتی چلی جائے گی سکے کی قیمت اُتنی ہی گرتی اور کم ہوتی چلی جائے گی۔ اُس کا نام اب بھی وہی رہے گا لیکن اُس کے نام کا اُس کی قیمت پر کوئی اثر نہ پڑے گا۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ سکے کی قیمت کم ہو گئی ہے تو ہم مراد لیتے ہیں کہ اب وہ کم چیزیں خرید سکے گا۔ اس کو دوسرے الفاظ میں یوں ادا کر سکتے ہیں کہ اب اشیاء کی قیمتیں بڑھ جائیں گی۔

کوئی شبہ نہیں تمام بادشاہ جانتے تھے کہ سکے کی قیمت میں کمی کر کے فوری نفع کمایا جا سکتا تھا بادشاہوں کو اس سے کوئی سروکار نہ تھا کہ سکے کی قیمت میں جلد جلد تبدیلی سے تجارت کو نقصان پہونچے گا۔ بادشاہ کو اس کی کوئی فکر نہ تھی کہ سکے کی قیمت گھٹنے سے چیزیں گراں ہو جائیں گی اور متعین رقم پانے والے اور کم آمدنی والے غریب عوام پریشانی میں مبتلا ہو جائیں گے۔ بادشاہ کے دل میں سکے کی قیمت گھٹاتے وقت یہ خیالات آتے ہوں یا نہ آتے ہوں اور وہ اُس کی اہمیت محسوس کرتا ہو یا نہ کرتا ہو لیکن اُس کی رعایا میں بعض ایسے لوگ ضرور تھے جو اس کی اہمیت سے بے خبر نہ تھے۔

بہت سے لوگ جن میں بادشاہ بھی شامل تھے، سکے کی قیمت میں کمی اور چیزوں کی قیمتوں میں اضافے کا باہمی تعلق محسوس نہیں کرتے تھے لیکن بعض لوگ ایسے موجود تھے جن کی

نگاہوں میں یہ تعلق پوری طرح واضح تھا۔

فرانس میں اکتوبر ۱۳۵۸ء سے لے کر مارچ ۱۳۶۰ء تک سکے کی قیمت میں سترہ مرتبہ تغیرات ہوئے ایک پیرس کے باشندے نے یہ صورت حال دیکھ کر لکھا:-

"چاندی اور سونے کے سکوں میں غیر معمولی تغیر کی وجہ سے، کھانے پینے کا سامان، دوسری چیزیں اور عام سامان تجارت جس کی ہر شخص کو روزمرہ زندگی میں حاجت ہوتی رہتی ہے اتنا گراں ہو گیا ہے کہ عام آدمیوں کے لئے جینے کا کوئی سہارا نہیں رہ گیا ہے۔"

لیسکس کے بشپ نکولس ارسمے نے ۱۳۷۷ء میں "روپے" پر ایک کتاب لکھی تھی، اُس نے لکھا ہے کہ روپے کی قیمت میں کمی وقتی طور پر بادشاہ کو ضرور فائدہ پہونچاتی ہے لیکن درحقیقت یہ عوام کو دھوکا دے کر لوٹنا ہے۔ وہ لکھتا ہے:-

"گیہوں، شراب اور دوسری کم اہم چیزوں کے ناپنے کے پیمانوں پر اکثر بادشاہ کی مہر لگی ہوتی ہے اور اگر کوئی شخص ان پیمانوں میں دھوکا کرتا ہوا پایا جائے تو وہ بدنام جعل ساز سمجھا جاتا ہے۔ اسی طرح ہر سکے پر بادشاہ کی مہر اس بات کی ضامن ہے کہ اس میں دھاتیں صحیح مقدار میں شامل کی گئی ہیں۔ پھر ایسے بادشاہ پر کون اعتبار کرے گا جو اپنے سکے کا وزن گھٹا دے یا اُس میں کھری دھات کم کر دے اور اس پر اپنی مُہر باقی رہنے دے ——
میری رائے میں تین طریقے ہیں جو سکے کو اُس کے قدرتی استعمال سے ہٹا کر نفع پہونچا سکتے ہیں۔ پہلا طریقہ "مبادلہ" ہے۔ ہم اس طریقے سے سکے کی تجارت کر سکتے ہیں۔ دوسرا طریقہ سود خوری ہے اور تیسرا طریقہ سکے کی قیمت گھٹانا ہے۔ پہلا طریقہ معیوب ہے، دوسرا طریقہ بُرا ہے اور تیسرا تو قابل نفرت ہے۔"

ایک انگریز رچرڈ کینٹلن (RECHARD CANTILLON) نے تقریباً چار سو سال کے بعد بہت واضح طریقے سے اُس اثر کا تذکرہ کیا ہے جو سکے کی قیمت کم ہونے کی وجہ سے اشیاء کی قیمتوں پر پڑتا ہے۔ وہ لکھتا ہے:-

"ہر زمانے کی تاریخ کا مطالعہ ہم کو یہی بتاتا ہے کہ جب بادشاہوں نے سکے کی قیمت تو کم کر دی ہے اور اس کی ظاہری قیمت کو برائے نام قائم رکھا ہے، تمام خام پیداوار اور مصنوعات کے دام اسی مناسبت سے جس مناسبت سے سکے میں قیمتی دھاتیں گھٹائی گئی ہیں، بڑھ گئے ہیں"

تم نے کوپرنیکس کا نام تو سنا ہوگا؟ یہ وہی مشہور سائنسداں ہے جس نے ۱۵۳۰ء میں ثابت کیا تھا کہ "زمین سورج کے گرد گھومتی ہے" کوپرنیکس اقتصادیات کا طالب علم بھی تھا۔ اس نے زور دیا تھا کہ اس کے ملک پولینڈ کا "نظام زر" بدل دیا جائے۔ وہ محسوس کرتا تھا کہ مختلف سکوں کے رواج نے تجارت کی راہ میں بڑی دشواریاں پیدا کر دی تھیں۔ اس لئے اس نے مطالبہ کیا کہ پورے ملک میں سکہ سازی کا ایک طریقہ اور ایک نظام قائم کر دیا جائے اور تمام جاگیرداروں امراء سے جو اپنے سکے ڈھلواتے رہتے ہیں یہ حق چھین لیا جائے۔ اس نے پورا زور دے کر یہ بھی مطالبہ کیا کہ سکے کی قیمت میں کمی کا رواج ہمیشہ کیلئے ختم کر دیا جائے۔ وہ لکھتا ہے:۔

"وہ مصیبتیں جو عام طور سے کسی سلطنت، جاگیرداری اور جمہوریہ کی تباہی کا باعث ہوتی ہیں، بے شمار ہیں لیکن میری رائے میں چار بلائیں جو ملکتوں پر ناقابل برداشت تباہی لاتی ہیں بہت خاص ہیں۔ ان میں سب سے پہلی بلا تو خانہ جنگی ہے۔ دوسری طاعون ہے۔ تیسری بنجر زمین ہے اور چوتھی بلا روپئے کی قیمت کا بدلتے رہنا ہے۔"

آرسمے (ORSME) نے بعض اہم وجوہ جن کی بناء پر محققین سکے کی قیمت میں تغیر کی مخالفت کرتے ہیں بیان کئے ہیں۔ وہ لکھتا ہے۔

"یہ ایک بادشاہ کے لئے بڑی شرمناک بات ہے کہ اس کی مملکت میں روپئے کی قیمت مقرر نہ ہو اور وہ روزانہ گھٹتی بڑھتی رہے ——— ان تغیرات کی وجہ سے لوگ اکثر یہ بتا نہیں پاتے کہ ان کے چاندی اور سونے کے سکے کی قیمت کیا ہے۔ سکے کی قیمت جسے بالکل یقینی ہونا چاہئے غیر یقینی اور غیر متعین ہو جاتی ہے اور اس کا اثر ان تجارتی

معاہدوں پر پڑتا ہے جو ہمارے تاجر اپنے سامانِ تجارت کے متعلق کرنا چاہتے ہیں اس طریقے سے ہمارے ملک میں سونے اور چاندی کی مقدار کم ہو جاتی ہے سکے میں چاندی سونے کی مقدار کی کمی اور سکے کی قیمت میں تغیرات کی وجہ سے بیرونی ممالک کے تاجر آنا چھوڑ دیتے ہیں جن ممالک میں سکے کی قیمت میں تغیر کا عمل جاری رہتا ہے، وہاں تجارتی کاروبار میں بڑی خلل اندازی ہوتی رہتی ہے اور تاجر اور صناع کاریگر یہ نہیں سمجھ پاتے کہ ایک دوسرے سے کس طرح معاملت کریں:

بادشاہوں کے مشیر اس صورت حال سے، جو روپے کی قیمت میں تغیر سے پیدا ہو گئی تھی بہت پریشان تھے، وہ تجارت کی ترقی کے آرزومند تھے، وہ نہیں چاہتے تھے کہ سونے اور چاندی کی نامناسب مقدار بیرونی تاجروں یا مہاجنوں کے ذریعے سے دوسرے ملکوں میں جائے۔ غریب آدمی قیمتوں کے چڑھنے اور اُترنے سے بہت متاثر ہوتا رہتا ہے، وہ دن ورات اپنی روزی پیدا کرنے میں لگا رہتا ہے۔ اُس کے پاس اتنا وقت نہیں ہوتا کہ وہ اپنے حقوق کی حفاظت کر سکے لیکن مہاجن جو روپے کے کاروبار میں مصروف رہتا ہے۔ اپنی دولت کی حفاظت اور اُس کے زور سے نفع کمانے کی تدبیروں سے خوب واقف ہوتا ہے ایسے وقتوں میں جب روپے کی قیمت ڈانواں ڈول ہوتی ہے، وہ خوب نفع کماتا ہے۔

بہت سے ملکوں میں بار بار ایسے قوانین منظور کیے گئے جن کی مدد سے سونے اور چاندی کی برآمد پر پابندیاں عائد کی گئیں تاکہ تجارت کی ترقی میں جو دشواریاں پیدا ہو رہی تھیں ان کو روکا جائے سنہ ۱۴۷۷ء میں انگلستان میں اس قسم کا ایک قانون منظور کیا گیا۔

"مرحوم بادشاہ ہنری ششم کی تاجپوشی کے دوسرے سال یہ قانون منظور کیا گیا تھا کہ سونے اور چاندی کو اس مملکت کے باہر نہ جانے دیا جائے گا لیکن اس قانون اور اسی طرح کے دوسرے قوانین کے باوجود جو سونے اور چاندی کی برآمد سے تعلق رکھتے ہیں سونے اور چاندی کے سکے برتن، سونے اور چاندی کی پلیٹیں اور سونے اور چاندی کا تجارتی مال اس مملکت سے باہر بھیجا جاتا ہے، جو ملک کے غیر معمولی افلاس کا سبب ہو رہا ہے اور جس کا برا اثر سرکاری خزانے کی تباہی کی شکل میں ظاہر ہو رہا ہے اگر اس خرابی کا فوراً علاج نہ کیا گیا تو حالات قابو

سے باہر ہو جائیں گے اس لئے مذکورہ بالا حکمراں کے حکم سے فرمان نافذ کیا جاتا ہے کوئی شخص اس سلطنت کا کسی قسم کا سکہ نہ خود اس مملکت سے باہر لے جائے گا اور نہ کسی دوسرے کو لے جانے دے گا، اور نہ کسی دوسری مملکت کے سکے کو باہر بھیجے گا۔ سونے اور چاندی کی پلیٹیں، برتن، سلاخیں اور سونے چاندی کے جڑاؤ زیور، شاہی منظوری کے بغیر اب باہر نہ بھیجے جائیں گے۔"

بادشاہوں نے اپنی انتہائی کوششیں صرف اسی بات پر صرف نہیں کیں کہ سونے اور چاندی کی کوئی مقدار ملک کے باہر نہ جانے پائے بلکہ اُنھوں نے کان کنوں کو خاص حقوق دے کر سونے اور چاندی کی پیداوار بڑھانے کی بھی سعی کی۔ ایک فرمان کا اقتباس جو اس مقصد سے نافذ کیا گیا تھا نیچے دیا جاتا ہے:۔

"تمام کان کن، مالک اور مزدور جو برابر ان کانوں میں کام کر رہے ہیں جو ہماری مملکت میں اس وقت تک کُھل چکی ہیں اور جو آئندہ کُھلنے والی ہیں، ہماری طرف سے مجاز ہیں کہ اپنے خرچ پر کام جاری رکھیں، اور کانیں کھولیں اور ان میں آزادی سے کھدائی جاری رکھیں۔ اُن سے کچھ لیا نہیں جائے گا، نہ کوئی ان کے کام میں خلل انداز ہوگا نہ انھیں ستائے گا اور نہ کسی طرح ان کو پریشان کرے گا۔ کسی مذہبی سردار یا دنیوی امیر کو اور کسی تاجر یا ہمارے کسی عہدہ دار کو، جو ان کانوں میں اپنے حق کا مدعی ہو، اس فرمان کی خلاف ورزی کا حق نہ ہوگا۔"

اس زمانے میں تجارت کی مزید ترقی کے لئے سونے اور چاندی کی بڑی ضرورت تھی، اس لئے تجارت کی ترقی نے ان دھاتوں کی مزید دریافت میں مدد بہم پہونچائی اور اس طرح تجارت کی ترقی اور توسیع میں اور بھی مدد ملی۔ آج جب ہم کولمبس کے زمانے سے چار سو سال آگے بڑھ گئے ہیں، اُس کی کوششوں کی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ کر سکتے ہیں لیکن پندرھویں صدی عیسوی میں وہ ہندوستان کا پتہ نہیں لگا سکا تھا اس لئے وہ ناکام سمجھا جاتا تھا۔ سولھویں صدی عیسوی میں جب میکسیکو اور پیرو کی چاندی اسپین پہونچی تو اُس کی نئی دریافت قدر کی نگاہ سے دیکھی جانے لگی۔

اگر سامانِ تجارت اونٹوں، گھوڑوں اور خچروں پر چلتا اور پہاڑوں اور ریگستانوں کی ہزاروں میل کی مسافت طے کر کے اپنی منزل تک پہونچتا؟ اگر راستے میں کہیں کہیں انسانوں

کے کندھوں پر لاد لاد کر یہ سامان آگے لے جانا پڑتا، اگر راہ میں قبائلی قزاقوں کے حملوں کا خطرہ قافلے والوں کے دماغوں پر چھایا رہتا، اگر سمندری سفر میں بحری ڈاکوؤں کی قاتلانہ چڑھائیوں کے اندیشے ستاتے رہتے اور طوفانوں کی مصیبتوں سے دوچار رہنا پڑتا، اگر راہ میں بہت سی حکومتیں، جن کی حدود سے گذر کر یہ سامانِ تجارت آگے بڑھتا، لمبے لمبے محصول طلب کرتیں اور اگر آخری منزل پر پہنچ کر اُن تاجروں سے سابقہ پڑتا جو اس بیرونی تجارت کے واحد اجارہ دار ہوتے اور زیادہ سے زیادہ من مانا نفع لینے میں کوئی پس وپیش نہ کرتے تو یقیناً چیزوں کی قیمتیں اتنی بڑھ جاتیں کہ ہر شخص کی قوت خرید ان کی طرف طلب کا ہاتھ بڑھانے سے گھبراتی۔ پندرھویں صدی عیسوی میں مشرق کے تجارتی مال کے ساتھ، جس کی عام طور سے مغربی ملکوں میں بہت ضرورت محسوس کی جاتی تھی، یہی صورت پیش آتی تھی۔ مشرقی ممالک کا گرم مسالہ، وہاں کے قیمتی پتھر، دوائیں عطر، تیل اور ریشمی کپڑے ان بندرگاہوں تک جہاں وینس کے تاجر خریدنے اور لادنے کے لئے تیار ملتے، پہونچتے تھے، سفر کی یہ لمبائی اور سفر کی یہ مصیبتیں چیزوں کی قیمتیں بڑھا دیتی تھیں۔ وینس کے تاجر یہ سامان جنوبی جرمنی تک پہونچاتے تھے اور جرمنی سے یہ سامان پورے یورپ میں تقسیم ہوتا تھا۔ ان تمام منزلوں سے گذر کر چیزوں کی قیمتیں اپنی انتہا کو پہونچ جاتی تھیں۔

دوسرے ملکوں کے تاجر دیکھ رہے تھے کہ وینیشی تاجر مشرقی تجارت کا پورا نفع بٹور رہے ہیں وہ بھی اس تجارت میں شریک ہونا چاہتے تھے۔ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ مشرقی ملکوں کی تجارت بڑی نفع بخش ہے لیکن وہ وینس کی اجارہ کی دیوار کیسے توڑتے؟ مشرقی بحیرۂ روم وینیشی جھیل کی حیثیت رکھتا تھا اس لئے اس میں مداخلت اُن کے بس کی بات نہ تھی۔

لیکن وہ دوسرے راستے سے ہند قصیٰ پہونچ سکتے تھے، ان راستوں پر وینیشیوں کا کوئی اقتدار نہ تھا۔ وہ سمت نما جسے تیرھویں صدی عیسوی میں اطالوی ملاح استعمال کرتے تھے ایک تختی پر لگا ہوتا تھا۔ اب اسطرلاب کی مدد سے عرض البلد کا ناپنا اور خط استوار سے جنوبی اور شمالی فاصلوں کا صحیح اندازہ کرنا بہت آسان ہوگیا تھا۔ اب اطالوی جہاز رانوں نے اپنے

ذاتی مشاہدوں سے نقشے تیار کرنے شروع کردئے تھے۔ اب ان کو کہی سنی باتوں اور خیالی تخمینوں پر بھروسہ کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ اب ان کو ساحل سمندر کا سہارا لے کر کنارے کنارے چلنے کی بھی حاجت نہ تھی۔ اگر لوگ کچھ زیادہ دلیری سے کام لیتے تو مشرق کا کھوج نکالنا جہاں گرم مسالوں کے انبار اور سونے اور قیمتی پتھروں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے، اب زیادہ دشوار نہیں رہا تھا۔

ہمت وروں کی کمی نہ تھی۔ جہاز دانوں نے ہر طرف سمندروں کا سینہ چیرنا شروع کیا۔ کولمبس کا مغرب کی طرف سفر اسی قسم کے بحری کارناموں کی ایک مثال ہے۔ بعض حوصلہ مند جہاز رانوں نے شمالی سمندروں میں اپنے جہاز دوڑائے تاکہ اُتر سے دکھن کی راہ ڈھونڈھ نکالیں۔ بعضوں نے آئندہ کی امیدوں میں افریقی ساحلوں کے چکر لگا ڈالے۔ آخر کار ۱۴۹۷ء میں واسکوڈی گاما نے افریقہ کے براعظم کا طواف کیا اور دکھن اور پورب کی سمتیں ناپتا ہوا ہندوستان میں کالی کٹ کے ساحل پر ۱۴۹۸ء میں لنگر انداز ہوا اور ہند اور ہند اقصیٰ کا سمندری راستہ کھل گیا۔

کیا اب دوسرے راستوں کی تلاش ختم کردی گئی تھی؟ نہیں، بالکل نہیں، کولمبس نے اپنی کوششیں جاری رکھیں۔ اُس نے بار بار بحری سفر کئے اور ہر بار کوشش کی کہ وہ براعظم امریکہ کو، جو اُس کے راستے کا پتھر بنا ہوا تھا، پار کرکے آگے بڑھ جائے۔ دوسرے جہاز راں جنھوں نے مغرب کی طرف اپنے جہاز دوڑائے تھے اسی طرح کی نامرادیوں سے دوچار ہوئے اور اپنے جہازوں کا رُخ شمال کی طرف پھیر کر آگے بڑھے، کچھ حوصلہ مند جنوب کی طرف بھی چلے اور قسمت آزمائی کرتے چلے گئے۔ یہ سلسلہ برابر جاری رہا۔ چنانچہ ۱۶۰۹ء میں بھی ہنری ہڈسن ہند اقصیٰ کی تلاش میں مشرق کی راہ ڈھونڈھتا ہوا نظر آتا ہے۔

حوصلہ مند جہاز رانوں کی یہ جدوجہد قدرتی بات تھی۔ مشرق کی راہ، بے شمار دولت کی راہ تھی۔ واسکوڈی گاما کے پہلے بحری سفر میں چھ ہزار فی صدی نفع ہوا تھا، کوئی شبہ نہیں دوسرے جہازوں نے بھی ایسا ہی خطرناک سفر اختیار کرکے، ایسا ہی نفع کمایا ہوگا۔ تجارت آناً فاناً اپنی انتہا کو پہنچ گئی وینس کے تاجر، مصر کے سلطان سے چار لاکھ بیس ہزار پونڈ کالی مرچ ہر سال خریدا کرتے تھے۔ اب

صرف ایک کشتی میں دو لاکھ پونڈ کالی مرچ پرتگال پہونچ جاتی تھی۔ اب اگر ترک مشرق جانے والے راستوں پر قبضہ کر لیتے تو تاجروں کے لئے فکر کی کوئی بات نہ تھی، اگر وینیشی تاجر چیزوں کی قیمتیں بہت بڑھا دیتے تو مغربی تاجروں کے لئے گھبرانے اور فکرمند ہونے کا کوئی موقع نہ تھا، مشرق جانے والے سمندری راستے نے جو راس امید کا چکر لگا کر آگے بڑھتا تھا، ان کو ترکوں کی خوشامد اور وینیشیوں کے احسان سے بے نیاز کر دیا تھا۔

اب تجارت کے دھارے نے اپنا راستہ بدل دیا تھا۔ پرانے زمانے میں وینس اور جنوبی جرمنی کے شہروں کی جغرافیائی حیثیت نے ان کی اہمیت بہت بڑھا دی تھی۔ اور ان کو ان تمام شہروں پر، جو زیادہ مغرب میں واقع تھے ایک طرح کی برتری دے دی تھی لیکن اب اس نئے راستے کی دریافت نے بحر اٹلانٹک کے کنارے بسنے والے شہروں کی اہمیت بڑھا دی تھی۔ وینس اور وہ شہر، جو اب تک تجارتی قافلے کی گذرگاہ سمجھے جاتے تھے۔ تجارت کی شاہراہ سے دور جا پڑے۔ اب تک جو راستہ تجارت کا خاص راستہ سمجھا جاتا تھا، وہ اپنی خصوصیت کھو کر ایک بھولی بسری پگڈنڈی بن گیا تھا۔ اس نئے دور میں اٹلانٹک کا سمندری راستہ نئی شاہراہ بنا اور پرتگال اسپین، ہالینڈ، انگلستان اور فرانس تجارتی اہمیت کے نقطۂ عروج پر پہونچ گئے۔

تاریخ کے اس دور کو اگر تجارتی انقلاب کا زمانہ قرار دیا جائے تو نامناسب نہ ہوگا تجارت جو اب تک ایک مناسب اور یکساں رفتار سے بڑھ رہی تھی، اچانک اپنی انتہا کو پہونچ گئی، صرف یورپ کی پرانی دنیا اور ایشیا کے اکثر حصے ہی حوصلہ مند تاجروں کی جولانگاہ نہیں بنے بلکہ امریکا اور افریقہ کی پوری نئی دنیا ان کی زد میں آگئی۔ تجارت اب صرف دریاؤں اور روم اور بالٹک کے سمندروں تک محدود نہیں رہی، اب تک صرف یورپ اور ایشیا کی تجارت بین الاقوامی تجارت کہلاتی تھی، اب اس اصطلاح نے چار بر اعظموں، ان کی سمندری راہوں اور شاہراہوں کی تجارت کو اپنی آغوش میں لے لیا۔ ان نئی دریافتوں نے پورے مغربی یورپ کی اقتصادی زندگی میں ایک شاندار وسعت پیدا کر دی۔ بازار کی توسیع ہمیشہ تازہ اقتصادی سرگرمیوں

کا باعث ہوتی ہے۔ بازار میں اس وقت جو بے اندازہ وسعت پیدا ہوئی تھی اُس کے امکانات کا تجربہ اس سے پہلے دنیا والوں کو نہ ہوا تھا۔ اب ایسے بے شمار نئے مقامات پیدا ہو گئے تھے جو تجارتی سرگرمیوں کا تقاضا کر رہے تھے، نئے بازار تمہارے ملک کی نئی چیزوں کے منتظر تھے اور نئے ملک اپنی مصنوعات تمہارے شہروں تک پہونچانا چاہتے تھے، تجارت کی اس گرم بازاری نے دلوں میں نئے حوصلے پیدا کئے اور ایک زبردست حرکت، جو اس سے پہلے کبھی مشاہدے میں نہ آئی تھی، پیدا ہو گئی۔ اب نئی دریافتیں ہونے لگیں۔ نئی چیزیں ڈھونڈھی جانے لگیں اور توسیع کے نئے سامان پیدا کئے جانے لگے۔

تاجروں کی نئی نئی جماعتیں خطرناک مہموں کی تازہ ذمہ داریاں سنبھالنے کے لئے تیار ہونے لگیں، نئے امکانات کی نئی دنیا ان کو اپنی طرف بلا رہی تھی۔ اُس زمانے کی ایک بالکل ابتدائی اور مشہور تجارتی کمپنی کا نام سننے کے لائق ہے۔ یہ نام حسب ذیل تھا:۔

"حوصلہ مند تاجروں کی جماعت جو ان ملکوں، سلطنتوں، جزیروں اور مقامات کی تلاش کے لئے جو ابھی تک دریافت نہیں ہوئے ہیں، بنائی گئی ہے۔"

یہ نام ہی ان کے مقاصد اور جذبات کی ترجمانی کے لئے کافی ہے لیکن اس نام میں ہم کو تصویر کا صرف ایک ہی رخ دکھائی پڑتا ہے۔ یہ تصویر نامکمل رہ جائے گی اگر اُن انتظامات کا بھی نقشہ نہ کھینچا جائے جو ان مہموں کی کامیابی کے بعد قدم جمانے کے لئے کئے جاتے تھے۔ نئے مقامات کی دریافت کے بعد قلعوں کی تعمیر عمل میں آتی تھی اور ان قلعوں کی حفاظت کے لئے محافظ فوجی دستے مقرر کئے جاتے تھے۔ دیسی باشندوں سے معاملات طے ہوتے تھے اور تجارت شروع کر دی جاتی تھی اور ساتھ ہی ساتھ اجنبی تاجروں کو اپنی حدود سے باہر رکھنے کی تدبیریں اختیار کی جاتی تھیں، ان تمام انتظامات سے پہلے اگر جہازوں کی تیاری، ملاحوں کا تقرر اور اتنی خطرناک مہم کی ضروریات کے لحاظ سے جہازوں اور ملاحوں کے لئے ضروری ساز و سامان کا انتظام بھی سامنے رکھ لیا جائے تو ان زبردست مصارف کا بھی اندازہ ہو جائے گا جو اس مہم کی تکمیل کے لئے لازمی تھے۔

ان تمام انتظامات کے لئے بہت بڑی رقم کی ضرورت ہوتی تھی۔ اتنی بڑی رقم جس کا تحمل کسی ایک انسان کے لئے ممکن نہ تھا اور نہ کوئی ایک شخص اتنی خطرناک مہم پر "زرکثیر" صرف کرنے کی جرات ہی کر سکتا تھا۔

حالات بدل گئے تھے اور وہ قدیم روائتی تجارتی انجمنیں جنھیں پرانے تاجروں نے قائم کیا تھا، اب نئے زمانے کے لئے موزوں نہ تھیں۔ وہ انجمنیں جانے بوجھے ہوئے راستوں پر بندھے ہوئے قواعد کے ماتحت محدود پیمانے پر کاروبار چلا سکتی تھیں لیکن اب تجارتی قافلے ان ملکوں کے لئے رخت سفر باندھ رہے تھے، جو ان کے وطنوں سے بہت دور تھے اور جن کو اب تک انھوں نے جانا بھی نہ تھا، ان کو ایسے لوگوں سے معاملہ کرنا تھا جو ان کے لئے بالکل اجنبی تھے۔ ان حالات میں زندگی بسر کرنی تھی جن کے وہ اب تک عادی نہ رہے تھے۔ اس صورت حال کے پیش نظر اُن کو ایک نئے قسم کی تجارتی جماعت، جو حالات کا پوری طرح مقابلہ کر سکے، تیار کرنی پڑی۔

جو کام ایک دو یا تین آدمی علیحدہ علیحدہ رہ کر نہیں کر سکتے وہ چند آدمی متحدہ طور پر ایک جماعت بنا کر اور ایک نظام کے ماتحت رہ کر کر سکتے ہیں۔ جوائنٹ اسٹاک کمپنیاں (مشترک سرمایے کی جماعتیں) جو سولھویں اور سترھویں صدی عیسوی میں قائم ہوئیں۔ دراصل اُس وقت کے تقاضوں کا عملی جواب تھیں۔ امریکہ، افریقہ اور ایشیا کے براعظموں سے تجارتی کاروبار بڑھانے اور فروغ دینے کے لئے بہت بڑے سرمایے کی ضرورت تھی۔ یہ کام کسی ایک فرد کے بس کا نہ تھا۔ پہلی انگریزی جوائنٹ اسٹاک کمپنی میں، جو "حوصلہ مند تاجروں کی انجمن" کے نام سے مشہور ہوئی، دو سو چالیس حصہ داروں نے روپیہ لگایا تھا۔ ہر حصہ دار کو اپنے حصے کی قیمت پچیس پونڈ ادا کرنی پڑی تھی۔ یہ مجموعی سرمایہ، جو اس طرح کمپنی نے اکٹھا کیا تھا اُس زمانے کے لحاظ سے بہت بڑا سرمایہ تھا۔

یہ جوائنٹ کمپنیاں اپنے اسٹاک کے حصے مختلف افراد کے ہاتھ بیچتی تھیں اور اس طرح وہ ضروری سرمایہ، جو اتنا بڑا کاروبار چلانے کے لئے ضروری ہوتا تھا، فراہم کر لیتی تھیں۔ اس سرمایے سے ان کو وہ مسلح جنگی جہاز بھی، جو دشمنوں کی تجارت کو نقصان پہونچانے کے فرائض انجام دیتے تھے، فراہم

کرنے پڑتے تھے اور نئی بستیاں بسانے کی مہموں کے مصارف بھی ادا کرنے پڑتے تھے۔ یہ جوائنٹ اسٹاک کمپنیاں آج کل کی بڑی بڑی انجمنوں (کارپوریشن) کی پیش خیمہ تھیں۔ آج کل کی طرح اُس زمانے میں بھی روپئے والے لوگ ان جوائنٹ اسٹاک کمپنیوں کے حصے خرید کر کاروبار کے حصہ دار بن سکتے تھے۔ یہ جوائنٹ کمپنیاں اُس زمانے کا دستور بن گئی تھیں۔ اُس زمانے کی غارت گرانہ مہمیں بھی انہیں کمپنیوں کے طرز پر اپنی تنظیم کرتی تھیں۔ ڈریک (DRAKE) کی کسی مہم میں، جو اسپینیوں کے خلاف روانہ کی گئی تھی خود ملکہ الزبتھ نے چند جہازوں کے عوض میں، جو بطور قرض دیے گئے تھے، حصے خریدے تھے اس مہم میں چار ہزار سات سو فی صدی نفع ہوا تھا۔ ملکہ نے اپنے حصے میں دو لاکھ پچاس ہزار پونڈ پائے تھے۔

اس غارت گرانہ مہم میں ملکہ کی خفیہ شرکت کچھ زیادہ راز کی بات نہ تھی۔ فگر (FUGGER) کی ایک چٹھی نے جو ۲ر دسمبر ۱۵۶۹ء کو لکھی گئی ہے۔ ظاہر کیا ہے کہ :-

"اس معاملہ کا، جو بہت ناگوار پہلو ہے وہ یہ ہے کہ یہ ہاکنس ملکہ کی مدد اور خفیہ منظوری کے بغیر نہ اتنے بڑے بیڑے کا ساز و سامان مہیا کر سکتا تھا اور نہ اتنے آدمیوں کا انتظام اس کے بس کی بات تھی۔ ملکہ کا یہ رویہ معاہدہ کے خلاف ہے جس کی صفائی کے لئے بادشاہ نے ایک غیر معمولی سفیر ملکہ انگلستان کے پاس بھیجا ہے۔ اعتبار قائم نہ رکھنا اس قوم کی فطرت اور عادت ہے۔ ملکہ حیلہ تراشتی ہے کہ جو کچھ ہوا اُس کی لاعلمی میں ہوا اور اُس کی منظوری کے بغیر کیا گیا۔"

سولھویں اور سترھویں صدی عیسوی میں جو کمپنیاں قائم کی گئیں، ان کے نام بتاتے ہیں کہ ان کا تجارتی حلقہ کہاں تھا اور وہ کہاں نو آبادکاری کا کام کرتی تھیں۔ ان کمپنیوں میں سات کمپنیاں ایسٹ انڈیا کمپنی کے نام سے مشہور تھیں۔ ان میں انگریزی اور ڈچ کمپنیاں بہت مشہور تھیں چار کمپنیاں ویسٹ انڈیا کمپنی کے نام سے مشہور تھیں یہ ہالینڈ، فرانس، سویڈن اور ڈنمارک میں قائم کی گئی تھیں۔ لیونٹ اور افریقی کمپنیاں بھی بہت مشہور تھیں۔ امریکی لوگوں کے لئے بڑی دلچسپ بات یہ ہے کہ پلی متھ اور ورجینیا کمپنیاں بھی انگلستان ہی میں قائم کی گئی تھیں۔

تم کو یہ قیاس کرنے میں کوئی دشواری نہ ہوگی کہ یہ کمپنیاں جو اتنے بڑے سرمایے سے اتنی خطرناک مہموں کا آغاز کرنے جارہی تھیں اپنی حکومتوں سے زیادہ سے زیادہ تجارتی حقوق حاصل کرلیتی ہوں گی۔ ان حقوق میں سب سے بڑا حق تجارتی اجارہ تھا جو یہ کمپنیاں اپنے حق میں منظور کرالیتی تھیں۔ یہ کمپنیاں چاہتی تھیں کہ اجنبی تاجران کے کاروبار کی حدود میں داخل ہوکر ان کے نفع میں خلل اندازی نہ کرنے پائیں۔ یہ کمپنیاں یہ سوچنے اور یقین کرنے کی عادی ہوگئی تھیں کہ تجارت کی توسیع صرف ان کے حوصلہ مندانہ اقدام کی برکت ہے لیکن اب بعض مورخوں کو ان کمپنیوں کے ان دعووں میں کوئی حقیقت نظر نہیں آتی ہے۔ ان کو یقین ہے کہ ان کمپنیوں کے حلقوں کے باہر بھی تاجروں کی کچھ سرگرم جماعتیں تھیں جو تجارت میں پوری طرح حصہ لینا چاہتی تھیں لیکن کمپنیوں کی اجارہ داری نے کچھ ایسے قوانین بنا رکھے تھے کہ ان کو ابھرنے کا موقع نہیں ملا، ورنہ تجارت نے کمپنیوں کے زمانے میں جتنی ترقی کی ہے اس سے کہیں زیادہ ترقی کرتی۔

حقیقت جو بھی ہو اتنا تو صاف ہی ہے کہ کمپنیاں صرف اپنے حصہ داروں کے لئے نفع کما رہی تھیں۔ یہی ان کا بنیادی مقصد تھا۔ جہاں ان کا مقصد پیداوار بڑھانے اور زیادہ بیچنے سے پورا ہوتا تھا وہ زیادہ پیداوار بڑھاتی، اور زیادہ فروخت کرتی تھیں، جہاں پیداوار گھٹاکر زیادہ نفع کمایا جاسکتا تھا وہ پیداوار بے تکلف گھٹاکر اپنی جھولی بھرنے کا بندوبست کرتی تھیں۔ حسب ذیل اقتباس سے یہ بات واضح ہوجائے گی:-

"ڈچ دیسی رئیسوں کو تقریباً تین ہزار تین سو پونڈ پنشن صرف اس غرض سے دیا کرتے تھے کہ وہ لونگ اور جائے پھل کا نشان دوسرے جزیروں سے مٹا دیں لیکن وہ خود امبوانا (AMBOYNA) میں جہاں ان کو قابو حاصل تھا، ان کی کاشت کراتے تھے، جہاں تک ان کی ایسٹ انڈین تجارت کا تعلق تھا وہ اس کے بڑھانے کے مقابلے میں اس کے محدود رکھنے میں زیادہ نفع دیکھتے تھے تاکہ وہ پیداوار کے اونچے دام وصول کرسکیں۔ کوئی شبہ نہیں بعض خاص حالتوں میں تجارت کی توسیع کے بجائے اس کی تحدید سے زیادہ

نفع ہوتا تھا لیکن عام طور سے تجارت کی غیر معمولی توسیع سے غیر معمولی نفع کی امید کی جا سکتی تھی۔ یہ تجارت کا سنہرا دور تھا۔ اس زمانے میں دولت کے انبار لگائے گئے اور سرمایے کی تعمیر کی گئی جسکی بنیاد پر آگے چل کر سترھویں اور اٹھارھویں صدی میں "صنعتی توسیع" کی بنیاد رکھی گئی۔

تاریخ کی کتابیں بادشاہوں کی اولوالعزمی، ان کی فتوحات اور جنگوں کے حالات بڑی تفصیل سے بیان کرتی ہیں لیکن دراصل وہ اپنا زور بیان غلط لوگوں کے لئے صرف کرتی ہیں۔ وہ صفحات، جو وہ ان بادشاہوں کے کارناموں سے بھرنے کی کوشش کرتی ہیں، اگر ان لوگوں کے حالات سے رنگے جائیں، جو تخت کے پیچھے ان بادشاہوں کی طاقت کا اصل سرچشمہ بنے ہوئے تھے، تو یقیناً تاریخ نویسی کا صحیح حق ادا ہو۔ یقیناً یہ لوگ ایک زبردست طاقت تھے۔ بادشاہ ہمیشہ ان کی دولت کے محتاج رہتے تھے، سولھویں اور سترھویں صدیوں میں جنگوں کا سلسلہ پھیلا رہا۔ ان لڑائیوں میں جو روپیہ صرف ہوتا تھا وہ ادا تو بادشاہ ہی کرتے تھے لیکن یہ تاجروں اور مہاجنوں کی جیبوں سے نکل کر بادشاہ کے ہاتھ مضبوط اور اُس کی ساکھ قائم کرنے کا ذریعہ بنتا تھا۔

اسپین کا بادشاہ چارلس پنجم اور فرانس کا حکمراں فرانسس اوّل دونوں رومن امپائر کے مقدس تاج کے آرزومند تھے لیکن اس نزاع کا فیصلہ ان کے بس میں نہیں تھا۔ جرمنی کے ایک چھوٹے سے مہاجن یعقوب فگر (JACOB FUGGER) نے جو فگر کے مشہور مہاجنی خاندان کا سردار تھا یہ جھگڑا طے کرا دیا۔ چارلس کو اس تاج کے لئے آٹھ لاکھ پچاس ہزار فلورن[1] ادا کرنے پڑے تھے۔ اس لمبی رقم میں یعقوب فگر کے پانچ لاکھ تینتالیس ہزار فلورن شامل تھے۔ ہم یعقوب فگر کے اس خط سے جو اُس نے چارلس کو لکھا تھا اُس کے اُس اثر کا اندازہ کر سکتے ہیں جو دربار شاہی سے دور رہ کر بھی اُس کو حاصل تھا۔ یعقوب نے یہ خط بادشاہ کے نام تقاضے کے طور پر اُس وقت لکھا ہے جب اُس رقم کی وصولی میں جو اُس نے تاج کے حصول کے وقت دی تھی، دیر لگی۔ یعقوب کے روپیہ نے آڑے وقتوں میں بادشاہ کی مدد کی تھی اسی لئے اس کو یہ ہمت ہوئی تھی کہ وہ اس لب و لہجہ

---

[1] سونے کا ایک سکہ

میں بادشاہ سے خطاب کرے۔ وہ لکھتا ہے:-

"۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ہم نے جناب والا کے نمائندے کی خدمت میں جو بڑی زبردست رقم پیش کی تھی۔ وہ ہم نے خود اپنے دوستوں سے بطور قرض لی تھی۔ جناب والا رومن امپائر کا تاج شاہی کبھی حاصل نہ کر سکتے اگر میری بروقت امداد آپ کے کام نہ آتی ہیں یہ بات آپ کے نمائندوں کی تحریروں سے جو انھوں نے اپنے دستخطوں سے مجھے دی ہیں ثابت کر سکتا ہوں، میں نے اس معاملہ میں اپنے ذاتی نفع کا کوئی خیال نہیں کیا (کیا تم کو یقین آتا ہے؟) اگر میں آسٹریا کا گھر چھوڑ دیتا اور آگے بڑھ کر فرانس کا ارادہ کر لیتا تو میں بہت روپیہ اور بڑی جائداد پیدا کر لیتا، جیسا کہ اُس وقت مجھ سے وعدہ کیا جا رہا تھا۔ اگر میں ایسا کرتا تو جناب والا اور آسٹریا کے ایوان شاہی کو کتنا نقصان پہونچتا! جناب والا اس حقیقت سے خوب واقف ہیں۔"

فگرس کا خاندان سولھویں صدی عیسوی کا بڑا اہم خاندان تھا۔ اُس زمانے کا کوئی معاملہ فگرس کا سایہ پڑے بغیر اہمیت نہیں حاصل کرتا تھا۔ اس خاندان نے پندرھویں صدی عیسوی میں اُون اور مسالوں کے تاجروں کی حیثیت سے اپنا کاروبار آگے بڑھایا لیکن انھوں نے ساری ترقی اور شہرت مہاجنی میں حاصل کی۔ رفتہ رفتہ وہ اتنے دولت مند ہو گئے کہ انھوں نے دوسرے تاجروں، بادشاہوں اور شاہزادوں کو قرض دینا شروع کیا۔ اس قرض کے بدلے میں وہ کانوں سے، تجارتی جماعتوں اور شاہی زمینوں سے اور قریب قریب ہر کاروباری مہم سے محصول وصول کرتے تھے۔ جب قرض وصول نہ ہوتا، وہ ان جائدادوں، زمینوں، اور کانوں کے، جو قرض کے عوض میں مکفول کی جاتی تھیں، مالک بن جاتے تھے۔ پوپ بھی فگرس کے قرض کے بوجھ سے آزاد نہ تھے۔ فگرس کے نمائندے اور ان کے کاروبار کی شاخیں ہر جگہ موجود تھیں۔ فگرس کی ۱۵۲۶ء کی واصل باقی سے جرمن شہنشاہ، اینٹ ورپ کے شہر، شاہ انگلستان، شاہ پرتگال اور نیدرلینڈ کی ملکہ کے قرض کا، جو انھوں نے فگرس سے لیا تھا، پتہ چلتا ہے۔ اس زمانے کی تاریخ میں وقت کی حدبندی

اگر بادشاہوں کی مدت حکومت کے بجائے فگرس کے عہد کے نام سے کی جائے تو حقیقت سے بہت قریب ہو۔

اگرچہ فگرس اپنے زمانے کے بہت بڑے اور اہم مہاجن تھے لیکن دولت کے کاروبار کے میدان میں وہ تنہا نہ تھے بلکہ بعض دوسرے مہاجن بھی جو ان سے کم حیثیت نہ رکھتے تھے موجود تھے۔ ایک دوسرے جرمن بینکنگ ہاؤس ولسر (WELSER) نے چارلس پنجم کو تقریباً ایک لاکھ تینتالیس ہزار فلورن قرض دیا تھا۔ ان لوگوں نے بھی تجارتی مہموں میں بڑی بڑی رقمیں لگا رکھی تھیں اور کانوں اور زمینوں میں بھی ان کا بہت بڑا سرمایہ لگا ہوا تھا۔ ہاکسٹٹر (HOCK-STETTER) ہاگ (HAUG) اور امہاف (IMHOF) وہ بڑے بڑے لوگ تھے جو مہاجنی اور تجارت دونوں کاروباروں میں اپنی ساکھ رکھتے تھے۔ اطالوی مہاجنوں میں اُس زمانے میں فرسکو بالڈی، گالٹروتی اور اسٹروزی بڑی ترقی کر رہے تھے۔ دو ایک صدی پہلے بیروزی اور مڈیسی نے بڑی نمایاں شہرت حاصل کی تھی۔ اگر ہم ان دونوں کا فگرس سے مقابلہ کریں تو ہم کو صحیح اندازہ ہو جائے گا کہ ان مہاجن خاندانوں کے مقابلے میں فگرس نے تجارتی اور ساہوکاری میدانوں میں کتنی زیادہ نمایاں ترقی کی تھی:۔

بیروزی	(RERUZZIS)	سنہ ۱۳۰۰ء میں	۸۰۰,۰۰۰
مڈیسی	(MEDECES)	سنہ ۱۴۴۰ء میں	۷,۵۰۰,۰۰۰
فگرس	(FUGGERS)	سنہ ۱۵۴۶ء میں	۴۰,۰۰۰,۰۰۰

ان تمام تجارتی اور مالی سرگرمیوں کا مرکز اینٹورپ (ANT WERP) تھا۔ جب تجارت کے دھارے نے بحیرۂ روم کو چھوڑ کر بحر اٹلانٹک کی طرف اپنا رخ پھیر دیا تو اٹلی کے بڑے شہر جو کسی زمانے میں بڑی اہمیت کے مالک تھے اپنی عظمت کھو بیٹھے اور اینٹورپ نے ان کی جگہ لے لی آبادی کے لحاظ سے یہ کوئی بڑا شہر نہ تھا۔ اس کی آبادی صرف ایک لاکھ نفوس پر مشتمل تھی۔ یہ ان تمام پابندیوں سے آزاد تھا جو قدیم شہروں کی تجارت پر عائد تھیں، بڑی حد تک یہی وجہ تھی

جس نے اُس کو اتنا اہم بنا دیا تھا۔ قرونِ وسطیٰ میں بیرونی تاجروں کے لئے یہ کسی طرح ممکن نہ تھا کہ وہ شہروں کی حدود کے اندر تجارتی کاروبار کر سکیں لیکن اینٹورپ ان کو کشادہ پیشانی سے خوش آمدید کہتا تھا۔ درحقیقت اس شہر کو بین الاقوامی مرکزیت حاصل تھی۔ ہر شخص کو اجازت تھی کہ وہاں آزادی سے تجارت کرے۔ ہر شخص اس حق سے فائدہ اُٹھا کر وہاں تجارت کرتا بھی تھا۔ یہاں کے ٹاؤن ہال کی دیواروں پر، جہاں تاجر، دلال اور بینکر اکٹھا ہو کر تجارتی بات چیت اور معاہدے کیا کرتے تھے، لکھا ہوا تھا:۔

"تمام تاجروں کے استعمال کے لئے خواہ وہ کسی قوم کے ہوں اور کوئی زبان بولتے ہوں"

دنیا کے ہر حصے کے تاجروں نے یہ دعوت عام قبول کی۔ انگلستان کے کپڑوں کے تاجر بھی وہاں اپنا مرکز رکھتے تھے اور مشرق کے مسالوں کی بھی سب سے زیادہ اہم منڈی یہیں تھی۔ جب مسالوں کی تجارت کا اجارہ وینیشیوں کے ہاتھوں سے نکل کر پرتگالیوں کے ہاتھوں میں آیا، انھوں نے اینٹورپ ہی کے ذریعہ سے اپنا سارا مال دنیا کے دوسرے ملکوں میں بھیجنا شروع کیا۔

ایک دستور، جو آگے چل کر غیر معمولی اہمیت حاصل کر گیا اینٹورپ ہی میں شروع ہوا تھا۔ اس دستور سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ تجارت عروج کی کتنی اعلیٰ منزل پر پہونچ گئی تھی۔ یہ معیاری اور پسندیدہ چیزوں کے نمونے دکھا کر فروخت کرنے کا دستور تھا۔ خریدار کے سامنے مطلوبہ سامان کے ڈھیر لگانے کے بجائے اب نیا دلاّل اور کمیشن ایجنٹ صرف نمونے پیش کرتا تھا۔ میلے جو تمام پابندیوں سے عارضی طور پر آزاد ہونے کی وجہ سے بڑی اہمیت رکھتے تھے اب ختم ہونے لگے تھے اب ایسے بازار جو ہر طرح کی قید سے آزاد تھے وجود میں آگئے تھے اور پرانے بازار کی جگہ مبادلے کے نئے طریقے نے لے لی تھی۔

اینٹورپ تجارتی سرگرمیوں کا بہت بڑا اور اہم مرکز تھا اس لئے یہ مالی کاروبار کا بھی خاص حلقہ بن گیا۔ جرمنی اور اٹلی کے بڑے بڑے مہاجن خاندانوں نے یہاں اپنے کاروباری گھر کھول دئے اور مالی لین دین نے تجارتی کاروبار سے بھی زیادہ اہمیت حاصل کر لی۔ یہی زمانہ

تھا جب اینٹورپ میں مالی کاروبار کا ایک خاص ذریعہ روزمرہ کے کاروبار کی آسانی کے لئے وجود میں آگیا۔ اُس زمانے کے مہاجنوں نے تجارتی مال کی خرید و فروخت اور اس کی قیمتوں کی ادائگی کے لئے بہت آسان تدبیریں نکال لیں۔ اب دین لین کا طریقہ بہت آسان ہوگیا اور بہت کم وقت میں حساب کتاب مکمل اور صاف ہونے لگا۔ اب اگر انگلستان کا کوئی تاجر اٹلی کے کسی تاجر سے کچھ تجارتی سامان خریدتا تو اس سامان کی قیمت کیسے چکاتا؟ کیا وہ انگریز تاجر اطالوی تاجر کے پاس سونے اور چاندی کی اینٹیں بھیجتا؟ یہ طریقہ تو بہت خطرناک، دقت طلب اور بڑے مصارف کا موجب تھا، ادائگی کا کوئی ایسا طریقہ جس میں ان قیمتی دھاتوں کی باربرداری سے نجات ملتی، ضرور ایجاد ہونا چاہیئے تھا۔

یہ طریقہ اب نکل آیا تھا۔ وہ انگریز تاجر اب اپنا قرض نقد چکانے کے بجائے اطالوی تاجر کے نام ایک رقعہ لکھتا تھا۔ اس رقعہ میں وہ لکھتا تھا کہ اُسے اطالوی تاجر کو اتنی رقم ادا کرنی ہے، کوئی دوسرا اطالوی تاجر کسی انگریز تاجر سے کچھ سامان خریدتا تھا، وہ بھی انگریز تاجر کو لکھ کر دے دیتا تھا کہ مجھے اس انگریز تاجر کو اتنی رقم ادا کرنی ہے۔ ایک مرکزی دفتر میں جو ان حسابوں کے چکانے کے لئے قائم کیا گیا تھا۔ یہ تحریریں دیکھی جاتی تھیں اور ان رقعوں کی رو سے تمام حسابات صاف کرلئے جاتے تھے۔ اس صورت سے سونے اور چاندی کے ڈھیروں کو انگلستان سے اٹلی اور اٹلی سے انگلستان بھیجنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی تھی بلکہ ان رقعوں کے ذریعہ سے خرید و فروخت جاری رہتی تھی۔

مبادلے کا یہ طریقہ صدیوں پہلے ایجاد ہوگیا تھا۔ سولھویں صدی عیسوی کا ایک مصنف لکھتا ہے :-

"مذکورہ ممالک کے حسابات صاف کرنے کے لئے لوائن (اینٹورپ کی طرح ایک تجارتی مرکز) اور دوسرے ملکوں کے تاجر زیادہ تر رقعے استعمال کرتے ہیں۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ میں ایک جانب سے تمھارا قرضدار ہوں اور تم دوسری طرف سے میرے مقروض ہو۔

اب ہم ایک دوسرے کے حسابات مجرا لیتے ہیں اور ادائگی صرف اس مجرائی سے مکمل ہو جاتی ہے۔ اس طرح حسابات صاف کرنے میں ہم کو نقد روپیہ دینے لینے کی کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔"

کینٹلن (CANTILLON) نے بھی، نقد روپیہ ادا کئے بغیر چیزیں بیچنے کے اس نئے طریقے کو، جو دراصل اُس زمانے میں کسی معجزے سے کم نہ تھا، یوں بیان کیا ہے :۔

"اگر انگلستان فرانس کا ایک لاکھ آونس چاندی کا قرضدار ہے، فرانس ہالینڈ کو ایک لاکھ آونس چاندی ادا کرنا چاہتا ہے اور ہالینڈ انگلستان کا ایک لاکھ آونس چاندی کا دیندار ہے۔ یہ تینوں حسابات ہنڈیوں (BILLS OF EXCHANGE) کے ذریعہ سے تینوں ملکوں کے بینکر بیباق کر لیتے ہیں اور چاندی اور سونا بھیجنے کی ضرورت نہیں محسوس ہوتی۔"

یہ معلومات اپنی جگہ پر زیادہ اہم نہ ہوں لیکن ان سے جو نتیجہ نکلتا ہے وہ ہمارے موضوع کے لئے بہت اہم ہے۔ اس سے یہ پتہ چل جاتا ہے کہ مالی مشین کا یہ پرزہ ہنڈی (BILLS OF EXCHANGE) سولھویں صدی میں وجود میں آیا۔ بڑھتی ہوئی تجارت کی توسیع نے اُس وقت کے تاجروں اور مہاجنوں کو اس کی ایجاد پر مجبور کیا۔ کوئی شبہ نہیں بعد کی صدیوں میں اس سے کہیں بہتر طریقے دریافت ہوئے اور بدلتے ہوئے حالات کے پیش نظر اُس سے زیادہ آسان اور مفید تدبیریں اختیار کی گئیں لیکن یہ حقیقت نہ بھولنی چاہیئے کہ اس کی بنیاد سیکڑوں برس پہلے (سولھویں صدی عیسوی میں) تاجروں اور مہاجنوں ہی نے رکھی تھی۔

زمین کے وسیع ٹکڑے دریافت ہو رہے تھے۔ تجارت کی ترقی اپنے عروج کی انتہا کو پہونچ گئی تھی۔ تاجروں اور ساہوکاروں نے سونے اور چاندی کے ڈھیر لگا دئے تھے، تم سوچ رہے ہوگے کہ نگرس کے اس زمانے میں، جب ہر طرف دھن برس رہا تھا انسانیت نے کچھ امن اور آسودگی کے دن دیکھے ہوں گے! اگر ایسا سوچ رہے ہو تو تم بڑی غلطی پر ہو۔

غریب آدمی، بھکاری اور چور

فگرس (FUGGERS) کا زمانہ اگر ایک طرف دولت کا زمانہ تھا تو دوسری طرف یہی دور فقر و فاقے اور بھکاریوں کا دور بھی تھا۔ سولھویں اور سترھویں صدی عیسوی میں جب فگرس کے محلوں پر چاندی اور سونے کے چاند اور سورج طلوع ہو رہے تھے بھکاریوں کی بہت بڑی تعداد ایک ٹکڑے روٹی کے لئے غریبی کے اندھیرے میں ہاتھ پاؤں مار رہی تھی۔ سنہ ۱۶۳۰ء میں پیرس کی چوتھائی آبادی بھکاریوں پر مشتمل تھی۔ یہ تو شہر کا حال تھا۔ دیہاتی علاقوں میں فاقہ کشوں کی تعداد اور بھی زیادہ تھی۔ انگلستان کی حالت بھی اچھی نہ تھی۔ ہالینڈ میں تو بھکاریوں کی تعداد پوری شہری آبادی پر بھاری نظر آتی تھی۔ سولھویں صدی کے سوئٹزرلینڈ کا حال ان الفاظ میں پڑھو:-

"جب ان بھکاریوں سے جو ان (امراء) کے گھروں کو گھیرے رہتے تھے اور گروہ در گروہ سڑکوں پر اور جنگلوں میں گھومتے رہتے تھے، نجات پانے کی کوئی شکل نہ رہی تو ان امیروں نے کچھ شکاری دستے بنائے جو ان خانماں برباد محتاجوں کا شکار کھیلتے تھے۔"

آخر اس زمانے میں جب انے گنے چند خاندان، فارغ البالی کی دولت سے نہال ہو رہے تھے، عوام پر یہ تباہی کیوں چھائی ہوئی تھی؟ کوئی شبہ نہیں، جنگ بھی بربادی کا ایک سبب تھی۔ جنگ عظیم (سنہ ۱۹۱۴ء سے ۱۹۱۸ء) نے یورپ کے ان ممالک میں جہاں یہ لڑی گئی تھی، تباہی کی انتہا کر دی تھی۔ لیکن اس زمانے کی جنگیں بیسویں صدی کی اس جنگ عظیم سے بھی زیادہ تباہ کن تھیں۔ جرمنی کی تیس سالہ جنگ (سنہ ۱۶۱۸ء سے ۱۶۴۸ء) کی تباہ کاریوں کا تجربہ شاید دنیا کو آج تک پھر کبھی نہیں ہوا۔ اس لڑائی میں:-

"دو تہائی آبادی موت کا شکار ہو گئی، جو باقی بچے ان کی تباہ حالی دیکھی نہیں جاتی تھی، دیہاتوں کا ۵/۶ حصہ برباد ہو گیا تھا۔ ہم نے پلیٹنٹ (PALATINATE) کے حالات میں پڑھا ہے کہ دو سال میں وہ اٹھائیس مرتبہ لوٹا گیا۔ سیکسنی (SAXONY) میں بھیڑیوں کے جھنڈ گشت کرتے تھے، شمال میں تہائی زمین کاشت کے قابل نہیں رہ گئی تھی۔"

کوئی شبہ نہیں جنگ بھی عوام کی بے انتہا پریشانی اور بے اندازہ تباہی کا موجب تھی لیکن جنگ کے علاوہ ان تباہیوں کا سبب ایک اور بھی تھا ـــــ یہ سبب تھا امریکہ۔ اس نئی دنیا نے براہ راست نہیں لیکن بالواسطہ ان خانماں بربادوں کی تباہی میں بڑا اہم حصہ لیا۔ آخر یہ کیسے ہوا؟

جس زمانے میں انگلستان، ہالینڈ اور فرانس تجارت میں دولت کے انبار لگا رہے تھے ہسپانوی ایک سادے طریقے سے اپنے خزانے کا پیٹ بھر رہے تھے۔ ان کے جہاز راں ہند اور ہند اقصیٰ کا راستہ دریافت کرنے میں ناکام رہے تھے لیکن وہ شمالی اور جنوبی امریکہ کے براعظموں تک پہونچنے اور وہاں قدم جمانے میں ضرور کامیاب ہو گئے تھے۔ میکسیکو اور پیرو میں سونے اور چاندی کی زبردست کانیں موجود تھیں۔ اسپین کے بادبانی جہاز یہ دولت سمیٹ کر بار کر رہے تھے۔ سیکسنی (SAXONY) اور آسٹریا کی کانیں بھی چاندی کی بڑی مقدار پیدا کر رہی تھیں لیکن یہ مقدار اُس چاندی کے انبار کے مقابلے میں جو ہسپانوی نئی دنیا سے اسپین میں آ رہی تھی، کوئی حقیقت نہ رکھتی تھی۔ سنہ ۱۵۴۵ء سے لے کر سنہ ۱۵۶۰ء تک صرف پچپن سال میں ان نئی امریکی کانوں سے جو ہسپانیوں کے قبضے میں تھیں بیس لاکھ پونڈ سالانہ چاندی نکلی تھی۔ ایک کان کے خالی ہوتے ہی دوسری کانیں سامنے آجاتی تھیں۔ ہسپانوی ٹکسال نے تقریباً پینتالیس ہزار کیلوگرام چاندی سنہ ۱۵۰۱ء سے لے کر سنہ ۱۵۲۰ء تک ڈھالی لیکن سنہ ۱۵۴۵ء سے لے کر سنہ ۱۵۶۰ء تک یہ پیداوار بڑھ کر چھ گنی یعنی دو لاکھ ستر ہزار کیلوگرام ہو گئی۔ سنہ ۱۵۸۱ء سے لے کر سنہ ۱۶۰۰ء تک بیس برسوں میں یہ پیداوار تین لاکھ چالیس ہزار کیلوگرام تک پہونچ گئی۔ یہ مقدار سنہ ۱۵۲۰ء کی مقدار سے آٹھ گنی زیادہ تھی۔ ذیل کے نقشے سے ترقی

کی یہ تدریجی رفتار اچھی طرح سمجھ میں آجائے گی:۔

سنہ	ہسپانوی ٹکسال کی پیداوار
۱۵۰۰ء سے ۱۵۲۰ء	۵۰۰۰ء کیلوگرام
۱۵۴۵ء سے ۱۵۶۰ء	۲۷۰۰۰۰ ״
۱۵۸۰ء سے ۱۶۰۰ء	۳۴۰۰۰۰ ״

دولت کا یہ سیلاب جو امریکہ کی ہسپانوی کانوں سے بہہ کر اسپین میں آرہا تھا کہاں جاتا تھا؟ کیا یہ اسپین میں رُک جاتا تھا؟ نہیں، بالکل نہیں، یہ اسپین میں آتے ہی پورے یورپ میں پھیل جاتا تھا شاہانِ اسپین نے پے درپے متعدد احمقانہ لڑائیاں لڑیں انھوں نے فوجی رسد اور سپاہیوں کی تنخواہوں پر بڑی لمبی رقمیں خرچ کیں۔ ہسپانوی عوام چاندی کھا تو نہیں سکتے تھے، ان کو یہ چاندی اپنی ضروریات زندگی کی چیزیں خریدنے کے لئے دوسروں کو دینی پڑتی تھی۔ وہ اپنا سامان کم بیچتے تھے لیکن دوسروں کا سامان زیادہ خریدتے تھے۔ ان کی دولت ان کی انگلیوں سے چھن چھن کر ان اجنبی تاجروں کی جیبوں میں پہونچ رہی تھی، جو ان کے ہاتھ اپنا سامان بیچتے تھے

یورپ میں چاندی کی اس بڑی مقدار کی آمد نے، جو اس سے پہلے کبھی نہیں آئی تھی، کیا حالات پیدا کئے؟ اس چاندی کے آنے سے چیزوں کی قیمتوں میں ایک ہیجان خیز اضافہ ہوا، یہ اضافہ پیسے دو پیسے کا نہ تھا بلکہ ہر چیز کی قیمت نمایاں طور پر پریشان کن حد تک بڑھ گئی قیمتوں میں ایسا انقلاب ہو رہا تھا جو دنیا کی پچھلے ہزار سال کی تاریخ میں شاید صرف تین یا چار بار مشاہدے میں آیا تھا۔ سنہ ۱۶۰۰ء میں چیزوں کی قیمتیں دوگنی ہو گئیں اور سنہ ۱۷۰۰ء میں تو یہ اضافہ تین چار گنے تک بڑھ گیا۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ سکوں میں سونے اور چاندی کی مقدار کم کرنے سے ان کی قیمت گھٹ جاتی ہے یہی بات ہم اس طرح بھی کہہ سکتے ہیں کہ سکے کی قیمت کم کرنے سے چیزوں کی قیمتیں بڑھ جاتی ہیں۔ اسی صورت سے جب روپئے کی ایک بڑی تعداد بازار میں آجاتی ہے تو چیزوں کی قیمتیں بڑھ جاتی ہیں۔ روپیہ بھی ان چیزوں میں جن کی ضرورت انسان کو رہتی ہے، شامل ہے لیکن اس کی

رسد غیر محدود نہیں ہے۔ ہم سب کو ہوا کی ضرورت ہے لیکن ہوا اتنی مقدار میں ہر جگہ موجود ملتی ہے کہ اس کی معاشی قیمت ختم ہو جاتی ہے اور ہم کو اپنی ضرورت بھر کی ہوا کے لئے کچھ ادا کرنا نہیں پڑتا۔ ہم پانی بھی خریدنے اور بیچنے کا کوئی خیال نہیں کرتے لیکن گرم اور خشک ملکوں اور ریگستانی علاقوں میں پانی بکتا ہے، وہاں اُس کی جتنی طلب ہوتی ہے اتنی مقدار میں وہ فراہم نہیں کیا جا سکتا۔ جس زمانے میں اشیا کے تبادلے (BARTER) کا رواج تھا، اُس زمانے میں اگر گیہوں کم پیدا ہوتا اور انگوروں کی فصل اچھی ہوتی تو ہم اچھی طرح اندازہ کر سکتے ہیں کہ گیہوں کی معمولی مقدار خریدنے کے لئے ہم کو شراب کی غیر معمولی مقدار دینی پڑتی۔ یہی اصول روپئے کے معاملے میں بھی اثر انداز ہوتا ہے۔ اگر بازار میں روپیہ کی افراط ہو جائے یعنی وہ اُن چیزوں کے مقابلے میں جن کے لئے وہ استعمال ہوتا ہے زیادہ بڑھ جائے تو اس کی قیمت گر جائے گی یعنی وہ کم چیزیں خرید سکے گا اور چیزوں کی قیمتیں بڑھ جائیں گی۔ روپئے کی قیمت میں کمی کا مطلب چیزوں کی قیمتوں کا بڑھنا ہے اور روپئے کی قیمت میں اضافے سے مراد چیزوں کی قیمتوں کا کم ہونا ہے یہ تغیرات اُس روپئے کی تعداد میں کمی بیشی سے، جو بازار میں گردش کر رہا ہے، پیش آتے رہتے ہیں۔

یہی وجہ تھی کہ جب قیمتی دھاتیں یورپ کے بازاروں میں بڑی مقداروں میں آگئیں تو قیمتیں بڑھ گئیں اور لوگ عام طور سے یہ باتیں کرنے لگے کہ:-

> مجھ کو وہ اچھے بیتے ہوئے دن یاد آتے ہیں جب ہم اس کی چوتھائی رقم میں، جو ہم آج ادا کرتے ہیں، اتنا مکھن اور انڈے خرید لیا کرتے تھے

امریکہ کی دولت سب سے پہلے اسپین میں آئی اور وہیں سب سے پہلے قیمتوں کا غیر معمولی اضافہ مشاہدے میں آیا۔ ایک ڈچ سیاح نکولس کلینرٹس (NICOLAS CLEYNAERTS) نے اسپین اور پرتگال کا ۱۵۳۶ء میں سفر کیا تھا، وہاں کی اونچی قیمتیں دیکھ کر وہ دم بخود رہ گیا۔ ایک مرتبہ داڑھی منڈانے کی اجرت اتنی زیادہ دینی پڑی کہ وہ ایک خط میں، جو اُس نے اپنے گھر والوں کے نام لکھا تھا، اس کا تذکرہ کئے بغیر نہ رہ سکا۔ اُس نے لکھا:-

"سلامنکا (SALAMANCA) میں ایک مرتبہ داڑھی منڈانے کے لئے نصف ریال ادا کرنا پڑتا ہے۔ اسی گرانی کی وجہ سے اسپین کے لوگ فلینڈرس کے مقابلہ میں داڑھیاں رکھتے ہوئے زیادہ نظر آتے ہیں"

جب امریکہ کی چاندی اسپین کے ذریعہ سے پورے یورپ میں پھیل گئی تو گرانی بھی جس نے اسپین میں اس سیاح کو پریشان کر دیا تھا، ہر طرف چھا گئی۔ گرانی کے اسباب عام آدمی کی سمجھ میں نہیں آتے تھے اُس کو یہ نہیں معلوم تھا کہ قیمتوں کا یہ انقلاب بین الاقوامی ہے اور ملک کے کسی خاص حصے تک محدود نہیں ہے۔ وہ بڑبڑاتا اور گرانی کی ذمہ داری کسی خاص لالچی آدمی کے سر تھوپ دیتا سولھویں صدی عیسوی میں ایک کتاب "مملکتِ انگلستان کی بہبودی کی بات چیت" (A DISCOU-RSE OF THE COMMON WEAL OF THIS REALM OF ENGLAND) لکھی گئی ہے مصنف نے اس کتاب میں دکھایا ہے کہ ایک کسان گرانی کی ذمہ داری زمین کے مالک نائٹ (KNIGHT) پر ڈالتے ہوئے کہتا ہے کہ چونکہ تم نے زمین کا کرایہ بہت بڑھا دیا ہے اس لئے یہ گرانی پیدا ہو گئی ہے۔ نائٹ اپنے جواب میں گرانی کی ذمہ داری کسان پر ڈال کر کہتا ہے کہ تم نے اپنی پیداوار کی قیمت بہت بڑھا دی ہے اس لئے یہ مشکل پیدا ہو گئی ہے:۔

کسان:۔ جناب والا! چونکہ آپ نے زمین کا لگان بہت بڑھا دیا ہے، اس لئے جو لوگ کھیتوں کی آمدنی پر بسر کرتے ہیں، وہ مجبوراً اپنی پیداوار کی قیمت بڑھاتے ہیں۔ اگر وہ ایسا نہ کریں تو آئندہ لگان ادا کرنے کے لائق نہ رہیں گے۔

نائٹ:۔ کسان! یہ تو صرف تمھاری ہوس کی وجہ سے ہو رہا ہے۔ ہم کو تم سے غلہ، جانور، سوّر کا گوشت، مرغ، چوزے، مکھن اور انڈے وغیرہ بہت گراں ملتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم بھی اپنی زمین کا کرایہ بڑھانے پر مجبور ہوئے ہیں۔ آٹھ سال پہلے چیزوں کے جو دام تھے وہ تم نے ڈیوڑھے کر لئے ہیں۔ تمھارے پڑوسیوں کو خوب معلوم ہے کہ اس وقت ہم سوّر کا جتنا گوشت آٹھ پنس میں خریدتے ہیں پہلے اتنا چار پنس میں ملتا تھا ہم

ایک اچھا مرغ تین پنس یا چار پنس میں، جوڑے ایک پینی اور مرغیاں دو پنس میں
لیتے تھے، اب ہم کو ان کے دام پہلے کے مقابلے میں دوگنے ادا کرنے پڑتے ہیں یہی
حال بکری اور گائے کے گوشت کا ہے۔"

اُس زمانے میں کچھ ایسے مفکر بھی موجود تھے جو قرونِ وسطیٰ کے روایتی طرزِ فکر سے ہٹ کر آزادی سے غور کرنے کے عادی تھے جیسے بوڈن اور کینٹیلن وہ لوگ تھے جو اس نتیجے پر پہونچ گئے تھے کہ قیمتوں کے اضافے کے پیچھے ایک غیر شخصی قانون کام کر رہا ہے اس قانون کا کسی آدمی کی اچھائی یا برائی سے کوئی تعلق نہیں نہ تھا۔ بوڈن نے سولھویں صدی عیسوی کے آخر میں لکھا تھا:۔

"میں خیال کرتا ہوں کہ یہ گرانی تین وجوہ سے پیدا ہوئی ہے، خاص اور سب سے بڑی وجہ (جسے
کسی شخص نے اب تک معلوم نہیں کیا ہے) سونے اور چاندی کی زیادتی ہے۔ اس وقت
ان دھاتوں کی اتنی بڑی مقدار اس سلطنت میں موجود ہے جتنی پچھلے چار سو برسوں میں
کبھی نہیں ہوئی تھی۔"

سونے چاندی کی بہتات اور چیزوں کی گرانی میں ایک خاص تعلق ہے۔ یہ حقیقت ابھی تک بہت کم لوگوں کے دماغ میں آئی تھی لیکن بوڈن کی اس اہم کتاب نے بہت سے دماغوں کی کھڑکیاں کھول دیں اور اس کی کتاب کی اشاعت کے کچھ دنوں کے بعد سنہ ۱۶۰۱ء میں جنرل ڈی مالی نس نے لکھا۔

"روپے کی بہتات عام طور سے چیزوں کو مہنگا کر دیتی ہے اور روپے کی کمی اسی طرح چیزوں
کے سستے ہونے کا باعث ہوتی ہے۔ اس لئے روپے کی کمی اور زیادتی کے بموجب چیزیں مہنگی
اور سستی ہوا کرتی ہیں۔ پچھلے زمانے میں ہند قصلی سے سونے اور سکوں کی جو کثیر مقدار ہمارے
ملک میں آئی ہے اس نے ہر چیز کو مہنگا کر دیا ہے۔"

سولھویں اور سترھویں صدی عیسوی میں جو بات بڑے اختلافات کا موجب بنی ہوئی تھی وہ اٹھارھویں صدی عیسوی میں ہر شخص کی سمجھ میں آگئی کینٹلن لکھتا ہے:۔

"اگر سونے اور چاندی کی کانیں مل جائیں اور سونے چاندی کی بڑی مقدار ان سے

نکال کر قرض دی جائے یا خرچ کی جائے جیسے ہی یہ مقدار گردش میں آئے گی، پیداوار اور مصنوعات کی قیمت، جہاں کہیں جائے گی بڑھا دے گی۔ ہر شخص متفق ہے کہ روپے کی زیادتی ہر چیز کی قیمت بڑھا دیتی ہے۔ زر کی بڑی مقدار جو امریکہ سے یورپ میں گذشتہ دو صدیوں کے اندر آئی ہے، چیزوں کی قیمتیں بڑھانے کی موجب ہوئی ہے، یہ خیال اب تجربے سے اچھی طرح صحیح ثابت ہو چکا ہے۔"

چیزوں کی قیمتوں میں غیر معمولی اضافے کے کیا نتائج نکلے ہیں؟ کس کو فائدہ پہونچا ہے اور کس نے نقصان برداشت کیا ہے؟ جن لوگوں نے افراطِ زر کے اس دور میں غیر معمولی فائدے حاصل کیے وہ تاجر تھے۔ کوئی شبہ نہیں ان کے مصارف بہت بڑھ گئے تھے لیکن ان کو اپنی تجارت میں مصارف سے زیادہ منافع ہوا۔ انھوں نے جو چیزیں خریدیں ان کے زیادہ دام ادا کیے لیکن جو کچھ بیچا اُس کے دام اُس سے بہت زیادہ لیے، جو وہ معمولاً لیا کرتے تھے۔ دوسرے لوگ جنھوں نے اس گرانی سے فائدہ اُٹھایا وہ تھے جن کے مصارف اپنی جگہ پر قائم رہے لیکن ان کی پیداوار کی قیمت بڑھ گئی۔ انھوں نے طویل المیعاد پٹوں پر زمینیں لے رکھی تھیں۔ اور قدیم معاہدے کی بنا پر گرانی سے پہلے کا محصول ادا کرتے تھے۔ اب ان کی پیداوار مکھن، انڈے، گیہوں اور جو وغیرہ کی قیمت بڑھ گئی تھی۔ اس لئے وہ بھی بدلے ہوئے حالات میں کافی نفع کما رہے تھے۔

لیکن ان مذکورہ بالا گروہوں کے علاوہ یہاں ان بدقسمتوں کے بہت سے گروہ تھے جنھوں نے قیمتوں کے انقلاب سے بڑا نقصان اُٹھایا تھا، حکومتوں کے لئے اپنے مصارف کا پورا کرنا بہت مشکل ہو گیا۔ ان کی آمدنیاں مقرر تھیں لیکن ان کے مصارف بڑھ رہے تھے۔ یہ ایک انقلاب کا زمانہ تھا۔ قومی حکومت کے تصور کی جڑیں مضبوط ہو رہی تھیں حکومتوں کا مالیاتی نظام پرانا ہو چکا تھا اور نئے حالات میں وہ کسی طرح کامیاب نہیں ثابت ہو رہا تھا۔ رفتہ رفتہ یہ ختم ہو رہا تھا اور کبھی کبھی اس کے ٹوٹنے کی آوازیں بھی سننے میں آ جاتی تھیں قیمتوں کے انقلاب نے اس بوسیدہ نظام کی گرتی ہوئی دیواروں کو اور بھی ہلا دیا۔ مالی دشواریوں نے بادشاہوں کو روپئے والوں کے ہاتھوں

میں کٹھ پتلی بنا دیا اور ان سرمایہ داروں نے حکومت کی مجبوریوں سے فائدہ اٹھا کر ان کٹھن گھڑیوں میں بڑی بڑی رعائتیں حاصل کر لیں۔ اس دور کے انقلابات کا جنھوں نے اس دولتمند متوسط طبقے کے اثر و اقتدار کو اور بھی بڑھا دیا، قیمتوں کے انقلاب سے بڑا گہرا تعلق تھا۔

اس دور میں مزدور پیشہ لوگوں نے بھی بڑے بُرے دن دیکھے قیمتیں بڑھنے کا زمانہ ہمیشہ مزدوری بڑھنے کا زمانہ بھی ہوتا ہے۔ اس لئے تم ضرور امید کرتے ہو گے کہ قیمتوں کے اضافے کے ساتھ ساتھ اجرتوں کے اضافے سے حالات خود بخود متوازن ہو گئے ہوں گے لیکن ایسا نہیں ہوا، حقیقت یہ ہے کہ مزدوری کبھی اتنی نہیں بڑھتی جتنی چیزوں کی قیمتیں بڑھ جاتی ہیں مزدوری کے اضافے کے لئے عام طور سے لڑائیاں لڑنی پڑتی ہیں اور یہ اضافہ عام طور سے اسی وقت ملتا ہے جب اس کے حاصل کرنے کے لئے پختہ عزم و ارادے کے ساتھ کوئی عوامی تحریک شروع کی جاتی ہے۔ اس تحریک کا مقابلہ بہت شدت سے کیا جاتا ہے لیکن قیمتوں کے اضافے میں یہ جد و جہد نہیں کرنی پڑتی، بلکہ صرف کاروبار کے ہیر پھیر سے بازار میں چیزوں کی قیمتیں بڑھ جاتی ہیں، اب مزدور کو بھی ان حالات کے مقابلے کے لئے اُٹھنا پڑا۔

پندرھویں صدی عیسوی کے آخر میں فرانس کا ایک مزدور اپنی ایک دن کی اجرت سے ۴ر۳ کیلوگرام گوشت خرید سکتا تھا۔ ایک صدی کے بعد اسی اجرت میں وہ صرف ۸۰ر۱ کیلوگرام گوشت خریدنے کے لائق رہ گیا تھا۔ پہلے دور میں وہ چار فرانک کا جتنا غلہ خرید لیتا تھا دوسرے دور میں بیس فرانک میں بھی اتنا غلہ نہیں میسر ہوتا تھا۔ روجرس اندازہ لگاتا ہے کہ ۱۴۹۵ء میں ایک کسان پندرہ ہفتے میں سال بھر کے مصارف کے لئے ضروری رقم پیدا کر لیتا تھا۔ لیکن ۱۶۱۰ء میں وہ پورے سال ہر ہفتے کام کرنے کے بعد بھی پورے سال کی ضروریات خریدنے کے لائق نہ تھا۔

"۱۶۱۰ء میں انگلینڈ میں ایک دست کار کو اتنی رقم پیدا کرنے کے لئے جو وہ ۱۴۹۵ء میں دس ہفتے کی محنت سے پیدا کر لیتا تھا، تینتالیس ہفتے محنت کرنے کی ضرورت تھی۔"

ایک مزدور کے لئے ان حالات میں سوا اس کے کیا چارہ کار تھا کہ وہ بھوکے پیٹ پر قناعت کرے یا پیٹ کی روٹی کی خاطر مزدوری بڑھانے کا مطالبہ کرے اور اگر ان دونوں باتوں میں سے کوئی بات نہ ہو سکے تو کاسۂ گدائی لے کر بھیک مانگنے نکل کھڑا ہو۔ قیمتوں کے انقلاب نے یہ تینوں صورتیں پیدا کر دیں۔

ایک اور طبقہ جو قیمتوں کے انقلاب سے بہت متاثر ہوا، وہ تھا جس کی آمدنیاں مقرر تھیں، مالکان املاک، سالانہ عطیوں، وظیفوں اور پنشنوں پر بسر کرنے والے اور وہ لوگ جو مکفول رقموں پر مقررہ سود پاتے تھے، اس مصیبت زدہ طبقے میں شامل تھے۔ ہم ذیل میں مس رنرسز (RENERSES) کی مثال پیش کرتے ہیں۔ اس خاتون نے چودھویں صدی عیسوی کے آخر میں اپنا روپیہ سالانہ وظیفہ (ANNUITY) حاصل کرنے کے لئے لگا دیا تھا تاکہ وہ اپنی آخری عمر آرام سے بسر کر سکے۔ ذیل کی تحریر سے اس واقعہ پر روشنی پڑتی ہے:-

"ہم مجلس شوریٰ کے ارکان، میر بلدہ اور شہر ہلبرسٹاٹ (HALBERSTADT) کے ارکان گلڈ (GILD) اعلان کرتے ہیں کہ ہم نے مقدس کنواری الہٹرے رنرسز کے ہاتھ نصف مارک کا سالانہ کرایہ پانچ مارک کے عوض میں بیچ دیا ہے اور رقم ہم کو ادا کر دی گئی ہے۔"

مس رنرسز نے یہ رقم غالباً اپنے بڑھاپے کے دن آرام اور اطمینان سے بسر کرنے کے لئے جمع کی تھی۔ یہ بڑی دور اندیشی کی بات تھی لیکن اگر یہ عاقبت اندیش خاتون وہ زمانہ دیکھنے کے لئے زندہ رہتی جس میں چیزوں کی قیمتوں میں یہ غیر معمولی انقلاب ہوا تھا، تو وہ یقیناً اپنے مقصد میں ناکام رہتی۔ اور اس کو اپنے بڑھاپے کے دن فاقہ کشی میں گذارنے پڑتے۔ چیزوں کی گرانی اپنی انتہا کو پہنچ چکی تھی وہ اپنے آدھے مارک میں ضروریات کی وہ مقدار تو ہرگز نہ خرید سکتی۔ جس کے لئے اس نے وہ رقم جمع کی تھی۔ اس کی آمدنی برائے نام وہی آدھا مارک رہتی لیکن "اصلی" آمدنی کم ہو جاتی۔ یہ صورت ان لوگوں کے لئے جو مقررہ آمدنی رکھتے ہیں، گرانی کے زمانے میں ہمیشہ پیش آتی ہے۔

اسی طرح جن لوگوں کی زندگی کا دارو مدار زمین کی مقررہ آمدنی پر تھا وہ بھی قیمتوں کے اس غیر معمولی انقلاب سے بہت متاثر ہوئے۔ تم کو یاد ہوگا کہ پہلے مقررہ لگان کے بجائے کسان اپنے مالک کے فارم پر کچھ دنوں کام کیا کرتے تھے، اس دستور کے بجائے اب زمینوں کا کرایہ ملتا تھا۔ یہ طریقہ قیمتوں کے انقلاب کے زمانے سے پہلے تک کامیابی سے چلتا رہا۔ لیکن اس انقلابی دور میں بھی، جب بازار کا بھاؤ آسمان سے باتیں کر رہا تھا، ان کی آمدنیاں وہی رہیں، جو پہلے تھیں لیکن ان کو اپنی ضروریاتِ زندگی کے دام وہ دینے پڑ رہے تھے جو اس وقت بازار میں رائج تھے۔ ان کے سامنے یہ مسئلہ زیرِ غور تھا کہ وہ اس صورتِ حال کا مقابلہ کیسے کریں؟۔

وہ بڑے جاگیردار اور دولت مند لوگ جنھوں نے جاگیر میں زمینیں پائی تھیں یا چرچ کی وہ زمینیں جو بادشاہوں نے ضبط کر لی تھیں، خریدی تھیں۔ زمینوں کا وہی کرایہ پا رہے تھے جو اب تک ملتا آیا تھا۔ وہ بھی اپنی زمین کی آمدنی بڑھانا چاہتے تھے لیکن آخر اس کی تدبیر کیا تھی؟

اس کی دو شکلیں تھیں، زمینوں کی احاطہ بندی اور اونچے محصول کی نئی تشخیص۔

زمینوں کی احاطہ بندی کا رواج پورے یورپ میں ہو گیا۔ انگلستان میں اس رواج نے کچھ زیادہ زور پکڑا۔ تم نے پہلے باب میں کھلے ہوئے غیر محدود کھیتوں کا ذکر پڑھا ہوگا۔ یہ طریقہ کچھ اچھا نہ تھا۔ اس طرح کے کھلے کھیتوں میں نقصان بہت ہوتا تھا یہ اس لئے بھی مناسب تھا کہ نیا بیدار مغز کسان اب ان پرانے ٹکڑوں پر نئے تجربے کرنے کے بجائے اسے پسند کرتا تھا کہ وہ ایسے کسانوں سے معاملت کرے جن کے ٹکڑے اس کے پڑوس میں واقع ہوں۔ چند بیوقوف کسان پورے گاؤں کی ترقی میں روڑا اٹکا سکتے تھے، وہ ایسے پرانے خیال کے کسانوں سے دور رہنا چاہتا تھا۔ بعض مقامات پر اب زمین کے قطعے جو مختلف سمتوں میں واقع ہو سکتے تھے بدلنے کی تحریک شروع ہوئی۔ اس تحریک نے کسانوں کی ایک تعداد کو بہت فائدہ پہونچایا۔ فرض کرو ان کی تیس تیس ایکڑ زمین پورے گاؤں میں اِدھر اُدھر بکھری ہوئی پڑی تھی۔ انھوں نے آپس میں مفاہمت کر کے زمینیں بدل لیں اور اس طرح انھوں نے چار بڑے بڑے چک جو

چھ چھ سات سات ایکڑوں پر مشتمل تھے، نکال لئے۔ بعض خوش قسمت اور ذہین چک بند کسان ایسے بھی نکلے، جو ایک ہی جگہ اپنا تیس ایکڑ کا چک نکالنے میں کامیاب ہو گئے۔ اس چک بندی کے بعد اب احاطہ بندی کی باری تھی۔ اب تک جو زمین ہر طرف سے کھلی ہوئی تھی، اب اُس کے چاروں طرف احاطہ بن گیا۔ اگر تم نے کبھی نئے انگلستان کا سفر کیا ہوگا تو تمھاری نگاہ سے پتھر کی دیواریں جو کسانوں کے فارموں کو گھیرے کھڑی ہیں، گذری ہوں گی۔ پرانے انگلستان میں بھی، جہاں پتھر آسانی سے مل سکتا تھا، کسانوں نے پتھر کی دیواروں سے احاطہ بندی کر لی، جہاں پتھر نہ مل سکے انھوں نے کٹیلی جھاڑیوں سے اپنے چکوں کو گھیر لیا۔ اس قسم کی احاطہ بندی سے کسی کا کوئی نقصان نہ تھا بلکہ کھیتوں کی پیداوار میں اضافہ ہو رہا تھا اس لئے کسی نے اس رواج پر کوئی اعتراض نہیں کیا بلکہ چھوٹے بڑے تمام کسانوں نے اس رواج پر عمل کر کے اس سے فائدہ اٹھایا۔

لیکن اسی زمانے میں ایک دوسرے قسم کی احاطہ بندی نے بھی رواج پایا۔ اس سے ہزاروں آدمیوں کو نقصان پہونچا۔ یہ بھیڑیں پالنے کے لئے احاطوں کا رواج تھا۔ اُون کی قیمت بڑھ گئی تھی (انگلستان سے اون بڑی مقدار میں برآمد ہوتا تھا) بہت سے مالکانِ زمین نے اپنی زمینوں کو زراعت کے بجائے بھیڑیں پالنے کے لئے استعمال کرنا شروع کیا۔ انھوں نے اپنی زمینوں کی احاطہ بندی کر کے بھیڑوں کے لئے چراگاہیں بنالیں۔ اب ان کو کھیتی میں کم لیکن بھیڑوں کے کاروبار میں زیادہ نفع تھا، یہ تغیر قیمتوں کے انقلاب سے پہلے شروع ہو چلا تھا۔ اب قیمتوں کے نئے اضافے نے سونے پر سہاگے کا کام کیا اور دوسرے جاگیرداروں نے بھی اپنے کھیتوں کو بھیڑوں کے باڑوں اور چراگاہوں سے تبدیل کرنا شروع کر دیا۔ اس طریقہ سے ان کو آمدنی بھی زیادہ ہوتی تھی اور زراعت کے مقابلے میں ان کو مصارف بھی کم برداشت کرنے پڑتے تھے۔ لیکن وہ کسان اور مزدور جو ان زمینوں پر کام کر کے اپنے پیٹ کی روٹی پیدا کر لیا کرتے تھے بیکار ہونے لگے بھیڑوں کے فارم چلانے کے لئے اتنے آدمیوں کی (جتنے کھیتی میں لگتے ہیں) ضرورت نہ تھی۔ اس لئے اب ان زرعی مزدوروں کا بڑا حصہ فارموں سے باہر کر دیا گیا۔ بہت سے ایسے کسان بھی تھے۔

جن کی زمینیں ابھی تک ان بڑے چکوں کے بیچ میں پڑی ہوئی تھیں۔ ان مالکوں نے، اپنے چکوں سے یہ رخنہ دور کرنے کی نیت سے ان کو بھی نکال باہر کیا۔ اس صورت سے ان بیکار مزدوروں کی بھیڑ میں کچھ اور فاقہ کشوں کا گروہ بھی شامل ہو گیا۔ ہم کو اس زمانے کے بعض کتابچوں سے جن میں اس عہد کے مصیبت زدوں کی دردانگیز فریادیں درج کی گئی ہیں اس بڑی تباہی کا اندازہ ہوتا ہے جو اس احاطہ بندی کے رواج سے، غریب کسانوں کی بستیوں پر چھا گئی تھی۔

کبھی کبھی زمینوں کے مالک ان عام چراگاہوں کو بھی، جن کے چاروں طرف احاطہ کھنچا ہوتا تھا، بند کر دیتے تھے اور غریب کسانوں کے جانوروں کے لئے چرنے کی کوئی جگہ نہ رہ جاتی تھی۔ یہ مصیبت بھی ان غریبوں کی تباہی کے لئے کافی ہوتی تھی۔

کیا کسانوں کو ان مظالم کے خلاف کسی چارہ جوئی کا اختیار تھا؟ ہاں تھا۔ وہ عدالتوں کا دروازہ کھٹکھٹا سکتے تھے لیکن عدالتوں کے مصارف بھی تو امیروں ہی کے لئے آسان تھے۔ وہ تاوان ادا کر کے مقدمے کی زندگی اور مصارف بڑھاتے رہتے تھے۔ غریب کسان، جو بھوکے پیٹ مقدمہ لڑنے آتا تھا، تھک کر بیٹھ رہتا تھا۔ امراء اس طرح ان کسانوں کو گھٹنے کے بل گرا کر زمینوں کے باہر کر دیتے تھے اور ان کی زمینیں خرید کر اپنے چک میں شامل کر لیتے تھے۔

ذیل میں ہم اس عرضداشت کا اقتباس پیش کرتے ہیں، جو ووٹن بسیٹ (WOOTEN BASSET) کے کسانوں نے دارالعوام میں "چراگاہوں کے حقوق کی بحالی" کے لئے پیش کی تھی:-

"چونکہ ہم میر بلدہ اور آزاد کاشتکاران بلدہ، قصبہ مذکور کی چراگاہ میں اپنے جانوروں کو بلا معاوضہ چرانے کا حق رکھتے تھے سر فرانسس انگلفیلڈ (ENGLEFIELD) نے اس چراگاہ کو بند کر لیا ہے اور ہم لوگوں کو اپنے جانور چرانے کی اجازت نہیں دیتا ہے وہ بہت طاقتور آدمی ہے اور ہم آزاد کاشتکار اس قابل نہیں ہیں کہ عرصے تک اس کے خلاف عدالتوں میں چارہ جوئی کرتے رہیں۔ ہم میں سے ایک آزاد کاشتکار جان روس مقدمے کے مصارف کے بوجھ سے مجبور ہو کر اپنی زمین، جس کی قیمت تقریباً پانچ سو پونڈ ہوگی

بیچ چکا ہے اور اس کے علاوہ اور بہت سے لوگ تباہ ہو چکے ہیں۔ ہم چراگاہ سے باہر نکال دئے گئے ہیں اور اب ہم کو چراگاہ میں قدم رکھنے کی بھی اجازت نہیں ہے۔ ہم لوگ بہت غریب ہو گئے ہیں۔ اس لئے اگر آپ کے دل میں خدا رحم ڈال دے اور آپ ہمارے حال زار پر ترس کھا کر کوئی ایسا قانون بنا دیں جو ہم کو چراگاہ پھر واپس دلا دے تو ہم اس قابل ہو سکیں گے کہ پھر اپنے حق کا استعمال کر سکیں۔"

(اس عرضداشت پر تیئیس آدمیوں کے دستخط ہیں)

"اور بھی بہت سے لوگ دستخط کرتے لیکن وہ مالک سے اگانی معاہدے کر چکے ہیں اور ڈرتے ہیں اگر وہ دستخط کریں گے تو مالک ان معاہدوں کو فسخ کر دے گا اور وہ اس لائق نہ رہیں گے کہ زندگی بسر کر سکیں۔ اگر یہ ڈر نہ ہوتا تو انھوں نے بھی دستخط کرتے ہوتے۔"

لیکن یہ احاطہ بندی صرف بھیڑوں کے فارم قائم کرنے کے لئے نہیں ہو رہی تھی۔ بہت سے زمینوں کے مالک بڑے بڑے زرعی فارم بھی قائم کرنا چاہتے تھے۔ چھوٹے زرعی فارموں میں خرچ بہت ہوتا تھا اس لئے اب مالکانِ زمین نے بڑے فارم قائم کرنے شروع کئے تاکہ وہ زیادہ پیداوار اور آمدنی حاصل کر سکیں۔ وہ بدقسمت کسان جن کی زمینیں ان امیروں کے فارموں کے درمیان میں آ گئیں وہ بے دخل کئے گئے اور وہ بھی ان خانماں برباد کسانوں کی بھیڑ میں شامل ہو گئے جن کے پاس اپنا رزق پیدا کرنے کے لئے زمین ہی نہ تھی۔

ہم کو چکوں کی احاطہ بندی کے متعلق تو بہت کچھ معلوم ہو چکا ہے لیکن ہم اس دور کے "اضافہ محصول" کی رو سے بہت کم واقف ہیں۔ دراصل اس دور میں یہی بات سب سے زیادہ اہم تھی۔ زمینوں کا لگان اور نذرانہ جو نیا پٹہ کراتے وقت ادا کرنا پڑتا تھا اپنی جگہ پر عملاً قائم تھا۔ زمانے کے رواج نے اس کو اپنی جگہ پر قائم کر دیا تھا۔ پرانے زمانے میں رواج بھی قانون کی طرح بڑی اہمیت رکھتا تھا۔ لیکن اب قیمتوں کے انقلاب نے زمین کے محصول میں بھی اضافہ ضروری کر دیا تھا۔ اس لئے مالکان آراضی نے بھی رواج کو، جو اب تک کسان کی پشت پناہی کرتا تھا، پیچھے

ڈال دیا جب کسی کسان کے پٹے کی مدت ختم ہوتی، اُسی محصول پر اُس کی تجدید کے بجائے، جیساکہ اب تک دستور چلا آرہا تھا، مالکانِ آراضی غیر معمولی اضافہ کردیتے تھے۔ کسان اکثر اپنی حیثیت اتنی نہ پاتا کہ اتنا بڑا محصول ادا کرسکے اور مجبوراً اپنی زمین سے دست بردار ہوجاتا۔ عام طور سے اُس زمانے میں پٹے داروں کے ساتھ یہی صورت پیش آتی تھی۔

آگے چل کر زمین پر پٹے کے بموجب قبضہ بہت اہم ہوگیا تھا لیکن اُس زمانے میں کاشتکاروں کی بڑی اکثریت جمع بندی کے اصول کے ماتحت اپنی زمین پر کاشت کرتی تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ اپنی کاشت کے معاملے میں اُس دستور کے، جو اُس جاگیر میں رائج تھا، پابند تھے۔ جاگیروں میں سب سے بڑا اصول "مالک کی مرضی" کا تھا۔ بدقسمتی سے "مالک کی مرضی" اکثر یہی ہوتی تھی کہ اُس کو اپنی زمین سے زیادہ روپیہ ملے اور اگر یہ کاشتکار اتنا روپیہ جو مالک چاہتا تھا ادا نہ کرسکتا تو یہ زمین کسی دوسرے گاہک کے پاس جو مالک کو زیادہ خوش کرسکتا تھا، چلی جاتی تھی۔ اور اس طرح ہر امکانی کوشش کی جاتی تھی کہ اُس کسان کو اپنی کاشت سے بے دخل کردیا جائے۔ جب کوئی اس طرح کی زمین خالی ہوجاتی یعنی میر خاندان کے مرنے کے بعد اُس کا وارث اُس کو اپنے نام منتقل کرانا چاہتا تو جاگیر کے دستور کے مطابق اُس کو نذرانہ پیش کرنا پڑتا تھا۔ یہ نذرانہ بھی اب "مالک کی مرضی" کا پابند تھا۔ غریب وارث، اپنے باپ کی زمین پر قبضہ پانے کے لئے نذرانے کی رقم پوچھتا تو پتہ چلتا کہ وہ اتنی زیادہ ہے کہ وہ ادا نہ کرسکے گا۔ یہ مصیبت زدہ کسان خاندان ہاتھ مل کر رہ جاتا اور اپنی آبائی کاشت چھوڑ کر باہر نکل جاتا۔ زمین خالی پاکر جاگیردار یا تو اس زمین کو بیچ کر لمبے دام کھرے کرلیتا یا کسی ایسے آدمی کے نام لکھ دیتا جو اس کو نئی شرح سے نذرانہ ادا کرتا۔

۱۵۵۳ء میں وٹبائی کے باشندوں نے ایک عرضداشت پیش کی تھی۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ لگان اور نذرانہ اُس زمانے میں کتنا زیادہ بڑھ گیا تھا:-

نام	پرانا لگان	نیا لگان	نذرانہ
ہنری رسل	۲۴ شلنگ ۱۱½ پنس	۴ پونڈ، شلنگ ۳ پنس	۳ پونڈ ۶ شلنگ ۸ پنس

ٹامس رابن سن	۱۲ شلنگ ۱۱ ۱/۲ پنس	۴۰ شلنگ ۷ پنس	۳۳ شلنگ ۴ پنس
ٹامس کاورڈ	۱۴ شلنگ ۹ پنس	۳۱ شلنگ	۲ شلنگ ۶ پنس
ولیم واکر	۷ شلنگ ۴ پنس	۱۷ شلنگ	۵ شلنگ
رابرٹ بارکر	۱۴ شلنگ ۶ پنس	۳۰ شلنگ	۲ شلنگ ۸ پنس

بشپ لاٹیمیر (LATIMER) نے ایڈورڈ ششم کے درباریوں کے سامنے ایک وعظ میں کھری کھری باتیں سُنائی تھیں۔ اُس نے کہا:۔

"اے زمین کے مالکو! اے لگان بڑھانے والو! اے غیر فطری مالکو! تم اپنے بسر اوقات کیلئے ایک بڑی سالانہ آمدنی رکھتے ہو۔ پہلے تم کسی دوسرے آدمی کے گاڑھے پسینے کی کمائی سے بیس سے لے کر پچاس پونڈ سالانہ تک لیا کرتے تھے، جو مناسب تھا لیکن تم نے اب اس کو بڑھا کر پچاس سے لے کر سو پونڈ سالانہ تک بڑھا لیا ہے۔"

صرف لاٹیمیر ہی تنہا وہ شخص نہ تھا جس نے ان لالچی جاگیرداروں کو بُرا بھلا کہا ہو بلکہ اُس زمانے کے زبان اور قلم والوں کی ایک بڑی تعداد نے اس لالچی گروہ کے خلاف جہاد کیا ہے۔ احاطہ بندی، اضافہ محصول اور لمبے نذرانے، کون سا موضوع تھا جس پر ان دردمندوں نے زبان اور قلم سے کام نہ لیا ہو۔ وہ جاگیردار خاص طور سے ان کی ملامت کا نشانہ بنے جنھوں نے مختلف تدبیروں سے غریب کسانوں کو ان کی زمین سے بے دخل کر کے خانماں برباد آوارہ گردوں اور بھکاریوں کی بھیڑ میں شامل کر دیا تھا۔

ہم نے ایک کتاب "جاگیرداروں سے التجا" میں حسب ذیل سطریں دیکھی ہیں:۔

"ہم بڑی منت اور عاجت سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ لوگ جو زمینوں چراگاہوں اور رہائشی مکانات کے مالک ہیں رحم کھائیں، اپنے اسامیوں کا خون تک چوسنے کی نیت نہ کریں اور غیر معقول نذرانے اور رقمیں نہ وصول کریں ——— خدا انھیں توفیق دے کہ وہ اُس کافی رقم پر جو ان کو مل رہی ہے قناعت کریں اور گھر پر گھر جوڑتے اور زمین پر

زمین بڑھانے نہ چلے جائیں تاکہ دوسرے اتنے غریب ہو جائیں کہ جی ہی نہ سکیں۔"

ان التجاؤں کا زمین کے مالکوں پر کوئی اثر نہ ہوا اور وہ احاطہ بندی کرنے اور زمین کا محصول بڑھانے سے باز نہ آئے۔ پورے پورے گاؤں خالی ہو گئے، بے دخل کاشتکار بھوکوں مرنے لگے، پیٹ کی آگ سے تنگ آکر چوریاں کرنے لگے اور جب اس سے بھی پیٹ نہ بھرا تو سڑکوں پر کاسۂ گدائی لے کر بھیک مانگنے نکل آئے۔ التجائیں بے اثر رہیں تو دوسری تدبیریں بھی آزمائی گئیں اور صورتِ حال کو مزید خرابی سے بچانے کے لئے کچھ قوانین بھی پاس کئے گئے۔ دیہاتی علاقے ویران ہو رہے تھے۔ دربارِ شاہی کے لئے بھی یہ بات برداشت کے لائق نہ تھی۔ زیادہ پریشانی کی بات یہ تھی کہ فوج کا بڑا حصہ انھیں دیہاتی کسانوں اور تھوڑی حیثیت رکھنے والے لوگوں پر مشتمل تھا۔ اس کے بعد بھی کسانوں سے ان کی روزی کا ذریعہ چھینا جا رہا تھا۔ وہ حکومت کو محصول ادا کر کے اس کے خزانے کا پیٹ بھر رہے تھے لیکن ان آوارہ گرد بھکاریوں کی ٹولیوں نے ایک بڑا خطرہ پیدا کر دیا تھا۔ چاروں طرف آتش زنی کی وارداتیں ہونے لگی تھیں، احاطے توڑے جا رہے تھے اور جا بجا بغاوت کے نعرے لگائے جا رہے تھے۔

اب احاطہ بندی کے خلاف قوانین پاس ہوئے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلا قانون سنہ ۱۴۸۹ء میں منظور ہوا اور اس سلسلے کے دوسرے قوانین سولھویں صدی عیسوی تک پیش اور منظور ہوتے رہے لیکن ان قوانین کے بار بار پیش اور منظور ہونے سے پتہ چلتا ہے کہ زمینوں اور جائدادوں کے مالکوں نے کبھی ان قوانین کی پروا نہیں کی اور بار بار ان کی تجدید کی ضرورت پڑتی رہی۔ کچھ خرابیاں ضرور کم ہوئیں لیکن اکثر جگہوں پر جاگیردار ہی عدالتوں کے حاکم بھی تھے اس لئے ان قوانین پر پوری طرح عمل نہیں ہو سکا۔

یہ دلچسپ حقیقت خاص طور سے غور کرنے کے لائق ہے کہ وہ کاشتکار جو احاطہ بندی کے خلاف جہاد کر رہے تھے۔ قانون شکنی کے مرتکب نہ تھے، قانون تو ان کی تائید میں تھا جو احاطہ کے گنہگار تھے، وہی اصل قانون شکن تھے۔ اس کا یہ مطلب نہ سمجھا جائے کہ کاشتکاروں کے

ساتھ جنھوں نے احاطہ بندی کے خلاف آواز اُٹھائی تھی کوئی نرم سلوک ہوا ہوگا؟ نہیں۔ وہ بہت سختی سے دبا دئے گئے۔۔۔۔ ہمیشہ ان کے ساتھ ایسا ہی سلوک ہوتا آیا ہے۔

اس دور نے بعض تصورات میں بنیادی تغیرات پیدا کر دئے تھے پہلے زمین محنت کرنے والے کی محنت سے مل کر اہمیت اور قیمت حاصل کرتی تھی۔ اب تجارت اور صنعت کی ترقی اور قیمتوں کے انقلاب نے روپئے کو آدمی سے زیادہ اہم بنا دیا۔ اب زمین ایک آمدنی کے ذریعہ کی حیثیت سے اہمیت حاصل کرنے لگی۔ اب عام طور سے یہ بھی جائداد سمجھی جانے لگی اور ان سٹے بازوں کا کھلونا بن گئی، جو صرف روپیہ پیدا کرنے کی نیت سے اس کو بیچنے اور خریدنے لگے۔

احاطہ بندی کی تحریک نے عوام کی مصیبتوں میں تو بہت اضافہ کر دیا لیکن زراعت کی ترقی کے امکانات بھی بہت بڑھا دئے۔ جب سرمایہ داروں نے اپنا سرمایہ صنعتوں میں لگانا شروع کیا تو ان کے کارخانوں کو مزدوروں کی ضرورت بھی ہوئی۔ ان تمام برباد کاشتکاروں کا ایک حصہ ان کارخانوں میں مزدوری کر کے اپنا پیٹ پالنے لگا۔ اب ان کی محنتیں ہی ان کی روزی کا سہارا تھیں۔

مدد کی ضرورت ہے

دو برس کے بچے بھی درخواست دے سکتے ہیں

"توسیع تجارت" ــــ اس فقرے کو بار بار اپنی زبان پر دہراؤ۔ اس کو اپنے دماغ میں اس طرح جمالو کہ پھر نہ نکلے۔ یہی فقرہ وہ کنجی ہے جو اچھی طرح سمجھ میں آجانے کے بعد تم کو ان عوامل کے سمجھنے میں مدد دے گا، جنھوں نے اس سرمایہ دارانہ صنعت کو جنم دیا ہے۔

ایک چھوٹے اور ٹھہرے ہوئے بازار کے لئے چیزیں پیدا کرنا اور بات ہے۔ اس بازار میں کاریگر اپنے گاہک کے لئے اُس کی فرمائش کے بموجب چیزیں تیار کرتا ہے۔ وہ گاہک آتا ہے اپنی چیز پسند کرتا ہے اور لے جاتا ہے لیکن ایسے بازار کے لئے جو ایک قصبے کی منزل سے آگے بڑھ کر ایک قوم کی شکل اختیار کرتا ہے، چیزیں تیار کرنا بالکل دوسری بات ہے۔ قرونِ وسطیٰ کے تاجروں اور دستکاروں کی جماعتوں (GILDS) کا نظام ایک چھوٹے اور مقامی بازار کے لئے موزوں تھا لیکن جب بازار نے قومی اور بین الاقوامی شکل اختیار کرلی تو قدیم جماعتی نظام کی گنجائش باقی نہیں رہی۔ مقامی کاریگر صرف مقامی تجارت کے اصول سمجھ سکتا تھا اور اُس کو کامیابی کے ساتھ چلا بھی سکتا تھا۔ لیکن ایسی تجارت کا چلانا جو پورے کرۂ ارض سے تعلق رکھتی ہو اُس کے بس کا روگ نہ تھا۔ بازار کی وسعت نے ایک "درمیانی آدمی" (MIDDLE MAN) کو جنم دیا۔ یہ درمیانی آدمی کا فرض تھا کہ وہ دیکھتا رہے کہ جو چیزیں کاریگر تیار کر رہے ہیں وہ ان خریدنے والوں تک پہونچ رہی ہیں جو سیکڑوں میل دور بیٹھے ہوئے ان چیزوں کی ضرورت محسوس کر رہے ہیں

جماعت دستکاراں کا مالک کاریگر صرف چیزوں کا بنانے والا ہی نہ تھا بلکہ کچھ اور بھی

تھا۔ اُس کے فرائض میں چیزیں بنانے کے علاوہ چار خاص باتیں اور بھی شامل تھیں۔ وہ دراصل پانچ آدمیوں کے فرائض کا تنہا ذمہ دار تھا۔ جہاں تک اپنی مصنوعات کے لئے خام مال کی تلاش اور خرید کا تعلق ہے وہ ایک تاجر کی حیثیت رکھتا تھا۔ لیکن اس کی ماتحتی میں اجیر کاریگر اور شاگرد امیدوار بھی تھے۔ اس لئے وہ ایک مالک کارخانہ دار کی حیثیت بھی رکھتا تھا۔ وہ ان اجیر کاریگروں اور امیدواروں کے کام کی دیکھ بھال بھی کرتا تھا۔ اس حیثیت میں وہ اپنے چھوٹے سے کارخانے کا نگراں کار (FORE MAN) بھی تھا۔ وہ اپنی دوکانوں کی بنی ہوئی چیزیں دوکان کی کھڑکی پر کھڑا ہو کر بیچتا بھی تھا۔ اس کا یہ کام ایک دوکاندار کا کام تھا۔

اب درمیانی آدمی (MIDDLE MAN) نمودار ہوتا ہے۔ اب مالک دستکار کے فرائض گھٹ کر صرف تین رہ جاتے ہیں۔ تجارت اور دوکانداری ان دونوں فرائض سے وہ آزاد ہو جاتا ہے یہ درمیانی آدمی اب خام مال اُس تک پہونچاتا ہے اور اس خام مال سے بنی ہوئی مصنوعات اکٹھا کر کے لے جاتا ہے۔ اب یہی درمیانی آدمی اس کاریگر اور خریدار کے بیچ میں کھڑا رہتا ہے۔ اب مالک دستکار کا فرض صرف اتنا رہ جاتا ہے کہ وہ خام مال کے آتے ہی چیزیں تیار کر کے درمیانی آدمی کے حوالے کر دے۔

یہ طریقہ جس کی مدد سے یہ درمیانی آدمی اپنا خام مال دے کر انھیں کاریگروں کے گھروں میں چیزیں تیار کراتا ہے "گھریلو طریقہ" (DOMESTIC) کہلاتا ہے۔ غور سے دیکھو جہاں تک چیزوں کی تیاری کے طریقے کا تعلق ہے یہ "گھریلو طریقہ" قدیم جماعتی طریقے (GILD SYSTEM) سے مختلف نہیں ہے اس طریقے میں بھی مالک کاریگر اپنے مددگاروں کے ساتھ اپنے ہی گھر میں اپنے ہی اوزاروں سے کام کرتا ہے۔ لیکن اگرچہ پیداوار کا ڈھنگ وہی ہے لیکن مصنوعات کے بازار میں لانے کا طریقہ بدل گیا ہے۔ اب اس نئی تنظیم میں "درمیانی آدمی" تاجر کی حیثیت سے کام کرتا ہوا نظر آتا ہے۔

یہ درمیانی آدمی اگرچہ کام کرنے کے طریقے پر بالکل اثر انداز نہیں ہوتا لیکن یہ اس کی نئی تنظیم ضرور کرتا ہے۔ یہ نئی تنظیم صرف پیداوار میں اضافہ کی نیت سے کی گئی ہے۔ اُس نے بہت جلد

"مہارتِ خصوصی" (SPECIALIZATION) کے فوائد محسوس کرلئے۔ سترھویں صدی عیسوی کے مشہور ماہر اقتصادیات ولیم پٹی (WILLIAM PETTY) نے درمیانی آدمی کے طرزِ فکر اور طریق کار پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے :-

"کپڑا اُس وقت سستا تیار ہوتا ہے جب ایک شخص دُھنتا ہے، دوسرا کاتتا ہے، تیسرا بنتا ہے، چوتھا تھان کھینچتا ہے اور دوسرے لوگ علیحدہ علیحدہ اس کو صاف کرتے، لوہا کرتے اور باندھتے ہیں۔ اگر یہ سب کام ایک ہی آدمی اناڑی پن سے انجام دے تو کپڑا سستا تیار نہیں ہو سکتا۔"

جب تم کوئی خاص چیز تیار کرنے کے لئے بہت سے آدمیوں کی خدمات حاصل کرو تو کام بہت سے آدمیوں کے درمیان بٹ جاتا ہے۔ ہر آدمی صرف اپنا مخصوص کام کرتا ہے۔ بار بار ایک ہی کام کرنے سے اس خاص کام میں اُس کی مہارت بڑھ جاتی ہے۔ یہ طریقہ وقت بھی بچاتا ہے اور پیداوار کی رفتار بھی تیز کرتا ہے۔ ابھی بڑھتے ہوئے بازار کی ضروریات کے لحاظ سے بہت سے تغیرات ہونے باقی تھے۔ یہ وہ بات تھی جس پر یہ منجھلا "درمیانی آدمی" غور کررہا تھا لیکن ہم پیشہ لوگوں کی انجمنوں کے سوچنے کا طریقہ مختلف تھا۔ تم کو یاد ہوگا کہ ان ہم پیشہ لوگوں کو اپنی اجارہ داری قائم رکھنے اور اپنی خاص مصنوعات کو بیچنے کی کتنی فکر تھی! وہ اپنے مقابلے میں دوسروں کو بڑی رشک کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ ان لوگوں کو اپنے حقوق خصوصی کی حفاظت کی بڑی فکر رہتی تھی۔ اس حفاظت کے جوش میں وہ اتنا آگے بڑھ گئے تھے کہ ایک مرتبہ گلاسکو کے مشین سازوں کی انجمن نے جیمس واٹ (JAMES WATT) کو صرف اس بنا پر کہ وہ ان کی انجمن کا ممبر نہ تھا، بھاپ کے انجن کے نمونے پر اپنا کام جاری رکھنے سے روکا تھا۔ کوئی شبہ نہیں ان منظم پیشہ وروں کی انجمنیں یہ سوچنے اور یقین کرنے کی عادی ہوگئی تھیں کہ مختلف چیزوں کی صنعت تنہا ان کا اجارہ ہے اور کوئی ان کے اس حق میں مداخلت کا اختیار نہیں رکھتا ہے

اب ان تغیرات کے زمانے میں یہ درمیانی آدمی جو پرانے نظام میں بڑی زبردست تبدیلیاں

پیدا کر رہا تھا ان کے لئے بڑی پریشانیوں کا موجب ہو رہا تھا۔ اور وہ اس کی اس جدت پسندی کے خلاف بُری طرح احتجاج کر رہے تھے۔ یہ قدیم پیشہ ور جماعتیں قدیم دستور اور روایات کی پابند تھیں۔ پرانے طریقے، پرانا بازار، اور پرانی اجارہ داری، یہ سب پرانی باتیں ان کے لئے موزوں تھیں لیکن یہ نیا منچلا " درمیانی آدمی" اس پرانے نظام کے پیچھے پڑا ہوا تھا۔ وہ اب بڑھتی ہوئی طلب کے پیش نظر پرانے دستور کے احترام کے لئے تیار نہ تھا وہ پرانے دستور میں زبردست تغیر پیدا کر کے بازار نئے ڈھنگ سے چلانا چاہتا تھا۔ پرانی انجمنوں کی اجارہ داری اُس کی راہ کا پتھر بنی ہوئی تھی اب وہ اس پتھر کے خلاف بھی زور آزمائی کے لئے آستین چڑھا رہا تھا۔ پرانا جماعتی نظام بے شمار قواعد اور ضابطوں کی زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا۔ اس نئے زمانے میں جب صنعت کی بھی نئے انداز پر توسیع ہونے جا رہی تھی، اُس کے لئے کوئی گنجائش باقی نہ رہی تھی۔ اس لئے اب اُسے ختم ہونا ہی تھا۔ زمانے کے انقلاب نے آخر اُسے ختم ہی کر کے دم لیا۔

لیکن ان پرانی جماعتوں کا خاتمہ اچانک نہیں ہوا۔ فرانس میں انقلاب تک یہ کسی نہ کسی طرح چلتی رہیں۔ انگلینڈ میں بھی وہ ختم ہوتے ہوتے انیسویں صدی کی ابتدا تک پہونچ گئیں۔ یہ درمیانی آدمی اکثر ان جماعتوں کے اندر گھس کر کام کرتا ہوا نظر آتا تھا۔ لیکن اندر رہ کر بھی یہ ان کی بیخ کنی کرتا رہتا تھا۔ کبھی کبھی ان پیشہ ور جماعتوں کے مالدار مالک بھی بعض دوسرے غریب مالکوں کو نوکر رکھ لینے لگے۔ یہ غریب مالک ان مالداروں کے لئے اپنے اپنے کارخانوں میں کام کرتے تھے بعض اوقات ایک صنعت کی کوئی خاص جماعت، دوسری جماعتوں کو جو اسی کام میں لگی ہوتی تھیں کچھ کام سپرد کر دیتی تھی۔ اب وہ زمانہ بہت پیچھے رہ گیا تھا جب ان جماعتوں میں تمام مالک آپس میں ایک دوسرے کے برابر سمجھے جاتے تھے، یہی مساوات ان جماعتوں کا بنیادی اصول تھی۔ یہ بنیادی اصول اب ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا تھا۔

کبھی کبھی یہ درمیانی آدمی ان پرانی جماعتوں کے قواعد و ضوابط کو بھی بالائے طاق رکھ دیتا اور ان جماعتوں کی سخت گیریوں سے نجات پانے کے لئے وہ شہروں کو چھوڑ کر دیہاتی اضلاع

میں جا نکلتا، وہاں وہ آزادی سے جس طرح چاہتا اپنا کام شروع کر دیتا۔ یہاں وہ مزدوری کی ان شرحوں اور اجارہ داری کے اُن ضابطوں سے، جو شہر میں اُس کا ہاتھ پکڑتے تھے، پوری طرح آزاد ہوتا تھا۔ گرین وچ کے لوہے کے تاجر امبروس کراولی (AMBROSE CROWLEY) نے ڈرہم میں میں اپنا ٹھکانا بنایا اور وہاں بڑے پیمانہ پر لوہے کا سامان بنوانے کا بندوبست کیا۔ چھوٹا سا گاؤں، جو پہلے کوئی اہمیت نہیں رکھتا تھا۔ ڈیڑھ ہزار کام کرنے والوں کے اجتماع کی وجہ سے ایک بڑا صنعتی مرکز بن گیا۔ اُس نے لوگوں سے گھریلو صنعت کے طور پر کیلیں، قفل، قبضے، بسولے، پھاوڑے اور دوسرے لوہے کے اوزار بنوانے شروع کیے۔ ایک معقول رقم کی ادائگی کی دستاویز لکھنے کے بعد ایسا معلوم ہوتا ہے، کراولی ان تمام گھروں کا، جن میں وہ اپنی فرمائش کا سامان بنوا رہا تھا مالک ہو گیا تھا، وہ ان کاریگروں کو، جو اپنے گھروں میں کام کرتے تھے خام مال اور اوزار دیتا تھا۔ دستاویز نے اُس کو کارخانہ قائم کرنے کا حق دیدیا اور اُس کو مالک کارخانہ کی حیثیت سے کام کرنے کا موقع ملا اب وہ اپنے متعلقین اور دو ایک اجیر کاریگروں کے ساتھ خود بھی محنت کرنے لگا۔ وہ اپنے بنائے سامان سے اپنی اجرت نکالتا تھا۔ یہی کراولی ۱۷۰۶ء میں نائٹ بنایا گیا اور کچھ دنوں کے بعد پارلیمنٹ کا ممبر بھی ہو گیا۔ اُس وقت تک وہ دو لاکھ پونڈ سرمائے کا مالک ہو چکا تھا۔

پیشہ وروں کی انجمنیں اس تغیر سے، جو صنعت میں ہو رہا تھا خوش نہ تھیں۔ انھوں نے اپنی پرانی اجارہ داری بچانے کی بڑی تدبیریں کیں لیکن ان کا زمانہ ختم ہو چکا تھا اور اب وہ ایک ہاری ہوئی بازی جیتنے کے لئے ہاتھ پیر مار رہے تھے۔ بازار کی توسیع نے ان کے پرانے نظام کا غیر مفید ہونا ثابت کر دیا تھا۔ وہ اب بازار کی بڑھتی ہوئی طلب کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔

۴، فروری ۱۶۶۴ء کو اُس فیتہ سازی کے متعلق جو دیہاتی علاقوں میں جاری تھی، ایک شکایت پیش ہوئی تھی۔ اس شکایت کے جواب میں ان لوگوں نے، جو دیہاتوں میں کام پھیلائے ہوئے تھے، جواب دیا تھا کہ اب صورتِ حال ۱۶۱۲ء کے مقابلے میں بالکل بدل گئی ہے، تجارت بہت بڑھ گئی ہے۔ پیشہ ور جماعتوں کے پاس اتنے آدمی نہیں ہیں کہ وہ ایک ایسے آدمی کی

فرمائشیں سال بھر پوری کرسکیں، جو بازار کی مطلوبہ چیزوں کے لئے خام مال تقسیم کرتا پھرتا ہے۔

درمیانی آدمی (MIDDLE MAN) جو کپڑے کی تجارت میں مصروف تھا۔ اس صنعت کی توسیع کی ضرورت دن بدن زیادہ محسوس کرتا جاتا تھا۔ اُس زمانے میں کپڑا ہی سب سے زیادہ مشرق کو بھیجا جاتا تھا۔ اس بڑھتی ہوئی طلب کو پورا کرنے کے لئے کام کرنے والوں کی ایک بڑی تعداد کی ضرورت تھی۔ اس لئے یہ درمیانی آدمی خام مال صرف پیشہ ور انجمنوں ہی کو نہیں دیتا تھا بلکہ دیہاتوں میں مردوں عورتوں اور بچوں کو بھی، جو اس کام میں اُس کی مدد کرسکیں تقسیم کرتا پھرتا تھا۔

ان کسانوں کو جو احاطہ بندی کی تحریک میں تباہ ہو کر اپنا سب کچھ کھو بیٹھے تھے، روزی کمانے کا ایک نیا موقع ہاتھ آیا۔ اس صنعت کی توسیع سے وہ اپنے متعلقین کا پیٹ بھرنے کے لئے چند شلنگ پیدا کرنے لگے۔ بہت سے ایسے لوگ جو احاطہ بندی کی تحریک سے برباد ہو کر دیہاتوں کو چھوڑ کر بھاگ جاتے، پھر قدم جمانے کے قابل ہو گئے۔ اور اب ان کو وہیں اتنا کام ملنے لگا کہ وہ کسی طرح دیہاتوں میں پڑے رہ سکیں۔

رابن سن کروسو کے مصنف ڈینیل ڈے فو (DANIEL DE FOE) نے ۱۷۲۴ء میں اپنی مشہور کتاب "برطانیہ عظمیٰ کا سفر" شائع کرائی تھی اس نے اس کتاب میں بعض ان دیہاتوں کا نقشہ کھینچا ہے جو اس صنعتی توسیع کے زمانے میں کام سے لگے ہوئے تھے۔ ان دیہاتیوں کو یہ کام اسی "درمیانی آدمی" نے دیا تھا۔ وہ لکھتا ہے:-

> "کپڑا بنانے والوں کے گھر اور جھونپڑے بڑی تعداد میں پھیلے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان جھونپڑوں میں کام کرنے والے رہتے ہیں۔ ان میں سے بعض دُھنتے ہیں بعض کاتتے اور بُنتے ہیں۔ عورتیں اور بچے سب کام میں بُری طرح لگے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان گھروں میں کوئی بیکار نظر نہیں آتا چار برس کے بچے بھی اپنی روٹی کے لئے محنت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں اور سن رسیدہ بوڑھے بھی یہی وجہ ہے کہ ہم کو قریب قریب ہر گھر میں دروازے نظر آتے ہیں۔ اگر ہم کسی مالک صناع کے دروازے پر کھٹکھٹائیں تو ہم کو اُس کا گھر بھی ہٹے کٹے تندرست کام کرنے والوں سے بھرا ہُوا

نظر آئے گا۔ کچھ لوگ کپڑے کی رنگائی میں مصروف ہوں گے، کچھ سوت صاف کر رہے ہوں گے اور کچھ کرگھے پر کام میں لگے ہوں گے ـــــ کوئی ایسا نہ ہوگا جو اپنے کام میں بُری طرح مصروف نظر نہ آئے اور ایسا نہ معلوم ہو کہ ابھی ان کا بہت کام باقی ہے۔"

ڈیے کے تاجر کراولی کی طرح جس نے اپنی تنظیمی صلاحیتوں سے پوری طرح کام لے کر بڑا سرمایہ اکٹھا کر لیا تھا۔ یہ کپڑے کی صنعت کو فروغ دینے والے بھی جو بڑھتے ہوئے بازار کی بڑھتی ہوئی طلب کو کامیابی کے ساتھ پورا کر رہے تھے بہت مالدار ہو گئے۔ ڈیے فو نے لکھا ہے :۔

"ان لوگوں نے مجھ سے "بریڈ فورڈ" (BRAD FORD) میں کہا کہ کوئی کپڑے کا کام کرنے والا دس ہزار سے لے کر چالیس ہزار پونڈ سے کم حیثیت کا آدمی نہیں ہے۔ بہت سے بڑے خاندان جو بہت ترقی کر گئے ہیں اسی شریفانہ پیشے سے اپنی حیثیت بنا سکے ہیں۔ نیوبری (NEW BERY) کے مشہور کپڑے کے کام کرنے والے جیک کی کپڑے کی گانٹھیں لاد لاد کر لندن روانہ کی جا رہی تھیں۔ شاہ جیمس نے گانٹھوں کے یہ انبار دیکھ کر پوچھا کہ یہ کس کی گانٹھیں ہیں۔ لوگوں نے نیوبری کے جیک کا نام لیا۔ بادشاہ نے کہا تو جیک مجھ سے زیادہ مالدار ہے۔"

نیوبری کے جیک کی ترقی کی وجہ ایک اور بھی تھی۔ اُس نے اپنے زمانے کے درمیانی آدمی کے دستور کے خلاف کام کرنے والوں کو خام مال نہیں بانٹا۔ اُس نے خود اپنی عمارت بنائی اور اُس میں ایک کارخانہ جس میں دو سو کرگھے لگے ہوئے تھے، قائم کر دیا۔ اس کارخانے میں چھ سو مرد، عورتیں اور بچے کام کرتے تھے۔ یہ سولھویں صدی عیسوی کی ابتدا کی بات ہے۔ اُس کا یہ کارخانہ ان فیکٹریوں کے نظام کا جو تین سو برس کے بعد قائم ہوا، پیش خیمہ تھا۔

نیوبری اور دوسرے درمیانی آدمی جو کاریگروں کو خام مال دُھننے، کاتنے اور بُننے کیلئے دیتے تھے سرمایہ دار تھے، وہ کپڑے کے مالک ہوتے تھے اور اُسے بازار میں بیچتے اور نفع کماتے تھے۔ مالک کارخانہ دار اور اسیر کاریگران کے ماتحت کام کرتے تھے اور اپنی اجرت پاتے تھے۔ وہ اپنے گھروں میں کام کرتے تھے اور اپنے کام کا وقت خود ہی مقرر کرتے تھے۔ وہ اوزار بھی اپنے ہی

استعمال کرتے تھے (اگرچہ کبھی کبھی بعض حالات میں اس کے خلاف بھی ہوتا تھا) لیکن وہ اب آزاد نہ تھے۔ خام مال کے لیے بھی اُسی درمیانی آدمی کے جو ان کے لئے کام مہیا کرتا تھا محتاج ہوتے تھے۔ یہ درمیانی آدمی خام مال لاتا اور ان کو دیتا تھا (کبھی کبھی اس کے خلاف بھی ہوتا تھا اور بعض کاریگر اپنا خام مال استعمال کرتے تھے) یہ اب صرف کاریگر تھے ان کا خریدار سے کوئی براہِ راست تعلق نہ تھا۔ ان کے تجارتی فرائض اسی درمیانی آدمی نے جو اب ایک ناظم (ENTREPRENEUR) کی حیثیت سے کام کرتا تھا اختیار کر لئے تھے اور وہ اب صحیح معنوں میں صرف دستکار (دست MANU + کار FAC-TURA) تھے۔

جماعتی نظام مقامی اور قصباتی اقتصادیات کی پیداوار تھا اس میں سرمایے کی کوئی بڑی ضرورت نہ تھی لیکن اس نئے نظام میں جو قومی اقتصادیات کا ساختہ پرداختہ تھا بڑے سرمایے کی ضرورت تھی۔ اس نظام میں متعدد دستکاروں کے لئے خام مال خریدنا اور مہیا کرنا پڑتا تھا اس خام مال کی تقسیم کو بھی منظم طرز پر جاری رکھنے، مال بنوانے اور باہر بھیجنے کے لیے خاصی رقم کی ضرورت تھی۔ اس لئے دولت مند آدمی، جو ایک بڑے سرمائے کا مالک ہوتا تھا۔ اس نئے نظام برآمد (PUTTING-OUT SYSTEM) میں پورے نظام کا سردار بن گیا۔

بازار کی بڑھتی ہوئی طلب کا تقاضا تھا کہ سرمایہ دارانہ بنیاد پر بھاری صنعتوں کی از سرِ نو تنظیم کی جاتی۔ ان صنعتوں کو چلانے کے لئے بڑی زبردست اور قیمتی مشینوں کی ضرورت تھی۔ اس ضرورت کی بڑی واضح مثال سولھویں صدی عیسوی کی کوئلے کی کانیں تھیں۔ ان کانوں میں کوئلے کی اوپری پرت ختم ہو چکی تھی اور اب بڑی گہرائی میں کھدائی کرنے کی ضرورت تھی۔ اس کام کے لئے بڑا زبردست سرمایہ مطلوب تھا اور یہی طلب سرمایہ دار کو اس اسٹیج پر لے آئی۔

اسی طرح دھاتوں کی کانوں میں بھی بہت بڑا سرمایہ لگایا گیا۔ بڑی بڑی صنعتوں اور فوجی ضروریات کے لئے لوہے، پیتل، اور تانبے کی بہت بڑی مقدار کی ضرورت تھی اس کام کے لئے مطلوبہ سرمایہ پورا کرنے کے لئے جوائنٹ اسٹاک کمپنیاں قائم کی گئیں اور دولتمندوں کی ایک

تعداد نے مل کر ضروری سرمایہ اکٹھا کیا۔ یہی صورت اس سے پہلے ابتدائی تجارتی مہموں میں بھی پیش آئی تھی اور اب صنعت کی ترقی اور توسیع کے لئے بھی یہی قدم اٹھایا گیا۔

نئی زمینوں کی دریافت نے نئی صنعتوں کے لئے تازہ گنجائشیں پیدا کیں۔ شکر سازی اور تمباکو کے کام نے فروغ پایا، حکومتوں نے، ان لوگوں کو جو ان صنعتوں میں اپنا روپیہ لگا سکیں۔ بڑے بڑے اجارے دئے۔ یہ صنعتیں شروع ہی سے سرمایہ دارانہ بنیادوں پر قائم کی گئیں۔

سولھویں صدی عیسوی سے لے کر اٹھارھویں صدی عیسوی تک قرون وسطیٰ کا مستقل بالذات دستکار کاریگر غائب ہو گیا اور اس کی جگہ ایک ایسے بڑھتے ہوئے طبقے نے لے لی جس کی زندگی ہر طرح اس سرمایہ دار درمیانی آدمی پر منحصر تھی۔ جو اس طبقے کو اجرت دے کر اس کے لئے کام مہیا کرتا تھا اور اس طرح بڑھتے ہوئے بازار کے لئے سامانِ تجارت تیار کراتا تھا۔

اگر ہم اُن تمام ادوار کو جو ایک دوسرے کے بعد آئے اور ایک دوسرے کی جگہ لیتے رہے الگ الگ کر کے مرتب کریں تو ہم کو صنعتی تنظیم اور اس کی تدریجی ترقی کے سمجھنے میں بڑی مدد ملے گی۔

۱۔ گھریلو یا خاندانی نظام۔ گھر کے مختلف ممبر اپنی ضرورت کی چیزیں پیدا کرتے تھے۔ اس سے مقصود تجارت نہ تھی۔ ان کو بازار کی طلب پوری کرنے کے لئے کوئی کام نہیں کرنا پڑتا تھا
ہم قرونِ وسطیٰ کے ابتدائی دور کو اس نظام کا زمانہ کہہ سکتے ہیں۔

۲۔ پیشہ وروں کا جماعتی نظام۔ مستقل بالذات مالک، دو یا تین آدمیوں کی مدد سے اپنا کام جاری رکھتے تھے۔ یہ ایک چھوٹے اور ٹھہرے ہوئے بازار کے لئے چیزیں پیدا کرتے تھے۔ کام کرنے والے لوگ خام مال بھی رکھتے تھے اور اوزار بھی وہ اپنی محنت نہیں بلکہ اپنی محنت سے پیدا کی ہوئی چیزوں کو فروخت کرتے تھے۔ یہ دور پورے قرون وسطیٰ پر محیط ہے۔

۳۔ برآمدی نظام (PUTTING OUT SYSTEM) بڑھتے ہوئے بازار کے لئے گھروں پر کام جاری رہتا تھا۔ مالک دستکار چند ساتھیوں کی مدد سے، جیسا

دوسرے دور میں ہوتا تھا کام کرتا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ یہ مالک دستکار اب آزاد نہیں ہوتا تھا، وہ اپنا کام جاری رکھنے کے لئے خام مال اور اوزار درمیانی آدمی سے جسے منتظم کار کہنا زیادہ مناسب ہوگا لیتا تھا۔ اب اس کے اور خریدار کے درمیان براہ راست کوئی رشتہ نہ تھا بلکہ ان کے بیچ میں یہ منتظم کار آگیا تھا۔ یہ مالک دستکار اب صرف مزدور تھا جو اپنے حصے کا کام مقررہ معاوضے کے لئے کرتا تھا۔ یہ دور سولھویں صدی عیسوی سے لے کر اٹھارھویں صدی عیسوی تک پھیلا ہوا ہے۔

۴۔ فیکٹری نظام۔ اب وسعت پذیر اور بڑھتی اور ترقی ہوئی قیمتوں کے بازار کے لئے گھروں کے بجائے سرمایہ دار مالک کی عمارتوں میں کام ہونے لگا۔ اس کام کی بڑی کڑی نگرانی کی جانے لگی۔ اس دور میں کام کرنے والوں نے اپنی آزادی بالکل کھودی۔ اب نہ ان کے پاس خام مال ہوتا ہے اور نہ وہ اب اپنے اوزاروں کے مالک ہیں۔ اس مشینی دور میں مہارتِ کار کی بھی ضرورت نہیں رہی۔ سرمایہ نے اس دور میں ہر زمانے سے زیادہ اہمیت حاصل کر لی۔ انیسویں صدی اسی نظام کا زمانہ ہے۔

اب ذرا ٹھہرو

دیکھو

اور

غور سے سنو!

ان ادوار کو پوری طرح سمجھنے کے لئے کچھ آنکھیں کھول کر دیکھنے کی ضرورت ہے۔ اوپر کے چار لفظ صرف تمہاری رہنمائی کے لئے بہت نمایاں طور پر لکھے گئے ہیں۔ یہ آسمانی بشارت نہیں ہیں بلکہ تمہاری ذہنی سیاحت کے لئے چند سنگ ہائے میل ہیں۔ ہم نے مختلف ادوار کی

جو تقسیم اوپر لکھی ہے وہ کوئی مکمل حد بندی نہیں ہے اور اُسے مکمل حقیقت کے طور پر قبول نہیں کیا جا سکتا۔ تھوڑے سے استثنار کے ساتھ یہ تقسیم قابل قبول ہے۔ لیکن اگر اسے مکمل حقیقت سمجھ کر چل پڑو گے تو تمہارے قدم غلط پگڈنڈیوں پر جا پڑیں گے۔

یہ خیال نہ کرنا کہ صنعت کا یہ پورا قافلہ ان چاروں منزلوں سے ہو کر ضرور گذرا ہے۔ بعض صنعتوں کے لئے یہ زینے ضرور درست ہیں لیکن سب کو یہ مسافت نہیں طے کرنی پڑی ہے۔ بہت صنعتیں تیسرے دور میں شروع ہوئیں۔ بہت سی صنعتیں بہت سی چھلانگیں لگا کر، اس دور تک پہونچی ہیں۔

ہم نے دوروں کی تقسیم محض اندازے سے کی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ کسی دور کے ختم ہونے سے پہلے ہی اُس کے زوال کے آثار پیدا ہو جاتے ہیں اور اُسی زمانے میں، جب اس دور کا شباب ہوتا ہے یہ آثار پوری طرح واضح ہو جاتے ہیں۔ تیرھویں صدی عیسوی میں جب پیشہ ور جماعتیں پورے شباب پر تھیں، برآمدی نظام کی بنیادیں شمالی اٹلی میں قائم ہو رہی تھیں۔ اسی طرح فیکٹری نظام نے اسی دور میں جسے ہم برآمدی نظام کہتے ہیں جڑ پکڑلی تھی۔ سولھویں صدی عیسوی میں نیوبری کے جیک کی مثال ہمارے اس دعوے کے ثبوت کے لئے کافی ہے۔

لیکن ہر حال میں یہی صورت پیش نہیں آئی ہے کبھی کبھی یہ بھی ہوا ہے کہ کسی نئے دور کے شروع ہو جانے کے بعد بھی پرانے دور کے بعض نظام چلتے رہے ہیں۔ برآمدی نظام شروع ہو جانے کے بعد بھی عرصے تک جماعتی نظام چلتا رہا ہے۔ ذیل میں ہم ایک رپورٹ کا اقتباس پیش کرتے ہیں۔ اس سے اچھی طرح معلوم ہو جائے گا کہ نئے دور میں بھی پرانے زمانے کے بعض نظام عرصے تک زندہ رہتے ہیں۔ یہ رپورٹ "برآمدی نظام میں گھریلو کام" کے مطالعہ کے بعد لکھی گئی ہے:-

"گھریلو کام کا ایک جائزہ جو مصنوعی دھاتوں کی صنعت میں لیا گیا ——— مصنوعات میں ہک، کانٹے، تکمے، سیفٹی پن اور دھات کے بٹن شامل ہیں، تسموں میں لگانے کے خوبصورت تار اور سرے بھی بعض لوگ بناتے ہوئے نظر آتے ہیں۔"

گھریلو کام کی تقسیم، روزانہ گھنٹے وار اجرت کے لحاظ سے	خاندانوں کی تعداد
ایک سنٹ (CENT) سے لے کر دو سنٹ (CENT) تک	۵ ″
۲ ″ ″ ۳	۹ ″
۳ ″ ″ ۴	۱۵ ″
۴ ″ ″ ۵	۹ ″
۵ ″ ″ ۶	۱۴ ″
۶ ″ ″ ۷	۸ ″
۷ ″ ″ ۸	۵ ″
۸ ″ ″ ۹	۱۵ ″
۹ ″ ″ ۱۰	۱۴ ″
۱۰ ″ ″ ۱۱	۱۳ ″
۱۱ ″ ″ ۱۲	۵ ″
۱۲ ″ ″ ۱۳	۲ ″
۱۳ ″ ″ ۱۴	۵ ″
۱۴ ″ ″ ۱۵	۳ ″
۱۵ ″ سے اوپر	۷ ″
میزان	۱۲۹

"ہر اوسط درجے کا خاندان ایک ہفتے میں ۳۵ گھنٹے کے اوسط سے کام کرتا ہے اور ۷۵ر۱ شلنگ معاوضہ پاتا ہے۔"

"جن گھروں میں تحقیقات کی گئی ان میں جگہ تو بہت تھوڑی تھی لیکن آدمی بہت بھرے ہوئے تھے۔ حفظانِ صحت کی نہ ان مکانوں میں کوئی گنجائش تھی اور نہ اس کا کوئی انتظام

ہی تھا۔ گھروں کی بوسیدگی اپنی انتہا کو پہونچی ہوئی تھی۔ لوگ پھٹے پرانے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ غذا کی خرابی کی شکایت اور کمی کے خلاف فریاد بھی اکثر سننے میں آئی ہے۔ جن گھروں کا مشاہدہ کیا گیا، مذکورہ بالا خرابیاں ان گھروں کا امتیازی نشان ثابت ہوئیں"

"ایک سو انتیس ۱۲۹ گھروں میں سے چھیانوے گھروں میں جن کا ہم نے مشاہدہ کیا بچے بھی کام کرتے ہوئے پائے ان میں سے آدھے لڑکوں کی عمریں بارہ سال سے بھی کم تھیں۔ ان میں سے چونتیس لڑکے آٹھ سال یا اس سے بھی کم عمر کے تھے۔ بارہ لڑکوں کی عمر پانچ سال سے بھی کم تھی۔"

مزدور بچوں کی عمروں کا نقشہ

عمر	بچوں کی تعداد	عمر	بچوں کی تعداد
۲ سے ۳ سال کے بچے	۲	۱۰ سے ۱۱ سال کے بچے	۲۳
۳ ״ ۴ ״	۲	۱۱ ״ ۱۲ ״	۲۱
۴ ״ ۵ ״	۸	۱۲ ״ ۱۳ ״	۴۰
۵ ״ ۶ ״	۲	۱۳ ״ ۱۴ ״	۲۶
۶ ״ ۷ ״	۷	۱۴ ״ ۱۵ ״	۲۹
۷ ״ ۸ ״	۱۳	۱۵ ״ ۱۶ ״	۳۵
۸ ״ ۹ ״	۱۵	نامعلوم	۴
۹ ״ ۱۰ ״	۱۹	میزان	۲۴۶

کیا یہ اعداد و شمار درد انگیز نہیں ہیں؟ ذرا تصور تو کرو دو اور تین سال کے معصوم بچے مزدوری کر رہے ہیں! کیا یہ "برآمدی نظام" کی داستان سولھویں صدی سے لے کر اٹھارھویں صدی تک کی کوئی حکایت ہے؟ نہیں ہرگز نہیں۔ پھر آخر اس مذکورہ بالا اقتباس میں کہاں اور کس وقت کے اعداد و شمار پیش کئے گئے ہیں؟

وقت — اگست ۱۹۳۴ء

مقام — کننکٹیکٹ (CONNECTICUT) ریاست ہائے متحدہ امریکہ

سونا عظمت اور شان

وہ کیا چیز ہے جو کسی ملک کو دولت مند بناتی ہے؟ کیا تم کوئی بات بتا سکتے ہو؟ محض مذاق کے طور پر ایک ایسی فہرست بناؤ، جو ان تمام باتوں پر مشتمل ہو، جو تمہارے نزدیک کسی ملک کو دولتمند بنا سکتی ہیں، اور پھر اس فہرست کا ان باتوں سے مقابلہ کرو، جو سترھویں اور اٹھارھویں صدی عیسوی کے کسی منچلے انسان کے نزدیک ملک کی دولت مندی کا سبب ہو سکتی تھیں۔

سترھویں اور اٹھارھویں صدی عیسوی کے لوگوں کو، "قوم" سے بہت دلچسپی تھی۔ وہ قومی حکومت کے خیال میں مست تھے اور کسی خاص شہر کے بجائے پورے ملک کی ترقی میں اپنی فلاح سمجھتے تھے۔ اس نئے تصور نے ان کے سامنے نئے سوالات پیدا کئے تھے۔ انھوں نے اب یہ سوچنا چھوڑ دیا تھا کہ کیا بات شہر ساؤتھمپٹن کے لئے مفید ہے، لوائن کی بھلائی کے لئے کیا ہونا چاہئے اور امسٹرڈم کس طرح ترقی کر سکتا ہے۔ وہ اس تنگ طرزِ خیال سے نکل کر اب یہ سوچنے لگے تھے کہ پورے ملک انگلستان کے لئے کیا بات مفید ہوگی۔ پورے فرانس کی بھلائی کے لئے کیا ہونا چاہئے اور پورا ملک ہالینڈ کس طرح ترقی کر سکتا ہے۔ وہ ان اصولوں کو جن کی بنیاد پر صرف شہروں کی دولت بڑھی تھی اب پوری قومی حدودِ مملکت پر منطبق کرنا چاہتے تھے تاکہ پورا ملک مالدار اور پوری قوم دولت مند ہو جائے۔ ایک سیاسی سلطنت بنانے کے بعد، اب ان کی توجہ معاشی ریاست کی تعمیر کی طرف ہو گئی تھی۔ اب وہ جو کچھ لکھتے یا جو قوانین بناتے ان سب میں پورے ملک کی مفاد کی ترجمانی ہوتی تھی۔ اب حکومتیں جو قوانین منظور کرتی تھیں۔ ان سے پوری ریاست کی دولت مندی اور پوری قوم کی سیاسی اہمیت مقصود ہوتی تھی۔ اسی قومی بہبودی

کے واحد مقصد کے حصول کے لئے وہ اپنی زندگی کے روزمرہ اعمال پر کڑی نگاہ رکھتے تھے اور سوچ سمجھ کر اپنی قومی زندگی کی راہوں میں ضروری تغیر اور زندگی کے طرز میں مناسب اصلاح کرتے رہتے تھے تاکہ پوری قوم ایک منظم تحریک کے ماتحت اپنے قومی مقاصد کے حصول میں کامیاب ہو سکے۔ اس زمانے کے مورخوں نے، ان نظریات اور قوانین کو جو قومی تنظیم کے لئے بنائے گئے تھے "تجارتی نظام" کے نام سے موسوم کیا۔ لیکن درحقیقت ان کا کسی نظام سے کوئی تعلق نہ تھا تجارتی نظریہ زر (MERCANTILISM) جہاں تک لفظ کے مفہوم کا تعلق ہے کوئی نظام نہیں ہے بلکہ ان مروجہ اقتصادی نظریات کا نام ہے جنہیں کسی ریاست نے خاص مواقع اور اوقات میں دولت اور طاقت حاصل کرنے کے لئے اختیار کیا تھا۔ سیاسی مدبرین ان نظریات سے دلچسپی اس لئے نہیں لیتے تھے کہ وہ ان کو پسند کرتے تھے اور اپنا وقت صرف کرکے ان پر سنجیدگی سے غور کرنا چاہتے تھے۔ ان کی دلچسپی کی وجہ صرف یہ تھی کہ ان کی حکومتیں ہمیشہ دیوالیہ رہتی تھیں اور کسی وقت ان کو روپے کی ضرورت سے نجات نہیں ملتی تھی، اس لئے یہ سوال کہ وہ کیا چیزیں ہیں جو کسی ملک کو مالدار بنا سکتی ہیں محض تفریحی سوال نہ تھا بلکہ وقت کا ایک ضروری سوال تھا اور اس کا صحیح حل تلاش کرنے کی ضرورت بھی تھی

سولھویں صدی عیسوی میں غالباً اسپین دنیا کا سب سے زیادہ مالدار اور طاقتور ملک تھا۔ جب کسی دوسرے ملک کے منچلے اپنے دل سے اسپین کی دولتمندی اور طاقت کا سبب پوچھتے تو اس کا جواب خودبخود ان کے دل میں آجاتا تھا کہ اسپین کی دولت اور طاقت دراصل چاندی اور سونے کے وہ خزانے تھے جو اس کی نوآبادیات سے ابل ابل کر آئے تھے۔ کسی ملک میں ان قیمتی دھاتوں کی جتنی زیادہ مقدار ہوتی تھی وہ ملک اتنا ہی زیادہ مالدار اور طاقتور ہوتا تھا، افراد کے لئے جو بات صحیح تھی، اسی بات کو قوموں اور ملکوں کے لئے بھی صحیح ہونا چاہیے تھا۔

صنعت اور تجارت کی گاڑی کو آگے بڑھانے والی طاقت کیا ہے؟ چاندی اور سونا۔ ایک بادشاہ کس چیز کے برتے پر پورا لشکر بھرتی کر کے دشمنوں سے کامیاب مقابلہ کرسکتا ہے؟ چاندی

اور سونا۔ وہ مضبوط شہتیر اور تختے جو ان جہازوں کے بنوانے میں صرف ہوتے ہیں۔ جو غلہ بھوکوں کے منہ تک پہونچانے اور کپڑوں سے ننگوں کی پیٹھیں چھپانے میں آخر کس چیز سے خریدے جاتے ہیں چاندی اور سونے سے۔ وہ کیا طاقت ہے جو کسی ملک کو مضبوط کر کے اس کو غنیم کے ملکوں پر فتحیاب بناتی ہے؟ چاندی اور سونا! اس لئے چاندی اور سونے کی بڑی مقدار کسی ملک کی دولت اور طاقت کے سامانوں میں اگر سر فہرست ہے تو کیا تعجب کی بات ہے؟

اسی خیال کی بنا پر اس دور کے اہل قلم ان قیمتی دھاتوں کے راگ الاپتے ہوئے لکھتے ہیں :-

"ایک مالدار وہی ہے جس کے پاس بے شمار دولت ہو، اسی طرح ایک ملک کے دولتمند اور طاقتور ہونے کے لئے ضروری ہے کہ اس کے پاس دولت کے خزانوں کی انتہا نہ ہو کسی ملک کی دولت اور طاقت اسی پر منحصر ہے کہ اسے مالدار بنانے کی تدبیریں برابر اختیار کی جاتی ہیں

جوزیف ہیرس (JOSEPH HARRIS) نے ۱۷۵۷ء میں ایک مضمون "زر اور سکے پر ایک مضمون" (AN ESSAY UPON MONEY AND COINS) میں لکھا ہے :-

"سونا اور چاندی ان دھاتوں میں جواب تک دریافت ہوئی ہیں جمع اور اکٹھا کرنے کیلئے سب سے زیادہ موزوں ہیں۔ وہ پائدار ہیں اور ان کی قیمت کو نقصان پہونچائے بغیر ان کو ہر شکل میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ ان کے حجم کے مقابلے میں ان کی قیمت کہیں زیادہ ہے اور عالمگیر زر" (MONEY OF THE WORLD) کی وجہ سے ہر چیز کے مبادلے میں سب سے زیادہ موزوں ثابت ہوتی ہیں۔ اور ہر قسم کے کاروبار میں ان سے یقینی طور پر فوراً کام چل جاتا ہے"

اگر کوئی حکومت یہ یقین کر لیتی کہ سونے اور چاندی کی جتنی مقدار اس کے ملک میں ہوگی اتنی ہی وہ دولتمند اور طاقتور ہوگی تو اس یقین کے بعد اس کا دوسرا قدم کیا ہوتا؟ وہ یقیناً ایسے قوانین جن کی مدد سے سونے اور چاندی کی برآمد پر پابندیاں عائد کی جائیں منظور کرتی حکومتوں نے ایک دوسرے کے بعد اسی قسم کے قوانین منظور کئے اور سونے چاندی کی برآمد کے خلاف قوانین

روز مرہ (ACTS AGAINST THE EXPORTATION OF GOLD AND SILVER)
کی بات ہوگئے۔ ہم ذیل میں انگلستان کے ایک قانون کا اقتباس پیش کرتے ہیں:۔

"کوئی شخص بادشاہ سے اجازت لئے بغیر نہ خود اس مملکت سے روپیہ اور نہ اس مملکت کا کوئی سکہ اور نہ کسی جاگیر یا جاگیردار کا سکہ، نہ سونے کی سلاخیں اور نہ سونے کی جڑاؤ پلیٹیں یا سادہ پتیاں باہر لے جائے گا اور نہ کسی شخص کو لے جانے دے گا۔"

فگرس کے اخبار نویسوں نے جو ایسوسی ایٹڈ پریس کے نمائندوں کی طرح، اُس زمانے میں اپنے مرکزی بینکنگ ہاؤس کے لئے خبر رسانی کے فرائض انجام دیتے تھے، بعض اہم خبریں بھیجی تھیں یہ نمائندے ہر اہم مقام پر متعین ہوتے تھے اور روزمرہ کے واقعات کی خبریں بھیجا کرتے تھے۔ ہم ذیل میں فگرسس کے "اخباری خطوط" کے اقتباسات پیش کرتے ہیں:۔

"وینس۔ ۱۳ر دسمبر ۱۵۹۶ء شاہ اسپین نے بہت سخت احکام جاری کئے ہیں کہ سونا اور چاندی اس سلطنت سے باہر نہ بھیجا جائے اور نہ تجارتی ضرورتوں سے استعمال کیا جائے۔"

"روم۔ ۲۹ر جنوری ۱۶۰۰ء۔ پوپ کے صاحب نے تمام مقامی اور بیرونی سکوں کی قیمت شمار کرائی ہے اور ایک فرمان جاری کیا ہے کہ کوئی شخص اب یہاں سے پانچ کراؤن سے زیادہ نہ لے جا سکے گا۔"

ان قوانین سے یہ تو ممکن تھا کہ ملک کے اندر سونے اور چاندی کی جو مقدار ہوتی وہ باہر نہ جاتی اور وہ ممالک جو خوش قسمتی سے اپنی مملکت یا اپنی نوآبادیوں کے اندر سونے اور چاندی کی کانیں رکھتے تھے اپنی دولت میں اضافہ کرتے رہتے لیکن وہ ممالک جن کے پاس اضافۂ دولت کا کوئی ذریعہ نہ تھا کیا کرتے؟ تجارتی نظریۂ زر کے قائل زر ہی کو دولت کہتے ہیں، پھر آخر یہ ممالک اس عالمِ بے زری میں دولت اور طاقت کس طرح حاصل کرتے؟

تجارتی نظریۂ زر کے ماننے والوں نے ایک بڑی اچھی تدبیر بتائی۔ تجارتی توازن جو اپنے حق میں ہو (FAVOURABLE BALANCE OF TRADE) اس صورتِ حال کا بہترین

حل تھا؟ آخر اس تجارتی توازن کا جو اپنے حق میں ہو کیا مطلب تھا؟

۱۵۴۹ء میں انگلستان میں ایک کتاب انگلستان کو مالدار بنانے والی تدبیریں شائع ہوئی تھی، اس کتاب کا ایک اقتباس ہم ذیل میں پیش کرتے ہیں :۔

"اس ملک کی ٹکسال تک سونے کی بڑی مقدار لانے کی صرف ایک تدبیر ہے۔ وہ یہ ہے کہ اپنے ملک سے بہت زیادہ سامان تجارت دوسرے ملکوں میں بھیجیں اور دوسرے ملکوں سے بہت کم سامان منگائیں۔ اس طرح میں یقین دلاتا ہوں کہ ہم آسانی سے اپنے ملک سے گیارہ سو ہزار پاؤنڈ کا سامان باہر بھیجیں گے اور باہر سے صرف چھ سو ہزار پاؤنڈ کا سامان منگائیں گے۔ اور باقی رقم جو ہم کو اپنے سامان تجارت کی قیمت کے طور پر ملنی چاہیئے یا تو سونے کی سلاخوں کی شکل میں لے کر میزان پوری کریں گے یا اس کے بجائے انگریزی سکہ لے کر حساب پورا کرلیں گے۔"

اس طرح حکومتیں سونے کی مقدار کی رسد بڑھا سکتی ہیں "تجارتی نظریۂ زر" کے ماننے والے کہتے تھے۔ اگر ہم دوسرے ملکوں سے تجارت کرتے وقت اس کا لحاظ رکھیں کہ جتنا سامان تجارت بھیجیں اُس سے کم خریدیں تو مجبوراً ہمارے سامان تجارت کی جتنی قیمت بڑھے گی وہ ہم کو کسی قیمتی دھات کی شکل میں ادا کی جائے گی۔

انگریزی ایسٹ انڈیا کمپنی کے چارٹر میں ایک دفعہ تھی۔ اس دفعہ کی رو سے کمپنی کو حق تھا کہ وہ سونا باہر بھیجے۔ جب سترھویں صدی عیسوی میں بعض اہل قلم نے کمپنی پر اعتراضات کئے اور اس کو سونا باہر نہ بھیجنے کا مشورہ دیا تو ٹامس من (THOMAS MUN) نے، جو کمپنی کا ایک ڈائرکٹر تھا کمپنی کی پالیسی کی حمایت میں ایک کتاب "بیرونی تجارت سے انگریزی منافع" لکھی۔ من نے لکھا کہ ایسٹ انڈیا کمپنی خام مال خریدنے کے لئے مشرقی ملکوں میں سونا چاندی بھیجتی ہے، یہ خام مال انگلستان سے یا تو دوسرے ملکوں کو بھیج دیا جاتا ہے یا انگلستان ہی میں اس کی چیزیں بنوا کر دوسرے ملکوں کو بھیج دی جاتی ہیں۔ ان دونوں صورتوں میں اُس رقم سے کہیں زیادہ جو

ہم دوسرے ملکوں کو بھیجتے ہیں ہمارے ملک میں پھر لوٹ آتی ہے۔ اس طرح ہمارا دوسرے ملکوں کو قیمتی دھاتوں کا بھیجنا حق بجانب ثابت ہوتا ہے۔ مِن کی بس یہ تھی کہ ملک کی دولت بڑھانے کی سب سے اہم تدبیر یہ تھی کہ ہم دوسرے ملکوں کے ہاتھ زیادہ قیمت کا سامان بھیجیں اور ان سے کم قیمت کا سامان خریدیں اس طرح تجارتی توازن کو اپنے حق میں رکھ کر اپنی دولت بڑھائیں۔ وہ لکھتا ہے:-

"اس لئے ہم بیرونی تجارت کے ذریعہ سے اپنی دولت اور اپنا خزانہ بڑھا سکتے ہیں۔ اس تجارت میں ہمیں یہ خیال ہمیشہ رکھنا چاہئے کہ ہم غیر ممالک کے ہاتھ سالانہ زیادہ رقم کا سامان بھیجیں اور ان سے کم قیمت کا سامان خریدیں۔ اس طرح ہمارے اسٹاک کا وہ حصہ جو بیرونی دنیا کی شکل میں لوٹ نہیں رہا ہے، لازمی طور پر خزانے کی شکل میں لوٹے گا۔ اپنے ملک میں دولت بڑھانے کی کوئی بھی شکل اختیار کریں ہمارے پاس اتنی ہی رقم رک جائے گی جو تجارتی توازن سے ہمارے حق میں نکلے گی"۔

اب دولت بڑھانے کی یہی تدبیر تھی کہ قیمتی چیزیں باہر بھیجی جائیں اور باہر سے صرف ضرورت کی چیزیں منگائی جائیں اور اس تبادلے میں ہمارے مال کی قیمت جتنی بڑھے وہ نقد سکے کی شکل میں وصول کی جائے۔

یہ تدبیر کامیاب بنانے کے لئے یہ ضروری تھا کہ صنعت کی ترقی کی ہر امکانی کوشش کی جاتی مصنوعات کی قیمت جتنی زیادہ تھی اتنی قیمت زرعی مال کی نہ تھی، اس لئے اس خام مال کے مقابلے میں دوسرے ملکوں میں جا کر یہ مصنوعات زیادہ قیمت کی بک سکتی تھیں، اس لئے یہ بھی اتنا ہی ضروری تھا کہ اپنے ملک میں بھی صنعتی ترقی کی انتہائی کوشش کی جاتی تاکہ تم اپنے ملک والوں کی ضرورت کی تمام چیزیں خود ہی تیار کر لیتے اور ان کی خریداری کے لئے دوسرے ملکوں کے سامنے ہاتھ نہ پھیلانا پڑتا اور تم اس طرح اپنی بہت سی ضرورتیں اپنی مصنوعات سے پوری کرکے اپنی اچھی خاصی دولت بچا لیتے۔ تجارتی توازن اپنے حق میں رکھنے کی یہ بہت اچھی تدبیر تھی اور اس طرح تم اپنے ملک کو بڑی آسانی سے خود مکتفی بنا کر دوسروں سے بے نیاز ہو سکتے تھے۔

تمام ملکوں نے ایک دوسرے کے بعد یہی کوششیں کیں کہ کسی طرح وہ اپنی پرانی صنعتوں کو ترقی دیں اور ایسے وسائل اختیار کریں جو نئی صنعتوں کے قیام اور فروغ کا باعث ہوں۔ بویریا میں میکسی میلین اوّل (MAXI MILIAN I) کے زمانے میں ۱۶۱۶ء میں ایک "عقلمندوں کا بورڈ" قائم کیا گیا تھا، اس کے سپرد یہ خدمت تھی کہ وہ ہفتے کے چند مقررہ دنوں میں اکٹھا ہوں اور آپس میں مل جل کر غور و فکر کے بعد وہ ذرائع دریافت کریں، جو تجارت اور صنعت کی ترقی اور فروغ کا موجب ہوں اور جن کی مدد سے ان کو کامیابی کے ساتھ جاری رکھا جا سکے۔"

عقلمندوں کے اس بورڈ (BRAIN TRUSTERS) اور اسی قسم کے دوسرے لوگوں نے جو دوسرے ملکوں میں کام کر رہے تھے، صنعت و حرفت کی ترقی کے لئے کیا وسائل دریافت کیے؟ انھوں نے ذرائع اور وسائل کی بڑی فہرست جن کو انھوں نے سوچ سمجھ کر دریافت کیا تھا، تیار کر لی۔

ان تدابیر میں سے جن کا مشورہ یہ لوگ دے رہے تھے، ایک تدبیر یہ تھی کہ مصنوعات کی پیداوار پر جو باہر بھیجی جائیں حکومت کی طرف سے کچھ مالی امداد بھی دی جائے۔ اگر تم چاقو تیار کرتے ہوتے تو تم کو ان تمام چاقوؤں پر جو تم باہر بھیجتے، حکومت کی طرف سے مالی امداد ملتی۔ اس صورت سے تمھاری حوصلہ افزائی ہوتی اور تم چاقوؤں کی بہت بڑی تعداد تیار کرنے کی کوشش کرتے۔ اسی طرح، ٹوپیوں، اونی کپڑوں، ہتھیاروں اور کتان کے پارچہ جات کے بنانے اور تیار کرنے والے بھی حکومت کی حوصلہ افزائی کے بعد اپنی صنعت کی ترقی کے لئے جان توڑ کر کوششیں کرنے لگے ہوں گے۔ مصنوعات کی پیداوار پر سرکاری امداد صرف اس لئے دی جاتی تھی کہ صنعت کو فروغ ہو اور زیادہ سے زیادہ مال دوسرے ملکوں کو بھیجا جا سکے۔

صنعت کی ترقی کے لئے جو تدبیریں اختیار کی گئیں ان میں حفاظتی محصول (PROTECTIVE TARIFF) بھی شامل تھا۔ امریکی طالب علم جو امریکہ کی تاریخ سے زیادہ مانوس ہیں یقین کر رہے ہوں گے کہ برآمد پر حفاظتی محصول لگانے کی ابتدا سب سے پہلے امریکہ میں ہوئی اور اس کامیاب تدبیر کا

سہرا انگزنڈر ہملٹن کے سر بندھا ہوا ہے حقیقت یہ نہیں ہے، حفاظتی محصول کا دستور بھی اتنا ہی پرانا ہے جتنا تجارتی نظریہ زر کا تصور ــــــ ہوسکتا ہے کہ اس سے بھی زیادہ قدیم زمانے میں ابتدائی صنعت کی حفاظت کے لئے استعمال کیا جاتا ہو۔ انگلستان میں ابتدائی صنعت کی حفاظت کے لئے ایک عرضداشت اس وقت جب ہملٹن پیدا بھی نہیں ہوا تھا لکھی گئی تھی۔ اس عرضداشت میں آیا ہے:۔

> "میرا خیال ہے کہ میں نے اچھی طرح ثابت کر دیا ہے کہ انگلستان اور آئرستان میں کتان کی صنعت ابھی اپنی ابتدائی منزل میں ہے اس لئے اس کا سستا بیچنا ہمارے امکان سے باہر ہے۔ وہ لوگ جو عرصے سے یہی کام کر رہے ہیں اور ان کی صنعت کی بنیادیں پوری طرح جم گئی ہیں ایسا کر سکتے ہیں۔ ہم حوصلہ افزائی کے بغیر جو عوام کی جانب سے کی جائے۔ جلد کسی ترقی کی امید نہیں دلا سکتے۔"

"عوام کی جانب سے حوصلہ افزائی" جس کی درخواست یہ کارخانہ دار کر رہا تھا حفاظتی محصول کی شکل میں آئی۔ یہ محصول بہت بڑھا چڑھا کر بیرونی مصنوعات پر لگایا گیا تھا بعض خاص حالات میں حکومتوں نے باہر کی بعض مصنوعات کی درآمد بالکل ممنوع قرار دیدی۔

صنعت کی ترقی کے لئے کارخانہ داروں کو صرف سرکاری امداد ہی نہیں دی گئی اور ان کو بیرونی مصنوعات کے مقابلے سے بچانے کے لئے برآمد پر لمبے لمبے حفاظتی محصول ہی نہیں عائد کئے گئے بلکہ غیر ملکوں کے ماہر کاریگروں کو بھی، جو تجارت اور صنعت کی ترقی کے نئے گر بتا سکیں، بلایا گیا اور ان کو اپنے ملک میں بسانے کے لئے تمام امکانی تدبیریں اختیار کی گئیں۔ باہر کے دستکاروں کو ترغیب دی گئی کہ اگر آ کر بس جائیں گے تو ان پر کسی قسم کا محصول نہیں عائد کیا جائے گا، ان کو رہنے کے لئے مکانات دئے جائیں گے، ان سے ان مکانوں کا کوئی کرایہ نہیں لیا جائے گا۔ چند سالوں تک مصنوعات کی اجارہ داری ان کے ہاتھ میں رہے گی اور اگر ضرورت ہو گی تو ان کو اپنا کاروبار جمانے کے لئے سرمایہ بھی قرض دیا جائے گا۔ اگر یہ کاریگر اور دستکار خوشی سے آنے کے لئے تیار نہ ہوتے تو حکومتیں کبھی کبھی ان کے اغوا سے بھی باز نہ رہتیں۔

سترھویں صدی عیسوی میں کالبرٹ (COLBERT) نے، جو اپنے زمانے کا مسولینی تھا۔ اپنی کابینہ میں بعض ایسے عہدے رکھے تھے جن کا صرف یہی کام تھا کہ وہ باہر کے دستکاروں کو فرانس میں لے آئیں اور یہیں بساگران کو صنعت پر لگا دیں، اس نے دوسرے ملکوں میں اپنے نمائندے مقرر کر رکھے تھے۔ یہ لوگ دوسرے ملکوں کے دستکاروں اور مزدوروں کو جس طرح بن پڑتا، فرانس میں لے آتے۔ کالبرٹ نے ۲۸ رجون ۱۶۶۹ء کو اپنے فرانسیسی وزیر ایم چیسن (M.CHASSAN) کو جو ڈرسڈن (DRESDEN) میں تعینات تھا، لکھا تھا۔

> "مہربانی کرکے اس کو (بھرتی کے ایجنٹ کو) ہر امکانی امداد، جس سے وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائے، دیتے رہو اور یقین رکھو کہ اگر تم نے ان آہنگروں کو جو فرانس میں لاکر آباد کیے گئے ہیں ہر طرح سے خوش رکھا تو وہ (ایجنٹ) آسانی سے دوسرے کاریگروں کو بھی تیار کرکے ہماری صنعتوں کے لئے لاسکے گا۔"

ان دستکاروں کو آنے کے بعد، جہاں تک ہو سکتا تھا جانے نہیں دیا جاتا تھا۔ ان کو ملک میں روکنے کے لئے ہر حفاظتی تدبیر اختیار کی جاتی تھی اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی کوشش کی جاتی تھی کہ دیسی کاریگر دوسرے ملکوں میں نہ جا بسیں یا تجارتی گر اور صنعتی راز کسی دوسرے کے ہاتھ فروخت نہ کر دیں۔

ایک طرف ان کاریگروں، صنعت گروں اور مزدوروں کو دوسرے ملکوں سے لا لاکر اپنے ملک میں آباد کیا جا رہا تھا، دوسری طرف مذہبی اختلافات کی بنا پر، پوری پوری جماعتوں کو، جو دستکاروں اور ماہر تاجروں پر مشتمل تھیں، جلاوطن کیا جا رہا تھا۔ سترھویں صدی عیسوی میں فرانس ایک طرف انتہائی کوششیں کر رہا تھا کہ ماہر کاریگروں کو دوسرے ملکوں سے لاکر اپنی زمین پر بسائے لیکن دوسری طرف وہ پروٹسٹنٹ عیسائیوں کو زبردستی اپنی حدود سے جلاوطن کر رہا تھا اور اُسے کوئی پروا نہ تھی کہ اس جماعت میں فرانسیسی ماہر دستکاروں کی بڑی تعداد بھی فرانس سے باہر چلی جا رہی ہے۔

ملکہ الزبتھ کے ایک خط سے جو اُس نے ۱۵۶۶ء میں کمبرلینڈ اور ویسٹ مورلینڈ کے حاکمانِ عدالت کے نام لکھا تھا، اس حقیقت پر روشنی پڑتی ہے کہ اُس زمانے میں بدیسی دستکاروں کے آرام اور آسائش کی فکر کتنی ضروری سمجھی جاتی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب معمولی خطاؤں پر انسانوں کی زندہ کھالیں داغی جاتی تھیں۔ ان کے کان کاٹے اور ہاتھ پیر جدا کر دئے جاتے تھے اور کچھ زیادہ خیال کئے بغیر اُنھیں پھانسی کے تختے پر بھی لٹکا دیا جاتا تھا۔ انسانی جان کی ارزانی کے اِس زمانے میں بھی دیکھو، ملکہ الزبتھ ایک بدیسی جرمن کے قتل پر کتنی بے چین ہو رہی ہے! - وہ لکھتی ہے:-

"ہر گاہ کہ بعض جرمنوں پر، جن کو انگلستان کی مہر سے ایک سند شاہی عطا کی گئی تھی اور جنھوں نے بڑی محنت، مہارت اور مصارف برداشت کر کے ہمارے صوبے ویسٹ مورلینڈ اور کمبرلینڈ کے پہاڑوں اور ان کی چٹانوں سے قیمتی معدنیات کی بڑی مقدار نکالی ہے اور جن کا ارادہ تھا کہ وہ ابھی معدنیات کی کھدائی جاری رکھیں گے، حملہ کیا گیا اور ہمارے امن کے قوانین کی پوری خلاف ورزی کرتے ہوئے بلوہ کیا گیا۔ اس بلوے کے ذمہ دار ہمارے ان مذکورہ صوبوں کے چند امن شکن لوگ ہیں۔ اس خونی بلوے میں ایک جرمن جان سے مارا گیا ہے اور اس کا اندیشہ ہے کہ ان جرمنوں کی پوری جماعت دل شکستہ ہو جائے۔ اس لئے ہم تمہارے سپرد یہ خدمت کرتے ہیں اور تم کو حکم دیتے ہیں کہ ان تمام لوگوں کو، جو اس فساد اور قتل کے ذمہ دار ہوں گرفتار کر لو اور اس کا پورا خیال رکھو کہ آئندہ ان جرمنوں کے ساتھ بہت دوستانہ اور نرم سلوک کیا جائے۔ اگر تم ہمارے حکم کی پوری طرح تعمیل کرو گے تو ہماری خوشنودی مزاج کے مستحق ٹھہرو گے اور اگر ہمارے حکم کی تعمیل میں ناکام رہے تو اپنی تباہی کے خود ذمہ دار ہو گے۔"

جن بدیسی دستکاروں کی صنعت گری سے ملکی صنعت کو فائدہ پہونچتا تھا، ان کی حفاظت کا پورا انتظام کیا جاتا تھا۔ اسی صورت سے جو لوگ کوئی نئی چیز ایجاد کرتے تھے، حکومتوں کی طرف سے ان کی بھی سرپرستی کی جاتی تھی۔ جان ڈی براس ڈی فرنے ۱۶۱۱ء میں ایک نئے قسم کی چکی

بنائی تھی، حکومت نے اس کو یہ چکی بنانے اور بیچنے کا اجارہ دیا، جو بیس سال تک جاری رہا۔ یہ اجارہ بالکل ویسا ہی تھا جیسا آج کل ہماری حکومتیں عطا کرتی ہیں۔ اس حکم کے الفاظ یہ ہیں :-

"ہم نے ———— کو اجازت دی ہے کہ وہ اور اس کے ساتھی اس کی ایجاد کے بموجب چکیاں مملکت کے ہر قصبے اور شہر میں بنائیں۔ ہم منع کرتے ہیں کہ کوئی شخص اس ایجاد کے نمونے پر مکمل چکی یا اُس کا کوئی حصہ، اُس کی واضح اجازت اور منظوری کے بغیر نہ بنائے۔ اگر کوئی شخص اس حکم کی خلاف ورزی کرے گا تو اُس پر دس ہزار لیور جرمانہ ہوگا اور اُس کی چکی ضبط کر لی جائے گی۔"

صرف ایجاد کرنے والوں ہی کو اجارہ داری کے حقوق عطا نہیں کیے جاتے تھے بلکہ بعض ملکوں میں ان لوگوں کو بھی انعامات دیے جاتے تھے جو گھریلو صنعت کو فروغ دینے کی تدبیروں پر غور کرتے تھے اور ایسی نئی تدبیریں دریافت کرنے میں کامیاب ہو جاتے تھے جن سے صنعت میں کسی قسم کی ترقی ممکن ہو سکتی ہو۔ کالبرٹ نے ٹکنیکل تعلیم کے لیے ایک درسگاہ قائم کی تھی۔ اور حکومت کی طرف سے بعض کارخانے چلانے کا انتظام کیا تھا۔ بویریا میں سترھویں صدی عیسوی کے آخر میں کپڑے کا ایک سرکاری کارخانہ جس میں دو ہزار مزدور کام کرتے تھے، قائم ہوا تھا۔ یہ سرکاری کارخانے عام صنعتوں کے لیے نمونہ کا کام کرتے تھے۔ عام صنعتیں ان سے ہدایات حاصل کرتی تھیں اور ان سے وہی فائدہ حاصل کرتی تھیں، جو تجربہ گاہوں سے حاصل کیا جاتا ہے۔ ان کارخانوں میں جو بڑے پیمانہ پر قائم کیے گئے تھے اور جو ان تمام پابندیوں سے، جو جماعتی نظام میں عائد ہوتی تھیں آزاد تھے، نئے نئے تجربے اور طرح طرح کی ترقیاں ممکن تھیں کسی ایسے کارخانے میں، جسے صرف چند دستکاروں نے محض انفرادی طور پر جاری کر رکھا ہو، ایسے وسیع تجربے، جن کی اس وقت ضرورت تھی ممکن نہ تھے۔

صنعتوں کی حوصلہ افزائی کے لیے حکومتیں ان کو سرکاری امداد دینے کے لیے ہمیشہ تیار رہتی تھیں۔ یہ امداد کبھی براہ راست نقد روپے کی شکل میں ہوتی تھی اور کبھی بعض دوسرے ذرائع سے بہم پہنچائی جاتی تھی۔ کالبرٹ کے زمانے میں فرانسیسی پارچہ بافی کی صنعتوں نے مختلف شکلوں میں

اسّی لاکھ لیور کی امداد حاصل کی سترھویں صدی عیسوی میں پارچہ بافوں کی بعض جماعتوں نے ایک ایسا کارخانہ قائم کرنا چاہا تھا جس میں ریشم اور چاندی سونے کے تاروں سے قیمتی کپڑے تیار کئے جائیں حکومت نے ان کی حوصلہ افزائی کے لئے ان کو بہت سے حقوق عطا کئے اور مالی امداد بھی دی ایک فرمان میں آیا ہے :-

«عام رعایا کی بھلائی کے لئے یہ بہت ضروری ہے کہ بڑے پیمانے پر آرٹ اور صنعت کو فروغ دیا جائے۔ یہ دونوں چیزیں ہماری مملکت کی دولت مندی اور ترقی کے لئے بہت ضروری ہیں اگر ہم نے اعلیٰ پیمانے پر بڑے بڑے صنعتی کارخانے قائم کرلئے تو ہم کو اپنے پڑوسیوں کے سامنے دست سوال بڑھانے کی ضرورت نہ رہے گی اور اپنی ضرورت کی چیزوں کے لئے دنیا کے دور دراز گوشوں کی خاک نہ چھاننی پڑے گی۔ ہماری یہ صنعتی ترقی ان تمام خرابیوں کا جو بیکاری سے پیدا ہوتی ہیں علاج کرے گی، سونے چاندی کی بڑی مقدار جو ہم اپنی ضروریات کی خریداری کے لئے باہر بھیجنے پر مجبور ہو جاتے ہیں، ہمارے ملک سے باہر نہ جائے گی۔»

(یہاں پر ان آدمیوں کے نام دئے گئے ہیں جو بارہ سال کے لئے اس تجارت کے تنہا اجارہ دار قرار دئے گئے تھے)

«اس مدت میں کوئی شخص ان لوگوں کی رضامندی اور منظوری کے بغیر ریشم کا کوئی کارخانہ نہ قائم کر سکے گا۔ اس کارخانہ کے قیام پر جو زبردست رقم خرچ ہونے والی ہے اس میں ہاتھ بٹانے کے لئے ہم ان کو ایک لاکھ اسی ہزار لیور عطا کرتے ہیں۔ یہ رقم بلا تاخیر ان کو فوراً دیدی جائے گی۔ یہ رقم بارہ سال تک ان کے پاس رہے گی۔ اس کا کوئی سود ان سے نہیں لیا جائے گا۔ بارہ سال گذرنے کے بعد یہ صرف ایک لاکھ پچاس ہزار لیور ادا کریں گے۔ باقی تیس ہزار لیور ہم ان کو ان کے غیر معمولی مصارف کا خیال کرکے جو کسی صنعت کے قیام کیلئے ضروری ہوتے ہیں امداد کے طور پر چھوڑ دیں گے۔ یہ رقم وہ اپنا نقصان پورا کرنے میں صرف کریں گے تاکہ اس کارخانے کے مستقل قیام میں کوئی دشواری نہ پیدا ہو۔»

تجارتی نظریۂ زر کے ماننے والے (MERCANTILIST) عرصے سے کہہ رہے تھے کہ صنعتوں کے فروغ سے تجارتی برآمد بہت بڑھ جائے گی اور اس طرح تجارتی توازن کے موافق ہو جانے کی وجہ سے ہمارے ملک میں اچھی خاصی دولت بڑھ جائے گی۔ اس فوائد کے علاوہ کارخانوں کے قیام سے بیروزگاری کا مسئلہ بھی بڑی حد تک حل ہو جائے گا۔ سٹرٹی مین لے (MANLEY) نے ۱۶۷۷ء میں لکھا تھا:-

"ایک پونڈ اون کی مصنوعات کا باہر بھیجنا ہمارے نزدیک قیمتی ہے۔ ہم اس کے مقابلے میں دس پاؤنڈ خام مال دوگنی قیمت پر باہر بھیجنے کے لئے تیار نہیں ہیں مصنوعات کی برآمد ہمارے اہلِ وطن کی بے روزگاری دور کرتی ہے اس لئے یہ ہمارے لئے زیادہ قیمتی ہے۔"

اُس زمانے میں جب بھکاریوں اور بے روزگاروں کے جھنڈ کے جھنڈ پریشانی کا موجب ہو رہے تھے اور محتاجوں کی امداد پر ایک بڑی رقم خرچ کرنی پڑتی تھی، اس قسم کے دلائل کافی وزن رکھتے تھے بادشاہ کو اپنی رعایا کی بہبودی کی فکر تھی اور تجارتی نظریۂ زر کے ماننے والے قومی طاقت اور قومی دولت بڑھانے کے آرزومند تھے اس لئے ان سب کو اپنے وطن والوں کی جو بھوکی توپوں کا پیٹ بھرا کرتے تھے، حالت سدھارنے کی فکر دامن گیر تھی۔ غلے کی پیداوار پر بھی کافی زور دیا جا رہا تھا تاکہ لوگوں کو کھانے پینے کا آرام ہو اور ان کی جسمانی حالت اچھی ہو جائے۔ تاکہ جب جنگ چھڑے تو وہ کام آسکیں۔ یہ سب کو معلوم تھا کہ جنگ کے زمانے میں غذائی اشیاء کی کافی رسد بہت اہمیت رکھتی ہے اس لئے غلے کی پیداوار بڑھانے کے لئے بھی انگلستان میں سرکاری خزانے سے امداد دی جاتی تھی۔

اُس زمانے میں بہت سے ملکوں میں مختلف قوانین جو غلے کی پیداوار سے تعلق رکھتے تھے اسی لئے بنائے گئے تھے کہ جنگ کے زمانے میں غذا کی رسد میں کسی قسم کی کمی کا امکان نہ پیدا ہو اور فوج میں بھرتی ہونے کے لئے اچھے تندرست اور کھائے پئے ہوئے نوجوان کافی تعداد میں مل سکیں۔

"لڑنے والے آدمی" اور "جنگ کا زمانہ"۔ جو لوگ ان جنگی فقروں کی روشنی میں غور کرنے کے عادی تھے ان کو اپنے جنگی جہازوں کی تعداد بڑھانے کی بھی فکر تھی اور وہ ان جہازوں کی حیثیت بھی بہتر بنانا چاہتے تھے، اپنی مادرِ وطن کی حفاظت کے لئے بھی اور غنیم کی مملکت پر چڑھائی کرنے

کے لیے بھی جنگی بیڑوں کی ضرورت تھی۔ تجارتی نظریہ زر پر ایمان رکھنے والے بھی جو تجارتی توازن کو اپنے حق میں برقرار رکھنے کے لیے ہر امکانی تدبیر سوچ رہے تھے، ایک تجارتی جنگی بیڑے کی ضرورت محسوس کر رہے تھے۔ حکومتیں بھی، جو بیرونی تجارت میں دلچسپی لے رہی تھیں۔ اپنے تجارتی بیڑوں کو سہولتیں دینا چاہتی تھیں تاکہ ان کا سامان تجارت آسانی سے دوسرے ملکوں کے ساحلوں تک پہونچایا جا سکے۔ ان حکومتوں نے اسی دلچسپی کے ساتھ جو انھوں نے صنعت کی ترقی میں صرف کی تھی، جہاز سازی کی صنعت کی طرف توجہ کی۔ اس صنعت کی ترقی کے لیے بھی وہی ذرائع استعمال کیے گئے۔ جہازوں کے بنانے والوں کو حکومت کی طرف سے امداد دی گئی۔ تارکول، رال، مضبوط لٹھے اور تختے وغیرہ جن کی جہاز سازی کے لیے ضرورت پڑتی تھی باہر سے منگائے گئے اور ہر قسم کے محصول سے مستثنیٰ کر کے کارخانوں تک پہونچائے گئے۔ بحری خدمات کے لیے جبری بھرتی کی گئی۔ فرانس کی عدالتوں کو ہدایت کی گئی کہ وہ مجرموں کو جہاں تک ممکن ہو بادبانی جہازوں میں کام کرنے کی سزائیں دیں۔ انگلستان میں ماہی گیری کی صنعت کو فروغ دیا گیا۔ غرض صرف یہ تھی کہ اس پیشے میں ملاحی کی ابتدائی تربیت خود بخود ہو جائے گی۔ لوگوں کو ترغیب دی گئی کہ وہ زیادہ مچھلیاں کھائیں۔ حکومت کی طرف سے یہ عام چرچا کرایا گیا کہ مچھلیوں میں کچھ ایسے اجزا پائے جاتے ہیں، جو نہ صرف انسان کی غذائی ضرورت پوری کرتے ہیں بلکہ اگر زیادہ مقدار میں استعمال کیے جائیں تو انسان کی عمر بڑھا سکتے ہیں۔

سولھویں صدی عیسوی کے آخر میں اسپین کے زوال کے ساتھ چھوٹے سے ملک ہالینڈ نے بڑی اہمیت حاصل کر لی، یہ ملک اپنے زمانے کی اول درجہ کی طاقت بن گیا۔ ہالینڈ اگرچہ چھوٹا سا ملک تھا لیکن جہاز سازی کی صنعت میں خاص ترقی کرنے کی وجہ سے بہت دولت مند اور طاقتور ہو گیا تھا۔ وینس کے باشندوں کی طرح ہالینڈ کے رہنے والوں نے اپنے جغرافیائی سہولت سے پورا فائدہ اٹھایا اور انھوں نے کشتیوں کے متعلق اچھے خاصے معلومات حاصل کر لیے۔ شمالی سمندر، جو مچھلیوں کی دولت سے بھرپور تھے، ہالینڈ کے حوصلہ مندوں کو اپنی طرف بلایا کرتے تھے۔ شمالی ملکوں کی پیداوار، بحیرۂ روم آتے جاتے ہوئے ہالینڈ کے ساحل سے، جو بیچ میں پڑتا تھا، گذرتی تھی اور ہم

جو ڈچوں کو اپنے محلِ وقوع سے فائدہ اٹھانے کا پورا موقع ملتا تھا۔ انھوں نے سمندروں کو کارگاہ عمل بنالیا اور ڈچ کشتیاں سبک خرامی سے پوری دنیا کا سامان تجارت اِدھر سے اُدھر لے جانے اور ہر طرف پہونچانے لگیں۔

ڈچ جہاز راں ہر طرف چھائے ہوئے تھے لیکن فرانس اور انگلستان عرصے تک اسے کیسے برداشت کرتے کہ ان کا سامان تجارت غیروں کی کشتیاں ڈھوتی رہیں۔ وہ اپنے ملک کو خود مکتفی بنانا چاہتے تھے اس لئے جب تک اپنا بیڑا نہ تیار کرلیتے ان کو قرار نہ تھا۔ وہ پسند نہیں کرتے تھے کہ اپنا سامان تجارت لے جانے کے لئے ڈچوں کو اپنی دولت کا ایک حصہ دیتے رہیں۔ انگلستان کے قانون جہاز رانی کی منظوری اور اُس کے نفاذ کا سب سے بڑا مقصد یہی تھا کہ ڈچوں کو سمندروں کا تنہا اجارہ دار نہ رہنے دیا جائے۔ سنہ ۱۶۶۰ء میں جو قانون منظور ہوا تھا اُس کے الفاظ اس حقیقت پر روشنی ڈالتے ہیں۔ قانون کے الفاظ یہ ہیں:-

"فن جہاز رانی کو ترقی دینے کے لئے اور اس قوم کو جہاز رانی کا شوق دلانے کے لئے یہ قانون بنایا جاتا ہے کہ یکم دسمبر سنہ ۱۶۶۰ء کے بعد کوئی عام سامان یا سامان تجارت اس ملک یا اُس ملک نوآبادیات سے جو ایشیا، افریقہ یا امریکہ میں ہیں سوا انگریزی یا آئرستانی جہازوں کے جو دراصل انھیں ملکوں کے باشندوں کی ملکیت ہوں اور کسی جہاز پر نہ لے جایا جائے گا۔ اور نہ دوسرے ملکوں سے کوئی سامان ان ملکوں تک سوا ان جہازوں کے جو ان ملکوں کی ملکیت ہوں اور کسی جہاز میں لایا جائے گا۔ ان جہازوں کا مالک انگریز اور ان کے ملاحوں کی کم سے کم تین چوتھائی تعداد انگریز ہونی چاہیے۔"

ڈچ جہاز ←—— | سامراج کی دیوار —— باہر جاؤ

اس قانون کے بموجب انگلستان اور اُس کی نوآبادیات کو متفقہ طور پر بیرونی جہاز رانوں کا مقابلہ کرنا تھا۔ امریکی نوآبادی کے باشندوں کے لئے طاقتور ڈچ جہاز راں کمپنیوں کے مقابلے کا بڑا اچھا موقع پیدا ہوگیا تھا اور اب وہ آسانی سے اپنے تجارتی بحری بیڑے بنا سکتے تھے۔ وہ وقت

جلد آ گیا جب یانکی کشتیاں ہر طرف دنیا کے ہر بندرگاہ میں چلتی پھرتی ہوئی نظر آنے لگیں۔ بڑھتی ہوئی انگریزی سلطنت کی جہاز رانی کی صنعت میں حصہ پانے کے بعد یانکی (YANKEE) کے جہاز سازوں مالکانِ جہاز اور ملاحوں نے بے اندازہ دولت کمائی۔

لیکن اس جہاز رانی کے قانون کے کچھ ایسے حصے بھی تھے جو نوآبادیات کے لئے نفع بخش نہ تھے۔ تجارتی نظریۂ زر کے حامیوں کا یہ بھی خیال تھا کہ نوآبادیات کو مادرِ وطن کے مفاد کی خاطر آمدنی کا ایک ذریعہ بنایا جائے اس لئے ایسے قوانین بنائے گئے جن کے ذریعہ سے نوآبادیات کے باشندوں کو ایسی صنعتیں شروع کرنے سے منع کیا گیا جو مادرِ وطن انگلستان کی صنعتوں سے ٹکرائیں۔ نوآبادیات کے لوگوں کو ٹوپیاں، ہیٹ، اُونی اور لوہے کی چیزیں بنانے سے روکا گیا۔ ان تمام چیزوں کی صنعت کے لئے امریکہ میں خام مال کی کمی نہ تھی لیکن انگلستان یہ خام مال منگا کر اپنی صنعت میں لگانا چاہتا تھا تاکہ اسی سامان کی مصنوعات پھر واپس بھیج کر امریکہ کے بازار میں نفع کمائے۔

انگلستان کا یہ طرزِ عمل صرف امریکہ ہی کے ساتھ نہ تھا بلکہ تمام نوآبادیات کے ساتھ اُس کا یہی برتاؤ تھا۔ آئرلینڈ بھی انگلستان ہی کی ایک نوآبادی تھا۔ جب آئرش لوگوں نے اپنے ملک کے اُون سے کپڑے بنانے شروع کئے تو ایسے قوانین منظور کئے گئے جن کا سہارا لے کر وہاں کی کپڑے کی صنعت ہی ختم کردی گئی۔ کیا اُس وقت آئرستانی اپنا اُون باہر بھیج سکتے تھے؟ نہیں، وہ مجبور تھے کہ اپنا خام مال صرف انگلستان ہی کے ہاتھ فروخت کریں۔ انگلستان کو پورا اختیار تھا کہ وہ اس مال کو جس طرح چاہے استعمال کرے اور ضرورت ہو تو اسے پھر واپس کردے۔ انگلستان ہی اس خام مال کی قیمت بھی مقرر کرتا تھا اس لئے آئرستانی باشندوں کی بڑی تعداد دن بدن غریب ہوتی چلی جارہی تھی۔ "تجارتی نظریۂ زر" کے حامیوں کی یہی پالیسی تھی جس نے آئرستان کو مجبور کیا کہ وہ انگریزی تسلط کے خلاف ہاتھ پیر ہلائے اور لڑ بھڑ کر آزادی حاصل کرلے۔ یہی صورت امریکہ میں بھی پیش آئی۔

امریکہ سے تمباکو، چاول، نیل، شاہ بلوط، تارپین، سار کول، رال اور راؤد بلاؤ کی کھالیں، صرف انگلستان روانہ کی جاسکتی تھیں۔ انگریز یہ خام مال اپنے کارخانوں کا پیٹ بھرنے کے لئے چاہتے تھے۔ اگر مال

ان کی ضرورت سے زیادہ پہونچ جاتا اور ان کے کارخانوں میں اس کی کھپت نہ ہوسکتی تو وہ نفع سے کردہ مال کہیں اور برآمد کردیا کرتے تھے۔

انگلستان اور اُس کی نوآبادیات کے درمیان اختلاف کے وجوہ سمجھنے کے لئے یہ حقیقت ہمیش نظر رہنی چاہئے کہ انگلستان کے نزدیک نوآبادیات کو صرف انگلستان کی خدمت کے لئے زندہ رہنے کا حق تھا اور نوآبادیات کا خیال تھا کہ انھیں صرف اپنے لئے زندہ رہنا چاہئے تھا۔ سر فرانسس برنارڈ نے جو اُس زمانے میں میساچسٹ (MASSACHUSETH) کا شاہی گورنر تھا۔ اپنی ایک یادداشت میں "مادر وطن" اور "نوآبادیات" کے درمیان رشتے کی وضاحت کی ہے۔ اُس کی تحریر میں اُس زمانے کے "تجارتی نظریۂ زر" کے ماننے والوں کی ذہنیت پوری طرح جھلک رہی ہے۔ وہ لکھتا ہے :-

"امریکی تجارت کے متعلق برطانیہ عظمیٰ کو حسب ذیل دو صورتیں اختیار کرنی چاہئیں :-

۱- امریکی رعایا کو مجبور کرنا چاہئے کہ وہ اپنی ضرورت کی تمام چیزیں برطانیہ سے خریدے اگر کچھ ایسی چیزیں ہوں جو برطانیہ میں نہ بنتی ہوں تو دوسری یوروپین مصنوعات بھی برطانیہ ہی کے ذریعہ سے منگائے۔"

۲- امریکہ کی بیرونی تجارت کی تنظیم کچھ اس طرح کی جائے کہ نفع گھوم پھر کر برطانیہ کے خزانے میں آجائے اور اگر وہ برطانیہ کے خزانے میں نہ آسکے تو برطانوی سلطنت کی ترقی پر صرف ہو۔"

اس صاف بیانی سے یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ برطانیہ دولت اور اقتدار کے حصول کی جد وجہد میں اپنی نوآبادیات کو پوری طرح استعمال کرنا چاہتا تھا، اُس کے نزدیک ان نوآبادیات کا وجود صرف اس لئے تھا کہ وہ انگلستان کی خدمت کرتے رہیں۔ یہ صرف انگلستان ہی کی ذہنیت نہ تھی بلکہ فرانس، اسپین اور دوسرے ممالک بھی جو تجارتی نظریۂ زر کے حامل تھے، اپنی نوآبادیات کے متعلق اسی قسم کا تصور رکھتے تھے۔

ہمیں ان مسائل پر غور کرتے وقت "قومی دولت" اور "قومی اقتدار" کے فقروں سے دھوکہ نہ کھانا چاہئے تھا۔ یہ فقرے کافی ڈھیلے ڈھالے ہیں اس لئے ان کے معنی کے تعین میں غلط فہمی کی کافی گنجائش ہے

یہ عجیب اتفاق ہے کہ اس زمانے کے تمام اہل قلم نے اپنے ملکوں کو دولتمند اور با اقتدار بنانے کی جو صورتیں تجویز کی ہیں وہی صورتیں ان کی ذاتی دولت اور ان کے طبقوں کی طبقاتی دولت و اقتدار کے لئے بھی مفید ہیں۔ یہ ان کے لئے ایک قدرتی بات بھی تھی۔ وہ اپنے ذاتی اور طبقاتی مفاد کو اپنے ملک ہی کا مفاد سمجھتے تھے۔ اب وہ وقت آگیا تھا جب اقتصادی منافع اور قومی پالیسی کا تعلق اچھی طرح صاف نظر آنے لگا تھا۔

تم کو اچھی طرح یاد ہوگا کہ روپئے کے حصول کے لئے بادشاہوں کو کتنی پریشانیوں کا مقابلہ کرنا پڑتا تھا۔ اس زمانے میں محصول عائد کرنے کا کوئی خاص اور وسیع نظام نہ تھا۔ بادشاہوں کو ضرورت کے وقت اور ضرورت کی جگہ پر ہمیشہ روپیہ اکٹھا مل جانے کی پوری امید نہیں ہوتی تھی۔ خزانے میں روپئے کی باقاعدہ اور مسلسل آمدنی کبھی نہیں ہوتی تھی۔ اس لئے بادشاہ محصول وصول کرنے والوں کو تحصیل محاصل کا ٹھیکہ دے دیا کرتے تھے۔ یہ محصلین بادشاہ کو تو پیشگی رقم دے دیا کرتے تھے اور غریب رعایا سے من مانا محصول وصول کرتے رہتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ بڑے بڑے عہدے نیلام ہوا کرتے تھے اور جو شخص بادشاہ کو سب سے زیادہ رقم دینے کا وعدہ کرتا تھا اس کو وہ اونچا عہدہ دے دیا جاتا تھا۔ روپئے کی یہی ضرورت تھی جو اکثر بادشاہوں کو صرف خاص کی زمینیں بیچنے پر مجبور کرتی تھی اور ان کو مہاجنوں اور تاجروں کے سامنے قرض کے لئے دستِ سوال بڑھانا پڑتا تھا۔ حکومتوں کی یہی دشواریاں تھیں جن کی بنا پر وہ قیمتی دھاتیں جمع کرنے پر زور دیتی تھیں اور اب چونکہ یہ بھی یقین ہو گیا تھا کہ تجارت کے ذریعہ سے کافی دولت اکٹھا کی جا سکتی ہے اس لئے حکومت بھی اپنے اور تاجروں کے مفاد میں یکسانیت محسوس کرتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ بھی تجارت کی ترقی کے لئے کوشاں رہتی تھی۔

یہ تجارت ہی تھی جس کے ذریعہ سے حکومت کو اقتدار نصیب ہوتا تھا اور تجارت کی توسیع کے ساتھ ساتھ اس کا اثر بھی مختلف ممالک تک وسیع ہوتا جاتا تھا۔ تجارتی نظریہ زر، نے دراصل تاجروں کے نظریہ زر کی عملی شکل اختیار کر لی تھی۔

"تجارتی نظریہ زر" کے حاملین کا عقیدہ تھا کہ جہاں تک تجارت کا تعلق ہے۔ ایک ملک کا نقصان دوسرے ملک کے نفع کا باعث ہوتا ہے۔ ان کے عقیدہ کے بموجب ایک ملک اس وقت

ترقی کر سکتا تھا جب وہ دوسرے ملک کو نقصان پہونچائے۔ ان کے نزدیک تجارت میں ایک دوسرے کی خیر سگالی ممکن نہ تھی، تجارت میں منافع کا مبادلہ جو جانبین کے حقوق کے احترام سے خالی نہ ہو، ان کے نزدیک نہ ہونے والی بات تھی۔ وہ تجارت کو ایک ایسا کھیل سمجھتے تھے جس میں کامیابی کیلئے دوسرے کا خیال کئے بغیر سب سے پہلے بڑے سے بڑا حصہ اُچک لینا ضروری تھا۔ "ڈکشنری آف ٹریڈ اینڈ کامرس" کے مصنف نے اٹھارھویں صدی میں لکھا تھا:۔

"یورپ میں تجارتی سامان کی مقدار بہت محدود معلوم ہوتی ہے فرض کرو انگلستان پندرہ ملین کی قیمت کی اونی مصنوعات برآمد کرتا رہا ہے۔ اگر وہ کسی سال بیس ملین کی مصنوعات برآمد کرے تو دوسرے ملکوں کی تجارت کو نقصان پہونچے گا اور ان کے مال کی کھپت بازار میں کم ہو جائے گی۔"

کالبرٹ نے ایم۔ پامپون (M. POMPON) کو جو ہیگ میں ۱۶۷۰ء میں فرانس کی طرف سے متعین تھا، لکھا تھا:۔

"جب تک تجارت کسی دوسرے ملک کے ہاتھ میں نہ چلی جائے ہالینڈ کی مصنوعات میں کمی نہ ہوگی اس لئے حکومت کا مفاد اسی میں ہے کہ ایک طرف ہم اپنی تجارت اور مصنوعات میں اضافہ کریں اور دوسری طرف ہالینڈ کی تجارت اور مصنوعات میں موثر کمی کا بندوبست کریں۔ حکومت کے مفاد کے پیش نظر یہ بات بہت اہم ہے۔"

حکومت کے مفاد کے پیش نظر یہ بہت ضروری اور اہم تھا کہ دوسرے ملک کی تجارت کو نقصان پہونچایا جائے۔ اس پالیسی کا صرف ایک نتیجہ تھا ——— "جنگ"۔ تجارتی نظریہ زر کی کمائی، امن عامہ کی تباہی کے سوا اور کچھ نہ تھی، بازاروں کے لئے رسہ کشی، مختلف ممالک کی تجارت کے لئے خوفناک مقابلے، نئی نوآبادیوں کے حصول کے لئے کشاکش، یہ تمام صورتیں جو تجارتی نظریہ زر کے فروغ کا لازمی نتیجہ تھیں، رقیب قوموں کو لڑائی کے میدانوں میں کھینچ لائیں اور ایک جنگ کے بعد دوسری جنگ کا سلسلہ چھڑتا چلا گیا۔ ان میں سے بعض لڑائیاں اپنے اصلی نام

"تجارتی جنگوں" کے نام سے مشہور ہیں۔ دوسری لڑائیاں بھی جو مقدس ناموں کے پردوں میں لڑی گئی تھیں، دراصل تجارتی رقابت کے بُرے نتائج کے سوا اور کچھ نہ تھیں۔ آج کل بھی جو جنگیں بڑے اونچے مقاصد کے ماتحت چھیڑی اور لڑی جا رہی ہیں وہ بھی تجارتی اغراض کے سوا اور کوئی اونچا مقصد نہیں رکھتی ہیں۔ سنہ ۱۹۱۶ء میں، آرچ بشپ آف کنٹربری نے جو الفاظ کہے تھے، ہمارے نزدیک آج بھی وہی صحیح ہیں :-

"دنیا کے اس گوشے میں برسوں سے جو لڑائیاں ہو رہی ہیں لوگ ان کے اصلی رنگ کو بعض اونچے اور روحانی نام دے کر چھپا رہے ہیں لیکن ان لڑائیوں کا آخری ماحصل اور حقیقی مقصد، سونا، عظمت اور دنیوی اقتدار کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔"

آرچ بشپ کا آخری جملہ یاد رکھنے کے لائق ہے، سونا، عظمت اور دنیوی اقتدار کے سوا اور کوئی مقصد نہ تھا، جو تجارتی نظریۂ زر کے ماننے والوں کو گرمِ عمل بنا رہا ہو۔

ہم کو تنہا چھوڑ دو!

۱۷۷۶ء بغاوت کا سال تھا۔ یہ سال تاریخ کے صفحات میں ہمیشہ یادگار رہے گا۔ یہ سنہ امریکی باشندوں کو ان کی آزادی کے اعلان کی یاد دلاتا ہے۔ یہ اعلان اُس بغاوت کا نتیجہ تھا جو انھوں نے انگلستان کی نوآبادیاتی پالیسی کے خلاف کی تھی۔ دنیا کے ماہرین اقتصادیات کی نگاہوں میں بھی یہ سال بہت اہم ہے۔ اسی سال آدم اسمتھ کی کتاب قوموں کی دولت (WEALTH OF NATIONS) شائع ہوئی تھی۔ یہ گرمیوں کا زمانہ تھا اور "تجارتی نظریۂ زر" کی تین قیدوں حدبندی (RESTRICTIONS) تنظیم (REGULATIONS) اور روک (RESTRAINT) کے خلاف عام بغاوت برپا تھی

اٹھارھویں صدی عیسوی میں ایسے لوگوں کی تعداد، جو تجارتی نظریۂ زر سے اتفاق نہ رکھتے ہوں کم نہ تھی۔ انھوں نے اس نظریہ کے ہاتھوں بہت کچھ جھیلا اور برداشت کیا تھا، تجارت پیشہ لوگ بھی اُس بے اندازہ نفع میں جو ان صنعتی کمپنیوں نے بٹورا تھا، حصہ بٹانا چاہتے تھے۔ جب وہ گھس بیٹھ لگاتے تو یہ کہہ کر کہ "تم دخل درمعقولات کرتے ہو" دودھ کی مکھی کی طرح نکال دئے جاتے تھے۔ جن لوگوں کے پاس روپیہ تھا وہ اس کو اپنی مرضی سے جب اور جہاں چاہتے، لگانا چاہتے تھے وہ ہر اُس موقع سے جو بڑھتی ہوئی تجارت اور صنعت پیدا کرتی تھی پورا فائدہ اٹھانا چاہتے تھے۔ وہ سرمائے کی طاقت سے بے خبر نہ تھے۔ وہ اس طاقت کی آزمائش کے لئے میدان چاہتے تھے۔ وہ یہ سنتے سنتے اکتا چکے تھے۔

"تم کو یہ کرنا چاہیئے اور یہ نہ کرنا چاہیئے"

وہ ان قوانین سے جو ان کی آزادی سلب کرتے رہتے تھے اور ان محصولوں سے جو آئے دن عائد ہوتے

رہتے تھے اور اس سرکاری امداد سے جو صنعتی فروغ کے لیے عطا ہوتی رہتی تھی بہت نالاں تھے۔ وہ اب ان قیود کو توڑ کر آگے بڑھنا اور آزاد تجارت کے ذریعہ سے اپنا مستقل تعمیر کرنا چاہتے تھے۔

حکومتیں صنعتوں کی امداد کرنا چاہتی تھیں یہ بات بُری نہ تھی لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ایک طبقے کو فائدہ دوسرے طبقے کو نقصان پہونچائے بغیر نہیں پہونچا سکتی تھیں۔ ان کی اس صنعتی امداد سے جس طبقے کو نقصان پہونچتا تھا وہ حکومت کی اس پالیسی سے خوش نہ تھا، وہ اس پالیسی کے خلاف احتجاج کرتا رہتا تھا۔ ۱۶۶۰ء میں پرشیا کے باشندوں کو اون باہر بھیجنے کی اجازت نہیں دی گئی۔ یہ ممانعت صرف اس لئے کی گئی کہ کپڑے کے کارخانوں کو خام مال کی کمی نہ پڑے اور کم قیمت پر ضروری مال مہیا کیا جا سکے۔ کارخانوں کے مالکوں نے اس امتناعی حکم کو بہت پسند کیا لیکن ان لوگوں نے جو اون پیدا کرتے تھے اس حکم کے خلاف آواز اُٹھائی ۱۷۲۱ء میں انھوں نے ایک عرضداشت بادشاہ کی خدمت میں پیش کی اور مطالبہ کیا کہ یہ قانون منسوخ کر دیا جائے۔ ان کی عرضداشت کے الفاظ یہ ہیں :-

"کارخانہ دار تسلیم کرتے ہیں کہ اُن کے اسٹاک میں اون کی بڑی مقدار موجود ہے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ اس سال کی اُون کی پیداوار آدھی سے زیادہ نہ بک سکے گی۔ جناب والا نے صنعت کو فروغ دینے کے لئے محض اس خیال سے کہ کارخانہ داروں کو اون کی کمی نہ پڑے یہ فرمان نافذ فرمایا ہے، ہم جناب والا کے اس ارادہ کی نیکی کو محسوس کرتے ہیں لیکن جو لوگ بھیڑیں پالتے ہیں ان کی دشواریاں دن بدن بڑھ رہی ہیں۔ اُون کا اسٹاک بڑھتا چلا جا رہا ہے اور مال کے پڑے ہونے کی وجہ سے اُون اُس قیمت پر بکے گا جو یہ کارخانہ دار جن کو اب مال کی ضرورت نہیں ہے لگائیں گے۔ ملک کو اس قانونی تخفیف قیمت سے بہت نقصان پہنچ رہا ہے۔ اون کی قیمت اور بھی گر جائے گی اگر مال کے برآمد کرنے کی ممانعت بدستور قائم رہے گی۔ بھیڑوں پر جتنا خرچ ہو رہا ہے اُس سے کم آمدنی ہوتی ہے۔ بھیڑوں کے فارموں کے مالک اس تجارت کے مقابلے میں فارم کی مکمل تباہی میں اپنی نجات سمجھتے ہیں۔"

لیکن شاہ فریڈرک ولیم اول (FREDERICK WILLIAM I) نے اس عرضداشت پر کوئی توجہ نہ کی اور حکم دیا :-

"شاہ پرشیا یہ ضروری سمجھتے ہیں کہ اون کی برآمد پر پابندی بدستور قائم رہے۔ ہم کو تجربے سے معلوم ہوا ہے کہ دوسری سلطنتیں بھی (خاص طور سے انگلستان جس نے اون کی برآمد پر پابندی عائد کر رکھی ہے) اس سے نفع اٹھا رہی ہیں اور ان کے ملکوں کی دولت بڑھ رہی ہے۔"

ہو سکتا ہے شاہ پرشیا کی یہ رائے صحیح رہی ہو اور انگلستان واقعی مالدار ہو رہا ہو لیکن اُس زمانے کے تاجروں نے اس کی اس دلیل کو بے چون و چرا کبھی تسلیم نہ کیا ہو گا۔ ہم کو اچھی طرح معلوم ہے کہ تجارتی نظریۂ زر کے حامیوں نے جو پابندیاں عائد کرائی تھیں وہ انھیں کسی طرح پسند نہ تھیں۔ وہ چاہتے تھے کہ اُس نظام میں کچھ ایسی تبدیلیاں کی جائیں جو ان کی تجارت میں مددگار ثابت ہو سکیں۔ انھوں نے بھی بات چیت کرنے اور معاملہ سلجھانے کا وہی ڈھنگ سیکھ لیا تھا جو تجارتی نظریۂ زر کے حامیوں کا شعار رہا تھا۔ انھوں نے بھی کہنا شروع کیا کہ اگر ان کے دلائل قبول کر کے مطلوبہ تغیرات کر دیے جائیں تو ملک کی خوش حالی اور دولت میں بڑا اضافہ ہو جائے گا۔ یہ پرانی اور قابل معافی غلطی تھی۔ وہ بھی اپنے ذاتی مفاد کو ملک کے مفاد کا رنگ دے کر پیش کر رہے تھے۔ دارالعوام کے ۸ مئی ۱۸۲۰ء کے جرنل میں ان کے یہ دلائل جو انھوں نے آزاد تجارت کے لیے پیش کیے تھے۔ شائع ہوئے تھے :-

"لندن کے تاجروں کی ایک عرضداشت پیش ہوئی، اس عرضداشت میں کہا گیا ہے کہ بیرونی تجارت ملک کی خوش حالی اور دولت کی موجب ہوتی ہے۔ اس تجارت کے ذریعہ سے ہم غیر ممالک کی وہ تمام مصنوعات اور پیداوار جن کے لیے وہاں کی آب و ہوا سب سے زیادہ موزوں ہے اپنے بازاروں میں لے آتے ہیں اور ان کے بدلے میں اپنی وہ پیداوار اور مصنوعات جن کے لیے ہمارے ملک کی زمین اور آب و ہوا بہت موزوں ہے بھیجتے ہیں اور اس صورت سے اگر ہم تمام پابندیاں اُٹھا لیں تو بیرونی مال کی تجارت میں غیر معمولی ترقی ہو گی اور ہم اس قابل ہو سکیں گے کہ جس بازار میں

سب سے زیادہ سستا مال ملے خریدیں اور جہاں سب سے زیادہ مہنگا بک سکتا ہو فروخت کریں۔ یہی اصول جو ایک تاجر کی تجارت کی ترقی کے لئے مفید ہے دراصل کسی ملک اور قوم کی تجارت کے لئے بھی موزوں ہے۔ اگر یہ آسانیاں پیدا کر دی جائیں تو پوری دنیا میں سب اقوام آپس میں ایک دوسرے کے حقوق کا احترام کریں گی اور ہر ریاست میں دولت اور خوش حالی کا دور دورہ ہو جائے گا۔ اس وقت جو پابندیاں عائد ہیں دراصل ان کی بنیاد اس غلط مفروضہ پر ہے کہ اگر یہ پابندیاں اٹھا دی گئیں تو غیر ملکوں کی تجارت کو فروغ ہوگا اور ہماری تجارت اور مصنوعات کی پیداوار کو نقصان پہونچے گا اور اس طرح ہمارے کارخانہ داروں کی حوصلہ شکنی ہو گی اور وہ مال تیار نہ کریں گے۔ اگر یہ پالیسی جاری رہی تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہم پوری دنیا کی تجارت سے پوری طرح ہمیشہ کے لئے کٹ کر علیحدہ ہو جائیں گے۔"

آدم اسمتھ کی کتاب "قوموں کی دولت اور اس کی نوعیت کی تحقیق" ایک ایسی کتاب تھی جس نے عوام کے خیالات کو ایک مرتبہ اپنی طرف متوجہ کر لیا اور ایک ملک سے گذر کر دوسرے ملک میں اس کے طرز فکر کی اہمیت اپنی جگہ پیدا کرتی گئی۔ پرانے زمانے کے مصنفین صرف ہم سے یہ کہتے تھے کہ ریاست فلاں طریق کار اختیار کر کے دولت مند ہو سکتی ہے لیکن آدم اسمتھ نے ان مسائل پر غور کرنے کا طریقہ بدل دیا۔ اس نے ان وجوہ اور اسباب کی جستجو کی جو پیداوار کی زیادتی اور دولت کی تقسیم کا باعث ہوتے ہیں۔ "تجارتی نظریۂ زر" کے حامی خود اپنی اغراض پوری کرنا چاہتے تھے لیکن یہی بات گھما پھرا کر یوں کہتے تھے کہ ملک اپنا مفاد اس راہ پر چل کر حاصل کر سکتا ہے۔ اسمتھ نے ان کے دلائل کی تحلیل اور جہاں بین سے زیادہ دلچسپی لی اور حامیانِ نظریۂ زر کے طرزِ وکالت پر کوئی خاص توجہ نہیں کی اُس نے اصل معاملے پر بڑے علمی انداز سے نگاہ ڈالی۔ اُس نے اپنی کتاب کے ایک خاص باب میں نظریۂ زر کی تعلیمات سے بھی بحث کی اور اس کے کھوکھلے پن کو اچھی طرح کھول کر رکھ دیا۔

آدم اسمتھ سے پہلے بھی کچھ اہل قلم نظریۂ زر کی غلطیوں کا پردہ فاش کر چکے تھے۔ اُس زمانے میں بھی، جب یہ نظریہ لوگوں کے دماغوں پر چھایا ہوا تھا، ایسے ارباب فکر موجود تھے جو اس کے اصولوں پر نکتہ چینی کرتے رہتے تھے۔ شاید ہی نظریۂ زر کا کوئی ایسا حامی رہا ہو جس پر کسی خاص اہل قلم نے کڑی تنقید نہ کی ہو۔

سنہ ۱۶۹۰ء میں نکولس بیربن (NICHOLAS BARBON) نے اپنی کتاب "تجارت پر ایک گفتگو" (A DISCOURSE OF TRADE) میں محصولِ برآمد اور غیر ملکی مال کی برآمد کی ممانعت پر گفتگو کی ہے۔ وہ لکھتا ہے:-

تجارت کے معاملے میں امتناعی احکام اُس کی تباہی کا سبب ہیں، تمام غیر ملکی مال دیسی مصنوعات کے مبادلے میں آتا ہے اس لئے اگر غیرِ ملکی مال کی برآمد روک دی گئی تو دیسی مال کی پیداوار اور صنعت پر اثر پڑے گا، نہ وہ بنے گا اور نہ باہر بھیجا جائے گا۔ وہ کاریگر جو یہ مال تیار کرتے ہیں اور وہ تاجر جو اس کی تجارت کرتے ہیں اپنے کاروبار سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے۔"

سنہ ۱۶۹۱ء میں ڈڈلے نارتھ (DUDLEY NORTH) نے اپنی کتاب "تجارت پر بحث" (DISCOURSE ON TRADE) میں توازن تجارت (BALANCE OF TRADE) کے مشہور موضوع پر قلم اُٹھایا ہے اور اُس کی دھجیاں اڑا کر رکھ دی ہیں۔ وہ لکھتا ہے:-

کچھ بہت دن نہیں گذرے توازن تجارت پر لوگوں نے گلے پھاڑ پھاڑ کر گفتگو شروع کی ہے اور یہ خیال کیا جانے لگا ہے کہ اگر ہماری برآمد سے ہماری درآمد کم ہو تو ہم تباہ ہو جائیں گے یہ دعویٰ سن کر لوگ چونک پڑیں گے کہ پوری دنیا تجارت کے معاملے میں ایک قوم ہے اور دنیا کی اقوام ایک قوم کے افراد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ دنیا میں کوئی کاروبار عوام کے لئے غیر نفع بخش نہیں ہے۔ اگر کوئی ایسا کاروبار ہوگا تو عوام اسے خود چھوڑ دیں گے۔ کوئی قانون چیزوں کی قیمتیں مقرر نہیں کر سکتا۔ یہ قیمتیں اور شرحیں خود ہی مقرر ہوں گی اور تسلیم کر لی جائیں گی۔ جب قوانین بنائے جاتے ہیں اور زبردستی قابو حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی

نہ تو تجارت کی راہ میں دشواریاں پیدا ہوتی ہیں اور اس کو نقصان پہونچانے کا موجب بنتی ہیں۔"

اسی طرح جوزیف ٹکر (JOSEPH TUCKER) نے بھی "حامیان نظریۂ زر" کی اس پالیسی پر جس کے ماتحت بعض لوگوں کو بعض پیداواروں اور صنعتوں کے اجارے دیے جاتے تھے، بڑا شدید حملہ کیا۔ اس نے لکھا:۔

"ہمارے اجارے، پبلک کمپنیاں اور منشور آزاد تجارت کے لئے زہر ہیں اور اس کی تباہی کا موجب ہیں۔ اس صورت سے پوری قوم کی تجارت ختم ہو جائے گی اور مٹھی بھر لٹیرے ڈائرکٹروں کا پیٹ بھرنے کے لئے ہم کو دنیا کے تین چوتھائی رقبے کی تجارت سے محروم کر دیا جائے گا۔ یہ ڈائرکٹر جتنے مالدار ہوتے جاتے ہیں، عوام اتنے ہی غریب ہوتے جاتے ہیں۔"

ٹکر حامیان نظریۂ زر کی نوآبادیاتی پالیسی پر تنقید کرتے ہوئے لکھتا ہے:۔

"آئرلینڈ کی صنعت اور تجارت میں روڑے اٹکا کر ہم اپنی احمقانہ پالیسی اور اپنے غیر فطری حسد کا پردہ فاش کر رہے ہیں، ہمارا یہ طرز عمل توسیع تجارت کی راہ میں ایک بڑی روک بنا ہوا ہے اگر آئرلینڈ دولت مند ہو جاتا ہے تو نتیجہ کیا ہو گا؟ انگلستان کی دولت میں بھی اضافہ ہو گا اور فرانس اور زیادہ غریب ہو جائے گا۔ جو اون اس وقت چرا چھپا کر فرانس لے جایا جاتا ہے اور وہاں کے کارخانے اس کی مصنوعات تیار کر کے بازار میں بھیجتے ہیں تاکہ ہماری مصنوعات کا مقابلہ کریں، اگر یہی اون آئرلینڈ کے کارخانوں میں مصنوعات تیار کرنے میں صرف ہو تو آئرلینڈ کے شریف آدمیوں کی زمینوں کی آمدنی بڑھ جائے اور روپیہ گھوم پھر کر انگلستان آجائے۔"

ڈیوڈ ہیوم نے جو آدم اسمتھ کا دوست تھا ۱۷۵۲ء میں حامیانِ نظریۂ زر کے اس تصور کے متعلق جو انھوں نے چاندی اور سونے کے زبردست اسٹاک کی اہمیت کے متعلق قائم کیا تھا بہت کچھ لکھا ہے۔ اس نے ثابت کیا ہے کہ دولت کی بہتات کسی ملک کو کوئی مستقل فائدہ نہیں پہونچاتی ہے۔ اس کا خیال تھا کہ بین الاقوامی تجارت کے ذریعے سے ہر ملک، جو دھات کے سکے رکھتا ہے، سونے کی اتنی مقدار حاصل کرلے گا جو اس کی قیمتوں کو اس سطح پر لے آئے گی جو اس کی برآمد اور درآمد میں توازن

پیدا کرے ـــــ آخر ایسا کیوں کر ہوگا؟

تم کو یاد ہوگا کہ یہ زمانہ ہوا تسلیم کیا جا چکا ہے کہ قیمتوں کا گھٹنا بڑھنا زر کی اُس مقدار پر منحصر ہے جو بازار میں گشت کر رہی ہے۔ ہیوم اسی حقیقت پر اپنی بحث کی بنیاد رکھتے ہوئے کہتا ہے:۔

"کسی مملکت کے لئے روپیہ کا زیادہ یا کم ہونا کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا ہے۔ روپیہ اگر زیادہ مقدار میں گشت کر رہا ہوگا تو چیزوں کی قیمتیں بھی اُسی مناسبت سے کم ہو جائیں گی۔"

اگر کسی ملک میں چیزوں کی قیمتیں چڑھ جاتی ہیں تو کیا نتائج نکلتے ہیں؟ دوسرے ملکوں کے لوگ اس ملک کی چیزیں، ان کی قیمتیں چڑھ جانے کی وجہ سے کم خریدیں گے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ملک کی مصنوعات کی برآمد کم ہو جائے گی اور درآمد بڑھ جائے گی۔ اُس کو دوسرے ملکوں سے زیادہ سامان خریدنا پڑے گا لیکن وہ اُس سامان درآمد کے بدلے میں ان ملکوں کو اپنا سامان اُسی مقدار میں برآمد نہ کر سکے گا لیکن کسی نہ کسی طرح درآمد اور برآمد کا یہ فرق پورا ہی کرنا پڑے گا۔ یہ فرق نقد ادائگی کے ذریعہ سے پورا کیا جائے گا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ یہ دولت اُس ملک سے جس میں افراطِ زر کی وجہ سے قیمتیں چڑھ گئی تھیں دوسرے ملکوں کو درآمد اور برآمد کا فرق پورا کرنے کے لئے روانہ کرنی پڑے گی لیکن دولت کی یہ روانگی "افراطِ زر" کم کر دے گی اور چیزوں کی قیمتیں ایک مرتبہ پھر کم ہونے لگیں گی۔ اب دوسرے ممالک پھر سستا مال خریدنے آنے لگیں گے اور ملک کی برآمد پھر بڑھنے لگے گی اور یہ بڑھی ہوئی برآمد پھر درآمد سے متوازن ہو جائے گی۔ یہ صورت تو اُس وقت پیش آئی تھی جب افراطِ زر کی وجہ سے چیزوں کی قیمتیں چڑھ گئی تھیں۔ اگر کسی ملک میں گشت کرنے والے روپیہ کی مقدار میں کمی ہونے کی وجہ سے چیزوں کی قیمتیں کم ہو جائیں تو کیا ہوگا؟ اس صورت میں بھی نتائج وہی رہیں گے قیمتوں کی کمی کی صورت میں غیر ممالک مال سستا دیکھ کر زیادہ خریداری کریں گے اور ملک کی برآمد بڑھ جائے گی اور درآمد گھٹ جائے گی۔ اس حالت میں درآمد اور برآمد کا فرق نقد سکوں کی ادائگی سے پورا ہوگا۔ جب ملک کی دولت اس نقد ادائگی کی وجہ سے بہت بڑھ جائے گی تو افراطِ زر کی صورت میں چیزوں کی قیمتیں پھر بڑھنی شروع ہوں گی اور ملک کی برآمد پھر کم ہو جائے گی اور درآمد

اور برآمد کی قیمتوں کا فرق پورا کرنے کے لئے ہم کو پھر نقدادائگی کی فکر کرنی ہوگی۔

اوپر واقعہ کی چند سرخیاں بیان کی گئی ہیں لیکن واقعات اتنی آسانی سے اور سیدھے سادھے طریقے سے نہیں پیش آتے۔ ان کو ظہور پذیر ہونے کے لئے ایک بڑی مدت کی ضرورت ہوتی ہے لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ہیوم (HUME) نے تجارتی نظریۂ زر کے حامیوں کی اس رائے کا، کہ ملک میں قیمتی دھاتوں کی بڑی مقدار موجود رہنی چاہیئے، گمراہ کن ہونا پوری طرح ثابت کر دیا۔

تجارتی نظریۂ زر کی بنیاد پر بے شمار پابندیاں فرانس میں عائد کی گئی تھیں، اس لئے ان پابندیوں کے خلاف آواز بھی سب سے پہلے وہیں اٹھنی چاہیئے۔ فرانس کی صنعت اوامر و نواہی (MUSTS اور MUSTNOTS) کے ایک ایسے جال میں، جس کے اور چھور کا پتہ نہ تھا بندھی ہوئی تھی تفتیش کرنے والے افسروں کی ایک فوج تھی جو ان تکلیف دہ ضابطوں اور حکموں کی تعمیل پر اصرار کرتی رہتی تھی۔ ان حالات کے علم کے بعد یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ فرانس کی صنعت آخر زندہ کیسے رہی۔ پیشہ ور جماعتوں کے قواعد اور ضوابط بہت برے تھے، وہ جاری رہے یا ان کی جگہ پر حکومت نے کچھ اور قواعد جو اُن سے بھی زیادہ باریک تھے نافذ کر دیے۔ یہ قواعد و ضوابط صرف فرانس کی صنعت کی ترقی اور اُس کی حفاظت کے لئے بنتے رہتے تھے۔ بعض حالات میں ان سے فائدہ بھی ہوتا تھا لیکن اس وقت بھی جب ان قوانین کی مصلحت اندیشی میں کوئی شبہ نہیں ہوتا تھا یہ کارخانہ داروں کے لئے تکلیف دہ ثابت ہوتے تھے۔ کیا کپڑے کا کوئی کارخانہ دار جس طرح کے کپڑے چاہتا بنوا سکتا تھا؟ نہیں وہ پابند تھا کہ اس قسم کا کپڑا اور اتنا لمبا تیار کرے۔ ایک ٹوپیوں کا کارخانہ دار کیا عوام کی طلب اور پسند کا لحاظ کرکے کوئی ٹوپی جو اود بلاؤ کی کھال، پوستین اور اون سے تیار کی جاتی، بنا سکتا تھا؟ نہیں۔ وہ یا تو اود بلاؤ کی کھال کی ٹوپی بناتا یا صرف اون کی۔ اس کے سوا اور کسی قسم کی ٹوپی تیار کرنے کا اُسے اختیار نہ تھا۔ کیا کوئی کارخانہ دار اپنی مصنوعات کی تیاری میں زیادہ اچھے قسم کا اون لگا سکتا تھا؟ نہیں۔ وہ اپنے اختیار سے ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ اوزاروں کے سائز اور ان کی شکل بھی حکومت کی طرف سے مقرر تھی۔ انسپکٹر جو ان کی دیکھ بھال کے لئے مقرر تھے، دیکھتے رہتے تھے کہ ہدایات پر پوری طرح عمل ہو رہا ہے یا نہیں۔

اس انتہا پسندی اور شدت کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے خلاف لوگوں کے دماغوں میں خیالات پرورش پانے لگے صنعتوں پر قابو رکھنے کی انتہائی کوششیں کی جا چکی تھیں اور پابندیوں کی آخری حد ہو چکی تھی اس لئے اب ان پابندیوں سے آزادی کا مطالبہ ایک قدرتی ردعمل تھا۔ گارنے (GOURNEY) ان لوگوں میں تھا جنھوں نے سب سے پہلے ہر قسم کے کنٹرول ہٹانے کا مطالبہ شروع کیا یہ ایک فرانسیسی تاجر تھا۔ فرانس کے مشہور وزیر مالیات ٹرگٹ (TURGOT) نے اُس کے متعلق لکھا ہے:۔

"اُس کو یہ معلوم کر کے بہت تعجب ہوا کہ فرانس کا کوئی شہری نہ کوئی چیز تیار کر سکتا اور نہ بیچ سکتا ہے تاوقتیکہ وہ ایک لمبی رقم خرچ کر کے کارپوریشن کا ممبر نہ بن چکا ہو۔ اُس کی سمجھ میں یہ بات نہ آتی تھی کہ ایک ایسی مملکت جہاں تخت نشینی کا مسئلہ ابھی تک دستور اور رسم کے مطابق طے ہوتا ہو ایک بادشاہ اپنی جگہ سے نیچے اتر کر ایسے فرمان نافذ کرے گا جن کے بموجب کپڑوں کی لمبائی چوڑائی تک حکومت کی طرف سے مقرر ہو جایا کرے گی اور یہ بھی طے ہو جایا کرے گا کہ اس کپڑے میں کتنے نمبر کا سوت استعمال کیا جا سکے گا اور ان قوانین کی اتنی کثرت ہو جائے گی کہ چار موٹے موٹے دفتر ان ہدایات کی تفصیلات سے بھر جائیں گے۔ یہ بات بھی اُس کے لئے ناقابل فہم تھی کہ اجارہ داری کی ذہنیت اتنے لاتعداد قوانین کی منظوری اور نفاذ کا موجب ہو سکتی ہے اس کو اس بات پر بھی کچھ کم تعجب نہ تھا کہ حکومت ہر چیز کی قیمت مقرر کرتی ہے بعض چیزوں کو اپنی امان اور حفاظت کی ذمہ داری سے خارج کر کے دوسری اشیاء کی تجارت کو پھلنے پھولنے کا موقع دیتی ہے۔ وہ یہ بھی نہیں سمجھ پاتا تھا کہ کسان کی حالت عام شہریوں سے بھی زیادہ بگاڑ کر اور اُسے اپنے مستقبل کی طرف سے بالکل غیر مطمئن کر کے پیداوار کی بہتات کا کیسے یقین کیا جا سکتا ہے۔"

گارنے قواعد و ضوابط کے اس لمبے سلسلے سے گھبرا گیا تھا اُس کی آرزو تھی کہ فرانس ان کی گرفت سے آزاد ہو جائے۔ اس نے ایک فقرہ ڈھالا۔ یہ فقرہ ان تمام جماعتوں کا نعرہ بن گیا، جو اس قسم کی پابندیوں کے خلاف آواز اٹھا رہی تھیں۔ گارنے کا فقرہ تھا "ہم کو تنہا چھوڑ دو" (LAISSEZ FAIRE)

"تم کو تنہا چھوڑ دو" ان لوگوں کا بھی نعرہ بن گیا جو فرانس میں "قدرتی حکومت (PHYSIOC RACY) کے نظریہ کی تبلیغ کر رہے تھے۔ ان کا زمانہ بھی وہی تھا جو گارنے کا تھا۔ یہ جماعت بہت اہم تھی۔ انھوں نے معاشئین کا ادارہ (SCHOOL OF ECONOMISTS) قائم کیا۔ یہ لوگ ۱۷۵۷ء کی ابتدا میں فرانسیس کوئیسنے (FRANCOIS QUESNAY) کی رہنمائی میں باقاعدہ اکٹھا ہو کر معاشی مسئلوں پر بحث کیا کرتے تھے۔ اس ادارے کے ارکان نے ان پابندیوں کے خلاف آواز بلند کی اور اپنی رائے ظاہر کرنے کے لئے ان مسائل پر بہت سی کتابیں لکھیں اور اپنے مضامین میں آزاد تجارت کی حمایت کی۔

بیڈن (BADEN) کے حکمراں کارل فریڈرک نے ۱۷۷۰ء میں قدرتی حکومت کے نظریہ کے مشہور حامی میرابو (MIRABEAU) سے درخواست کی کہ اسے اس کی سلطنت کے انتظام کے لئے کچھ مفید صلاحیں دے۔ میرابو نے کہا:-

> "اپنی رعایا کو سب سے پہلے آزاد بندرگاہ اور آزاد میلے عطا کرو اور اپنے پیارے نام کے بعد یہ تین لفظ اس طرح لکھوا کر آویزاں کرادو کہ تمہاری زمین پر قدم رکھتے ہی ان پر نگاہ پڑے
>
> آزادی، حفاظت اور حریت
>
> تمہاری ریاست بہت جلد آباد ہو جائے گی، تجارت کی قدرتی شاہراہ بن جائے گی اور تمام لوگوں کے ملنے کا ایک بین الاقوامی مقام ہو جائے گی۔"

فطری حکومت کے نظریے کے حامی (PHYSIOCRATS) آزاد تجارت کے عقیدے تک ذرا گھوم پھر کر پہونچتے تھے۔ وہ نجی ملکیت کی حرمت کے قائل تھے، وہ نجی ملکیت جو زمین سے تعلق رکھتی تھی ان کے نزدیک زیادہ اہم تھی۔ وہ ذاتی ملکیت کے قائل تھے اس لئے وہ ذاتی آزادی کے بھی حامی تھے اور ہر شخص کو مختار سمجھتے تھے کہ اپنی ملکیت کا جس طرح چاہے، دوسرے کو نقصان پہونچائے بغیر استعمال کرے۔ وہ آزاد تجارت کے حامی تھے اور کاشتکاروں کو پوری طرح حق دینا چاہتے تھے کہ اپنی زمینوں پر جو کچھ چاہیں اپنی خوشی سے پیدا کریں۔ اس زمانے میں فرانس سے غلے کی کوئی مقدار محصول ادا کئے بغیر باہر نہیں بھیجی جا سکتی تھی۔ اندرون ملک میں بھی اس کو ایک حصے سے

دوسرے حصے میں منتقل کرنے کے لیے محصول ادا کرنے کی پابندی تھی، بالکل اُسی طرح جیسے نیو جرسے (NEWUERSEY) کا کاشتکار اپنی سبزی محصول ادا کئے بغیر نیو یارک نہیں بھیج سکتا تھا۔ قدرتی حکومت کے نظریے کے حامی ان پابندیوں کو درست نہیں سمجھتے تھے۔ مرسیر ڈی لاریویر (MERCIER-DE LA RIVIERE) نے جس نے فطری حکومت کے نظریے کے ماننے والوں کے عقائد پر ایک عمدہ کتاب لکھی ہے لکھا ہے کہ نجی جائداد کے حق کے پورے استعمال کے لئے مکمل آزادی ایک بنیادی شرط ہے۔ وہ لکھتا ہے :-

"بڑی آزادی کے بغیر بڑی پیداوار کا تصور بے معنی ہے کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ ایک حق جس کے استعمال کرنے کی آزادی نہ ہو حق ہی نہیں ہے؟ اس لئے جائداد کے حق کا تصور بھی آزادی کے بغیر نہیں کیا جا سکتا۔ آدمی اُس وقت تک کوئی چیز پیدا نہیں کر سکتا جب تک اس کو اس سے فائدہ اُٹھانے اور اُسے استعمال کرنے کا حق نہ ہو۔ فائدہ اُٹھانے اور استعمال کرنے کی آرزو بے معنی ہو جاتی ہے اگر ہم سے فائدہ اُٹھانے اور استعمال کرنے کی آزادی چھین لی جائے۔

قدرتی نظریۂ حکومت کے حامی ہر مسئلہ پر صرف اس نقطۂ نظر سے غور کرتے تھے کہ اس کا اثر زراعت پر کیا ہوگا۔ وہ لکھتے تھے کہ صرف زمین ہی پیدائش دولت کا واحد ذریعہ ہے اور جو محنت ان زمینوں پر صرف کی جاتی ہے صرف وہی "پیدا کرنے والی محنت" ہے۔ میرابو نے کارل فیڈرک کو لکھا تھا:-

"ہمارے کسان جوتنے بونے والے کی حیثیت سے، اپنے آپ کو پیدا کرنے والی محنت کے لئے وقف کر دیتے ہیں اور یہ وہی محنت ہے جس سے ہم مصارف وضع کرنے کے بعد نفع حاصل کرتے ہیں۔ ایک بننے والے کی حیثیت سے وہ ایک بے ثمر کام کرتا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں وہ مجموعی حیثیت سے ایک مفید کام کر رہا ہے لیکن اپنی اس محنت سے وہ کچھ پیدا نہیں کر رہا۔"

فطری حکومت کے نظریے کے حامیوں کے نزدیک صرف زراعت ہی وہ خام مال پیدا کرتی ہے جو صنعت اور تجارت میں کھپتا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں دستکار اس خام مال کو ایک مکمل شکل عطا کرتے ہیں لیکن اپنے اس عمل سے وہ دولت کے ذخیرے میں کسی قسم کا کوئی اضافہ نہیں کر رہے

ہیں۔ دستکار کی محنت کے بعد اُس خام مال کی قیمت ضرور بڑھ گئی لیکن یہ قیمت اتنی ہی بڑھی جتنی دستکار کی محنت کی قیمت تھی لیکن اس قیمت کے اضافے سے دولت میں کوئی اضافہ نہیں ہوا لیکن زراعت میں ایسا نہیں ہوتا۔ اس لئے ان کے نزدیک صنعت اپنی جگہ پر عقیم تھی اور زراعت ثمردار قدرت کی فیاضی سے زرعی محنت کی قیمت جو مالک کو ملتی ہے اور نفع کے علاوہ بھی دولت میں کچھ خاص اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ یہ اضافہ موسم کی تبدیلی سے ہر سال گھٹتا بڑھتا رہتا ہے۔

آج کل کے ماہرین اقتصادیات، فطری حکومت کے پرستاروں سے اکثر مسئلوں پر اتفاق نہیں کر سکتے لیکن ان کی یہ بات انھوں نے بھی مان لی ہے کہ قوم کی دولت مصنوعات کے ڈھیر کی مجموعی قیمت نہیں ہے بلکہ اُس کی آمدنی ہے جو ایک ٹھہری ہوئی (STOCK) چیز نہیں ہے بلکہ ایک بہتا ہوا (FLOW) دھارا ہے۔

آدم اسمتھ نے فطری حکومت کے نظریوں پر لکھا ہے :۔

"یہ نظام اپنی ناتمامیوں کے باوجود حقیقت سے قریب تر ہے۔ اس سے پہلے اب تک اقتصادیات پر جو کچھ چھپ چکا ہے اُس میں یہ نظریہ سب سے بہتر ہے۔ اگرچہ اُس محنت کی ترجمانی، جو اس زمین پر پیدا کرنے والی محنت کی حیثیت سے صرف کی جاتی ہے پوری طرح نہیں کی گئی ہے لیکن قومی دولت کے باب میں ان کا یہ خیال کہ قوم کی دولت ناقابل استعمال سونے چاندی کے ڈھیر نہیں ہیں بلکہ وہ قابل استعمال چیزیں ہیں جو ہر سال بار بار سماج کی محنت سے پیدا ہوتی رہتی ہیں، اپنی جگہ پر درست ہے۔ مکمل آزادی کی حمایت اس حیثیت سے کہ یہی ایک چیز انسان کے حوصلے کو سالانہ پیداوار کے لئے آمادہ کر سکتی ہے، بالکل صحیح ہے۔ ان تمام باتوں کے پیش نظر اس کی تعلیمات ہر حیثیت سے منصفانہ، فیاضانہ اور آزادانہ معلوم ہوتی ہیں۔"

فطری حکومت کے حامیوں نے آدم اسمتھ سے پہلے مکمل آزادی کی تبلیغ شروع کر دی تھی لیکن آدم اسمتھ کے خیالات کا اثر ان لوگوں سے زیادہ پڑا۔ اُس کی کتاب قوموں کی دولت کے کئی ایڈیشن شائع ہوئے اور اُس کی زندگی میں اور اُس کے بعد اُس کی تعلیمات کا مطالعہ عام رہا۔ تجارتی نظریۂ زر

جن لوگوں کی ضرب کاری سے اپنے انجام کو پہونچا ان میں آدم اسمتھ کا نام ہمیشہ سرفہرست رہے گا، اُس نے زر پرستوں (BULLIONISTS) کے دلائل کا اس طرح ابطال کیا:۔

"جن ملکوں میں کانیں نہیں ہیں وہ بلاشبہ اپنی ضرورت کا سونا اور چاندی غیر ملکوں سے برآمد کریں گے۔ بالکل اسی طرح جس طرح وہ ممالک جن میں انگور کے باغات نہیں ہیں اپنی ضرورت کی شراب غیر ملکوں سے منگائیں گے، یہ کسی طرح ضروری نہیں معلوم ہوتا کہ کسی ملک کی حکومت کی توجہ ایک چیز کو چھوڑ کر دوسری چیز کی طرف بہت بڑھ جائے۔ ایک ملک جس کے پاس شراب خریدنے کے ذرائع ہیں، وہ جب موقع دیکھے گی شراب ضرور خریدے گی لیکن جس ملک کے پاس سونا اور چاندی خریدنے کے وسائل ہیں اُس کو ان دھاتوں کی کبھی ضرورت نہ پڑے گی۔ یہ چیزیں بھی خاص قیمتوں پر دوسری چیزوں کی طرح خریدی جاسکتی ہیں"

اُس نے نظریۂ زر کے حامیوں کی پالیسی پر جو انھوں نے نوآبادیات کے متعلق اختیار کر رکھی تھی لکھا:۔

نوآبادیات کی تجارت کی اجارہ داری نے بھی، نظریۂ زر کے حامیوں کی دوسری ناپاک تدبیروں کی طرح، دوسرے عام ملکوں کی صنعت پر ضرب کاری لگائی لیکن نوآبادیات پر تو اس کا اثر بہت مہلک ہوا جن کی ترقی کے لئے یہ ادارے قائم کئے گئے درحقیقت انھیں ملکوں کی تجارت بڑھنے کے بجائے سب سے زیادہ تباہ ہوئی"

اسمتھ کی کتاب کے ابتدائی جملے آزاد تجارت کی تائید میں لکھے گئے ہیں۔ وہ ہم کو سمجھاتا ہے:۔

مزدوروں کی محنت کی بارآوری کی بڑی وجہ کاموں کی تقسیم معلوم ہوتی ہے"

اسمتھ نے تقسیم کار (DIVISION OF LABOUR) سے ۱۷۷۶ء میں وہی مراد لیا تھا جو ہم اس زمانے میں مراد لیتے ہیں۔ وہ تقسیم کار کے لفظ کو مہارت خصوصی کے معنی میں استعمال کرتا تھا۔ اس کی مراد یہ تھی کہ ایک آدمی کو ایک خاص کام میں زیادہ عرصے تک لگایا جاتا تاکہ وہ اس کام میں خاص مہارت اور تجربہ حاصل کرلیتا۔ وہ ایک مثال دے کر سمجھاتا ہے:۔

"پن سازی کی معمولی مثال لو۔ یہ بڑی حقیر صنعت ہے لیکن اس میں تقسیم کار اکثر پوری طرح نمایاں نظر آتی ہے۔ ایک آدمی جو اس صنعت کی تعلیم سے بے بہرہ ہے اور اس مشین کے استعمال سے بھی ناواقف ہے جو پن سازی کے لئے استعمال کی جاتی ہے شاید پورے دن میں ایک پن بھی نہ بنا سکے اگر وہ اپنی مزاجی صناعی سے ایک آدھ بنا بھی لے تو بیس پنیں تو ہرگز نہ بنا سکے گا لیکن آج کل یہ صنعت ایک خاص طریقے سے چلائی جا رہی ہے۔ اس کی بہت سی شاخیں کر دی جاتی ہیں۔ ایک آدمی تار کھینچتا ہے۔ دوسرا اُسے سیدھا کرتا ہے، تیسرا اُسے کاٹتا ہے، چوتھا اُس میں نوک بناتا ہے پانچواں اُس کے کنارے کو چپٹا کرتا ہے تاکہ اس پر گھنڈی لگائی جا سکے۔ گھنڈی بنانے کیلئے دو تین خاص کاموں کی ضرورت پڑتی ہے۔ اس گھنڈی کو پن پر چپاں کرنا ایک خاص کام ہے پن پر جلا کرنا بھی ایک علیحدہ صنعت ہے۔ ان تیار آلپینوں کو کاغذ میں لپیٹنا بھی ایک علیحدہ کام ہے۔ اس طرح پن سازی کی معمولی صنعت اٹھارہ نمایاں اور مستقل شاخوں میں بٹی ہوئی ہے بعض کارخانوں میں یہ سب کام علیحدہ علیحدہ کاریگر کرتے ہیں اور بعض کارخانوں میں ایک آدمی دو دو تین تین شاخوں کا کام سنبھالتا ہے۔ میں نے پن سازی کا ایک چھوٹا سا کارخانہ دیکھا ہے۔ اس میں صرف دس آدمی کام کرتے تھے اور ہر شخص دو دو تین تین شاخوں کا کام سنبھالے ہوئے تھا۔ یہ لوگ اس صنعت میں پوری مہارت حاصل کرنے کے بعد ایک دن میں بارہ پونڈ آلپینیں تیار کرتے ہیں۔ ایک پونڈ میں درمیانی قد وقامت کی چار ہزار سے زیادہ آلپینیں ہوتی ہیں۔ دس آدمی جو اس کارخانہ میں کام کرتے تھے دن بھر میں اڑتالیس ہزار آلپینیں بناتے تھے۔ اس طرح ہر آدمی دن بھر میں چار ہزار آٹھ سو آلپینیں تیار کرتا تھا اگر یہ سب لوگ علیحدہ علیحدہ کام کرتے اور تقسیم کار کے اصول پر ایک دوسرے کی معاونت سے کنارہ کش ہوتے اور ان میں سے کوئی شخص پن سازی کے کام میں ماہر بھی نہ ہوتا تو بیس آلپینوں کا تو کیا ذکر ہے وہ شاید دن بھر میں ایک آلپین بھی تیار نہ کر سکتے۔"

اگر ہم آدم اسمتھ کی یہ رائے مان بھی لیں کہ تقسیم کار آدمی میں مہارت پیدا کرتی ہے، دقت

بچاتی ہے، کارگردگی کی طاقت بڑھاتی ہے اور اس طرح محنت کی بارآوری میں اضافہ کرتی ہے تو ان تمام باتوں کا آزاد تجارت سے کیا تعلق ہے؟

بلاشبہ یہ تمام باتیں آزاد تجارت سے بہت گہرا تعلق رکھتی ہیں آدم اسمتھ کہتا ہے کہ:۔

تقسیم کار پر بازار کی وسعت کا بڑا اثر پڑتا ہے۔ مبادلے کا اختیار تقسیم کار کے لئے گنجائش پیدا کرتا ہے۔ اس لئے اس تقسیم کار کی وسعت، اس اختیار کی وسعت کی پابند ہوگی اسی بات کو ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ بازار کی وسعت تقسیم کار کی وسعت پر اثر انداز ہوگی۔ اگر بازار چھوٹا اور محدود ہے تو کسی شخص کو یہ حوصلہ نہ ہوگا کہ وہ اپنے آپ کو کسی ایک کاروبار میں لگائے رکھے۔ اس چھوٹے سے بازار میں یہ گنجائش ہی نہ ہوگی کہ وہ کسی چیز کی مزید پیداوار کے لئے جو اس کی ذاتی ضرورت سے زیادہ ہے کسی ایسی چیز سے جس کی اس کو ضرورت ہے مبادلے کی سبیل نکال سکے،،

اگر پیدا کرنے کی طاقت تقسیم کار کی وجہ سے بڑھی ہے اور یہ تقسیم کار بھی بازار کی وسعت کی مناسبت سے عمل میں آئی ہے تو بازار جتنا زیادہ وسیع ہوگا اسی قدر تقسیم کار کا حلقہ بھی بڑا ہوگا اسی قدر پیداوار کی طاقت میں بھی اضافہ ہوگا اور قوم کی دولت میں بھی اسی قدر زیادتی ہوگی۔ آزاد تجارت بازار کو بے اندازہ وسعت عطا کرتی ہے اس لئے تقسیم کار کے لئے بھی بے انتہا گنجائش نکل آتی ہے اور پیدا کرنے کی طاقت (PRODUCTIVITY) بھی اسی مناسبت سے بہت بڑھ جاتی ہے، اس لئے قوم کی دولت بڑھانے کے لئے تجارت کی آزادی بہت ضروری ہے۔

یہ بحث کسی حد تک الجھی ہوئی ہے اس کو تم آسانی سے یوں بھی سمجھ سکتے ہو۔

۱۔ پیداوار کی طاقت تقسیم کار سے بڑھتی ہے

۲۔ تقسیم کار بازار کی تحدید اور توسیع کے بموجب گھٹتی بڑھتی رہتی ہے

۳۔ بازار آزاد تجارت کی وجہ سے بے انتہا وسعت اختیار کرتا ہے اس لئے آزاد تجارت پیدا کرنے کی طاقت میں اضافے کی موجب ہوتی ہے۔

ایک بات اور غور کرنے کے لائق ہے۔ مختلف ملکوں کے درمیان آزاد تجارت بڑے پیمانے پر تقسیم کار ہی کی ایک شکل ہے۔ آدم اسمتھ نے پن سازی کی جس فیکٹری کا ذکر کیا ہے، بالکل اُسی فیکٹری کے انداز پر پوری دنیا میں تقسیم کار کا یہ عمل جاری ہے۔ آزاد تجارت ہر ملک کو آمادہ کرتی ہے کہ کسی خاص چیز کے بنانے میں پوری مہارت پیدا کرے اور اچھا سے اچھا مال کم سے کم قیمت پر دنیا کے بازاروں میں بھیجے اور اس صورت سے دنیا کی مجموعی دولت میں اضافہ کرے۔

ہم نے آدم اسمتھ کا تعارف نظریۂ زر کے باغی کی حیثیت سے کرایا تھا، آؤ یہ بھی دیکھیں کہ وہ صنعتوں میں دخل اندازی کے متعلق کیا رائے رکھتا ہے۔ وہ حکومتوں کی اس دخل اندازی کی پالیسی کو بہت بُرا کہتا ہے اور صنعت کے لئے بھی آزادی کا مطالبہ کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے۔

"ہر وہ نظام جو کچھ خاص صنعتوں کی حوصلہ افزائی کے لئے سماج کے سرمایے کے ایک بڑے حصے کو جو عام حالات میں اُس کی طرف نہ جاتا اُس کی طرف منتقل کرتا ہے یا خاص احکام امتناعی کے ذریعہ سے سرمایے کے ایک حصے کو ایک خاص صنعت میں جانے سے روکتا ہے، حالانکہ وہ قدرتی انداز پر اُس کی طرف جاتا، درحقیقت اُسی مقصد کا دشمن ہے جس کی ترقی اور بقا کا وہ دم بھرتا ہے۔ ایسا نظام سماج کو دولت اور عظمت کی طرف لے جانے کے بجائے پیچھے ہٹا کر اُس سے اور دور کر دیتا ہے۔ اُس کی محنت اور زمین کی سالانہ پیداوار کو بڑھانے کے بجائے گھٹاتا اور اُس کی قیمت کم کرتا ہے۔"

اگر یہ ترجیحی اور امتناعی نظام ہمیشہ کے لئے بالکل ختم کر دیا جائے تو قدرتی آزادی کا سیدھا سادھا نظام خود بخود اُس کی جگہ لے لے گا، ہر شخص جب تک وہ عدل وانصاف کے قوانین میں مخل نہ ہو بالکل آزاد ہے جس طرح چاہے اپنے مفاد کے لئے اپنے طرز پر جد وجہد کرے اور اپنی صناعی اور سرمائے سے دوسرے لوگوں یا جماعتوں کا مقابلہ کرے۔"

اوپر دیئے ہوئے اقتباس کے آخری جملے پڑھو اور غور کرو کہ آدم اسمتھ کی کتاب اُس زمانے میں جب "تاجران بے پناہ پابندیوں سے چھوٹنے کے لئے ہاتھ پیر ہلا رہے تھے آسمانی صحیفہ کیوں بن گئی؟

پُرانا نظام بدلتا ہے

تم ایسی حکومت کو کیا کہو گے جو غریبوں سے تو ٹیکس وصول کرتی ہو لیکن امیروں کو چھوڑ دیتی ہو؛ تم پہلے تو ایسی حکومت کو اپنے دل میں سودائی سمجھو گے لیکن کچھ سوچ کر یاد کرو گے کہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کا بھی کسی حد تک ایسا ہی دستور ہے۔ تم کو بہت سے ایسے لوگ ملیں گے جو تم سے اس مسئلہ پر بحث کریں گے کچھ لوگ ایسے بھی ہوں گے جو یہ ثابت کرنے کی کوشش کریں گے کہ امریکہ کا دولتمند طبقہ اپنے حصے کے محصول سے کہیں زیادہ دوسرے طریقوں سے بھی ادا کرتا ہے۔ لیکن اٹھارھویں صدی عیسوی کے فرانس کی بحث کے لئے کیا کہا جائے گا جو صرف غریبوں پر ٹیکس عائد کرتی تھی اور امیروں کو بالکل چھوتی ہی نہ تھی۔

فرانس کی حکومت کو اپنی صفائی کے لئے کوئی وکیل نہ ملے گا۔ اُس وقت کے امتیازی طبقوں (PRIVILEGED) نے خود تسلیم کر لیا تھا کہ وہ عملی طور پر اپنے زمانے میں ہر محصول سے مستثنیٰ تھے۔ اربابِ کلیسا اور طبقۂ امرا نے اپنا خیال صاف صاف ظاہر کر دیا تھا کہ اگر ان پر بھی ویسے ہی محصول عائد کئے گئے جیسے عوام پر عائد کئے جاتے ہیں تو فرانس بالکل تباہ ہو جائے گا۔

جب فرانس کی حکومت کی مالی حالت بہت خراب ہو گئی۔ اُس کے مصارف اُس کی آمدنی کی حدود سے آگے بڑھ گئے تو بعض فرانسیسی مدبرین نے سوچا کہ اگر ہم اس امتیازی طبقے سے بھی عوام ہی کی طرح محصول وصول کریں تو یہ دشواری حل ہو جائے گی۔ ٹرگٹ (TURGOT) نے جو ۱۷۷۶ء میں فرانس کا وزیر مال تھا بعض بہت ضروری اصلاحیں نافذ کرنی چاہیں لیکن ان ممتاز طبقوں نے اُس کی ایک نہ چلنے دی۔ انھوں نے پیرس میں پارلیمنٹ کو گھیرا اور صاف صاف الفاظ میں

اپنے حقوق کی حفاظت کے لئے حسب ذیل فرمان نافذ کرالیا :-

"انصاف کا سب سے پہلا اصول یہ ہے کہ کسی شخص سے وہ چیزیں نہ چھینی جائیں جو اُس کی ملکیت ہیں۔ اس قاعدے میں صرف جائدادیں ہی نہیں آتی ہیں بلکہ وہ حقوق بھی آتے ہیں جو کسی شخص کو اپنی پیدائش اور حیثیت کی وجہ سے حاصل ہیں اس لئے انصاف اور عدالت کے اس قانون کی نگاہ میں ہر وہ نظام جو انصاف اور نیکی کی آڑ لے کر فرائض میں مساوات پیدا کرانا چاہے گا اور تمام طبقاتی امتیازات کے خاتمے کا موجب ہوگا، یقیناً بد امنی کی طرف جو مساوات کا لازمی نتیجہ ہے، لے جائے گا اور شہری آبادی کی تباہی کا موجب ہوگا۔ فرانسیسی شہنشاہی اپنے دستور کے مطابق چند ممتاز طبقوں پر مشتمل ہے۔ ارباب کلیسا کے سپرد تعلیمی اور مذہبی خدمات ہیں، امرائ حکومت کی حفاظت کے لئے اپنی جانیں وقف کر چکے ہیں اور اپنے شہنشاہ کو اپنے مشوروں سے مدد دیتے ہیں۔ نیچے کا طبقہ، جو بادشاہ کی خدمت میں کسی امتیازی فرض کی بجا آوری کے لائق نہیں ہے، خراج، اپنی کاریگری اور جسمانی محنت پیش کر کے اپنے آپ کو خدمات سے بری کراتا ہے۔ ان امتیازات کو ہٹانا دراصل فرانسیسی دستور کی دھجیاں اُڑانا ہے۔"

ارباب کلیسا اور امراء کے طبقے امتیازی حقوق کے مالک تھے۔ یہ دونوں طبقے بالترتیب پہلی اور دوسری جماعت (FIRST AND SECOND ESTATES) کہلاتے تھے۔ ارباب کلیسا کی آبادی ایک لاکھ تیس ہزار افراد پر مشتمل تھی اور طبقۂ امراء کی تعداد ایک لاکھ چالیس ہزار تھی یہ ممتاز طبقے تھے۔ ان میں غریب بھی تھے اور امیر بھی لیکن یہ کوئی کام نہیں کرتے تھے۔ غریب پادری بھی تھے اور امیر بھی اور مالدار بشپ بھی تھے اور بے انتہا دولتمند امراء بھی سخت کام کرنے والے پادریوں اور امیروں کی بھی کمی نہ تھی اور کاہل مذہبی رہنماؤں اور امیروں کا بھی کال نہ تھا۔

عوام ایک ایسے طبقے سے تعلق رکھتے تھے جس کو کوئی امتیازی حق حاصل نہ تھا۔ ان کو تیسری جماعت (THIRD ESTATE) کہتے تھے۔ فرانس کی ڈھائی کروڑ آبادی میں ان کی تعداد پچانوے فی صدی تھی۔ اس طبقۂ عوام میں بھی، اوپر کے دونوں طبقوں کی طرح دولت اور رہن سہن کے طریقوں میں

فرق تھا۔ اس تیسری جماعت کا اوپری طبقہ (UPPER MIDDLE CLASS) یا بورژوا (BOURGEOISIE) اس طبقے کے باقی لوگوں کے مقابلے میں خوشحال تھا۔ اسی جماعت کا دوسرا طبقہ دستکاروں پر مشتمل تھا۔ یہ لوگ شہروں اور دیہاتوں میں رہا کرتے تھے، ان کی تعداد چھبیس لاکھ تھی۔ باقی دو کروڑ بیس لاکھ افراد کسان تھے اور اپنے کھیتوں میں کام کیا کرتے تھے۔ یہ حکومت کو محصول ادا کیا کرتے تھے۔ کلیسا کو عشر (TITHES) دیتے تھے اور امرا کے جاگیردارانہ مطالبات پورے کرتے رہتے تھے۔

ہم نے اور تم نے اپنی زندگیاں کچھ اس طرح ڈھال لی ہیں کہ ہمارے مصارف ہماری آمدنی سے زیادہ نہیں ہونے پاتے۔ حکومتیں بھی زیادہ تر ایسا ہی کرنے کی کوششیں کرتی ہیں لیکن اٹھارھویں صدی عیسوی میں فرانس کی حکومت کے سوچنے کا انداز بالکل نرالا تھا۔ وہ احمقانہ طریقے سے اپنا خزانہ بغیر کچھ سوچے سمجھے ہوئے بے ترتیبی اور بداطواری سے لٹاتی رہتی تھی۔ ایک مثال اس الزام کے ثبوت کے لئے کافی ہوگی۔

فرانس میں ایک سُرخ کتاب رہتی تھی۔ اس میں ان تمام لوگوں کے نام درج رہتے تھے جو حکومت سے پنشن پاتے تھے۔ اس رجسٹر میں ڈکرسٹ (DUCREST) بار بر کا نام بھی لکھا ہوا ہے۔ اُس کو آخر ایک ہزار سات سو لور سالانہ پنشن کیوں ملتی تھی؟

وہ کومٹے ڈی آرٹوائس (COMTE D, ARTOIS) کی لڑکی کے بال تراشنے پر مامور ہوا تھا۔ وہ لڑکی ابتدائی عمر میں جب اُس کے بال تراشے جانے کا وقت بھی نہیں آیا تھا مر گئی لیکن ڈکرسٹ اپنی پنشن پاتا رہا۔

یہ اُس دیوانہ پن کی ایک مثال تھی جو فرانس کی مالیات کی تباہی کا موجب ہو رہا تھا۔ دنیا کا دستور ہے کہ آمدنی دیکھ کر مصارف کا خاکہ تیار کیا جاتا ہے لیکن فرانس کا دستور نرالا تھا، وہاں بے دردی سے خزانہ لٹتا تھا اور رعایا پر لمبے لمبے محصول عائد کر کے خزانے کی کمی پوری کی جاتی تھی اوپر کے ممتاز طبقے ان بڑھے ہوئے مصارف کا بوجھ برداشت نہیں کرتے تھے۔ تیسرے طبقے کے دولتمند

لوگ بھی کچھ داؤں پیچ کھیل کر اپنی جان بچا لیتے تھے اور حکمراں طبقے کی مسرفانہ عادتوں کا خمیازہ میرے طبقے کے صرف غریب لوگوں کو برداشت کرنا پڑتا تھا۔ اس زمانے کا غریب کسان اپنی پیٹھ پر بادشاہ، کلیسا اور طبقۂ امرا سب کا بوجھ اٹھائے ہوئے تھا اور اس کی کمر اس بارگراں سے ٹوٹی جا رہی تھی۔

ایک مشہور فرانسیسی مصنف ڈی ٹاکے وائل (DE TOCQUEVILLE) نے کسان کی روزمرہ کی زندگی پر ان بے کراں محاصل کا جو اثر پڑتا تھا اس کی تصویر کھینچی ہے :-

"اٹھارھویں صدی کے ایک کسان کا جو اپنی زمین پر جان دیتا تھا، تصور کرو، وہ اپنا تمام اندوختہ اس زمین کی خریداری پر صرف کر دیتا تھا۔ اس زمین کے حصول کے لئے اس کو سب سے پہلے ایک محصول ادا کرنا پڑتا تھا۔ بالآخر وہ یہ زمین حاصل کر لیتا تھا اور تخم ریزی کے وقت وہ ہر ہر دانے کے ساتھ اپنا دل بھی زمین میں دباتا جاتا تھا لیکن یہ پڑوسی اس کو چین سے بیٹھنے نہ دیتے تھے۔ اور اس کو پھر اپنے کھیت کی ان چھوٹی چھوٹی بالیوں سے جن میں اس نے ہل چلا کر بیج ڈالے تھے، بلا لیتے تھے۔ وہ اپنے کھیت کے نونہالوں کو ان کی چالوں سے بچانا چاہتا تھا لیکن اس کی ایک نہ چلتی تھی۔ جب وہ دریا پار کر کے آگے نکلنا چاہتا یہ اس کو روک کر اترائی کا محصول طلب کرتے، وہ اپنا سامان لے کر بازار جاتا تو یہ اس کو وہاں بھی ملتے اور اس کو بیچنے کا اختیار خریدنے کے لئے ان کو پھر محصول ادا کرنا پڑتا۔ وہ جب بازار سے لوٹتا اور بچا کھچا ہوا گیہوں استعمال کرنا چاہتا تو اس کو پھر اپنی مجبوری راستے کا پتھر معلوم ہوتی۔ وہ یہ گیہوں جب تک انھیں محصول لینے والوں کی چکیاں اسے پیس نہ دیتیں اور ان کے تنور اس کی روٹیاں پکا کر اس سے محصول وصول نہ کر لیتے، اپنے ہونٹوں کے قریب لے جانے کا حقدار نہ تھا وہ اپنی چھوٹی سی آمدنی کا ایک حصہ ان پڑوسیوں کو صرف اس غرض سے کہ وہ اس کو بیگار سے معاف رکھیں ادا کرتا رہتا تھا۔ جہاں کہیں وہ جاتا ہے یہ تکلیف دہ پڑوسی اس کو راستہ روکے ہوئے کھڑے ملتے۔ جب یہ ہٹ جاتے ہیں تو کلیسا کے پادری کالا جبہ اوڑھے ہوئے

اس کے کھلیان کا قیمتی نفع بٹانے آموجود ہوتے ہیں۔ قرونِ وسطیٰ کے اداروں کے ایک حصے کی تباہی کے بعد جو حصہ بچ رہا ہے وہ اس سے ہزار گنا زیادہ قابلِ نفرت حصہ ہے۔"

اوپر کی سطروں میں ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کسی نے گیارھویں صدی عیسوی کے جاگیرداری نظام کی تصویر کھینچی ہو۔ کیا ان سات صدیوں میں جو اس کے بعد گذر گئیں، حالات میں کوئی انقلاب نہیں ہوا؟ انقلاب ہوا۔ فرانس کے دو کروڑ بیس لاکھ کسانوں میں سے ۱۷۸۹ء میں صرف دس لاکھ سرف (جنہیں قدیم اصطلاح کے بموجب سرف کہا جا سکتا ہے) باقی رہ گئے تھے۔ باقی کسان اس منزل سے گذر کر پوری طرح آزاد ہو چکے تھے، لیکن اس کا یہ مطلب نہ تھا کہ قدیم جاگیردارانہ مطالبات اور محصولات بھی اپنی جگہ چھوڑ چکے تھے۔ بہت سی باتیں ختم ہو گئی تھیں لیکن ابھی تک بہت کچھ باقی بھی تھیں، یہ اُس وقت بھی، جب ان کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہی تھی، بدستور قائم تھیں۔ امراء جو اپنی فوجی خدمات کے عوض میں یہ جاگیرداری محصول اور مطالبات وصول کرتے تھے۔ اب شاہی فوج سے کوئی تعلق نہیں رکھتے تھے۔ وہ جماعتی حیثیت سے حکومت کی مدد کرتے تھے اور نہ انتظامی اور سیاسی خدمات سے ان کا کسی قسم کا کوئی تعلق تھا۔ وہ زمینوں پر کھیتی کسانی کے فرائض سے بھی کوئی غرض نہیں رکھتے تھے کسی کاروبار سے ان کو کوئی سروکار نہ تھا۔ اقتصادی امور سے بھی ان کو کسی قسم کا کوئی لگاؤ نہ تھا۔ وہ کسی کو کچھ دیتے نہ تھے بلکہ دوسروں سے اپنے حقوق وصول کرتے رہتے تھے۔ وہ بے انتہا کاہل ہو گئے تھے اور درباروں میں بڑے بڑے ہرائی روٹیوں پر زندگی گذارا کرتے تھے۔ ان کو اپنی جاگیروں سے بھی کسی قسم کی کوئی دلچسپی نہ تھی لیکن وہ اب بھی اپنے مطالبات کا تقاضا کرتے تھے اور اپنے کسانوں سے محصول وصول کرتے اور بیگار لیا کرتے تھے۔ ان امیروں کے حقوق کی کسی قسم کی تجدید اور بحالی کسانوں کو بہت کھلتی تھی، اور وہ بجا طور پر ان کے خلاف آواز اٹھاتے رہتے تھے۔ ڈی ٹاکے وائل نے پچھلے جملے میں اشارہ کیا ہے کہ بعض رواجوں کے اٹھنے کے بعد جو رواج رہ گئے تھے ان کے خلاف بھی شدید نفرت کا جذبہ عام تھا۔

کسان اپنی آمدنی کا کتنا حصہ محصولات کے طور پر ان امیروں کی خدمت میں پیش کرتا رہتا ہے؟ جواب سن کر تم چونک پڑو گے۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ اس کی آمدنی کا اسی فی صدی مختلف قسم کے محصلین (TAX COLLECTORS) کی نذر ہو جاتا تھا۔ باقی بیس فی صدی میں وہ اپنے رہنے کی جگہ ٹھیک کرتا تھا اور بال بچوں کو کھلاتا پہناتا تھا۔ اگر کسان ان حالات سے خوش نہ تھے اور اس کی زبان شکوؤں سے لبریز رہتی تھی تو تعجب کی کیا بات تھی؟ اگر فصل خراب ہو جاتی تھی تو وہ فاقوں کی منزل میں پہونچ جاتا تھا اور ان خراب دنوں میں اپنے پڑوسیوں کی اچھی خاصی تعداد کے ساتھ غذا کی تلاش میں گلیوں میں خاک چھانتا اور ایک ٹکڑے روٹی کے لئے در در دست سوال دراز کرتا گھومتا تھا۔

فرانس میں ۱۷۸۹ء میں انقلاب ہوا لیکن اس سے تم یہ خیال نہ کرو کہ فرانس کا کسان سترھویں صدی کے مقابلے میں اٹھارھویں صدی عیسوی میں کچھ زیادہ تباہ حال تھا۔ اٹھارھویں صدی عیسوی میں اس کی حالت زیادہ خراب نہ تھی بلکہ وہ کسی حد تک مزے میں تھا۔ یہ واقعہ ہے کہ کسان کسی نہ کسی طرح مر کھپ کر اپنی محدود آمدنی میں بھی کچھ نہ کچھ پس انداز کر لیتا تھا اور تمام محصولوں اور مطالبوں کی ادائگی کے بعد بھی کچھ نہ کچھ نئی زمین خریدنے کے لئے جمع کرتا رہتا تھا۔ انقلاب کے سو سال پہلے سے کسان برابر زمینیں خریدتے آئے تھے اور اب فرانس کی تقریباً تہائی زمین ان کے قبضے میں آگئی تھی لیکن اتنی زمین کے مالک ہونے کے بعد بھی وہ پہلے سے بھی زیادہ غیر مطمئن تھے، آخر کیوں؟

وہ زمینوں کے بھوکے تھے۔ تہائی زمین کی خریداری سے ان کی تھوڑی ہی بھوک مٹی تھی۔

اب آخر ان کی ترقی کی راہ میں کیا دشواریاں تھیں؟ حکومت اور امتیازی طبقوں نے ان کے اوپر بہت سے بوجھ لاد رکھے تھے۔ اس بوجھ سے ان کی کمر جھکی جا رہی تھی، اب وہ سوچنے لگے تھے کہ اگر وہ یہ بوجھ اتار پھینکیں تو کمر سیدھی کر کے کھڑے ہونے کا موقع پا جائیں گے اور جانوروں کی زندگی سے ذرا بلند ہو کر انسان کہلائے جانے کے مستحق ہو سکیں گے۔ ان کی حالت پہلے کے مقابلے میں کچھ بہتر ہو گئی تھی۔ اس بہتری نے ان کے دل میں ایک آرزو جگا دی تھی اور وہ سوچنے لگے تھے کہ "کیا ہو

اگر وہ........؟"

ان کے دل میں یہ بات پہلے ہی پہل نہیں آئی تھی۔ فرانس اور یورپ کے دوسرے ممالک کے کسان بہت دنوں سے سوچ رہے تھے کہ جاگیرداری مطالبات اور پابندیوں سے نجات حاصل کی جائے۔ انھوں نے تھوڑی بہت نجات حاصل بھی کرلی تھی۔ اس سے پہلے بعض جگہوں کے کسانوں نے بغاوتیں بھی کی تھیں۔ یہ بغاوتیں جاگیرداری قوانین کے مکمل خاتمے میں تو کامیاب نہیں ہوئیں لیکن ان کے نتیجے میں ان کی حالت پہلے سے بہتر ضرور ہوگئی لیکن پوری کامیابی کے لئے ان کو مدد اور رہنمائی کی ضرورت تھی۔ ابھرے ہوئے متوسط طبقے نے یہ کمی پوری کردی۔

یہ اُبھرتا ہوا متوسط طبقہ (BOURGEOISE) ہی تھا جس نے فرانس میں انقلاب برپا کیا اور اس انقلاب سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھایا۔ ان کے لئے اس کے سوا کوئی اور چارۂ کار بھی نہ تھا، اگر وہ ان لوگوں کو کچلنے میں کامیاب نہ ہوتے، جو ان کا خون چوس رہے تھے تو وہ خود بیخ وبُن سے اکھاڑ پھینکے جاتے۔ اُن کی مثال مرغی کے اُس بچے سے دی جاسکتی ہے جو انڈے میں پوری نشو ونما پا چکا ہو اور اُس منزل میں پہونچ چکا ہو کہ اُس کے لئے چھلکا توڑ کر باہر نکلنے یا اُسی انڈے میں گھٹ کر مرجانے کے سوا اور کوئی صورت ممکن نہ رہی ہو۔

بورژوا طبقے کے لئے، قواعد وضوابط، احکام امتناعی اور تجارت وصنعت پر پابندیاں بار تھیں، وہ اسے پسند نہیں کرتے تھے کہ ایک چھوٹے سے طبقے کو اجارہ داری کے جملہ حقوق دے دئے جائیں اور قدیم پیشہ ور جماعتوں کے حقوق، جو اپنی زندگی پوری کرچکے تھے، ان کی ترقی کی راہ میں آجائیں۔ وہ اس پالیسی سے بہت برہم تھے جو صرف غریبوں اور متوسط طبقے کے لوگوں پر محصولوں کا بوجھ ڈالتی تھی اور دن بدن ٹیکسوں کا بار بڑھاتی چلی جاتی تھی۔ انھیں پرانے قوانین کا اپنی جگہ پر قائم رہنا اور نئے قوانین کا ان کی منظوری کے بعد نافذ ہوتے رہنا بہت ناگوار تھا۔ حکومت کا بڑھتا ہوا قرض اور افسروں کا لشکر جو ان کے روزمرہ کے کاروبار میں مداخلت کرتا رہتا تھا۔ انکے لئے سوہان روح بنا ہوا تھا۔ اُس وقت کے سماج کا یہی گندا چھلکا تھا جس کو توڑ کر نئے سماج

کے ان بڑھتے ہوئے طبقوں کو باہر نکلتا تھا۔ اُنھوں نے گھٹ گھٹ کر مرنا پسند نہیں کیا اور بڑی عقلمندی سے اس خول کو توڑ کر نئی زندگی کے لئے تازہ آب وہوا کا انتظام کیا۔

یہ آخر بورژوا کون لوگ تھے؟ یہ اہلِ قلم، ڈاکٹر، ٹیچر، وکیل، جج، سرکاری ملازم اور عام پڑھے لکھے لوگ تھے، اس طبقے میں تاجر، کارخانوں کے مالک، بینکر اور روپئے والے لوگ تھے جو نہ صرف دولت رکھتے تھے بلکہ اور دولت پیدا کرنے کے آرزومند بھی تھے، شریک تھے۔ یہ سب لوگ نئے سماج کو جواب اپنا جاگیرداری مزاج بدل چکا تھا پرانی جکڑ بندیوں سے آزاد کرانا چاہتے تھے اور جاگیرداری نظام کی تنگ صدری کے بجائے اب سرمایہ دارانہ نظام کا ڈھیلا ڈھالا چغہ زیب تن کرنا چاہتے تھے، انھوں نے آدم اسمتھ کی کتاب اور ان لوگوں کی تحریروں میں جو قدرتی حکومت کے نظریئے کے علمبردار تھے اپنے اقتصادی خوابوں کی تعبیر دیکھی، انھوں نے والٹیر، دیدرو اور انسائکلو پیڈیا کے مصنفوں کی تحریروں میں اپنی سماجی آرزوؤں کا پورا نقشہ دیکھا "ہمیں تنہا رہنے دو" کا نعرہ تجارت اور صنعت کی حدود سے آگے بڑھ کر عقلیات مذہب اور سائنس کی دنیا میں بھی داخل ہوا۔

جب ہم کسی نااہل کو دیکھتے ہیں جو ہمارے برابر ذہنی صلاحیت اور سخت کام کرنے کی جسمانی طاقت نہیں رکھتا ہے لیکن بنا ٹھنا عیش وعشرت کی زندگی گذارتا پھرتا ہے تو ہمارا دماغی توازن بگڑنے لگتا ہے۔ بورژوا طبقے کا یہی حال تھا۔ وہ صلاحیت اور استعداد میں کسی سے کم نہ تھے، مہذب تھے اور ان کے پاس روپئے پیسے کی بھی کمی نہ تھی لیکن ان تمام خوبیوں کے باوجود سماج میں ان کا کوئی آئینی مقام نہ تھا جس کے وہ ہر طرح مستحق تھے۔

> "برنیو (BARNAVE) اسی دن انقلاب پسند ہو گیا جس دن گرنیوبل میں اُس کی ماں کو تھیٹر میں ایک امیر نے بکس سے، جہاں وہ پہلے سے بیٹھی ہوئی تھی نکال دیا۔ میڈم رولینڈ شکایت کرتی ہے کہ جب اُس کو چیٹو آف فانٹنے (CHATEAU OF FONTENAY) میں ایک ڈنر میں اپنی ماں کے ساتھ شریک ہونے کے لئے مدعو کیا گیا تو اُسے نوکروں کے

کو اڑوں میں بٹھا کر کھانا کھلایا گیا۔ پرانے نظام کے بہت سے دشمن صرف غیرتِ نفس کے مجروح ہو جانے کی وجہ سے پیدا ہوئے۔"

بورژوا طبقے کے پاس زمین کا کوئی ٹکڑا نہ تھا حالانکہ اُس کی خریداری کے لئے ان کے پاس روپئے کی کمی نہ تھی۔ وہ حکومت کو قرض دیتے تھے اور اُس کی واپسی کے منتظر رہتے تھے۔ وہ حاکم طبقے کے حالات سے بے خبر نہ تھے اور خوب جانتے تھے کہ عوام کا روپیہ کس بے دردی سے لٹایا جا رہا تھا اور انھیں خوب اندازہ تھا کہ یہ احمقانہ اسراف حکومت کو دیوالیے پن کی طرف لے جانے والا تھا۔ اب ان کو اُس رقم کی پڑی ہوئی تھی جس کو انھوں نے بچا بچا کر جمع کر رکھا تھا۔

بورژوا طبقے کی اقتصادی حالت بہت اچھی تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ ان کی مالی برتری کے بموجب ان کو سیاسی وقار بھی حاصل ہو، وہ صاحب جائداد بھی ہو گئے تھے اب ان کو حقوق کی ضرورت تھی وہ یقین کرنا چاہتے تھے کہ اُن کی جائدادیں، اُن تکلیف دہ پابندیوں سے جو زوال آمادہ جاگیرداری نظام کی خصوصیات میں شامل تھیں آزاد رہیں گی۔ وہ جاننا چاہتے تھے کہ انھوں نے حکومت کو جو رقمیں بطور قرض دے رکھی تھیں وہ ان کو ادا کر دی جائیں گی۔ ان تمام آرزوؤں کی تکمیل کے لئے ان کو ایک آواز کی جو حکومت کے حلقوں میں موثر ثابت ہو، ضرورت تھی۔ اب ان کے لئے موقع پیدا ہوا تھا، انھوں نے اس موقع سے پورا فائدہ اٹھایا۔

فرانس کے حالات میں ابتری پیدا ہو گئی اور اب پرانے طرز پر حکومت چلانے کا وقت نہ تھا۔ یہ حقیقت طبقۂ امرا کے بعض ارکان نے بھی تسلیم کر لی تھی۔ کامٹے ڈی کیلو (COMTE DE COLONNE) نے جو وزارت مال کے عہدے پر ممتاز تھا مستقبل کی طوفانی لہروں سے، جو افق پر نظر آنے لگی تھیں بے خبر نہ تھا اُس نے اُسی زمانے میں اپنی رائے کا اظہار کیا:۔

"فرانس کی حکومت مختلف ملکوں اور ریاستوں پر جو مشترکہ نظامِ حکومت رکھتی ہیں، مشتمل ہے، اس کے بعض صوبے دوسرے صوبوں کے حالات سے بالکل بے خبر رہتے ہیں۔ اس کے بعض ضلعے ذمہ داریوں کے بوجھ سے بالکل بری ہیں اور بعض ضلعے اس بارے کچلے جا رہے ہیں۔ امیر طبقہ

برائے نام محصول ادا کرتا ہے" حقوق" نے حکومت کا توازن بگاڑ دیا ہے اور اب یہاں یہ ممکن نہیں رہا ہے کہ مستقل طور پر اور عوامی ارادے اور مشترک مقصد سے حکومت کا نظام چلایا جا سکے۔ ان حالات کا لازمی نتیجہ ہے کہ ہماری حکومت ایک ناقص بادشاہت ہے جس میں خرابیاں بھری ہوئی ہیں اور موجودہ حالات میں حکومت کرنا ناممکن سا ہو گیا ہے۔"

آخر کے تین جملوں پر غور کرو۔ حکومت کا ایک ذمہ دار رکن تسلیم کر رہا ہے کہ اب بہت دنوں تک حکومت نہیں کی جا سکتی۔ اس کے آگے مفہوم پورا کرنے کے لئے اور بڑھا لو کہ "غیر مطمئن عوام پر" اب ایک ابھرنے والے ذہین طبقے کو، جو طاقت اور اقتدار حاصل کرنے کے لئے بے چین ہے میدان میں آنے دو اور عوام کو ابھار کر آگے لے چلنے دو۔ انقلاب خود بخود پیدا ہو جائے گا، یہ انقلاب ۱۷۸۹ء میں آیا اور دنیا کی تاریخ میں "انقلاب فرانس" کے نام سے مشہور ہوا۔

انقلاب کے ایک رہنما ایبے سیس (ABBE SIEYES) نے ایک پمفلٹ میں، جس کی اس زمانے میں عام اشاعت ہوئی تھی، انقلاب کے وجوہ اس طرح بیان کئے ہیں:۔

"ہم کو اپنے آپ سے تین سوال کرنے ہیں۔ پہلا سوال یہ ہے کہ "تیسری ریاست (THIRD ESTATE) کیا ہے؟" جواب یہ ہے کہ "ہر چیز"۔ دوسرا سوال یہ ہے کہ ہمارے سیاسی نظام میں اب تک اس کی کیا حیثیت رہی ہے؟ جواب ہوگا کہ "کچھ نہیں"۔ تیسرا سوال یہ ہے کہ اب یہ چاہتے کیا ہیں؟ جواب ہوگا کہ "کچھ بن جانا چاہتے ہیں"۔"

یہ واقعہ ہے کہ "تیسری ریاست" کے تمام ارکان دستکار، کسان اور بورژوا سب "کچھ بن جانا" چاہتے تھے لیکن یہ صرف آخری طبقہ تھا جو اپنے مقاصد میں کامیاب ہوا۔ بورژوا طبقے نے رہنمائی کے فرائض انجام دئے تھے اور دوسری جماعتوں نے تو لڑ بھڑ کر انقلاب کو کامیاب بنایا تھا لیکن سارے منافع صرف بورژوا طبقے کے حصے میں آئے۔ انقلاب کے دوران میں بورژوا طبقے نے دولت بٹورنے اور طاقتور بننے کے بہت سے موقعے پائے۔ انھوں نے ان زمینوں پر جو کلیسا اور امراء سے چھینی گئی تھیں سٹہ بازی کر کے خوب دولت کمائی اور فوج کے جعلی ٹھیکوں میں جی لگا کر اپنے گھر بھرے۔

انقلاب کے زمانے میں، حالات جو شکل اختیار کر رہے تھے. ان کا نقشہ مزدور طبقے کے ایک لیڈر ﺯیرات (MARAT) نے ان الفاظ میں کھینچا ہے :۔

انقلاب کی گھڑیوں میں عوام نے اپنی عددی طاقت سے تمام دشواریوں کو راہ سے ہٹا کر زبردستی اپنا راستہ بنایا۔ انھوں نے شروع میں کتنی ہی کامیابی حاصل کرلی ہو آخر میں ان کو اوپر کے طبقوں کے منصوبہ بند، ہوشیار، عیار اور مکار لوگوں نے اپنی چالوں سے بری طرح شکست دیدی، اوپر کے طبقوں کے پڑھے لکھے لوگوں نے جو پہلے جاگیرداروں کی مخالفت کر رہے تھے. اپنی باریک چالوں سے اپنا کام بنالیا اور غریبوں کے مخالف ہو گئے، پہلے انھوں نے عوام کے دلوں میں جس طرح بن پڑا گھر کر کے ان کی اجتماعی طاقت سے فائدہ اٹھایا لیکن انقلاب کے کامیاب ہوتے ہی امیروں کی جگہوں پر خود براجمان ہو بیٹھے، انقلاب سماج کے پسماندہ طبقوں، مزدوروں، دستکاروں چھوٹے دوکانداروں، کسانوں اور ادنی جماعتوں کے لوگوں نے شروع کیا تھا اور انھوں نے ہی اس کو پار گھاٹ بھی لگایا یہی وہ لوگ ہیں جن کو یہ بے شرم دولت والے رذیل کہتے ہیں اور جن کو برومن بے حیائی سے ادنی ترین طبقہ (PROLETARIAT) کہا کرتے تھے لیکن جس نیت کو یہ اوپر کے لوگ چھپائے ہوئے تھے وہی پوری پوری ہو کر رہی اور یہ انقلاب ان زمینوں کے مالکوں وکیلوں اور جعل سازوں کے نفع کی چیز بن کر ختم ہو گیا۔"

جو کچھ پیش آیا اس کی بہت صحیح تصویر اوپر کی سطروں میں کھینچی گئی ہے. انقلاب کے ختم ہونے کے بعد بورژوا طبقے نے فرانس میں سیاسی اقتدار حاصل کرلیا "پیدائش کا امتیاز، کوئی شبہ نہیں ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا لیکن اس کی جگہ "تجارتی امتیاز" نے لے لی. آزادی مساوات اور برادری کا نعرہ، جو انقلاب کے زمانے میں ہر انقلاب پسند کی زبان پر تھا صرف بورژوا طبقے کے لئے صحیح اور نتیجہ خیز ثابت ہوا۔

نپولین کے مجموعہ قوانین کے مطالعہ سے مذکورہ بالا حقیقت پوری طرح صاف ہو جاتی ہے. اس قانون کا مقصد اس کے سوا کچھ اور نہیں معلوم ہوتا کہ بورژوا طبقے کی جائداد (جاگیرداروں کی جائداد نہیں) کی حفاظت کی جائے. اس مجموعہ قوانین میں دو ہزار دفعات ہیں، ان میں سے صرف سات دفعات

مزدوروں کے متعلق ہیں اور تقریباً آٹھ سو دفعات صرف جائداد سے تعلق رکھتی ہیں۔ اس مجموعۂ قوانین ہیں ٹریڈ یونینوں اور اسٹرائکوں کے لئے کوئی گنجائش نہیں رکھی گئی ہے اور قانوناً ممنوع قرار دیا گیا ہے لیکن مالکوں کی انجمنیں اپنی جگہوں پر بدستور قائم رکھی گئی ہیں۔ اُن نزاعوں ہیں جو مالک اور مزدور کے درمیان معاوضے اور اجرت کے متعلق پیش ہوتیں عدالتوں کو ہدایت تھی کہ صرف مالک کے بیان پر بھروسہ کریں، یہ مجموعہ قوانین بورژوا طبقے نے صرف اپنے طبقے کے لئے مرتب کیا تھا، اور مالکان جائداد نے صرف اپنی جائدادوں کی حفاظت کے لئے اس کو منظور کیا تھا۔

جب طوفان کے بادل چھٹے اور لڑائی کا میدان صاف ہوا تو نظر آیا کہ بورژوا طبقے نے اپنے لئے خریدنے اور فروخت کرنے کا حق حاصل کرلیا تھا اب وہ پوری طرح مجاز تھا کہ جو کچھ چاہتا خریدتا، جہاں چاہتا خریدتا اور جب چاہتا خریدتا، اب جاگیرداری نظام ہمیشہ کے لئے ختم ہوگیا تھا۔

جاگیرداری نظام صرف فرانس میں ہی ختم نہیں ہوا بلکہ ہر ملک میں جہاں سے نپولین کی فوجیں گذریں اس کا جنازہ نکل گیا۔ نپولین کی فوجیں آگے بڑھتی گئیں اور اپنے پیچھے آزاد بازار کے پھاٹک کھولتی گئیں۔ مفتوحہ ممالک کے بورژوا طبقے نے بھی اگر بازاروں کی آزادی کا بڑی خوشی سے استقبال کیا تو کیا تعجب کی بات ہے! ان ممالک ہیں سرفوں کی گردنیں غلامی کے بندھنوں سے آزاد ہوگئیں۔ جاگیردانہ مطالبات ختم ہوگئے۔ کسانوں، مالکانِ زمین، تاجر اور دستکاروں کو کسی ضابطے، پابندی اور بندش کے بغیر آخری طور پر ہمیشہ کے لئے خرید و فروخت کا حق مل گیا۔

کارل مارکس (KARL MARX) نے ۱۸۵۲ء میں انقلاب فرانس کی داستان بڑے دلچسپ انداز سے لکھی ہے۔ وہ لکھتا ہے:۔

"ڈسمولنس (DESMOULINS) ڈینٹن (DANTON) رابسپیر (ROBESPIERRE) سینٹ جسٹ (SAINT JUST) نپولین اور ان مشاہیر نے فرانس کی دوسری زبردست انقلاب پسند جماعتوں کے دوش بدوش اپنی زندگی کی مہم جیت لی۔ یہ مہم صرف بورژوا طبقے کی آزادی اور جدید بورژوا سماج کے قیام کے سوا کچھ اور نہ تھی جمہوریت پسندوں نے، جو اپنی نظرت

میں انتہا پسند تھے، جاگیرداری نظام کو جڑ بنیاد سے اکھاڑ پھینکا اور جاگیردارانہ نظام کی مقتدر ہستیوں کے سر قلم کر کے رکھ دیے۔ نپولین نے پورے فرانس میں ایسے حالات پیدا کر دیے جن میں آزاد مقابلے کی ترقی کے لیے گنجائش نکل آئی، ریاستوں کی تقسیم کے بعد زمین کی جائداد سے پوری طرح فائدہ اٹھانے کے امکانات پیدا ہو گئے اور قوم کی صنعتی صلاحیتوں کو صنعتی پیداوار بڑھانے کا پورا موقع ملا۔ سرحدوں کے آر پار ہر جگہ اس نے جاگیرداری نظام کے ہر ادارے کو موت کی نیند سلا دیا۔ انقلابات خونی ہوتے ہیں بہت سے لوگ فرانس کے انقلاب کی شدت اور خونخواری دیکھ کر انگشت بدنداں رہ گئے۔ یہ ایک بہت دلچسپ حقیقت ہے کہ انقلاب فرانس کے شدید دشمن انگریز تھے۔ یہ حقیقت اس وجہ سے اور بھی دلچسپ ہے کہ انگریز اپنے سو برس پہلے کے انقلاب کو جو وہاں کے بورژوا طبقے نے سیاسی حقوق اور اقتصادی مساوات حاصل کرنے کے لیے برپا کیا تھا، بالکل بھول گئے تھے اور اب ان کو انقلاب کی وہ شدت اور خونخواری جو ان کے انقلاب کے جلو میں آئی تھی، بالکل یاد نہ رہی تھی۔

فرانس اور انگلستان کے انقلابوں میں ایک فرق بھی تھا۔ فرانس میں تجارتی طبقے نے پیدائشی امیر طبقے پر کاری ضرب لگائی، اس ضرب کے صدمے سے یہ طبقہ پوری طرح جانبر نہ ہو سکا۔ انگلستان میں بھی تجارتی طبقے نے فتح پائی لیکن وہاں ضرب کاری کی نوبت نہ آئی، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انگلستان کے امراء اور تاجر ایک دوسرے کی رگ رگ سے واقف تھے، انھوں نے آپس میں ایک دوسرے کو خوب نباہا، انگلستان کے تجارت پیشہ طبقے نے آخری ضرب کاری کے بغیر صرف سمجھوتے سے وہ سب کچھ حاصل کر لیا جو دوسرے ملکوں میں ممکن نہ ہو سکا۔ انگلستان کے بورژوا طبقے نے زمینی اشرافیت LANDED ARISTOCRACY حاصل کر لی اور زمینوں کے مالک امراء نے اپنی پرانی لن ترانیاں چھوڑ کر زیادہ پریشانیاں اٹھائے بغیر تجارت میں حصہ لینا شروع کیا۔ بہرکیف سنہ ۱۶۴۲ء - تا سنہ ۱۶۸۸ء کا زمانہ انگلستان کی تاریخ میں لڑائی اور جھگڑے کا زمانہ ہے۔ یہ ہنگامے اسی وقت ختم ہوئے جب وہاں کے بورژوا طبقے نے حکومت میں نمائندگی حاصل کر لی۔

تم کو اڈمنڈ برک کا نام یاد ہوگا۔ یہ وہ سیاسی مدبر ہے جس نے بڑی قابلیت سے امریکی

نو آبادی کے باشندوں کی حمایت کی تھی اور پوری نمائندگی کے بغیر ان کے اوپر تشخیص محصول کی کارروائی کو ناجائز قرار دیا تھا جب اس نے انقلابِ فرانس پر قلم اٹھایا اور انقلاب پسندوں پر کڑی نکتہ چینی کی تو انگلستان ہی کے ایک اہلِ قلم نے اس کو خود انگلستان کا شاندار انقلاب جو سو سال پہلے ظہور پذیر ہوا تھا یاد دلایا۔ اُس نے لکھا:۔

"مردانگی، شرافت اور انسانیت کے نام پر صاف صاف بتاؤ کہ فرانس کے باشندوں نے اس ملک کے خلاف کونسا ناقابلِ معافی جرم اور ناقابلِ تلافی گناہ کیا ہے؟ انھوں نے ۱۷۸۹ء کے انقلاب میں اپنے ملک کی حکومت بدل دی ہے کیا یہ کوئی گناہ ہے؟ وہ ہم سے اس معاملے میں صرف اتنا ہی مختلف ہیں کہ انھوں نے یہ قدم ہم سے سو سال کے بعد اُٹھایا ہے۔ انگریزی قوم نے اپنے شہنشاہ کی گردن پر چھری چلا کر مثال پہلے ہی قائم کر دی تھی"

بازار کی آزادی کی لڑائی انگلستان میں ۱۶۸۹ء میں اور فرانس میں ۱۷۸۹ء میں لڑی گئی اور متوسط طبقوں کی فتح کی شکل میں ختم ہوئی ۱۷۸۹ء میں انقلابِ فرانس نے جاگیرداری نظام کو ختم کر کے قرونِ وسطیٰ کے خاتمے کا اعلان کر دیا۔ قرونِ وسطیٰ کے برہمن، جنگ آزما اور محنت کش طبقوں نے ٹوٹ پھوٹ کر ایک نئے درمیانی طبقے (MIDDLE CLASS) کو جنم دے دیا۔ یہ طبقہ سالہا سال سے اقتدار حاصل کر رہا تھا۔ اس طبقے نے جاگیرداری نظام کے خلاف سخت کشاکش کی تھی اور اب تک اس نظام کے خلاف تین فیصلہ کن لڑائیاں لڑ چکا تھا۔ پہلی لڑائی پروٹسٹنٹ طبقے کی تجدید و اصلاح کی تحریک کے نام سے مشہور ہے۔ دوسری جنگ انگلستان کے عظیم الشان انقلاب کے نام سے شہرت پا چکی ہے۔ تیسری لڑائی تاریخ کے صفحات میں انقلاب فرانس کے نام سے یاد کی جائے گی۔ متوسط طبقہ اٹھارھویں صدی عیسوی کے خاتمے تک اتنا طاقتور ہو گیا کہ اُس نے جاگیرداری نظام کی بنیادیں اکھاڑ پھینکیں۔ اس قدیم جاگیرداری نظام کی جگہ پر ایک نئے سماج نے آنکھ کھولی۔ اس سماج کی بنیاد بورژوا طبقے نے آزاد تجارت کی زمین پر رکھی تھی تاکہ آئندہ نفع کمانے میں کسی قسم کی کوئی روک ٹوک نہ ہو۔

ہم اس نظام کو نظام سرمایہ داری (CAPITALISM) کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

حصّہ دُوُم

سرمایہ داری سے...... تک؟

دولت کہاں سے آئی؟

دو آدمی تماشے کے ٹکٹ خریدنے کے لئے ایک قطار میں کھڑے ہیں۔ دونوں ایک ہی درجے کے تین تین ٹکٹ خریدتے ہیں۔ پہلا آدمی اپنے ٹکٹ لے کر اپنے ساتھیوں کے ساتھ اندر جا بیٹھتا ہے اور پردہ اُٹھنے کا انتظار کرنے لگتا ہے۔ دوسرا آدمی ٹکٹ لے کر ایک کنارے کھڑا ہو جاتا ہے اور آنے والوں سے پوچھتا ہے "کیا آپ فلاں درجے کا ٹکٹ خریدیں گے؟" وہ اپنی اس کوشش میں کامیاب ہوتا ہے یا ناکام، ہم کو اس سے غرض نہیں۔ اُس نے یہ تینوں ٹکٹ کچھ نفع سے بیچے ہوں، یا اُس نے ان کو کچھ نقصان برداشت کر کے فروخت کر دیا ہو۔ ہم کو اس تحقیق میں بھی جانے کی ضرورت نہیں۔ ہم کو صرف یہ دیکھنا ہے کہ ان دونوں کے روپیوں میں نوعیت کا کیا فرق ہے۔ دونوں نے برابر رقم خرچ کر کے ایک ہی درجے کے تین تین ٹکٹ خریدے ہیں۔ پہلے نے یہ رقم صرف تماشا دیکھنے کے لئے خرچ کی ہے اور دوسرا اتنی ہی رقم ان ٹکٹوں پر کچھ کمانے کی نیت سے خرچ کرتا ہے۔ اس لئے دوسرے کی رقم "سرمایہ" ہے لیکن پہلے کی رقم کو سرمایہ نہیں کہا جا سکتا۔

آخر ان دونوں کی رقموں میں یہ فرق کیوں ہے؟

روپیہ اُس وقت "سرمایہ" بنتا ہے جب اُس سے کوئی چیز یا کسی محنت کش کی محنت نفع کمانے کی نیت سے خریدی جاتی ہے۔ دوسرا آدمی جس نے یہ ٹکٹ تماشا دیکھنے کے لئے نہیں خریدے ہیں، ان کو بیچ کر کچھ نفع کمانا چاہتا ہے۔ اس صورت سے اس کا روپیہ سرمائے کی حیثیت سے کام کر رہا ہے۔ پہلا آدمی جس نے صرف تماشا دیکھنے کی نیت سے یہ روپیہ خرچ کیا ہے کوئی نفع کمانے کی نیت نہیں رکھتا اس لئے اُس کا روپیہ سرمایہ کی حیثیت نہیں رکھتا ہے۔

اسی طرح اگر کوئی گڈریہ اون بیچ کر کمانے کے لئے روٹیاں خریدتا ہے تو اس صورت میں اس نے اون بیچ کر روٹیوں کے لئے جو روپیہ پیدا کیا وہ سرمایہ نہ کہا جائے گا لیکن تاجر نے اس اون کے خریدنے میں نفع کمانے کی نیت سے جو روپیہ صرف کیا ہے، وہ سرمایہ ہے۔ اس نے اون خریدنے میں روپیہ صرف اس نیت سے لگایا ہے کہ وہ یہ اون پھر بیچے گا اور اس روپیہ پر جو اس نے اون کی خریداری میں لگایا ہے نفع کمائے گا۔ یہ نفع اس سرمایہ پر اضافہ ہوگا جو اس نے خریداری میں صرف کیا ہے، جب روپیہ کسی کاروبار میں، جو نفع دے رہا ہو اس سے نفع ملنے کی امید ہو لگایا جائے تو وہ سرمایہ ہو جاتا ہے۔ کوئی چیز اس نیت سے بیچنا کہ اس کو بیچ کر ہم اپنے استعمال کے لئے کوئی چیز خریدیں گے سرمایے سے پہلے کی منزل ہے (PRE-CAPITALIST) لیکن کچھ خریدنا تاکہ اس کو بیچ کر کچھ نفع کمایا جائے سرمایے کے عمل کا میدان ہے۔

وہ کیا چیز ہے جسے ایک مخصوص سرمایہ دار بیچنے اور نفع کمانے کے لئے خریدتا ہے؟ کیا وہ تھیٹر کے ٹکٹ ہیں یا اون، ٹوپیاں اور گھڑ وغیرہ ہیں؟ نہیں ان میں سے کوئی چیز نہیں ہے لیکن وہ ان میں ہر ایک کا جزو ضرور ہے۔ ایک صنعتی مزدور کو لو۔ وہ تم کو بتائے گا کہ اس کا مالک اس کو اس کی کام کرنے کی قابلیت کی اجرت دیتا ہے۔ یہ تو مزدور کی محنت کرنے کی طاقت ہے جو سرمایہ دار خریدتا ہے تاکہ اسے بیچ کر کچھ کمائے لیکن بظاہر تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ سرمایہ دار مزدور کی محنت کرنے کی طاقت فروخت نہیں کرتا، پھر آخر وہ کیا فروخت کرتا ہے؟ وہ ان چیزوں کو بیچتا ہے جنھیں مزدور خام مال سے بناتا ہے اور ان کو مکمل مصنوعات کی شکل دے کر پیش کرتا ہے، مزدور اپنی محنت صرف کر کے جس قیمت کی چیز پیدا کرتا ہے مزدوری اس قیمت سے کم پاتا ہے، اس کمی کی جو مقدار ہوتی ہے دراصل وہی نفع کی مقدار بھی ہوتی ہے۔

سرمایہ دار ذرائع پیداوار پر قابض ہے۔ عمارتیں مشین اور خام مال وغیرہ سب کچھ اس کے پاس موجود ہے۔ اب وہ مزدور کی "محنت" خریدتا ہے اور ان تمام چیزوں کے ربطے اور ترکیب سے پیداوار شروع ہوتی ہے۔

یہ خیال رہے کہ صرف روپیہ ہی سرمایہ کی واحد شکل نہیں ہے۔ موجودہ زمانے میں صنعتی کارخانے کا کوئی مالک ہو سکتا ہے نقد روپیہ نہ رکھتا ہو لیکن سرمایے کی بڑی مقدار کا مالک ہو۔ اس کا یہ سرمایہ جیسے ہی وہ محنت کی طاقت "خرید لیتا ہے"، بڑھنے لگتا ہے۔

موجودہ زمانے میں صنعتی کارخانہ قائم ہوتے ہی اپنا سرمایہ بہت جلد اکٹھا کر لیتا ہے اور بہت کم مدت میں نفع کمانے لگتا ہے لیکن موجودہ صنعت کے شروع ہونے سے پہلے سرمایہ کہاں سے آیا تھا؟ یہ بہت اہم سوال ہے۔ جب تک گزشتہ زمانے میں سرمایہ کی زبردست مقدار اکٹھا نہ ہو جاتی موجودہ صنعتی سرمایہ داری کی بنیاد نہیں پڑ سکتی تھی۔ خانماں برباد مزدوروں کے گروہ بھی جو صرف دوسروں کا کام کر کے زندہ رہ سکتے تھے اس نظام کی کامیابی کے لئے ضروری تھے، آخر یہ دونوں شرطیں، جن کے بغیر یہ صنعتی سرمایہ داری کامیاب نہیں ہو سکتی کیسے پوری ہو گئیں؟

یہ کہا جا سکتا ہے کہ سرمایہ ان محتاط لوگوں نے دیا ہو گا جنھوں نے اپنی عاقبت اندیشی سے کام لے کر ساری زندگی سخت محنت کی، بہت جزرسی سے کام لیا اور تھوڑا تھوڑا جمع کر کے رفتہ رفتہ بڑی رقم اکٹھا کر لی۔ کوئی شبہ نہیں ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں، وہ پیٹ کاٹ کاٹ کر کافی رقمیں جمع کر لیتے ہیں لیکن وہ سرمایہ جس نے صنعتی سرمایہ داری کی بنیاد رکھی، اس طرح نہیں اکٹھا کیا گیا تھا۔ یہ کہانی حسین ضرور ہے لیکن افسوس ہے کہ پوری طرح سچ نہیں ہے، سچی داستانیں کبھی اتنی حسین نہیں ہوتیں۔

سرمایہ داری دور سے پہلے سرمایہ زیادہ تر تجارت کی راہ سے آتا تھا۔ تجارت سے صرف چیزوں کا مبادلہ مراد نہیں ہے۔ اس لفظ میں لچک بہت ہے۔ اس کی لہریں اپنے دامن میں چڑھائیاں ڈکیتیاں، لوٹ کھسوٹ اور چھین جھپٹ سب کچھ چھپائے ہوئے ہیں۔

اسپین کی شہری حکومتوں نے محاربات صلیبی میں مغربی یورپ سے بلا وجہ مدد نہیں مانگی تھی۔ ان مذہبی لڑائیوں کے ختم ہوتے ہی وینس، جنوا اور پیسا ایک دولت مند شاہنشاہی کے اقتدار میں آ گئے اور اطالوی فاتحین نے مال غنیمت سے اپنے گھر بھر لئے۔ دولت کا سیلاب مشرقی ممالک سے چلا اور اطالوی تاجروں اور مہاجنوں کے گھروں میں سما گیا۔ مسٹر جان اے ہابسن نے جو اس موضوع

کے امام سمجھے جاتے ہیں لکھا ہے:-

> "اس طرح بہت پہلے نفع بخش تجارت کی بنیاد رکھی گئی تھی۔ اس تجارت نے مغربی یورپ میں دولت کے انبار لگا دیئے اور اس طرح وہ ضروری سرمایہ اکٹھا ہو گیا جو آگے چل کر ان ملکوں میں سرمایہ داری بنیاد پر پیداوار کا موجب ہوا۔"

اگر ہابسن کا بیان صحیح ہے تو ہم کو سرمایہ داری نظام کی ابتداء کی تحقیق کے لئے اطالوی جزیرہ نما کی طرف نگاہ پھیرنی چاہئیے۔ ہم کو یہاں تیرھویں، چودھویں صدیوں میں بلکہ کہیں کہیں اس سے بھی پہلے اس نظام کے آغاز کے آثار ملتے ہیں۔

مشرق سے جو دولت آئی تھی وہ اگرچہ بہت تھی لیکن پھر بھی کافی نہ تھی۔ سرمایہ داری دور کی ابتداء سے پہلے بے شمار سرمایے کا اکٹھا ہونا ضروری تھا تاکہ اس کی بنیاد پر سرمایہ دارانہ پیداوار کا بندوبست کیا جا سکے۔ سولھویں صدی عیسوی ہی میں بے انتہا دولت کے ڈھیر جن کی اس غرض کی تکمیل کے لئے ضرورت تھی اکٹھا ہونے لگے۔ کارل مارکس نے جو "موجودہ سرمایہ داری نظام کے تدریجی ارتقاء" کے موضوع پر مسلم الثبوت استاد مانا جاتا ہے لکھا ہے:-

> "امریکہ میں سونے اور چاندی کی دریافت، دیسی آبادی کی تباہی، زبردستی غلام بنانے کی مہم، قدیم دیسی باشندوں کی امریکی کانوں میں تدفین، ہندوستان اور ہندوستانی جزائر پر فاتحانہ یلغار اور لوٹ کھسوٹ اور افریقہ کے براعظم کا کالی کھالوں کے حصول کے لئے شکارگاہ بننا یہ وہ وجوہ تھے جنھوں نے سرمایہ دارانہ پیداوار کے دور جدید کی ابتداء کی۔ یہی وہ اسباب تھے جنھوں نے اس دور کے آغاز کے لئے ابتدائی سرمایے کی بنیاد رکھی۔"

کیا تم اس ظلم، قتل اور خونریزی کی داستانیں سنو گے جن کے آگے بیسویں صدی عیسوی کے ڈاکوؤں اور خونخوار گروہوں کے خونی کارنامے بے رنگ معلوم ہوتے ہیں۔ آؤ میکسیکو اور پیرو کے کسی انڈین سے پوچھیں وہ ہم کو بتائے گا کہ سولھویں صدی عیسوی میں اس سفید کھال والے انسان نے اس کے باپ دادا کے ساتھ کیا سلوک کیا تھا۔ وہاں کی دیسی آبادی کو عیسائی بنایا گیا

اور اس کے ساتھ ہی ساتھ ان کو کانوں میں زبردستی ٹھونس دیا گیا۔ بے رحمانہ مار پیٹ اور قتل کی سزائیں ان کا مقدر ٹھہرائی گئیں۔ دولت کی کتنی بڑی اور زبردست مقدار تھی جو چاندی اور سونے کی شکل میں زمین سے کھود کھود کر نکالی گئی! جہازوں میں بھر بھر کر پرانی دنیا کے ساحلوں پر اتار دی گئی۔ یہ دولت گھوم پھر کر تاجروں اور مہاجنوں کے ہاتھوں میں پہونچ گئی (سونے اور چاندی کے ڈھیر ان لوگوں کے ہاتھوں میں پہونچ کر بیکار نہیں پڑے رہے۔ یہ دولت لوگوں کو قرض کے طور پر دی گئی۔ یہ رقم یا تو صنعت کی ترقی میں لگائی گئی یا تاجروں کو دے دی گئی تاکہ وہ اس کو مزید دولت پیدا کرنے والی مہموں میں لگائیں۔ اس لئے یہ کہنا صحیح ہے کہ اس دولت نے یہاں پہونچ کر سرمایے کی شکل اختیار کر لی تھی)

کارٹیزا اور پیزارو جنھوں نے میکسیکو اور پیرو کو فتح کیا تھا ہسپانوی تھے۔ ہسپانوی اس ظلم و جبر کے لئے جو انھوں نے اپنی نوآبادیات میں دیسی آبادی کے ساتھ روا رکھا تھا بہت بدنام تھے لیکن ڈچ تو دوسری قوم تھے ان کا برتاؤ اپنی نوآبادیات کے ساتھ یقیناً ان ہسپانیوں سے بہتر رہا ہوگا؟

سرٹی۔ ایف۔ رفلیس کسی زمانے میں جزیرہ جاوا کا لفٹنٹ گورنر رہ چکا ہے، وہ اس سوال کا جواب نفی میں دیتا ہے۔ وہ ہالینڈ کے نوآبادیاتی نظام حکومت کا نقشہ کھینچتے ہوئے لکھتا ہے:۔

"غیر معمولی دغابازی، غداری، رشوت خوری، سفاکی اور کمینہ پن کے ساتھ (حکومت کی جاتی تھی)"

اس نے تخمینہ لگایا ہے کہ ڈچ ایسٹ انڈین کمپنی نے ۱۶۱۳ء سے ۱۶۵۳ء تک تقریباً چھ لاکھ چالیس ہزار گلڈر سالانہ کے حساب سے نفع کھسوٹا

ڈچ کس طرح سرمایہ اکٹھا کرتے تھے؟ ذیل کا اقتباس یہ داستان سنائے گا:۔

"ملاکا پر قبضہ کرنے کے لئے ڈچوں نے پرتگیزی گورنر کو رشوت قبول کرنے پر آمادہ کر لیا۔ اس نے ۱۶۵۱ء میں ان کو اندر آنے کا موقع دے دیا۔ انھوں نے گھستے ہی اس کے مکان پر چھاپہ مارا اور اسے قتل کر دیا تاکہ اس کی غداری کی قیمت اکیس ہزار آٹھ سو پچھتر پونڈ ادا کرنے سے بچ جائیں۔ ان کے قدموں کے ساتھ جہاں وہ پہونچے عام بربادی اور ویرانی چھاتی

گئی۔ بنجو وانگی (BANJUWANGI) جو جاوا کا ایک صوبہ تھا ۱۷۵۰ء میں بہت آباد تھا۔ اس کی آبادی اسی ہزار نفوس سے زیادہ پر مشتمل تھی ۱۸۱۱ء میں یہ آبادی گھٹ کر اٹھارہ ہزار رہ گئی ــــ تجارت کے پھل کتنے میٹھے ہیں!"

ہالینڈ نے سترھویں صدی عیسوی کی ایک بڑی سرمایہ دار قوم بننے کے لیے اس طرح دولت بٹوری انگریز بھی دُنیا کی ایک بڑی سرمایہ دار قوم ہیں۔ آخر انھوں نے اپنی سرمایہ داری کی بنیاد قائم کرنے کے لیے یہ دولت کہاں سے اکٹھا کی؟ کیا وہ سخت محنت، جزرسی کی بدولت ایک بڑی رقم جمع کر کے اس معراج تک پہونچے؟ کیا کسی کو اس بات کا یقین آسکتا ہے؟

ڈبلیو ہووٹ نے اپنی کتاب "آبادکاری اور مسیحیت" میں جو لندن میں ۱۸۳۸ء میں چھپی تھی۔ ایک اہلِ قلم کا اقتباس پیش کیا ہے۔ یہ اقتباس ایک مضمون سے، جو اورنٹیل ہیرالڈ میں چھپا تھا لیا گیا ہے:-

"ہماری شہنشاہی کی بنیاد کسی باہمی صلاح اور مشورہ پر قائم نہیں ہے۔ یہ وہ شاہنشاہی بھی نہیں ہے، جو کسی قانون کے ہاتھ آئی ہو، یہ تو زبردستی حاصل کی گئی ہے اور اس پر اب بھی براہِ راست قوت اور دباؤ سے حکومت کی جا رہی ہے۔ ملک کے کسی حصے نے اپنی مرضی سے الحاق قبول نہیں کیا ہے۔ ہم کو پہلے پہل صرف اپنا مال بیچنے کے لئے ساحل پر قدم کی اجازت دی گئی تھی ــــ لیکن آخر کار رفتہ رفتہ کبھی زبردستی اور کبھی دھوکے اور فریب سے ہم نے دیسی بادشاہوں کو ختم کر دیا۔ ہم نے امراء سے تمام اختیارات چھین لئے۔ ان کو بالکل بے بس بنا دیا اور ان کی صنعت اور ذرائع آمدنی کو اچھی طرح سے نچوڑ لیا۔ ہم ان سے ان کا تمام زائد مال اور قابلِ انتقال چیزیں لے لیتے ہیں۔

مذکورہ بالا سطروں کا لکھنے والا کچھ خفا معلوم ہوتا ہے لیکن ۱۷۶۹ء اور ۱۷۷۰ء کے ہندستان میں جب ہزاروں ہندوستانی بھوک کے ہاتھوں موت کی نیند سو رہے تھے خوش ہونے کا کون موقع تھا۔ کیا اُس زمانے میں کافی چاول پیدا نہیں ہوتا تھا؟ نہیں ہوتا تھا، ملک میں چاول کے ذخیرے

کم نہ تھے۔ پھر آخر یہ قحط سالی کیوں تھی؟ یہ قحط سالی تو صرف اس وجہ سے تھی کہ انگریز وہاں کی پوری فصل خرید لیتے تھے اور بعد میں من مانا نفع لے کر یہی چاول ان غریب دیسیوں کے ہاتھ فروخت کرتے تھے اور غریب ہندوستانی اپنی غریبی کی وجہ سے ان بڑھی ہوئی قیمتوں پر غلہ خریدنے کے لائق نہ ہوتے تھے۔

نوآبادیاتی تجارت نے ان ملکوں میں دولت کے ڈھیر لگا دئے۔ اس دولت نے ابتدائی زمانے کے تاجروں کی بنیادیں مضبوط کردیں۔ تجارت کی اس گرم بازاری کے زمانے میں انسانوں کی تجارت بہت دلچسپ اور بے انتہا نفع بخش تھی۔ افریقہ کے کالی کھال والے انسان اس وقت کے تاجروں کا بہترین مالِ تجارت تھے۔

پروفیسر ایچ میری ویل نے ۱۸۴۰ء میں اکسفورڈ میں لکچرس کا ایک سلسلہ "نوآبادیات اور نوآبادکاری" کے عنوان پر شروع کیا تھا۔ اس نے اپنے ایک لکچر کے دوران میں دو اہم سوالات اٹھائے تھے اور ان کے جوابات بھی جو سوالوں سے کم اہم نہ تھے خود ہی دئے تھے۔ پروفیسر نے پوچھا:۔

"لیورپول اور مانچسٹر جو معمولی قصبوں کی حیثیت رکھتے تھے کیوں اتنے بڑے اور عظیم الشان شہر بن گئے؟ کیا چیز ان کی ہمیشہ جاری رہنے والی صنعت کا پیٹ بھرتی ہے اور ان کی تیزی سے بڑھنے والی دولت کا موجب ہوتی ہے؟ ان شہروں کی موجودہ دولت افریقی حبشیوں کی عرق ریزیوں اور تباہ حالیوں کی مرہونِ منت ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے انہیں حبشیوں کے ہاتھوں نے ان کے جہاز تعمیر کئے ہوں اور ان کے بھاپ کے انجنوں کو بنایا ہو۔"

پروفیسروں کے بیانات کا مذاق اڑانا کچھ اس زمانے کے دستور میں شامل ہوگیا ہے۔ کیا پروفیسر میری ویل اپنے لکچروں کے وقت واقعی کچھ مبالغے سے کام لے رہا تھا؟ نہیں یہ بات نہ تھی۔ غالباً اس کی نگاہ سے وہ عرضداشت گزری تھی جو لیورپول کے تاجروں نے ۱۷۸۸ء میں دارالعوام میں پیش کی تھی۔ یہ عرضداشت ان چند گمراہ لوگوں کے جواب میں پیش کی گئی تھی جنھوں نے اپنی بدمذاقی سے یہ کہہ دیا تھا کہ انسانی جانوں کی تجارت ایک مہذب ملک کے شایانِ شان نہیں ہے۔ اس عرضداشت

میں آیا ہے :۔

"آپ کے درخواست کنندگان اس تحریک کے سلسلے میں جو افریقی غلاموں کی تجارت کے امتناع کے لئے شروع کی گئی ہے، بڑی تشویش اور اضطراب کا اظہار کرتے ہیں۔ یہ تجارت سالہا سال سے لیور پول کی تجارت کی بڑی وسیع شاخ کی حیثیت سے جاری چلی آرہی ہے۔ آپ کے درخواست کنندگان التجا کرتے ہیں کہ ان کی شنوائی .... دولت کے اس سرچشمے کے امتناع کے خلاف فرمائی جائے۔"

پرتگالیوں نے افریقی غلاموں کی تجارت سولھویں صدی عیسوی کی ابتدا سے شروع کی تھی مسیحی یورپ کی دوسری مہذب قوموں نے بھی ان کے نقش قدم پر چلنے میں زیادہ دیر نہیں لگائی (۱۶۱۹ء میں افریقہ کے حبشی غلاموں کی پہلی کھیپ ایک ڈچ جہاز میں امریکہ پہونچی)

جان ہاکنس وہ پہلا انگریز ہے جس کے دل میں سب سے پہلے یہ خیال آیا کہ افریقہ کے حبشیوں کو پکڑ کر اگر خام مال کی طرح بیچا جائے تو بڑی بھاری دولت ہاتھ آسکتی ہے نیکدل ملکہ الزبتھ نے اس قاتل اور اغوا کے گنہگار انسان کے اس کارِ نمایاں کو بہت سراہا اور افریقی حبشیوں کی دوسری تجارتی کھیپ کو کامیابی سے پار گھاٹ لگانے کے صلے میں اس کو نائٹ (KNIGHT) بنا دیا۔

جان ہاکنس نے افریقی حبشیوں کی غلامی کی زنجیروں کو اپنے لئے طرۂ افتخار خیال کیا اور رچرڈ ہاکلوٹ (RICHARD HAKLUYT) نے بڑے فخر و ناز کے ساتھ اس بے اندازہ دولت کا تذکرہ کیا جو اس نے ان بدقسمت جانوں کو بیچ کر حاصل کی تھی۔ ہم ہاکلوٹ ہی کے الفاظ میں جان ہاکنس کے اس طرح کے پہلے بحری سفر کا جو اس نے ۱۵۶۲ء اور ۱۵۶۳ء میں کیا تھا۔ دلچسپ خاکہ کھینچتے ہیں :۔

اس یقین کے بعد کہ دوسرے سامان تجارت کے ساتھ ساتھ افریقی حبشی بھی بہت نفع بخش مال تجارت ثابت ہوں گے اور گنی کے ساحلوں پر ان کی بہت بڑی کھیپ بہت آسانی سے اکٹھا کی جا سکے گی، اس نے اس مہم کا پختہ ارادہ کر لیا اور اپنے ارادہ سے اپنے لندن

کے دوستوں کو جو اُس کے بہت مداح تھے مطلع کیا۔ ان تمام لوگوں نے اس کے اس ارادے کو بہت پسند کیا اور اپنی خوشی سے اس کے مددگار بن گئے اور انھوں نے اس کی مہم میں ہاتھ بھی بٹایا۔ اس ارادے کی تکمیل کے لئے فوراً تین جہاز بھی آموجود ہوئے اور وہ وہاں سے سیرالیونا جو گنی کے ساحل پر واقع ہے روانہ ہوا، یہاں وہ کچھ عرصے تک ٹھہرا۔ اس نے یہاں تلوار کے زور سے کچھ حبشی پکڑے اور کچھ دوسرے ذرائع سے حاصل کئے اور دوسرے سامانِ تجارت کے ساتھ کم سے کم تین سو حبشیوں کا گلہ بھی اکٹھا کر لیا۔ اس شکار کے ساتھ وہ سمندر رہوں کو کھیتا ہوا چلا، اُس نے حبشیوں کی پوری تعداد بیچ ڈالی۔ ان کے مبادلے میں اس نے دوسرے سامانِ تجارت کے اتنے بڑے بڑے انبار پائے کہ اس کو اپنے تینوں جہازوں کو کھالوں، ادرک، شکر اور موتیوں سے بھرنے کے بعد دو اور جہاز کرایے پر لینے پڑے ...... اس طرح وہ بڑی کامیابی فارغ البالی اور دولت کے ساتھ گھر لوٹا۔،،

ملکہ الزبتھ اس کی کامیابی اور منافع اندوزی سے بہت متاثر ہوئی۔ اُس نے بھی خواہش کی کہ آئندہ کی مہموں میں وہ بھی اُس کے نفع کی حصہ دار بن جائے ملکہ نے، دوسری مہم کے لئے غلاموں کے تاجر ہاکنس کو ایک جہاز بھی عنایت کیا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس جہاز کا نام ،،مسیح،، تھا۔

اُس زمانے میں تجارت نام تھا، حملے، رہزنی، غارت گری اور لوٹ کھسوٹ کا یہی وہ راہیں تھیں جن کے ذریعہ سے سرمایہ دارانہ پیداوار کے لئے دولت بیکراں اکٹھا کی جا رہی تھی۔ مارکس نے بلا وجہ نہیں لکھا کہ:۔

> ،،اگر روپیہ اپنے ایک رخسار پر خون کے دھبے لے کر جنم پاتا ہے تو سرمایہ سر سے پیر تک ایک ایک روئیں کو خون سے نہلائے اور خاک میں لتھیڑے ہوئے وجود میں آتا ہے،،

تجارت، حملہ، رہزنی، غارت گری اور لوٹ کھسوٹ وہ راہیں ہیں جن سے ہو کر سرمایہ آتا ہے انھوں نے بڑی دولت کمائی، بے اندازہ، وہم و قیاس میں نہ آنے والی دولت ـــــ

جو بڑھتے ہوئے سرمایے کے لئے ایک تازہ رسد کا کام کرتی تھی۔

لیکن دولت کے ان انباروں کے بعد بھی بڑے پیمانے پر سرمایہ دارانہ پیداوار کے لئے اب بھی ایک کسر باقی تھی۔ صرف سرمایہ سرمایے کے طور پر استعمال نہیں کیا جا سکتا۔ صرف سرمایہ نفع نہیں کما سکتا تاوقتیکہ محنت کشوں کی محنت شامل ہو کر اس کو نفع بخش نہ بنا دے۔ اس لئے سرمایے کی بہم کے بعد بھی محنت کرنے والوں کی معقول تعداد کی ضرورت تھی۔

بیسویں صدی عیسوی میں، جب ہر طرف بے روزگاری پھیلی ہوئی ہے اور مزدور گروہ در گروہ روزگار کی تلاش میں مارے مارے پھرتے ہیں یہ یقین آنا مشکل ہے کہ ایک زمانہ ایسا بھی تھا جب کسی کام کے لئے مزدور کا ڈھونڈھ نکالنا آسان نہ تھا۔ ہم کو تو یہ بات بالکل "قدرتی" معلوم ہوتی ہے اور ہم یقین رکھتے ہیں کہ دنیا میں ایک ایسا طبقہ قدرتی طور پر موجود رہنا چاہئے جو اپنی اجرت کے عوض میں کارخانوں میں کام کرے لیکن یہ بات قدرتی تو بالکل نہیں ہے۔ ایک آدمی دوسرے کے لئے کام اسی وقت کرے گا جب وہ ایسا کرنے پر مجبور کر دیا جائے۔ جب تک کسی انسان کے قبضے میں زمین ہے اور وہ اپنی قوت بازو سے اپنا رزق پیدا کر سکتا ہے وہ دوسرے کی غلامی کرنے نہیں جاتا۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی تاریخ اس حقیقت کا ثبوت ہے۔ جب تک مغرب میں سستی اور آزاد زمینیں تھیں۔ زمین کے بھوکے لوگ پچھم کی طرف جاتے ہوئے نظر آتے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ مشرق میں مزدور بڑی مشکل سے ہاتھ آتا تھا۔ یہی واقعہ آسٹریلیا میں بھی پیش آیا۔

> "جب دریائے سوان پر نئی بستی (نوآبادی) بسنے لگی مسٹر پیل تین سو مزدور ساتھ لے کر گئے لیکن یہ معلوم کر کے کہ ان کو بھی زمین مل سکتی ہے۔ وہ ان کو چھوڑ کر چلے گئے اور کوئی ایسا بھی نہ رہا جو مسٹر پیل کا بستر بچھاتا اور ان کے لئے دریا سے پانی بھر لاتا۔"

ہمیں مسٹر پیل سے ہمدردی ہے کہ ان کو اپنا بستر خود بچھانا پڑا۔ ان کو یہ نتیجہ صرف اس وجہ سے بھگتنا پڑا کہ انھوں نے یہ حقیقت پہلے ہی سے نہیں جان لی کہ جب تک کسی شخص کو ذرائع پیداوار (جیسے اس معاملے میں زمین) پر قابو رہے گا وہ کسی دوسرے کی غلامی کرنے نہیں جائے گا۔

جس طرح بعض مزدوروں کے لئے جو زمین پر کام کر سکتے ہیں، زمین ہی ذریعہ پیداوار ہے اسی طرح ان دستکاروں کے لئے جو اپنے کارخانوں میں اپنے اوزاروں سے کام کرتے ہیں۔ ان کے کارخانے اور اوزار ذرائع پیداوار ہیں جب تک یہ کام کرنے والے اپنے اوزاروں سے ایسی چیزیں پیدا کر سکیں گے جو بازار میں بک کر ان کی ضروریات کی چیزیں مہیا کر دیں گی وہ کسی دوسرے کے لئے کام کرنے نہیں جائیں گے۔

پھر آخر سرمایہ داروں کو کیا کرنا چاہیئے تھا؟

یہ کام کرنے والے اسی وقت دوسروں کے لئے کام کرنے جائیں گے جب ان کے پاس نہ زمینیں باقی رہ جائیں گی اور نہ کام کرنے کے لئے ان کے پاس اوزار ہوں گے جب وہ پیداوار کے ان ذریعوں سے بالکل محروم کر دئے جائیں گے تب وہ دوسروں کا کام کریں گے۔ وہ دوسروں کی خدمت اس لئے نہ کریں گے کہ ان کو ایسا کرنے میں مزہ آئے گا بلکہ ان کو اپنی ضروریاتِ زندگی کھانے کپڑے اور مکان کے لئے کچھ پیدا کرنے کی ضرورت ہوگی تاکہ وہ کسی طرح زندہ رہ سکیں۔ ذرائع پیداوار چھن جانے کے بعد ان کے پاس سوا اس کے اور کوئی چارہ نہیں رہ جاتا کہ وہ اپنی ایک بچی ہوئی چیز ——— "اپنی کام کرنے کی طاقت" بیچ ڈالیں۔

"سرمایہ دارانہ پیداوار" کے لئے مزدوروں کی ضروری تعداد کس طرح ہاتھ آئی؟ اس سوال کے جواب میں اگر پھر پوچھ لیا جائے کہ مزدوروں کی اتنی بڑی تعداد اپنے ذرائع پیداوار سے کس طرح محروم کر دی گئی تھی؟ تو یہ داستان خود بخود مکمل ہو جائے۔

"جو طریقہ سرمایہ داری نظام کے لئے راہ ہموار کر رہا ہے وہی مزدوروں کو بھی ذرائع پیداوار سے محروم کر رہا ہے۔ جو طریقہ روزی اور پیداوار کے ذرائع کو بدل کر سرمایے میں شامل کر رہا ہے۔ وہی دراصل روزی اور پیداوار کے پیدا کرنے والوں کو بھی اجرت پر کام کرنے والوں کی جماعتوں میں شامل کر رہا ہے۔ پیدا کرنے والے اور محنت کرنے والے اپنی ذات کو اس وقت فروخت کریں گے جب ان کے پاس بیچنے کے لئے زمین اور اوزار کچھ نہ رہ جائے گا جو شخص

اپنی محنت بیچتا پھرتا ہے وہ اپنا مال تجارت اپنے ساتھ رکھتا ہے اور جہاں بازار پاتا ہے بیچ دیتا ہے۔ ایسے آدمی کو پیشہ ور جماعتوں کے نظام (GILDS) ان کے قواعد امیدواری قواعد جبری کاریگری اور تنظیم محنت کے ضابطوں سے بالکل آزاد ہونا چاہیے ——— یہ نئے آزاد لوگ۔ جب ان کے ذرائع پیداوار اُن سے چھین لیے گئے اور زندگی اور بقا کی وہ تمام ضمانتیں جو جاگیرداری نظام میں اُن کو حاصل تھیں ختم کر دی گئیں۔ اپنے آپ کو بیچنے پر مجبور ہو گئے۔ ان کی داستانِ غم تاریخ کے صفحات میں خون اور آگ کے حروف سے لکھی گئی ہے۔

انگلستان میں بڑے پیمانے پر سرمایہ دارانہ پیداوار کا ارتقا ہوا اس لیے ہم کو اُس کی ابتدا کا پتہ لگانے کے لئے انگلستان ہی میں اپنی تحقیق جاری رکھنی چاہیئے۔ ہم ابتدائی ابواب میں دیکھ چکے ہیں کہ احاطہ بندی اور اضافہ محصول کی تحریک نے سولھویں صدی عیسوی میں کسانوں کے جم غفیر کو ان کے گھروں سے نکال کر سڑکوں پر لا ڈالا تھا۔ خانماں برباد ہونے کے بعد بھیک مانگنے آوارہ گردی اور چوری کرنے کے سوا ان کے پاس اور کوئی ذریعہ نہیں رہ گیا تھا۔ اس طرح اسی زمانے میں بے گھر اور بے ساز و سامان لوگوں کی ایک بھیڑ تیار ہو گئی تھی۔

اٹھارھویں اور انیسویں صدی عیسوی کی ابتدا میں، احاطہ بندی کی تحریک نے پھر زور پکڑا! اس مرتبہ اس کے عمل کا احاطہ اور بھی وسیع تھا۔ ان بد قسمت بے گھروں کی جماعتیں پہلے سے بھی زیادہ بڑھ گئیں اور اجرت پر کام کرنے والوں کی ایک زبردست فوج تیار ہو گئی۔ سولھویں صدی عیسوی میں احاطہ بندی کی تحریک کی مخالفت ان بد قسمت کسانوں نے بھی کی، جو اپنی زمینوں سے بے دخل کئے جا رہے تھے اور حکومت نے بھی، جو عوام کی فاقہ کشی سے بغاوت کا خطرہ محسوس کر رہی تھی اس تحریک کی حوصلہ افزائی نہ کی لیکن اٹھارھویں صدی عیسوی میں احاطہ بندی کی تحریک نے قانونی شکل اختیار کر لی! اور زمینداروں کی حکومت نے جو صرف زمینداروں کے لئے قائم تھی قانونِ احاطہ بندی (ACTS OF ENCLOSURE) منظور کر دیا۔ اب زمینوں پر کام کرنے والے اپنی زمینوں سے محروم کر دئے گئے اور ان کے لئے اپنی محنت کے عوض میں کارخانوں میں کام کرنے کے

سوا اور کوئی چارہ باقی نہیں رہا۔

احاطہ بندی کی تحریک اگرچہ انگلستان ہی کی مخصوص تحریک تھی لیکن یورپ بر اعظم پر اس کا کسی نہ کسی حد تک اثر پڑا۔ ہم کو اس کا ثبوت جیفیس (فرانس) کے کسانوں کی عرضداشت سے ملتا ہے۔ جو انھوں نے اپنے ارکان حکومت کے سامنے ۱۷۹۰ء میں پیش کی تھی:۔

"ہم جیفیس کے کلیسائی حلقے کے باشندے آپ کی خدمت میں اپنی گزارشات پیش کرنے کی ہمت کرتے ہیں اور اپنے حلقے کی چراگاہوں کے متعلق اپنی فریاد اور شکایت پیش کرتے ہیں ہماری ان چراگاہوں پر بعض مالدار، طاقتور اور لالچی لوگوں نے بے انصافی سے قبضہ کر لیا ہے۔ اس کلیسائی حلقے کے رہنے والے، اس فیصلے کے بموجب جو کاونسل نے جیفس کے جاگیرداروں کے حق میں کیا ہے اپنے حق سے محروم ہو گئے ہیں۔ ان لوگوں کے پاس ان زمینوں کے سوا اور کوئی زمین جہاں وہ اپنے جانوروں کو چرا سکیں، موجود نہیں ہے۔ ایسی حالت میں اب ان کے پاس زندگی کا کوئی سہارا باقی نہیں رہا ہے اور وہ انتہائی غربت اور پریشانی کا شکار ہو رہے ہیں بعض معاشین نے ایک نیا نظام نکالا ہے اور وہ لوگوں کو یقین دلانے کی کوشش کرتے ہیں کہ چراگاہیں زراعت کے لئے مفید نہیں ہیں۔ طاقتور امیروں نے جو ردپئے والے لوگ ہیں، ملک کی دولت سے ہماری چراگاہوں پر قبضہ کر کے اپنی دولت بڑھالی ہے۔ ان کلیسائی حلقوں کے لئے ان چراگاہوں سے زیادہ قیمتی اور کوئی چیز نہیں ہے، وہ ان چراگاہوں کے بغیر جانور نہیں پال سکتے، اگر جانور ہی نہ ہوں گے تو کھاد کہاں سے آئے گی اور جب کھاد ہی کا بندوبست نہ ہو گا تو اچھی پیداوار کی امید کیسے کی جا سکے گی؟"

چراگاہوں کے جن حقوق کے لئے یہ فرانسیسی کاشتکار فریاد پیش کر رہے ہیں، ان حقوق کے چھن جانے سے انگلستان کے کسانوں کو بڑا دھکا لگا تھا۔ کامیاب زراعت کے لئے جانوروں کی مناسب پرورش اور دیکھ بھال کے معقول انتظام کی ضرورت ہے۔ جب کسانوں کا ان چراگاہوں پر کوئی حق باقی نہیں رہا تو تباہی میں کسی قسم کے شک کی گنجائش باقی نہیں رہی۔

ان کے دلوں میں ان امیروں کے خلاف جو ان سے ان کی چراگاہیں چھین رہے تھے۔ جذبات کا برانگیختہ ہونا ایک قدرتی بات تھی۔ وہ اُس حکومت کو بھی کوس رہے تھے جس نے ان کی بے دخلی میں ان کے دشمن امیروں کی مدد کی تھی۔ یہ عام ناگواری ہم کو ذیل کی تک بندی میں جو اُس زمانے میں ہر شخص کی زبان پر تھی۔ پوری طرح نمایاں نظر آتی ہے :۔

"قانون اُس مرد اور عورت کو قید خانے میں ڈال دیتا ہے

جو چراگاہ سے ایک چڑیا چرا لے،

لیکن اُس "بڑے بدمعاش" کو چھوڑ دیتا ہے جو

جو چڑیا سے چراگاہ چھین لیتا ہے"

یہ خیال نہ کرو کہ زمینوں کے مالک کاشتکاروں کو اپنی زمینوں سے بے دخل کر کے کارخانوں میں کام کرنے پر مجبور کر رہے تھے۔ یہ بات ان کے حاشیہ خیال میں نہ تھی۔ وہ تو زمین سے زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل کرنا چاہتے تھے۔ اگر احاطہ بندی کرنے میں ان کو زیادہ نفع کی امید ہوتی تو احاطہ بندی ہرگز نہ کرتے۔ زمین کو کھلی چھوڑ کر اٹھانے میں ان کو وہ نفع نہ تھا جو احاطہ بندی سے حاصل ہو رہا تھا۔ آرتھر ینگ نے ۱۷۷۱ء میں شارپ شائر کی سیاحت کے بعد لکھا تھا :۔

"احاطہ بندی کے بعد محصولات تقریباً دگنے ہو گئے ہیں۔ ڈیونٹری سے برسٹن آنے میں ایک احاطہ ملتا ہے جو صرف سال بھر ہوئے قائم کیا گیا ہے۔ کھلی زمین ہونے کی حالت میں اس کا لگان ۶ شلنگ سے لے کر ۸ شلنگ ہوتا تھا۔ لیکن اب یہ بیس سے تیس شلنگ کی شرح سے اٹھا ہوا ہے۔"

ہم کو اسکاٹ لینڈ میں ان بدقسمت مزدوروں کے اپنے کھیتوں سے نکالے جانے کی بہت ہی شرمناک مثالیں ملتی ہیں۔ سدرلینڈ کے ڈچز نے اُن کسانوں کو، جو ایک زمانے سے اُس کی زمینوں پر آباد چلے آ رہے تھے، بے دخل کر دیا تھا۔ کارل مارکس یہ داستان یوں بیان کرتا ہے :۔

جب ان زمینوں پر کوئی مستقل کسان نہ رہا تو جھونپڑوں کا صفایا بولنے کا وقت آیا۔ تاکہ ان کسانوں کو سر چھپانے کے لیے ان زمینوں میں جواب تک اُن کی کاشت میں رہی تھی چپہ بھر جگہ بھی نہ ملے۔ یہ بتانے کے لئے کہ انیسویں صدی عیسوی میں یہ صفایا کس طرح بولا جاتا تھا۔ سدرلینڈ کی ڈچز کے طریقے کا بیان کر دینا کافی ہوگا۔ اس عورت نے، جو اقتصادیات سے خوب واقف تھی طے کیا کہ پورے علاقے کی آبادی، جو مختلف طریقوں سے گھٹاتے گھٹاتے صرف پندرہ ہزار رہ گئی تھی ختم کر کے اس کو بھیڑوں کے فارم سے بدل دیا جائے۔ ۱۸۱۴ء سے لے کر ۱۸۲۰ء تک ان پندرہ ہزار باشندوں کا، جو تین ہزار گھروں پر مشتمل تھے، باقاعدہ منظم تحریک کے ماتحت شکار کھیلا گیا اور آخر کار انھیں باہر نکال کر دم لیا گیا، ان کے پورے پورے گاؤں برباد کر کے پھونک دئے گئے اور ان کی زمینیں چراگاہوں سے تبدیل کر دی گئیں۔ برطانوی سپاہیوں نے، جن کے سپرد بے دخلی کی مہم تھی، باشندوں کو مارا پیٹا۔ ایک بوڑھی عورت نے اپنا جھونپڑا چھوڑنے سے انکار کیا، وہ اپنے جھونپڑے کے ساتھ زندہ پھونک دی گئی۔ اس طرح اس اچھی عورت نے سات لاکھ چورانوے ہزار ایکڑ زمین پر، جو صدہا برس سے اس بدقسمت قبیلے کی ملکیت تھی قبضہ پایا۔"

سولھویں صدی عیسوی سے لے کر انیسویں صدی کی ابتدا تک انگلستان میں کسانوں کی بیدخلی کا عمل جاری رہا۔ فرانس میں چھوٹے کسانوں کا طبقہ کچھ بڑھا لیکن انگلستان میں جہاں صنعتی سرمایہ داری بڑی تیز رفتاری سے ہر جگہ قدم جما رہی تھی چھوٹے کسانوں کا طبقہ قریب قریب ختم ہو گیا۔ ڈاکٹر آر۔ پراکس جو اٹھارھویں صدی عیسوی کا مصنف ہے یہ ماجرا یوں بیان کرتا ہے۔

"جب یہ زمین چھوٹے کسانوں کے ہاتھوں سے نکل گئی بڑے کسانوں کے ہاتھوں میں آتی ہے تو نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ چھوٹے کسان اُس جماعت میں تبدیل ہو جاتے ہیں جو اپنا رزق پیدا کرنے کے لئے دوسروں کا کام کرنے پر مجبور ہوتی ہے۔ شہر اور کارخانے بڑھیں گے اس لئے اس قسم کے کسانوں کی بڑی تعداد روزگار کی تلاش میں ان مقامات کی طرف بھاگے گی مجموعی طور پر انسانوں

کے اس نچلے طبقے کے حالات خراب سے خراب تر ہو گئے ہیں۔ زمین کے چھوٹے مالک کی حیثیت سے محروم کر کے وہ مزدور اور بھاڑے کے ٹٹو ہو کر رہ گئے ہیں"۔

یہ واقعہ کی بہت صحیح تصویر ہے، اپنی زمینوں سے نکالے جانے کے بعد یہ چھوٹے چھوٹے کسان دن بھر برائے چاکری کرنے والے بن گئے۔ احاطہ بندی کی تحریک وہ پہلا اور خاص طریقہ تھا جس پر عمل کر کے مزدوروں کی ضروری تعداد بہم پہونچائی گئی۔

احاطہ بندی کے علاوہ دوسرے طریقے بھی تھے جو مزدوروں کی فراہمی کے لئے اختیار کئے جا رہے تھے فیکٹری سسٹم نے بھی، جو اگرچہ غریبوں کی تباہی میں بہت نمایاں مقام نہیں رکھتا۔ مزدوروں کی فراہمی میں بہت امداد کی۔ اس نظام نے دستکاروں کو اپنی صنعت کی پیداوار کے ذرائع سے محروم کر دیا اور وہ بھی مجبور ہو کر چھوٹے کسانوں کی طرح مزدوروں کی بھیڑ میں شامل ہو گئے۔

۱۸۰۶ء میں دارالعوام کے سرکاری اخبار نے ایک رپورٹ شائع کی تھی، یہ رپورٹ اُس کمیٹی نے پیش کی ہے، جو انگلستان کے اونی کپڑوں کے کارخانوں کی حالت پر غور کرنے کے لئے قائم کی گئی تھی۔ اس رپورٹ میں آیا ہے کہ:۔

"یہاں مضافات میں عرصے سے چند فیکٹریاں قائم ہیں۔ یہ بہت دنوں سے گھریلو پارچہ بافوں کے رشک وحسد کا شکار بنی ہوئی ہیں۔ بہت سے شبہات ظاہر کئے جاتے ہیں کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ فیکٹری سسٹم گھریلو پارچہ بافی کی صنعت کو جڑ سے اکھاڑ پھینکے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ چھوٹے مالک کارخانہ دار، جو اس وقت صرف اپنی روزی کے لئے محنت کرتے ہیں اجیر کاریگروں کی حیثیت اختیار کرنے پر مجبور ہو جائیں اور ان کو اجرت لے کر پرایا کام کرنا پڑے"۔

اس رپورٹ میں گھریلو پارچہ بافوں کے جو شبہات بیان کئے گئے ہیں وہ آگے چل کر واقعہ بن گئے۔ یہ سمجھنا دشوار نہیں کہ ایسا کیوں کر ہوا ہوگا۔ ان فیکٹریوں میں طاقتور انجن مشین چلاتے تھے تقسیم کار کے اصول سے کام ہوتا تھا۔ اس لئے بہت کم وقت میں بہت زیادہ چیزیں تیار ہوتی

تھیں اور اُن چیزوں کے مقابلے میں، جو ہاتھ سے کام کرنے والے دست کار تیار کرتے تھے بہت سستی پڑتی تھیں۔ اس مقابلے میں جو مشین اور ہاتھ کے کام میں ہو رہا تھا، مشین کی جیت یقینی تھی۔ وہ جیتی اور نہ ہزاروں دستکار، جو اپنے چھوٹے چھوٹے گھریلو کارخانوں کے مالک تھے، بے روزگار ہو گئے اور ان کو اجیر کاریگروں کی حیثیت سے اجرت پر کام کرنا پڑا۔ ان لوگوں میں غیرت مندوں کی ایک بڑی تعداد عرصے تک فقر و فاقے کی زندگی بسر کرتی رہی لیکن ہار ان کو بھی ماننی ہی تھی۔ کچھ دن جھیل کر انھوں نے بھی ہتھیار ڈال دئیے۔

۱۸۴۰ء میں دارالعوام نے ایک اور رپورٹ جو دستی پارچہ بافوں کے اسسٹنٹ کمشنروں نے مرتب کی تھی شائع کی تھی۔ اس رپورٹ میں دکھایا گیا ہے کہ ان دستی پارچہ بافوں کا دقیانوسی ذرائع پیداوار پر اصرار کچھ موزوں نہ تھا۔ رپورٹ میں آیا ہے:۔

"مقابلہ جو اجرتوں میں تخفیف کا بڑا سبب ہے شروع ہو گیا ہے اور یہ کوشش جاری ہے کہ مال دوسروں سے کم قیمت پر بیچا جائے۔ ان حالات نے بڑا تغیر پیدا کر دیا ہے۔ ایک پارچہ باف اپنی بیوی اور بچوں کی مدد سے صرف چند کپڑے بنا پاتا تھا۔ اس نے اپنی خدمات بڑے کارخانوں میں لگا دی ہیں۔ بہت سے پرانے مالک اب اجیر کاریگروں کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔ غربت نے ان کے پاس کچھ باقی نہیں چھوڑا ہے۔"

فلپ گیسکل کی مشہور کتاب ۱۸۳۶ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس کتاب میں دکھایا گیا ہے کہ کس طرح قیمتوں کی تخفیف نے جو مقابلے کی وجہ سے پیدا ہوئی تھی ان دستی پارچہ بافوں پر اثر ڈالا تھا۔ وہ لکھتا ہے۔

"بھاپ کے انجنوں کے رواج پانے کے بعد سے دستی پارچہ بافوں کی زندگیوں پر بڑا غیر معمولی اور دردناک اثر پڑا۔ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ بھاپ کے انجنوں نے ان غریبوں کو کچل ڈالا۔ ذیل کے نقشے سے یہ اچھی طرح معلوم ہو جائے گا کہ ایک خاص کپڑے کی قیمت میں چند سالوں میں کتنا غیر معمولی فرق ہو گیا تھا:"

سنہ ۱۷۹۵ء	میں	۳۹٫۹
سنہ ۱۸۱۰ء	میں	۱۵٫۵
سنہ ۱۸۳۰ء	میں	۵٫۰

یہ کوئی تنہا مثال نہیں ہے۔ یہ ان تمام محنت کشوں کا حال ہے جو اس صنعت میں لگے ہوئے ہیں"

دستی مصنوعات کی قیمتوں میں یہ غیر معمولی کمی ہمارے سامنے بڑی دردناک صورت حال پیش کرتی ہے۔ ان حالات سے تنگ آکر غریب پارچہ باف نے اپنا کرگا بیچ ڈالا اور آگے بڑھ کر فیکٹری کے دفتر میں جا پہونچا۔ یہاں وہ ان بیکاروں کے گروہ میں، جو اسی طرح اپنی اپنی صنعتیں چھوڑ کر آئے تھے، شامل ہو گیا۔ اس طرح مشین کی پیداوار نے دستی کاریگروں کو تباہ کرکے اپنے لئے مزدوروں کی ایک بھیڑ جن کے بغیر اس کی بقا ممکن نہ تھی، اکٹھا کرلی، اس طرح مزدوروں کا ایک طبقہ جس کے پاس کوئی ملکیت نہ تھی، وجود میں آگیا۔ دولت کے انباروں کے ساتھ، جو صنعتی سرمایہ داری کی بنیاد قائم کر چکا تھا۔ ایسا ہونا لازمی تھا۔

اب پیداوار اور مبادلے کے طریقوں میں بڑا انقلابی تغیر ہو گیا تھا ہم اس تغیر کو جاگیرداری نظام کا خاتمہ اور سرمایہ داری عہد کی ابتدا سمجھتے ہیں۔ اب یہ بات سوچنے کے لائق ہے کہ اس تغیر نے قدیم سائنس، قانون تعلیم، حکومت اور مذہب پر کیا اثر ڈالا؟ انقلاب کی زد سے یہ بھی نہ بچے اور ان کو بھی اپنی جگہ چھوڑنی پڑی سنہ ۱۸۰۰ء میں قانون نے اپنا ڈھانچہ بالکل بدل دیا تھا اور اب اس کی شکل نہیں رہ گئی تھی جو سنہ ۱۲۰۰ء میں نظر آتی تھی۔ مذہبی تعلیمات کے ساتھ بھی یہی صورت پیش آئی "پروہت اور جنگ آزما" طبقے اپنا وقار کھو چکے تھے اب سماج پر تاجروں، کارخانہ داروں اور بڑے بینکروں کی حکومت تھی۔ ان کو بالکل دوسری قسم کی تعلیمات کی ضرورت تھی۔ وہ زمانہ ختم ہو چکا تھا جب صرف اپنے اور اپنے بال بچوں کے لئے روزی پیدا کرنی پڑتی تھی۔ اس زمانے میں چرچ کے لئے یہی مناسب تھا کہ وہ نفع خوری کے خلاف وعظ کہتا۔ لیکن اس بدلے ہوئے زمانے میں جب انسان کا بنیادی مقصد نفع کمانا تھا، چرچ کو بھی اپنے وعظ کا انداز بدلنا پڑا۔

رومن کیتھولک کلیسا قدیم جاگیرداری نظام کے ساتھ، جس میں دستکاروں کو صرف اپنے اور اپنے متعلقین کے لئے روزی پیدا کرنی تھی بندھا ہوا تھا، نئے نظام کے ساتھ فوراً چولا بدلنا اُس کیلئے ممکن نہ تھا۔ یہ دشواری پروٹسٹنٹ چرچ نے حل کردی۔ یہ چرچ کئی شاخوں میں تقسیم ہوگیا تھا لیکن ہر شاخ میں وہ سرمایہ دار جو مزید نفع اور دولت کے بھوکے تھے اپنے ضمیر کا اطمینان کم وبیش پا سکتے تھے۔

کیتھولک چرچ نے تعلیم دی تھی کہ وہ راستہ جو دولتمندی کی طرف لے جاتا ہے جہنم کا راستہ ہے لیکن پیورٹین[1] طبقے کے سرگروہوں نے وعظ کہا کہ اگر کوئی دولت حاصل کرنے کے تمام مواقع سے پورا فائدہ نہیں اٹھا رہا ہے تو خدا کی عبادت کا صحیح حق نہیں ادا کر رہا ہے :-

"اگر خدا تم کو وہ راستہ دکھاتا ہے جس پر چل کر تم دوسرے راستے کے مقابلے میں آئینی طور پر (اپنی یا کسی دوسرے کی روح کو نقصان پہونچائے بغیر) زیادہ دولت پیدا کرسکتے ہو اور تم اس راستے کو چھوڑ کر دوسرا راستہ جس پر کم نفع ہو اختیار کرنا چاہتے ہو تو تم خدا کے منتظم دولت ہونے سے انکار کرتے ہو اور اُس کے تحفے کو رد کرتے ہو اور یہ موقع کھوتے ہو کہ جب اس کو ضرورت ہو اس کیلئے یہ دولت استعمال کرو۔ تم خدا کے لئے دولتمند ہونے کی کوشش کرسکتے ہو نہ کہ تن پروری اور گناہ کے لئے۔"

میتھوڈسٹ طبقے کا رہنما وِسلے لکھتا ہے :-

"تم کسی شخص کو محنتی اور کفایت شعار بننے سے نہ روکو۔ ہم کو چاہئے کہ ہم تمام عیسائیوں کو ترغیب دیں کہ وہ جتنا زیادہ سے زیادہ حاصل کرسکیں حاصل کریں اور جتنا زیادہ سے زیادہ بچا سکیں بچائیں، دراصل دولتمند بننے کا یہی طریقہ ہے۔"

کالونسٹ طبقہ بھی کسی سے پیچھے نہیں رہا۔ سولھویں صدی عیسوی میں جب پروٹسٹنٹ طبقے نے اصلاح و تجدید کی تحریک شروع کی تھی، سرمایہ اکٹھا کرنے کے مواقع (جو بڑے پیمانے پر سرمایہ دارانہ پیداوار کے لئے بہت ضروری تھا) بے شمار تھے اس لئے کالونسٹ طبقے نے بھی سرمایہ پرست مہم جو طبقے کے مطلب

---

[1] پیورٹین (PURITEN) پروٹسٹنٹ طبقے کا ایک رکن جس کے نزدیک جو کلیسا کی اصلاح کے ساتھ ساتھ تمام بدعات کی تنسیخ کو سطالبہ کرتا تھا۔

کی باتیں کہیں حالانکہ اس سے پہلے کیتھولک چرچ ان تاجروں کو جو دولت کی ہوس میں گرفتار تھے گنہگار سمجھتا تھا۔ پروٹسٹنٹ کالون نے کہا :۔

"آخر تجارت کا نفع زمینداری کے نفع سے زیادہ کیوں نہ ہو، تجارت کا منافع تاجر کی محنت اور ہنرمندی کے سوا اور کہاں سے آتا ہے۔"

اگر کالونیسٹ (CALVINISM) اُبھرتے ہوئے بورژوا طبقے کا مذہب بن گئی تو تعجب کی کیا بات ہے؟

ہم امریکہ میں پیوریٹن کو خوب پہچانتے ہیں۔ یہ کالون ہی کے پیرو تھے اور نیو انگلینڈ میں آباد ہو گئے تھے، ہماری تاریخی کتابیں اُس مضبوط ہاتھ کی مدح و ثنا سے لبریز ہیں جس کا مقصد خدا کی عظمت و شان بڑھانے کے سوا کچھ اور نہ تھا۔ ہمیں خوب معلوم ہے کہ وہ اپنے مقصد کے حصول کے لئے بڑی محنت سے منظم زندگی گذارتے تھے۔ ان کی زندگی میں جزرسی اور کڑی محنت دونوں خوبیاں بڑی اہمیت کی مالک تھیں۔ عیش پرستی، فضول خرچی اور کاہلی ان کے نزدیک قابل نفرت برائیاں تھیں۔ ان تمام باتوں کو ایک دوسرے زاویۂ نگاہ سے دیکھو۔

ایسے اقتصادی نظام کے لئے جس کی بنیادیں دولت کے انبار اور مسلسل سخت محنت سے دو پتھر لگائے گئے ہوں، ان خوبیوں کے سوا جن کی تعلیم کالون کے ان پیرؤوں نے دی ہے اور کیا موزوں ہو سکتا ہے؟ ان کے نزدیک وہی انسان سب سے اچھا سمجھا جاتا تھا جس کا ہر قدم حصول دولت کے لئے بڑھا ہو، یہ عقیدہ سرمایہ داری نظام کی روح سے کتنا قریب ہے۔

بنجمن فرینکلن ان ممتاز ہستیوں میں تھا جن کے اندر یہ روح پوری طرح زندہ تھی، اُس نے اپنی کتاب "غریب رچرڈ کا المانک" میں پیوریٹین زندگی کی تمام اعلیٰ صفات آسان اور سیدھے سادے جملوں میں لکھ دی ہیں۔

"وہ آدمی کبھی شاندار نہیں ہو سکا جس نے سخت محنت کی عادت نہیں ڈالی۔"

"نفع کی امید محنت کی تکلیف کم کر دیتی ہے۔"

"ورتم اپنی دوکان رکھو تمھاری دوکان تم کو قائم رکھے گی۔"

وہ نوجوان تاجروں کو نصیحت (ADVICE TO YOUNG TRADE MEN) میں لکھتا ہے

"مختصر یہ ہے کہ اگر تم چاہتے ہو تو دولت کی راہ اتنی آسان اور صاف ہے جتنی بازار کی راہ۔ یہ صرف دو لفظوں پر منحصر ہے، صنعت اور جز رسی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ نہ وقت ضائع کرو اور نہ روپیہ۔ جو شخص وہ سب کچھ پیدا کر لیتا ہے جو وہ ایمانداری سے پیدا کر سکتا ہے اور جو کچھ پیدا کرتا ہے وہ سب کچھ بچا لیتا ہے وہ یقیناً مالدار ہو جائے گا۔"

یہی سرمایہ داری کی روح ہے، کالون طبقے کے نزدیک یہ نصیحت کوئی عام نصیحت نہ تھی بلکہ وہ مسیحی زندگی کے اعلیٰ نمونے کی طرف رہنمائی کا کام کرتی تھی۔ خدا کی عظمت و شان بڑھانے کی شکل اس کے سوا اور کیا ہو سکتی تھی کہ اس کی تعلیمات کو عملی جامہ پہنایا جاتا۔

اب اگر تم سے کوئی شخص کہے کہ "یہ انسانی فطرت کا تقاضا ہے کہ وہ نفع کی آرزو کرے" تو تم اس کو آسانی سے بتا سکتے ہو کہ "یہ انسانی فطرت کس طرح بن گئی۔ تم اس کو دکھا دو کہ "بچانا" اور "بچا بچا کر تجارت میں لگانا" جاگیرداری نظام میں درست نہ تھا لیکن رفتہ رفتہ یہی عادت سرمایہ داری سماج کا نشان امتیاز بن گئی اور خدا کی عظمت و شان کے لئے دولت کا حصول ضروری ٹھہرا۔ رفتہ رفتہ انیسویں صدی میں:-

"بچانا اور بچا بچا کر تجارت میں لگانا ایک بڑے طبقے کا فرض بن گیا اور اس کو اسی میں لطف آنے لگا۔ بچی ہوئی رقم شاید ہی کبھی نکالی جاتی ہو وہ جمع رہتی ہے اور اس پر سود در سود لگتا رہتا ہے۔ اس صورت سے بڑی مادی فتح جس کو ہم سب یقینی سمجھتے ہیں حاصل ہوتی ہے۔ اخلاق، سیاست، ادب اور مذہب سب نے ایک دوسرے سے اشتراک عمل کر کے دولت جمع کرنے کی بڑی زبردست سازش کی ہے۔ خدا اور دولت کے شیطان نے مصالحت کر لی ہے اور اب امن اسی شخص کے لئے ہے جو خدا کی زمین پر بڑی بھاری دولت کا مالک ہے۔ ایک مالدار آدمی اگر چاہے تو خدا کی بادشاہت میں روپیہ جمع کر کے داخل ہو سکتا ہے۔"

دولت کے ڈھیروں نے جو ابتدائی تجارت کی راہ سے آئے تھے اس خانماں برباد مزدور

طبقے سے مل کر صنعتی سرمایہ داری کی بنیاد ڈالی۔ فیکٹری سسٹم نے بھی دولت کے انبار میں معتدبہ اضافہ کر دیا۔ اس نئی دولت کے مالکوں نے یقین کرنا شروع کیا کہ اگر وہ دولت بچا بچا کر اکٹھا کریں اور پھر اس دولت کو تجارت یا صنعت میں لگا دیں تو خدا کی بادشاہت کے حقدار ثابت ہو سکتے ہیں۔

اس طرح یہ نیا نظام، جسے ہم اچھی طرح جانتے ہیں، وجود میں آیا۔

انقلاب

صنعت زراعت اور نقل وحمل کے ذرائع میں

ڈیڑھ سو سال پہلے کے اخبارات میں "تم کو یقین آئے یا نہ آئے" کے عنوان کے ماتحت حیرتناک اور ناقابل یقین واقعات کے متعلق کارٹونوں کا رواج نہ تھا۔ اگر یہ دستور ہوتا تو ۱۱ر مارچ ۱۷۷۶ء کے برمنگھم گزٹ میں ذیل کی تعجب خیز خبر اپنی موزوں جگہ ضرور پاتی :-

"گذشتہ جمعہ کو ایک بھاپ کا انجن، جو مسٹر واٹ کے نئے اصولوں کے مطابق بنایا گیا ہے بلوم فیلڈ کی کوئلے کی کان میں چلایا گیا، اس وقت معزز سائنسدانوں کی ایک اچھی خاصی جماعت موجود تھی۔ ایک انوکھی اور طاقتور مشین کی پہلی جنبش اور رفتار دیکھ کر ان کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ یہ مثال دیکھ کر ناتجربہ کار لوگوں کے شبہات دور ہو گئے اور ایجاد کی اہمیت اور افادیت آخری طور پر تسلیم کر لی گئی۔ اس کو مسٹر واٹ نے برسوں کے مطالعہ محنت شاقہ اور بے شمار اور بے حد مہنگے تجربوں کے بعد ایجاد کیا ہے۔"

۱۸۰۰ء تک مسٹر واٹ کی ایجاد کی اہمیت اور افادیت انگریزی قوم کے نزدیک اتنی مسلم ہو گئی تھی کہ اس کا استعمال تیس کوئلے کی کانوں، بائیس تانبے کی کانوں اٹھائیس صفار خانوں، سترہ شراب کی بھٹیوں اور چوراسی سوت کی ملوں میں کیا گیا۔

مشینوں کی ایجاد تاکہ ان سے آدمیوں کا کام لیا جا سکے ایک پرانی داستان بن چکی ہے لیکن ان مشینوں میں بھاپ انجنوں کا اضافہ پیداوار کے قدیم طریقوں میں بڑے تغیر کا موجب ہوا ان بھاپ انجنوں نے فیکٹری سسٹم کو بڑے اعلیٰ پیمانے پر کام کا موقع دیا۔ تمہارے پاس ایسی

فیکٹریاں ہو سکتی ہیں جن میں مشینیں نہ ہوں لیکن تم کو ایسی کوئی مشین نہ ملے گی جو بھاپ کی طاقت سے چلتی ہو اور اس کی مدد سے متعدد فیکٹریاں نہ چل رہی ہوں۔

فیکٹری سسٹم نے اپنی زبردست تنظیم اور تقسیم کار کی مدد سے پیداوار میں بڑا اضافہ کیا۔ مال کی بڑی بڑی کھیپیں کارخانوں سے باہر نکلنے لگیں۔ پیداوار میں یہ اضافہ اس سرمایے کی وجہ سے بھی ہوا تھا جو نفع کی امید پران کارخانوں میں لگایا جارہا تھا۔ کسی حد تک بازار کی بڑھتی ہوئی طلب بھی اس اضافہ کی موجب تھی۔ نئی دریافت کی ہوئی نوآبادیوں میں بھی بازار کھل گئے تھے اس لئے طلب میں اور بھی اضافہ ہو رہا تھا۔ ایک اور وجہ تھی۔ فیکٹری کی بنی ہوئی چیزوں کی طلب اپنے ملک کے بازار میں بیرونی ممالک کے بازاروں سے کم نہ تھی۔ اس طلب کی وجہ انگلستان کی بڑھتی ہوئی آبادی کے سوا کچھ اور نہ تھی۔

اٹھارھویں صدی عیسوی کے مورخین بحث کیا کرتے تھے کہ انگلستان کی آبادی میں اضافہ شرح پیدائش کے بڑھ جانے کی وجہ سے ہوا ہے یا شرح اموات گھٹ جانے کی وجہ سے آبادی اتنی بڑھ گئی۔ دونوں پہلو اپنی جگہ پر صحیح تھے لیکن اب خیال کیا جانے لگا ہے کہ شرح اموات میں کمی بڑی حد تک اس اضافے کا موجب تھی۔ لیکن آخر شرح اموات گھٹنے کے وجوہ کیا تھے؟ شاید اس وجہ سے کہ ڈاکٹروں نے اپنے پیشے کے متعلق کچھ زیادہ معلومات بہم پہونچالی تھیں۔ اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اب وہ لوگ جو عام حالات میں مرجایا کرتے تھے زندہ رکھے جاسکتے تھے۔ لندن کے ہسپتالوں میں ماؤں اور بچوں کی اموات کا جو ریکارڈ موجود ہے اُس سے ہم کو ان کی شرح اموات میں ناقابل یقین حد تک کمی کا پتہ چلتا ہے:۔

اموات کا تناسب	۱۷۴۹-۱۷۵۳ء	۱۷۹۹-۱۸۰۰ء
عورتیں	۴۲ میں ۱	۹۱۴ میں ۱
بچے	۵ میں ۱	۱۱۵ میں ۱

ان اعداد وشمار سے اصل صورت حال پر اچھی خاصی روشنی پڑتی ہے ۱۷۰۰ء سے پہلے ایک

صدی میں انگلستان کی آبادی بقدر دس لاکھ بڑھ جایا کرتی تھی لیکن ۱۷۰۰ء اور ۱۸۰۰ء کے درمیان یہ اضافہ بڑھ کر تیس لاکھ تک جا پہونچا۔

اضافہ آبادی کی ایک وجہ اور بھی ہوسکتی ہے۔ زراعت میں غیر معمولی ترقی ہو چکی تھی۔ اب لوگوں کو کھانے پینے کی کوئی کمی نہ تھی (زراعت میں ترقی بھی بڑی حد تک آبادی میں اضافے کی وجہ سے ہوئی تھی) جس طرح صنعتی دنیا میں انقلاب ہو چکا تھا اسی طرح زراعت میں بھی حیرت انگیز تبدیلیاں عمل میں آئی تھیں۔

کسی اسکول جانے والے انگریز بچے سے پوچھا جائے کہ ۱۶۴۹ء میں کیا اہم واقعہ پیش آیا تھا؟ تو وہ جواب دے گا کہ اس سنہ میں چارلس اول کی وفات ہوئی تھی لیکن وہ یہ نہ بتا سکے گا کہ اس سال کا سب سے اہم واقعہ ہالینڈ سے شلجم اور دوسری چیزوں کا (جن کی جڑیں استعمال کی جاتی ہیں) انگلستان میں آکر رواج پانا ہے۔ وہ اسکول کا بچہ یہ جواب کیوں دے؟ آخر شلجم کی اتنی اہمیت ہی کیا ہے؟

تم بالکل ابتدائی صفحوں میں کھیتی (THREE FIELD SYSTEM) کے نظام کا خاکہ دیکھو تم کو تہائی زمین بالکل خالی پڑی ہوئی نظر آئے گی۔ یہ بڑا زبردست نقصان تھا۔ شلجم اور تپتیا گھاس نے اس نقصان کی تلافی کردی اور اب چو کھیتی نظام (FOUR COURSE SYSTEM) نے پرانے کھیتی نظام کی جگہ لے لی۔ اس نظام کی ترتیب یہ تھی۔

پہلے سال ــــــ گیہوں	دوسرے سال ــــــ شلجم
تیسرے سال ــــــ جو	چوتھے سال ــــــ تپتیا گھاس

کھیتی کے نظام میں اس اضافے سے ایک بڑی ضرورت پوری ہو گئی۔ اب ایک بڑی دشواری حل ہو گئی تھی۔ اب دو مسلسل فصلوں کی کاشت سے زمین کے کمزور ہونے کا اندیشہ جاتا رہا تھا اور اب زمین کے خالی رکھنے کے نقصان سے بھی نجات حاصل ہو گئی تھی۔

شلجم اور تپتیا گھاس کے رواج نے زمین ہی کو قوت نہیں دی بلکہ جانوروں کے سرمائی چارے کا بھی معقول انتظام کر دیا۔ اس سے پہلے جانوروں کو (جن کے چارے کی کوئی تدبیر نہ ہوتی تھی)

جاڑوں میں ذبح کر کے کھا لیا جاتا تھا۔ اب اس ترقی سے ان کو جاڑوں میں بھی زندہ رکھنے کا امکان پیدا ہو گیا تھا۔

اسی زمانے میں جانوروں کی نسلوں میں ترقی کا کام بھی شروع ہوا۔ ذیل کے خاکے سے پتہ چل جائے گا کہ اسمتھ فیلڈ کے بازار میں جو جانور فروخت ہوتے تھے ان کے اوزان بھی اب بڑھ گئے تھے۔

	اٹھارھویں صدی کی ابتدا میں	اٹھارھویں صدی کے آخر میں
گائیں	۳۷۰ پونڈ	۸۰۰ پونڈ
بچھڑے	۵۰ 〃	۱۴۸ 〃
بھیڑیں	۲۸ 〃	۸۰ 〃

اٹھارھویں صدی عیسوی میں ان مشینوں اور اوزاروں میں جن کی کارخانوں میں ضرورت پڑتی تھی بڑی ترقیاں ہوئی تھیں۔ اسی قسم کی ترقیاں زراعت میں بھی ہوئیں اور ترقی یافتہ ہلوں اور کدالوں نے پرانے دقیانوسی ہلوں اور کدالوں کی جگہ لے لی۔

احاطہ بندی کی تحریک، جو خانماں برباد کسانوں کی تباہی کا باعث ہوئی تھی زراعت کے ڈھنگوں میں بڑی تبدیلیوں کا موجب ہوئی۔ ان چھوٹے چھوٹے کسانوں کے ہٹنے کے بعد بڑے پیمانے پر کھیتی شروع کی گئی اور کھیتی کے طریقے، علم اور کھیتی کے اوزار ہر چیز میں حیرت انگیز ترقی ہوئی۔ احاطہ بندی کی تحریک سے پہلے، جب زمینیں کھلی ہوئی پڑی تھیں اور عام چراگاہ کی حیثیت سے استعمال کی جاتی تھیں۔ یہ انتظامات ممکن نہ تھے۔

آبادی کے اضافے سے یہ امید ہو چلی تھی کہ اب اگر بڑے پیمانے پر کھیتی کی جائے تو بڑے منافع کا موجب ہوگی۔ زمینوں کے مالکوں نے، جو نفع کے بھوکے تھے کھیتی کے کاروبار میں بڑا سرمایہ لگا دیا۔ نتیجہ بھی توقع کے خلاف نہ نکلا، پیداوار پہلے سے بہت زیادہ اور اچھی ہوئی۔ پیداوار کی کثرت نے آبادی کے اضافے کے لئے اور راہیں بھی کھول دیں۔

زرعی اور صنعتی انقلابوں نے نقل و حمل کے ذرائع میں بھی بڑی زبردست تبدیلیاں پیدا

کر دیں۔ بہت کم مدت میں بڑی زبردست پیداوار اپنے نتیجے کے لحاظ سے بیکار اور غیر نفع بخش رہتی اگر ان لوگوں تک جو ان کے طلبگار تھے، اس کے جلد پہونچانے کے ذرائع پیدا نہ کیے جاتے۔ اس زمانے میں سڑکیں اچھی نہ تھیں۔ ان کی خرابی اپنی انتہا کو پہونچی ہوئی تھی۔ اٹھارھویں صدی عیسوی میں مارکوئس آف ڈاؤن شائر کو ایک سفر میں اپنے ساتھ مزدوروں کی ایک بھیڑ رکھنی پڑی تھی تاکہ وہ راستہ صاف کرتے چلیں کہیں کہیں یہ مزدور مارکوئس کی گاڑی اپنے کاندھوں پر لاد لاد کر دلدلوں سے باہر نکالتے تھے۔ سڑکوں کی جو حالت مارکوئس کے لئے تکلیف دہ تھی وہ ان کارخانہ داروں کے لئے، جو بڑھتے ہوئے بازار کی طلب پوری کرنے کے لئے اپنی مصنوعات جلد سے جلد بھیجنا چاہتے تھے، ناقابل برداشت تھی۔ ان کو سستے، تیز اور باقاعدہ ذرائع نقل و حمل کی ضرورت تھی۔ بعض کارخانہ بعض موزوں جگہوں پر خام پیداوار کے ڈھیر لگانے میں نفع سمجھتے تھے۔ (مثلاً لنکا شائر میں روئی) ان کو بھی اس پیداوار کے جلد منتقل کرنے کے لئے اسی قسم کی سہولتوں کی فکر تھی۔

اٹھارھویں صدی عیسوی کی یہی ضرورتیں تھیں، جو سڑکوں کی تعمیر اور نہروں کی کھدائی کی موجب ہوئیں۔ میکاڈم روڈ (جان میک آدم۔ انجنیر کی سڑک) ہم سب جانتے ہیں، انیسویں صدی کی ابتدا میں بنی تھی، اس کے بعد ہی ریل اور بھاپ سے چلنے والے جہازوں کا رواج شروع ہو گیا۔ اسی دوران میں دریاؤں کے پیٹے اور گہرے کیے گئے اور لمبی لمبی نہریں کھودی گئیں نقل و حمل کی آسانیوں نے بازار کی وسعت ہی میں اضافہ نہیں کیا بلکہ دنیا کے بازاروں بھی ایک طرح سے گھر ہی کا بازار بنا دیا۔

آبادی میں اضافہ، ذرائع نقل و حمل میں انقلاب، زراعت اور صنعت کی غیر معمولی ترقیاں سب آپس میں ایک دوسرے سے رشتہ رکھتی تھیں اور بڑی حد تک ایک دوسرے پر منحصر بھی تھیں یہی وہ سب اسباب تھے، جو "جہانِ تازہ" کی تخلیق کا باعث ہو رہے تھے۔

تم بوتے ہو، دوسرا کاٹتا ہے

"خدا کی پناہ! اور ہڑتالیے؟ میں تو ان ہڑتال کرنے والوں سے عاجز آ گئی ہوں۔ یہ ہمیشہ سڑکوں پر اِدھر اُدھر گھومتے اور دوکانوں، اور کارخانوں پر دھرنا دیتے پھرتے ہیں۔ یہ اپنے ساتھ اپنی منحوس تنظیم کے نشانات بھی لیے لیے گھومتے ہیں۔ آخر حکومت ان کو قید خانوں میں بند کیوں نہیں کر دیتی۔"

ناراض عورت جس نے بس پر بیٹھ کر یہ جملے کہے تھے، اپنی تاریخ سے ناواقف نہ تھی۔ وہ سمجھتی تھی کہ اُس نے ایک بہت آسان نسخے کا بہت سیدھا سادہ حل پیش کر دیا ہے لیکن وہ غلطی پر تھی، اُس کے حل کی بارہا آزمائش کی جا چکی تھی لیکن کبھی وہ صحیح نہیں ثابت ہوا تھا۔ لندن کے ایک مجسٹریٹ نے سو سال ہوئے وزارتِ داخلہ کو ان اسٹرائکوں کے کچلنے کی ایک تدبیر لکھ بھیجی تھی۔ یہ مجسٹریٹ لکھتا ہے:-

"میں تجویز کروں گا کہ ان سب کو جنھوں نے کام چھوڑ دیا ہے گرفتار کر لیا جائے اور انھیں پاؤں سے چلانے والی چکیوں پر مشقت کے لیے بھیج دیا جائے۔"

۱۸۳۰ء میں مجسٹریٹ نے بالکل وہی تجویز، جو آج یہ عورت پیش کر رہی تھی، اپنی حکومت کو بھیجی تھی لیکن اُس کا کیا نتیجہ نکلا؟ کوئی اس عورت سے پوچھے؟

انیسویں صدی کے اُس مجسٹریٹ اور بیسویں صدی کی اس عورت دونوں کو نہیں معلوم کہ یہ مزدور محض تفریح طبع کے لیے جھنڈے لئے ہوئے مارے مارے نہیں گھومتے ہیں۔ یہ مزدور اپنا کام اس لئے نہیں چھوڑتے ہیں کہ وہ کام کرنا نہیں چاہتے ہیں۔ ان اسٹرائکوں کے وجوہ دراصل بہت گہرے ہیں۔ ان وجوہ کا پتہ چلانے کے لئے ہم کو انگریزی تاریخ کی ورق گردانی کرنی ہو گی اس لئے کہ

انگلستان ہی وہ جگہ ہے جہاں صنعتی انقلاب نے سب سے پہلے اپنے قدم جمائے تھے۔

ہر شخص جانتا ہے کہ اعداد و شمار کی بہم رسانی سے ہر بات ثابت کی جا سکتی ہے لیکن انگلینڈ کے صنعتی انقلاب کی ابتدا میں اعداد و شمار نے واقعات کی جتنی غلط تصویر پیش کی ہے شاید اتنی غلط تصویر کبھی اور کہیں نہیں پیش کی جا سکی ہے۔ اعداد و شمار کے ہر خاکے نے ہر شاخ میں غیر معمولی ترقی دکھائی ہے، روئی، لوہا، کوئلہ اور دوسری چیزوں کی پیداوار میں دس گنا اضافہ دکھائی پڑتا ہے۔ چیزوں کی بکری، مصنوعات کی کھپت اور مالکوں کے نفع کی بھی کوئی انتہا نہیں رہی ہے۔ ان معلومات پر نگاہ ڈالتے ہی ہم حیرت میں پڑ جاتے ہیں اور سوچنے لگتے ہیں کہ شاید انگلستان اس زمانے میں وہی جنت بن گیا تھا جس کی تعریف میں شاعر ہمیشہ رطب اللسان رہے ہیں لیکن واقعہ یہ نہیں ہے انگلستان جنت ضرور بن گیا تھا لیکن صرف چند انے گنے لوگوں کے لئے۔ اکثریت ابھی تک اس فردوس کے قریب بھی نہ تھی۔ جہاں تک عوام کی فارغ البالی کا تعلق ہے، معلوم ہوتا ہے کہ ان اعداد و شمار نے جھوٹی تصویر کھینچنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی ہے۔ ایک مصنف نے جس کی کتاب ۱۸۳۶ء میں شائع ہوئی تھی، اس تلخ حقیقت کی طرف ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے:۔

> لاکھوں انسان درحقیقت فاقہ کشی کی زندگی گذار رہے ہیں ان بدقسمتوں کی تعداد دن بدن بڑھتی چلی جا رہی ہے، تجارت اور بیوپار کی تاریخ میں ایک نئے دور کا اضافہ ہوا ہے۔ اس دور میں بڑھتی اور پھیلتی پھولتی ہوئی تجارت محنت کش طبقے کی خوش حالی کی نہیں بلکہ غربت اور تباہ حالی کی فہرست پیش کرتی ہے۔ یہ وہ منزل ہے جہاں اس وقت برطانیہ عظمیٰ کا سماج پہونچ چکا ہے۔

اگر اس وقت مریخ کے باشندے انگلستان کے جزیرے پر اترتے تو وہاں کے باشندوں کی مصروفیت دیکھ کر ضرور کہتے کہ زمین پر پاگلوں کی بستی بسی ہوئی ہے۔ وہ یہ رائے یہ دیکھ کر قائم کرتے کہ لوگوں کی بہت بڑی اکثریت دن بھر بہت سخت محنت کرتی ہے اور رات بڑھے ایسی تاریک جھونپڑیوں میں جہاں سور بھی رہنا پسند نہ کریں، جا کر پڑ رہتی ہے۔ دوسری طرف چند

لوگ جو اپنے ہاتھوں میں محنت کا میل بھی لگنے نہیں دیتے، اس محنت کش اکثریت کے لئے قوانین بناتے ہیں اور اپنے اپنے محلوں میں بادشاہوں کی طرح عیش و عشرت کی زندگی بسر کرتے ہیں۔

درحقیقت انگلستان دو حصوں میں تقسیم ہو گیا تھا، ڈزرائیلی نے سبل (SYBIL) میں لکھا ہے:-

"دو قومیں ہیں، جن کے درمیان نہ باہمی سلوک ہے اور نہ ہمدردی، دونوں قومیں ایک دوسرے کے عادات و اطوار، خیالات اور محسوسات سے بھی بے خبر ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے یہ دونوں قومیں دنیا کے دو الگ الگ گوشوں کی رہنے والی ہوں یا دونوں ایسے دو ستاروں کی باسی ہوں جن میں آپس میں کوئی تعلق نہیں۔ ان کی نسلیں بھی الگ معلوم ہوتی ہیں یہ دونوں قومیں الگ الگ غذائیں بھی استعمال کرتی ہیں۔ ان کے انداز و اطوار بھی مختلف ہیں اور ان دونوں کے لئے الگ الگ قوانین بھی وضع کئے گئے ہیں۔"

"تم کس کا ذکر کر۔۔۔۔۔۔؟" اگر یانٹ نے جھجکتے ہوئے پوچھا،

"امیروں اور غریبوں کا۔"

یہ تقسیم نئی نہ تھی لیکن پہلے اتنی واضح نہ تھی لیکن مشین کے ڈھلتے ہی اور فیکٹری سسٹم کے رواج پاتے ہی ان دونوں طبقوں کے درمیان حد فاصل کچھ زیادہ نمایاں اور صاف ہو گئی، مالدار مالدار ہوتے گئے اور غریب اپنے ذرائع پیداوار سے کٹ کر غریب تر۔ اس کا اثر دستکاروں پر اور بھی برا ہوا جو پہلے اپنی گذر اوقات کے لئے معقول رقم پیدا کر لیا کرتے تھے لیکن اب مشینی مصنوعات سے مقابلے کی وجہ سے بے بسی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ ہم ذیل میں ایک پارچہ باف تھامس ہیتھ کا بیان دے رہے ہیں۔ اس بیان سے ان لوگوں کی پریشان حالی اور شکستہ دلی کا اندازہ اچھی طرح ہو جائے گا۔

سوال: "تمہارے کتنے لڑکے ہیں؟"

جواب: "دو لڑکے تھے لیکن شکر ہے، وہ دونوں مر گئے۔"

سوال: "کیا تم کو بچوں کے مرنے سے سکون ہوا؟"

جواب: "جی ہاں بہت، میں اس احسان کے لئے خدا کا مشکور ہوں۔ میں ان کی پرورش
کے بوجھ سے نجات پا گیا۔ وہ غریب بیاری جانیں بھی اس فانی زندگی کے عذابوں
سے چھٹکارا پا گئیں۔"

تم اچھی طرح اندازہ کر سکتے ہو کہ اس قسم کے جوابات دینے والا اپنی جگہ پر کتنا شکستہ دل رہا ہوگا! ان لوگوں کا کیا حال رہا ہوگا جو عرصے تک مشینوں کے مقابلے میں ڈٹے رہنے کے بعد پھر ان کا دروازہ کھٹکھٹانے پر مجبور ہوئے ہوں گے! ان فیکٹریوں کے حالات جو ابتدا میں قائم ہوئیں تھیں کیا تھے

ان مشینوں نے مزدوروں کا کام ہلکا کرنے کے بجائے دردناک حد تک بڑھا دیا تھا۔ یہ غریب مزدور اپنا کارگزار ثابت ہوا تھا کہ اس کو اپنی محنت کا کرشمہ دکھانے کے لئے بڑی دیر تک کام کرنا پڑتا تھا۔ مشین کا مالک مشین کے اوپر بڑی بھاری رقم خرچ کر چکا تھا۔ اس کا مفاد اسی میں تھا کہ مشین کسی وقت خاموش نہ ہونے پائے اور جہاں تک بن پڑے برابر کام کرتی رہے۔ مشینوں کے دوراندیش مالک، اس خوف سے کہ کہیں کوئی نئی ایجاد، ان کی مشینوں کی افادیت کم نہ کر دے، ان مشینوں سے زیادہ سے زیادہ کام لیتے تھے تاکہ ان کے متروک الاستعمال ہونے سے پہلے وہ زیادہ سے زیادہ رقم گھسیٹ لیں۔ مالکوں کی مصلحتیں مزدوروں کو زیادہ دیر تک کام کرنے پر مجبور کرتی تھیں اس زمانے میں عام طور سے ہر مزدور کو سولہ گھنٹے روزانہ کام کرنا پڑتا تھا۔ جب مزدوروں نے لڑ بھڑ کر بارہ بارہ گھنٹے کی ڈیوٹیاں مقرر کرا لیں تو ان کو بہت سکون محسوس ہوا۔

روزانہ کام کے یہ لمبے گھنٹے ان کے لئے اتنے پریشان کن نہ تھے۔ مزدور دن میں کئی کئی گھنٹے کام کرنے کے عادی تھے۔ وہ اپنے گھروں میں بھی گھریلو نظام کے ماتحت رات گئے تک کام کرتے رہتے تھے۔ ان کو اصل پریشانی فیکٹری کے نظام اور ضابطے کی پابندی میں، جس کے وہ کبھی عادی نہیں رہے تھے محسوس ہوئی تھی۔ ایک خاص اور مقررہ وقت پر کام شروع کرنا اور ایک خاص اور مقررہ ہی وقت پر چھٹی پانا اور دوسرے دن پھر اسی وقت پر اپنی نوکری پر جا پہونچنا اور اسی طرح دن تمام کرنا، یہ باتیں ان کے لئے بالکل نئی تھیں مشین کی جنبش اور اس کی

حرکت کے ساتھ اپنے ہاتھ پاؤں چلانا اور ایک سخت اور با اختیار نگران کے ماتحت اپنے فرائض منصبی کی تکمیل کرنا ان کے لئے زندگی کا ایک نیا اور ناگوار چکر تھا۔ زندگی کا یہ ڈھنگ ان کو پسند نہیں آرہا تھا۔ اس کے وہ کبھی عادی نہیں رہے تھے۔

مانچسٹر کے پاس کے ایک مل میں کاتنے والوں کو چودہ گھنٹے روزانہ کام کرنا پڑتا تھا۔ اسّی اور چوراسی درجے کے ٹمپریچر میں بھی وہ برابر محنت کرتے رہتے تھے، کام کے دوران میں ان کو پانی منگا کر پینے کی بھی اجازت نہ تھی۔ مل کے قواعد وضوابط کی خلاف ورزی کی پاداش میں ان کو حسب ذیل سزائیں برداشت کرنی پڑتی تھی:۔

اگر کسی کاتنے والے کی کھڑکی کھلی پائی جائے تو اس پر	۱ شلنگ جرمانہ
اگر کوئی کاتنے والا کام کے وقت گندا پایا جائے تو اس پر	۱ " "
اگر کوئی کاتنے والا منھ ہاتھ دھوتا ہوا پایا جائے تو اس پر	۱ " "
اگر کوئی کاتنے والا روشنی جلا کر ڈرم کے فیتے کی مرمت کرتا ہوا تو اس پر	۲ " "
اگر کوئی کاتنے والا صبح کو دیر تک روشنی جلاتا ہوا پایا جائے تو اس پر	۲ " "
اگر کوئی کاتنے والا سیٹی بجاتا ہوا پایا جائے تو اس پر	۱ " "

سزاؤں کی یہ فہرست من گھڑت سی معلوم ہوتی ہے لیکن یہ حقیقت نہیں ہے، اکثر مزدور یہ سزائیں بھگتتے رہتے تھے۔ بہت سی ایسی سزائیں جو ہم کو مٹھائی کی دوکانوں یا پسماندہ طبقوں میں آج ملتی ہیں اس زمانے میں عام تھیں صنعتی دور کی ابتدا میں کمپنی کے اسٹوروں سے خریداری اور کمپنی کے گھروں میں رہائش ایک عام اور لازمی بات تھی۔

سرمایہ داروں کا خیال ہے کہ وہ ان تمام چیزوں کے ساتھ جو ان کی ملکیت تھیں جو چاہتے سلوک کر سکتے تھے وہ مشینوں کے ساتھ، ان مزدوروں کو بھی جو ان مشینوں پر کام کرتے تھے اپنی ملکیت سمجھتے تھے لیکن حقیقت کچھ اس سے بھی بڑھ کر تھی مشینوں کی خریداری پر ان کو لمبی رقمیں خرچ کرنی پڑتی تھیں، اس لئے ان کو ان بدقسمت مزدوروں کے مقابلے میں، ان مشینوں کا زیادہ

خیال رہتا تھا۔

وہ ان مزدوروں کو اجرت دینے میں جتنی کفایت شعاری کر سکتے تھے کرتے تھے۔ وہ بازار میں جتنے مزدور چاہتے لگا لیتے اور مزدوری میں جتنی کمی کر پاتے، کر دیتے تھے۔ عورتوں اور بچوں سے بھی ان مشینوں کی دیکھ بھال ممکن تھی ان کو اجرت بھی کم دینی پڑتی تھی اس لئے اکثر مرد گھروں میں بیکار پڑے رہتے تھے اور عورتیں اور بچے ان فیکٹریوں میں کام کرتے تھے۔ پہلے پہل فیکٹریوں کے مالکوں نے محتاج خانوں کے نیجروں سے معاملہ کیا اور محتاج بچوں سے فیکٹریوں میں کام لینا شروع کیا۔ ان حالات میں مزدوری کی شرح اتنی کم ہو گئی کہ ماں اور باپ دونوں مل کر اتنا نہیں کما سکتے کہ بچوں کو بھی کھلا سکیں اس لئے وہ بچے جو اب تک گھروں میں پڑے رہتے تھے، ملوں اور کانوں میں کام کرنے پر مجبور ہو گئے۔ صنعتی سرمایہ داری کا نفرت انگیز گھناؤنا پن شاید اس زمانے میں اپنی انتہا کو پہونچ گیا تھا۔ جان مَاس نے، جو کسی زمانے میں ایک کاٹن مل میں امیدوار مزدوروں کا انچارج رہ چکا تھا، ۱۸۱۶ء میں پارلیمنٹ کی ایک کمیٹی کے سامنے مزدور بچوں کے متعلق بیان دیا تھا۔ یہ بیان کلیسائی حلقے کے محتاج خانے کے ان بچوں کے متعلق تھا جو فیکٹریوں میں کام کرنے پر مجبور کئے گئے تھے۔

"کیا یہ امیدوار بچے کلیسائی خیرات خانے سے تعلق رکھتے تھے؟"

"جی ہاں، یہ تمام بچے کلیسائی خیرات خانے سے آئے تھے"

"وہ کس عمر میں بھرتی کئے گئے تھے؟"

جو لندن سے آئے تھے ان کی عمریں سات سے گیارہ سال کے درمیان تھیں

جو نورپوں سے آئے تھے وہ آٹھ، دس اور پندرہ سال کے درمیان تھے۔"

"ان کو کتنی مدت تک امیدواری کرنی پڑی؟"

"اکیس روز تک"

"ان کے کام کے اوقات کیا تھے؟"

"صبح ۵ بجے سے ۸ بجے رات تک"

"کیا روزانہ پندرہ گھنٹے باقاعدہ کام کرنا پڑتا تھا؟"

"جی ہاں"

"جب مشین مرمت کے لئے روک دی جاتی تھی۔ یا روئی نہ ہونے کی وجہ سے نہیں چلتی تھی کیا لڑکوں کو اس مدت کا کام بھی پورا کرنا پڑتا تھا؟"

"جی ہاں"

"لڑکے کھڑے کھڑے کام کرتے تھے یا بیٹھ کر؟"

"کھڑے کھڑے"

"کیا وہ کھڑے رہ کر سارا وقت ختم کرتے تھے؟"

"جی ہاں کھڑے رہ کر"

"کیا مل میں کہیں بیٹھنے کی کوئی جگہ تھی؟"

"کہیں نہیں، میں نے ان کو اکثر چکی کے فرش پر اُس وقت کے بعد بھی جب ان کو بستروں پر ہونا چاہئے تھا، پایا تھا"

"کیا یہ بچے کبھی مشین سے زخمی بھی ہو گئے تھے؟"

"جی ہاں، اکثر، یہ تو ہوتا ہی رہتا تھا"

۱۸۳۳ء میں حکومتِ انگلستان کے کمشنروں نے فیکٹری میں بچوں کی مزدوری کے متعلق ایک رپورٹ پھر شائع کی۔ اس رپورٹ میں ایک گیارہ سال کے لڑکے کا بیان بھی شامل ہے، یہ بچہ چار شلنگ ہفتہ وار پاتا تھا۔ اس نے سوت جوڑنے کے لئے اپنے بھائی کو بھی اپنی مدد کے لئے نچ کے طور پر لگا لیا تھا۔ ذیل میں اُس کی داستان کا ایک حصہ دیا جاتا ہے:۔

"جب کبھی ہم اونگھ جاتے تھے یہ لوگ ہم کو چمڑے سے سزا دیتے تھے۔ کیلس میرے انگوٹھے کے برابر موٹی رسی بٹتا، اُس کو دُہرا کرتا اور اُس میں گرہیں لگاتا تھا۔ میں چھ بجے سے کچھ پہلے فیکٹری

جایا کرتا تھا۔ کبھی کبھی پانچ بجے پہونچ جایا کرتا تھا اور رات بڑھے نو بجے تک کام کرتا رہتا تھا۔ ہم نے ایک مرتبہ تو رات بھر کام کیا تھا، ہم نے یہ خود پسند کیا تھا، ہم خرچ کرنے کے لئے کچھ اور پیدا کرنا چاہتے تھے۔ اس دن ہم چھ بجے صبح سے کام کر رہے تھے۔ ہم دوسرے دن نو بجے رات تک برابر کام کرتے رہے۔ میں آج کل رسی بٹنے والے قطعے پر کام کرتا ہوں۔ میں آج کل تقریباً ۴ شلنگ فی ہفتہ پیدا کرتا ہوں۔ میرا بھائی میری طرف سے کام کرتا ہے۔ وہ صرف سات سال کا ہے۔ میں اس کو کچھ نہیں دیتا ہوں۔ اگر وہ میرا بھائی نہ ہوتا تو مجھے اس کو کم سے کم ایک شلنگ ہفتہ وار دینا پڑتا۔ میں اس کو اپنے ساتھ چھ بجے لے جاتا ہوں اور رات کو آٹھ بجے تک اپنے ساتھ رکھتا ہوں"۔

بچوں کا اتنی کم عمری میں کام کرنا کوئی نئی بات نہ تھی، ہم ڈیفو کے بیان میں دگھریلو نظام کے باب میں، ان کو اپنے گھروں میں کام کرتے ہوئے دیکھتے ہیں لیکن اس وقت وہ اپنے گھروں میں اپنے والدین کی مدد کے لئے کام کرتے تھے۔ لیکن نئے نظام میں ان کے کام کی حیثیت بالکل بدل گئی تھی۔ پہلے وہ اپنے والدین کی نگرانی میں کام کرتے تھے، ان کے کام کا وقت بھی وہی ہوتا تھا جو ان کے والدین مقرر کرتے تھے۔ اب وہ فیکٹریوں میں نوکر تھے اور ان سے وہ نگراں کار کام لیتا تھا جس کو اس کے نازک جسموں اور ننھی عمروں سے زیادہ اپنے کام کی فکر ہوتی تھی اور وہ چاہتا تھا کہ ان بچوں سے بھی زیادہ سے زیادہ جتنا کام لے سکے لے، ان بچوں کے کام کے اوقات بھی مالکوں کے ہاتھ میں تھے۔ یہ مالک ان کی نازک عمروں سے کم اور اپنے بھاری منافع سے زیادہ دلچسپی لیتے تھے۔ ویسٹ انڈین کمپنیوں کے بردہ فروش بھی جو غلاموں کی تجارت کرتے تھے، اتنے بے رحم نہ تھے۔ ان کو بھی ان ننھی ننھی روحوں کو اس طرح کام میں لگا ہوا دیکھ کر ترس آجاتا تھا۔ ان تاجروں میں سے کسی نے بریڈ فورڈ کے تین مالکان مل سے گفتگو کے دوران میں کہا تھا:۔

"میں نے ان غلاموں کے تاجر ہونے کی حیثیت سے ہمیشہ اپنے آپ کو اپنی نگاہوں میں ذلیل پایا۔ میں نے تو جزائر غرب الہند میں کسی شخص کو اتنا ظالم نہیں پایا کہ وہ نو برس کے بچوں سے ساڑھے بارہ گھنٹے یومیہ کام لیتا ہو اور تم کہتے ہو کہ تمہارا یہ روزمرہ کا معمول ہے"!

یہ غلاموں کا تاجران فیکٹریوں کے مالکوں کو ایک اور مثال بھی دے کر سمجھا سکتا تھا۔ کوئی شبہ نہیں جزائر غرب الہند اور جنوبی امریکہ کی غلاموں کی تجارت اپنی جگہ پر کوئی اچھی بات نہیں تھی لیکن پھر بھی ان غلاموں کے رہنے کے لئے جو مکانات وہاں بنوائے گئے تھے وہ ان گھروں سے کہیں بہتر تھے جو ان مزدوروں کو رہنے کے لئے انگلستان کے ان شہروں میں، جہاں فیکٹریاں قائم تھیں، دئے جاتے تھے۔ بھاپ انجن کی ایجاد نے فیکٹریوں کو دریا کے کناروں سے آزاد کر دیا تھا اور اب وہ آزادی سے کوئلے کی کانوں کے پاس اٹھ گئیں اور دیکھتے ہی دیکھتے معمولی مقامات قصبے اور قصبے شہر بن گئے۔ سنہ ۱۷۷۰ء میں انگلستان کی چالیس فی صدی آبادی دیہاتوں میں رہتی تھی سنہ ۱۸۴۱ء میں یہ آبادی گھٹ کر چھبیس فی صدی رہ گئی۔ شہروں کی آبادی اور ان کی ترقی کی رفتار ذیل کے خاکے سے اچھی طرح واضح ہو جائے گی:۔

	سنہ ۱۸۰۱ء	سنہ ۱۸۴۱ء
مانچسٹر	۳۵۰۰۰	۳۵۳۰۰۰
لیڈس	۵۳۰۰۰	۱۵۲۰۰۰
برمنگھم	۲۳۰۰۰	۱۸۱۰۰۰
شیفیلڈ	۴۶۰۰۰	۱۱۱۰۰۰

مشہور مقامات مشہور چیزیں تیار کر رہے تھے لیکن یہ چیزیں وہ مزدور بناتے تھے۔ جو تاریک غیر صحت بخش، گنجان اور گندے حصوں میں رہتے تھے۔ مشہور ماہر اقتصادیات ناسا سینیر نے سنہ ۱۸۳۷ء میں مانچسٹر کے ایک حصے کا حال دیکھا تھا۔ اس نے اپنے تاثرات ان الفاظ میں ظاہر کئے تھے:۔

"یہ قصبے، جو اپنی وسعت اور آبادی کی تعداد کے لحاظ سے یقیناً قصبے ہیں کچھ عجیب ڈھنگ سے بنائے گئے ہیں۔ ان کی تعمیر میں حریص تعمیر کنندگان کے فوری نفع کے سوا اور کسی بات کا کوئی خیال نہیں رکھا گیا ہے۔ میں نے ایک جگہ ایک ایسی سڑک دیکھی جو ایک خندق کی سیدھ میں بنائی گئی تھی۔ غرض یہ تھی کہ اس طرح بہت کم کھدائی کا خرچ برداشت کر کے سڑک کے

کنارے کنارے زمین دوز کوٹھریاں بنوادی جائیں گی۔ یہ کوٹھریاں تجارتی سامان کا اسٹاک رکھنے کے لئے نہیں انسانوں کے رکھنے کے لئے بنائی گئی تھیں۔ ان گھروں میں کوئی ایسا گھر نہ تھا جو ہیضے کی تباہ کاریوں سے محفوظ رہ سکا ہو۔ عام طور سے ان اطراف کی سڑکیں خام ہیں اور اکثر جگہوں پر ان سڑکوں کے بیچ میں گوبر ڈالنے کے گڑھے کھدے ہوتے ہیں۔ یہ گھر ایک دوسرے کی پشت پر بنائے گئے ہیں اور ان میں ہوا اور پانی باہر بہانے اور نکالنے کا کوئی انتظام نہیں ہے۔ مزدوروں کے خاندان انھیں زمین دوز مکانوں یا ان کے اوپر کے جھونپڑوں کے کونوں میں پڑے رہتے ہیں۔"

اوپر کے اقتباس میں خط کشیدہ جملہ غور سے پڑھو! ان غریبوں کی تنگ بستیوں پر رہائش کے اتنے خراب انتظامات کا اثر کتنا برا پڑتا ہوگا! یہ مکانات موت کی کمین گاہ تھے، وہ دبے پاؤں آتی اور ان بدقسمت انسانوں کا قتل عام کرکے چلی جاتی۔ وہ لوگ جو شہر کے ان حصوں سے دور رہتے تھے بہت خوش قسمت تھے۔ اس زمانے میں تمہاری عمر کی درازی ان جگہوں پر منحصر تھی جہاں تم رہتے تھے، تم ان سڑکوں سے جہاں یہ بدقسمت مزدور رہتے تھے دور رہتے تو زیادہ عمر پاتے۔ ڈاکٹر پی۔ ایچ ہالینڈ نے ۱۸۴۴ء میں مانچسٹر کے مضافات کے متعلق تحقیق کرکے لکھا تھا:-

"جب ہم دیکھتے ہیں کہ بعض محلوں میں شرح اموات بعض دوسرے محلوں سے دوگنی ہے اور ان محلوں میں موتیں زیادہ ہوتی ہیں جن کی حالت خراب ہے۔ جن محلوں کی حالت اچھی ہے وہاں موتیں کم ہوتی ہیں تو ہم یہ نتیجہ نکالے بغیر نہیں رہ سکتے کہ ہمارے یہ ساتھی اور پڑوسی صرف حفظانِ صحت کی ظاہری تدبیروں کے نہ ہونے کی وجہ سے سالانہ ہزاروں کی تعداد میں موت کی نذر ہوتے رہتے ہیں۔"

آخر یہ مالدار قوم ان قریبی پڑوسیوں کی عام بربادی سے کچھ متاثر ہوتی تھی یا نہیں؟ ان غریبوں کے متعلق ان دولتمندوں کا طرزِ عمل کیا تھا؟ اور وہ فیکٹری کے ان خراب حالات، رات بڑھتے تک کام کے اوقات، اور معصوم بچوں کی محنت اور مزدوری کے متعلق کیا سوچتے تھے؟ ان کی

بڑی تعداد تو ان سوالات پر کچھ سوچنے کی عادی ہی نہ تھی اگر کبھی کچھ ایسے حالات سامنے آجاتے تھے جو ان کو سوچنے پر مجبور کر دیتے تھے تو ان کو انجیل مقدس کا یہ جملہ یاد آجاتا تھا:-

"تمھارے ساتھ غریب ہمیشہ رہتے ہیں"

انجیل مقدس نے انسانوں کو اپنے دوسرے بھائیوں کے ساتھ جس قسم کے برتاؤ کی ہدایت کی تھی وہ کبھی اس کی پروا نہ کرتے تھے۔ وہ صرف اپنے مطلب کی بات پڑھتے تھے اور جو بات ان کے لئے مفید نہیں ہوتی تھی وہ وہ سنتے ہی نہیں تھے۔

آج ہم کو جو باتیں بہت ہولناک معلوم ہوتی ہیں وہ اس زمانے کے دولتمند طبقے کے نزدیک بہت مناسب تھیں۔ لڑکوں کا اسکول نہ جانا اور چودہ گھنٹے روزانہ فیکٹریوں میں کام کرنا بہت بُرا ہے؟ کتنی احمقانہ ہے یہ بات اجی۔ اے۔ لی جو ایک کاٹن مل کا (جس میں چھ بجے صبح سے آٹھ بجے رات تک کام ہوتا رہتا تھا) مالک تھا، کہا:-

"اخلاق کے لئے اس سے زیادہ مفید اور کیا بات ہو سکتی ہے کہ انسان بالکل ابتدائی عمر سے مطیع و فرماں بردار، ہنرمند اور پابند اوقات ہو جائے"

مسٹر لی کو غریبوں کے اخلاق کی بڑی فکر تھی۔ گڈی بھی جو رائل سوسائٹی کا صدر تھا، مزدور بچوں کی تعلیم کا بڑا مخالف تھا۔ اس نے ایک ابتدائی اسکول کے قیام کی تجویز کی، جو مزدور بچوں کیلئے قائم ہونے والا تھا، سخت مخالفت کی تھی۔ گڈی نے اپنے دلچسپ دلائل اس طرح پیش کئے:-

"نیچے طبقے کے مزدور بچوں کو تعلیم دلانے کا صرف یہ نتیجہ ہوگا کہ ان کے اخلاق بھی بگڑ جائیں گے اور ان کی دلی مسرت بھی چھن جائے گی۔ یہ تعلیم ان کو اپنی موجودہ حالت پر قانع نہ رہنے دے گی اور وہ نہ کھیتی کسانی کے لئے اچھے نوکر ثابت ہوں گے اور نہ کسی محنت طلب ملازمت کے لائق رہ جائیں گے۔ سماج میں دراصل ان کے یہی اصلی فرائض ہیں۔ اب تعلیم پانے کے بعد وہ ان کاموں کے بجائے باغیانہ رسالے پڑھنے کے لائق ہو جائیں گے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ اپنے بڑوں کی شان میں گستاخیوں کے مرتکب ہونے لگیں گے"

اُسی دور کے ایک اور شخص کی شہادت بھی مطالعہ کے لائق ہے۔ یہ شخص ان غریبوں کو قسمت کی شکایت کی بجائے اُس کے شکر گزار ہونے کی نصیحت کرتا ہے، اس کے نزدیک وہ لوگ بہت خوش قسمت تھے جن کو اس "انعام الٰہی" فیکٹری میں کام کرنے کا موقع ملا تھا۔ انڈریو ار کا یہی خیال تھا، اس نے ۱۸۳۵ء میں لکھا:۔

"میں نے اپنے اس سفر میں ہزاروں بوڑھوں، بچوں اور درمیانی عمر کے لوگوں کو جن میں عورتیں اور مرد دونوں شامل تھے کام کرتے ہوئے دیکھا۔ یہ لوگ بے اندازہ غذائی سامان کپڑے اور گھریلو ضرورت کی چیزیں تیار کر رہے تھے۔ ان کے بدن کا کوئی رواں عرق ریز نہ تھا یہ دھوپ کی گرمی اور برفیلی ہوا کے جھونکوں سے محفوظ تھے۔ یہ جن جگہوں میں کام کر رہے تھے وہ بہت ہوادار اور صحت بخش تھیں۔ ان کا مقابلہ ہمارے شہروں کے اعلیٰ طبقے والے امراء کی حویلیاں بھی نہیں کر سکتیں۔ یہ مکان بہت آرام دہ ہیں اور اپنے حسن تعمیر میں، البنائی مصری اور رومن مطلق العنان بادشاہوں اور امیروں کی مایۂ ناز عمارتوں کو بھی مات کرتے ہیں ـــ کیسا اچھا ہے یہ فیکٹری نظام!"

یہ بات خاص طور سے نگاہ میں رکھنے کے لائق ہے کہ ڈاکٹر آر نے ان فیکٹریوں کی صرف سیاحت ہی کی تھی کبھی اس کو ان فیکٹریوں میں کام کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔

ڈاکٹر آر کی قصیدہ خوانی سے پہلے ایک رکن کلیسا نے ان بدقسمت غریبوں کی تسکین اور تشفی کیلئے چند جملے کہے تھے، یہ کلیسا کا کوئی معمولی رکن نہ تھا بلکہ آرچ ڈیکن پیلے تھا۔ اس نے ان محنت کشوں کے آنسو، جو اپنی بدقسمتی پر نوحہ کناں تھے اور امیروں کی فارغ البالی کو رشک و حسد کی نگاہ سے دیکھ رہے تھے، اس طرح پونچھے تھے:۔

"غریبی ایک بات ضرور عطا کرتی ہے، یہ بات صرف محنت کشی تک محدود نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ اصل مسرت بھی ہاتھ آتی ہے، کفایت شعاری اپنی جگہ پر بڑی راحتوں کی موجب ہے یہ توجہ اور تدبیر دونوں کے استعمال سے اطمینان عطا کرتی ہے۔ یہ بات ہم کو وہاں نصیب

نہیں ہوتی جہاں نعمتوں کے ڈھیر لگے ہوئے ہیں۔ دولت کے ڈھیرے نکال نکال کر خرچ کرنے میں کوئی مزا نہیں ہے ——— غریب طبقوں کے لوگوں کو ایک بڑی سہولت نصیب ہے۔ وہ بڑی آسانی سے اپنے بچوں کی تربیت کر لیتے ہیں۔ ایک غریب آدمی کے بچے کو اپنی تربیت کے لئے صرف دو باتوں کی ضرورت ہے ——— ہنر اور معصومیت"۔

اگر کوئی غریب بے وقوف اور ضدی ہو، آرنج ڈیکن کی گفتگو اس کی سمجھ میں نہ آئے اور وہ بدستور اسی بات پر اڑا رہے کہ غربت کو کسی طرح مسرت اور شادمانی کا مرادف نہیں سمجھا جا سکتا تو گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ آرنج ڈیکن کے ترکش میں کچھ اور تیر بھی ہیں۔ وہ بڑی آسانی سے اس کو اپنی راہ پر لا سکتا ہے۔ غریب محنت کش امیروں کے عیش و آرام پر رشک کرتے ہیں کتنے بے وقوف ہیں یہ لوگ! رشک تو امیروں کو کرنا چاہئے۔ عیش و آرام سے پہلے اگر سخت محنت کی منزل نہ ہو تو عیش و آرام کا کوئی لطف نہیں، وہ کس مزے میں کہتا ہے:۔

"ایک دوسری بات جو غریبوں کو آمادہ کرتی ہے کہ وہ امیروں کی حالت پر رشک کریں، ان کی راحت ہے یہیں وہ حقیقت کے سمجھنے میں بنیادی غلطی کر جاتے ہیں۔ راحت تو دراصل نام ہے محنت کے ختم ہو جانے کا۔ راحت کا مزا تو دراصل اس وقت تک آ ہی نہیں سکتا جب تک کسی پر پوری طرح تھکن طاری نہ ہو جائے۔ امیر لوگ تو خود بڑی حسرت اور رشک کی نگاہ سے غریبوں کی اس تازگی اور راحت کو دیکھتے ہیں جو ان کو سخت محنت کے بعد حاصل ہوتی ہے"۔

آرنج ڈیکن پیلے نے یہ تسکین بخش جملے ۱۷۹۳ء میں کہے تھے۔ تم کو یاد ہوگا کہ یہ وہ زمانہ تھا جب فرانس کے محنت کش غریب وہاں کے امتیازی طبقوں کے خلاف کھڑے ہو رہے تھے۔ انقلاب فرانس ایک خونی واقعہ تھا، انگلستان کے امراء ان واقعات سے خوش نہ تھے۔ ان کو فرانسیسیوں کا یہ خونی نعرہ کہ "ان کے سر قلم کر دو" بہت خوفناک معلوم ہوتا تھا اور وہ نہیں چاہتے تھے کہ سمندر پار کی ہوائیں اس نعرہ کو اڑا کر انگلستان کے تباہ حال طبقوں تک پہنچا دیں۔ یہی وجہ تھی غریبوں کا یہ دوست

پہلے غریب انگریزوں کو جو اپنی جگہ پر خود ابال کھائے تھے ٹھنڈا رکھنا چاہتا تھا، وہ نصیحت کرتا ہے:-

"تغیر اور صرف تدریجی تغیر ہی جو رفتہ رفتہ ترقی کے راستے پر ڈال دے پسندیدہ کہا جا سکتا ہے۔ یہ تدریجی تغیر تو دراصل کامیاب صنعت کا قدرتی پھل ہے ـــــــــــ اس کی توقع تو صرف عوامی امن اور اطمینان کی راہ سے کی جا سکتی ہے۔ کسی اور راہ سے اس کی امید فضول ہے ـــــــــــ امیروں کے مرتبے اور ان کی دولت پر حسد کرنا اور طاقت استعمال کر کے ان سے یہ چیزیں چھیننے کے منصوبے باندھنا اور ایک عام بےچینی اور بدامنی پیدا کر کے اپنا مقصد حاصل کرنا صرف پاجی پن ہی نہیں بلکہ حماقت بھی ہے۔"

انگلستان کے غریبوں نے ارکان کنیسا کی نصیحتیں مان لیں، انھوں نے امیروں کی دولت پر زبردستی قبضہ نہیں کیا، لیکن وہ عرصے تک "تدریجی تغیر" کے "قدرتی پھل" کی راہ دیکھتے رہے لیکن اس طرح کا کوئی تدریجی انقلاب نہیں آیا۔ اور آخر کار ان کو بھی اپنے حقوق کے لئے لڑنا پڑا۔

انگلستان کے محنت کش طبقوں نے کام کا وقت کم کرانے کے لئے جد و جہد شروع کی۔ اس کش مکش میں بعض امیروں نے بھی، جو انسانی ہمدردی سے خالی نہ تھے، ان کا ساتھ دیا، وہ اب تیرہ چودہ گھنٹے روزانہ کام کرنے کے لئے تیار نہ تھے۔ بعض امیروں نے پارلیمنٹ میں بھی ان غریبوں کی وکالت کی، انھوں نے اپنی تقریروں میں سفارش کی کہ کام کا وقت گھٹا کر تیرہ، چودہ گھنٹوں کے بجائے صرف دس گھنٹے یومیہ کر دیا جائے۔ انھوں نے اپنے بعض ساتھی ممبروں کو بھی آمادہ کر لیا کہ وہ رائے شماری کے وقت اُن کا ساتھ دیں، ان کی اس تحریک نے بہتوں کو ناراض کر دیا۔ ان لوگوں میں جو ان کے اس طرز عمل کو پسند نہیں کرتے تھے، ڈاکٹر آر بھی تھا۔ اس نے ایک بڑی دلچسپ دلیل کا سہارا لے کر کہا:-

"دارالعوام کے تراسی[۵۴] ممبروں میں سے ہر ایک کو، جو ٹھنڈے دل سے غور کرے گا یہ بات بہت عجیب معلوم ہوگی کہ وہ اپنے آپ کو یہ رائے دینے کا مستحق سمجھے کہ عاقل و بالغ کاریگروں کے ایک طبقے کو صرف دس گھنٹے یومیہ کام کرنے پر مجبور کیا جائے۔ یہ تو رعایا کی آزادی میں مداخلت ہے۔ کبھی دنیا کا کوئی ایوان قانون ساز اس قسم کی قانون سازی کو جائز نہیں رکھ سکتا، گلوسٹر

شائر کے مالکان کارخانہ نے بجا طور پر اس تجویز کو صرف "قرونِ مظلمہ کے شایانِ شان قرار دیا ہے"

ڈاکٹر آر بھی آر ج ڈیکن پہلے کی طرح محنت کش عوام کی دوستی اور ہمدردی کا مدعی تھا شاید اسی لئے وہ گلوسسٹر شائر کے مالکان کارخانہ کا ہم زبان ہو کر ان تجاویز کی مخالفت پر تلا ہوا تھا جو مزدور کی اس آزادی پر کہ وہ اپنے مالک کی مرضی کے مطابق جتنی دیر تک چاہے کام کرتا رہے، اثر انداز ہونے والی تھیں۔ انگریزوں کی اس تاریخی حریت پسندی پر کیا حرف آتا اگر دار العوام ان سے ان کا یہ نہ الگ ہونے والا حق چھین لیتا کہ "اگر وہ چاہیں تو ان کے مالک ان پر کام کا اتنا بوجھ ڈال سکتے ہیں کہ وہ انھیں اٹھاتے اٹھاتے مرجائیں۔"

یہ دلیل کہ "کام کے اوقات میں تحدید ایک آدمی کی قدرتی آزادی میں مداخلت ہے"، اپنی جگہ پر بہت اہم ہے۔ یہ دلیل امریکہ اور انگلستان میں بار بار پیش کی گئی۔ کارخانوں کے مالکوں نے یہ دلیل آدم اسمتھ سے لی تھی "جو ہمیں تنہا چھوڑ دو" کے نعرہ کا علمبردار تھا (لیکن تعجب کی بات تو یہ تھی کہ محنت کش مزدور اس دلیل کے بموجب اپنے قدرتی حق کے اتلاف کا شاکی نہ تھا) یہ صحیح ہے کہ آدم اسمتھ نے جو تجارتی نظریہ زر کے حامیوں کی عائد کی ہوئی پابندیوں کا سخت دشمن تھا، اس طرح کی مداخلت کے خلاف بہت کچھ لکھا تھا۔ کارخانوں کے مالک آدم اسمتھ کی کتاب "قوموں کی دولت" (WEALTH OF NATION) کا یہ اقتباس پیش کرتے تھے:-

"وہ ملکیت جو ہر آدمی اپنی محنت سے پیدا کرتا ہے، اور جو در اصل دوسری تمام املاک کی بنیاد ہے، بہت مقدس ہے، اس پر کبھی حملہ نہیں کیا جا سکتا۔ ایک غریب آدمی کی آبائی املاک اس کی محنت کشی اور اس کے ہاتھوں کی ہنر مندی کی رہین منت ہے۔ کسی شخص کو اپنی محنت اور ہنر مندی کے استعمال سے روکنا اس مقدس املاک میں صریحی بے جا مداخلت ہے۔ ہر شخص کو مجاز ہونا چاہئے کہ وہ جس طرح چاہے اپنے پڑوسی کو نقصان پہونچائے بغیر اپنی محنت اور ہنر مندی کا استعمال کرے ــــــ اس کا اندازہ کرنا کہ وہ اس لائق ہے کہ اسے کام دیا جا

یا نہیں، کام دینے والے کے فرائض اور اختیارات میں شامل ہے اُسی کے مفاد سے اس کا تعلق بھی ہے۔"

آدم اسمتھ نے مذکورہ بالا دلائل حامیانِ نظریۂ زر کے امتناعی ضوابط اور اُن کی عائد کردہ پابندیوں کے خلاف پیش کیے تھے، یہ کہا جا سکتا ہے کہ کارخانوں کے مالک بھی یہ دلیل جو ۱۷۷۶ء میں پیش کی گئی تھی، دوسرے قسم کے ضوابط اور دوسری قسم کی پابندیوں کے خلاف ہی استعمال کر رہے تھے؟ تھوڑی دیر کے لئے مان لیں کہ آدم اسمتھ کے دلائل کا حوالہ ان کارخانوں کے مالکوں کے لئے اس وقت نامناسب نہ تھا لیکن ان کو یہ نہ بھولنا چاہیئے کہ آدم اسمتھ کے یہ دلائل اُس وقت جب یہ پیش کیے گئے تھے، ان کے حق میں نہ تھے، آدم اسمتھ کے ان دلائل کا انتخاب جو ان کے مفاد کے لئے موزوں ہوں اور ان دلائل سے روگردانی جو اُن کے مفاد کے خلاف ہوں حکمراں طبقے کی عادت میں داخل ہے۔ اس عادت سے اس وقت بھی صرف اسی طبقہ کو فائدہ بھی پہونچ سکتا تھا لیکن استدلال کا یہ طرز محنت کش جماعتوں کے لئے سخت تباہ کن تھا۔

آخر یہ محنت کش اپنی حالت سنبھالنے کے لئے کیا طرزِ عمل اختیار کرتا؟ اس کی اس تباہ حالی کے علاج کے لئے کیا نسخہ تجویز کیا جا سکتا تھا؟ فرض کرو وہ بنیائن اور موزے بُن کر اپنی گذر اوقات کے لئے ایک معقول رقم پیدا کر لیتا تھا۔ اس نے اپنی آنکھوں سے ان فیکٹریوں کو قائم ہوتے ہوئے دیکھا اور یہ بھی دیکھا کہ ان فیکٹریوں میں بنیائنوں اور موزوں کی بہت بڑی تعداد بہت سستے داموں میں تیار ہونے لگی۔ رفتہ رفتہ ان فیکٹریوں کے بنائے ہوئے سستے مال کے مقابلے میں اس کی بنیائنیں اور موزے مہنگے پڑنے لگے، اب اُس کے مال کے گاہک ختم ہو گئے اور رفتہ رفتہ وہ فاقہ کشی پر مجبور ہو گیا۔ اب ان اچھے دنوں کا نگاہوں میں پھرنا جب یہ رقیب فیکٹریاں قائم نہ ہوئی تھیں، بالکل فطرتی عمل تھا اور ان اچھے دنوں کی یاد جب وہ اچھی طرح سے کھاتا پیتا تھا، اس کے دماغ کیلئے ماضی کی صرف ایک حسین تصویر تھی۔ اس تصویر سے نگاہ ہٹاتے ہی وہ پھر اپنے حال کی بھیانک ویرانی دیکھ کر کانپ اُٹھتا ہوگا۔ وہ اپنے دل سے اس تباہی کی وجہ پوچھتا ہوگا۔ یہ پوچھ گچھ نئی نہ ہوگی وہ

پہلے بھی بارہا یہی سوال اپنے دل سے پوچھ چکا ہوگا اور ہر بار اس کے دل نے یہی جواب دیا ہوگا کہ تمھاری تباہی کی جڑ یہی مشین ہے۔ یہ مشین ہی تھی جس نے لوگوں سے روزگار چھین لیا تھا۔ یہ مشین ہی تھی جس نے چیزوں کی قیمتیں گرا دی تھیں۔ اس لئے یہی مشین تھی جو اس کی دشمن تھی۔ جب یہ دل شکستہ لوگ اس نتیجہ پر پہنچ گئے تو پھر دوسرا قدم اٹھنے میں کیا دیر تھی؟

دوسرا قدم کیا تھا؟ مشینوں سے انتقام، مشینوں کی توڑ پھوڑ۔

فیتے بنانے کے فریم، موزے اور بنیائنیں بُننے کے چوکھٹے، بُننے والی مشینیں، کاتنے والی کلیں سب کی سب توڑ ڈالی گئیں۔ وہ تمام مشینیں جو ان کے نزدیک ان کی تباہی کا سبب ہوئی تھیں، ان کے جوشِ انتقام کا شکار ہوئیں۔ انھوں نے ان کو توڑا، جلایا اور برباد کیا۔ مشینوں کے یہ توڑنے والے جن کو لڈائٹ[۵۱] کہتے تھے، زندگی کا ایک نیا معیار حاصل کرنے کے لئے جنگ کر رہے تھے، اپنے دلوں میں عرصے سے جو غم و غصہ وہ چھپائے ہوئے تھے، اب وہ یکبارگی ظاہر ہو گیا تھا۔ وہ یہ جنگی گیت گا گا کر اپنے انتقام کی آگ بجھاتے جاتے تھے ؎

ہم کندھا جوڑ کر کھڑے ہوں گے
اور ہم سختی سے قسم کھا کر کہتے ہیں کہ ہم
کترنیوں کو توڑ ڈالیں گے اور کھڑکیوں کو بھی
اور ہم آگ لگا دیں گے ـــــ مل کو

ہم آسانی سے تصور کر سکتے ہیں کہ اس کشاکش کا نتیجہ کیا ہوا ہوگا۔ املاک پر تباہی آئی اور غرضیکہ انھوں نے مشینوں کو توڑ پھوڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ جو لوگ ان مشینوں کے مالک تھے انھوں نے بھی ان ہنگاموں کے علاج میں دیر نہیں لگائی۔ انھوں نے قانون کا سہارا لیا۔ قانون نے بھی ان کی مدد میں کوتاہی نہیں کی۔ ۱۸۱۲ء میں پارلیمنٹ نے ایک قانون کے ذریعے سے مشین کے

---

۵۱ LUDDITE : کاریگروں کی ایک جماعت کا رکن جس نے ۱۸۱۱ء میں مشینوں کے تباہ کرنے کی غرض سے بلوہ کیا تھا۔

توڑنے والوں کو سزائے موت کی وعید سنائی. اس قانون کے منظور ہونے سے پہلے دارالامراء کے ایک رکن نے اپنے دورِ ممبری کی پہلی تقریر میں اس قانون کی سخت مخالفت کی. اس نے کہا کہ مشینوں کی تباہی کی اصل ذمہ داری ان حالات پر عائد ہوتی ہے جو انسانی تباہی کا موجب ہو رہے ہیں:-

اس میں کوئی شبہ نہیں یہ تشدد و پریشان کن حد تک آگے بڑھ گیا ہے لیکن یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہ اُن حالات کا نتیجہ ہے جو ایسی زبردست تباہی کا موجب ہو چکے ہیں جس کی مثال تاریخ میں ڈھونڈھنے سے بھی نہ مل سکے گی. ان تباہ حال لوگوں کا اپنی اس روش پر اصرار اس بات کا ثبوت ہے کہ ان کی تباہی ناقابلِ برداشت حد تک پہونچ چکی ہے اور اب ان ہنرمند اور ایماندار محنت کشوں کی جماعتیں مایوسی کے عالم میں اس تشدد کے سوا جو ان کے اور ان کے خاندان والوں کے لیے سخت تباہ کن ہے اور کوئی راستہ کھلا ہوا نہیں پاتی ہیں ـــــــ وہ اپنی نادانی سے خیال کرتے ہیں کہ ہنرمند غریبوں کی فلاح و بہبود ان تجارتی آلوں کی ترقی کے مقابلے میں جو صرف مٹھی بھر امیروں کی دولت بڑھانے کا موجب ہیں، زیادہ اہم اور نتیجہ خیز ہے. وہ یقین رکھتے ہیں کہ ان تجارتی آلوں نے ان سے روزگار چھین لیا ہے اور صرف ان کی وجہ سے محنت کشوں کو ان کی محنت کا صلہ نہیں ملتا ہے............ آپ ان لوگوں کو جاہل، خطرناک اور شورہ پشت عوام کہتے ہیں. کیا ہمیں ان ذمہ داریوں کا بھی احساس ہے، جو ان عوام کے بارے میں ہمارے اوپر عائد ہوتی ہیں؟ یہ عوام ہی ہیں جو ہمارے فارموں میں کام کرتے ہیں، یہ عوام ہی ہیں جو ہمارے گھروں میں ہماری خدمت کا فرض انجام دیتے ہیں. یہ عوام ہی ہیں جو ہمارے بحری بیڑے اور ہماری فوج میں بھرتی ہوتے ہیں، یہ عوام ہی ہیں جن کی مدد سے آپ پوری دنیا کا مقابلہ کرتے ہیں اور یہ عوام ہی ہیں جن کو اگر ہماری غفلتیں تباہ کر کے مایوسی کی منزل تک پہونچا دیں تو وہ ہمارا مقابلہ بھی کر سکتے ہیں:

جس شخص نے ۲۷ فروری ۱۸۱۲ء کو یہ تقریر کی تھی وہ لارڈ بائرن کے سوا کوئی دوسرا نہ تھا. مشینوں کی توڑ پھوڑ کی تحریک کوئی معقول تحریک نہ تھی. اگر یہ کامیاب بھی ہوتی تو کوئی نتیجہ

نہ نکلتا اور محنت کش عوام کے مسئلے جوں کے توں لاینحل پڑے رہ جاتے۔ انھوں نے اپنے مقصد کے حصول کے لئے صحیح راہِ عمل اختیار نہیں کی تھی۔ مشینیں ان کی تباہی کا سبب نہیں تھیں۔ ان کی تباہی کے ذمہ دار تو ان مشینوں کے مالک تھے۔ ان مشینوں کے مالکوں ہی نے کھلم کھلا نہ سہی لیکن ایسے ذرائع استعمال کئے جو احاطہ بندی کی تحریک کی طرح ان کی تباہی کے موجب ہو رہے تھے:۔

مزدوروں کی سمجھ میں بہت جلد یہ بات آگئی کہ مشینوں کی توڑ پھوڑ سے اصل مسئلوں کا کوئی حل نہیں نکلتا۔ بعض مزدوروں نے دوسری تدبیریں بھی آزمانی شروع کیں۔ نیچے ہم ایک عرضداشت کی نقل پیش کرتے ہیں۔ یہ درد بھری درخواست "غریب پارچہ بافوں" نے ۱۸۱۸ء میں اپنے مالکوں کے سامنے اولڈھم میں پیش کی تھی:۔

> ہم اس شہر اور آس پاس کے پارچہ باف بہت ادب سے آپ کی توجہ اپنے حالِ زار کی طرف جس میں ہم عرصے سے گرفتار ہیں مبذول کرانا چاہتے ہیں۔ ہماری پریشانی کی اصل وجہ ہماری اجرت کی انتہائی کمی ہے۔ اس لئے آپ سے التجا کرتے ہیں کہ آپ اپنا ایک جلسہ طلب کریں اور کوشش کریں کہ ہماری اجرتوں میں کچھ اضافہ ہو جائے تاکہ ہماری پریشانیوں میں کچھ کمی ہو۔ آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ ہم موجودہ حالت میں زندگی بسر کرنے کے لئے ضروری اور عام چیزیں بھی فراہم نہیں کر سکتے ہمیں امید ہے کہ اگر آپ جماعتی حیثیت سے اپنا اثر استعمال کریں گے تو آپ کے نفع کو نقصان پہونچے بغیر حالات درست ہو جائیں گے۔ ہم کبھی اور کسی حال میں نہیں چاہتے کہ آپ کے مفاد کو کسی قسم کا کوئی نقصان پہونچے:

اس قسم کی سیکڑوں عرضداشتیں مالکوں کے سامنے پیش کی گئیں لیکن ان کا کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ آخرکار یہ طریقہ ترک کر دیا گیا اور براہِ راست پارلیمنٹ کے سامنے درخواستیں پیش ہونے لگیں۔ بہت سی عرضداشتوں پر کوئی توجہ نہیں کی گئی لیکن بعض شکایتوں نے ایوان کی توجہ اپنی طرف مبذول کرا لی قوانین کے دفتر میں بعض ایسے قوانین پہلے سے درج چلے آ رہے تھے جن پر اگر عمل ہوتا رہتا تو اس محنت کش طبقے کی مصیبتوں کا علاج ہو چکا ہوتا۔ بعض قانون ساز کمیٹیوں نے بھی تحقیقات کے بعد یہی کہا تھا

کہ محنت کشوں کے حالات ناقابل بیان حد تک بھیانک ہیں اور ان حالات کی فوری اصلاح کی شدید ضرورت ہے۔ ان عرضداشتوں اور ان رپورٹوں کی وجہ سے کچھ اور قوانین بھی بنے۔

لیکن قوانین کا کتاب القوانین (STATUTE-BOOKS) میں چھپ جانا اور بات ہے اور ان پر عمل ہونا دوسری بات ہے۔ مزدوروں کی سمجھ میں بھی یہ حقیقت آنے لگی تھی۔ ان کو یہ بھی تجربہ ہو رہا تھا کہ وہی قوانین ایک خاص طریقہ سے ان کے حق میں بھی استعمال کیے جا سکتے ہیں لیکن ان کی تعبیر بدل کر دوسرے انداز سے وہ کارخانے کے مالکوں کے بھی کام آ سکتے ہیں کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ مزدور جن مالکان کارخانہ کے خلاف عدالتوں کا دروازہ کھٹکھٹاتے تھے کرسی عدالت پر وہی جلوہ افروز نظر آتے تھے۔ ان حالات میں ان کو اپنی فریاد کی بے اثری کا پہلے ہی یقین ہو جاتا تھا۔ یہ بات بھی کچھ کم نہ تھی کہ عدالت کے حاکم بھی مالکانِ کارخانہ جات ہی کے طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ اگر ان کا اس طبقے سے کوئی تعلق نہ ہوتا تب بھی ان کے طرز فکر کی یکسانی انصاف کے خون کے لیے کافی ہوتی تھی۔ محنت کش عوام ذلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے اور مالکان کارخانہ سماج میں بڑی عزت کے مالک تھے۔ عدالتوں کے حاکموں کے نزدیک، مزدوروں کو ان چند ٹکڑوں کے لئے جو مالک ان کے سامنے پھینک دیتے تھے شکر گذار ہونا چاہیئے تھا۔ کارخانوں کے مالک تعریف کے قابل تھے کہ انھوں نے ازراہِ غریب پروری ان کی پرورش کے لئے چند ٹکڑے پھینک دیتے تھے۔ اس مخصوص ماحول میں انصاف کا ترازو ہمیشہ سرمایہ داروں کی طرف جھکتا تھا اور مزدوروں کو اپنے کئے کا بھگتان بھگتنا پڑتا تھا۔ دو مشہور مورخوں نے جو واقعات پیش آ رہے تھے، ان کا خلاصہ دیا ہے کہ :۔

"پارلیمنٹ محنت کش طبقے کے مطالبات منظور نہیں کرتی ہے، جو رعائتیں ان کو دی جا چکی ہوں وہ بھی ان کو عملاً نہیں ملتی ہیں۔ حاکمان عدالت ان قوانین پر، جو مالکوں کے مفاد کے خلاف ہوں عمل کرنے سے انکار کرتے ہیں۔ ان مجسٹریٹوں کا خیال ہے کہ اگر مالکوں کا طبقہ کسی قانون پر عمل کرنے سے انکار کر دے گا تو ان کو کسی طرح قانون کی اطاعت پر مجبور نہ کیا جا سکے گا۔ وہ مالکوں کو قانون کے احترام پر مجبور کرنے سے قاصر تھے۔ اس لیے جو شخص ان مالکوں کو ان

قوانین پر عمل کرنے کے لئے مجبور کرنا چاہتا تھا وہ اُسے اس جرأت کی پاداش میں جیل خانے میں

بند کردیتے تھے۔"

آدم اسمتھ جس کو قدرت نے بڑی نکتہ رس نگاہ عطا کی تھی یقین کرتا تھا کہ یہ حالات کسی خاص زمانے اور کسی خاص ملک کے ساتھ مخصوص نہ تھے بلکہ عام طور سے تمام سرمایہ دار ملکوں میں، ہر زمانے میں پیش آتے رہتے تھے۔ مالکان کارخانہ جو اپنے کارناموں کی داد کے لئے، اپنے اس ہیرو کی طرف دیکھ رہے تھے، کچھ زیادہ عرصے تک ادھر متوجہ رہنے میں اپنا نفع نہیں سمجھتے تھے۔ وہ قوموں کی دولت" کے اس ہیرے سے اپنی نگاہ بچا کر کترا جانا چاہتے تھے:-

"جہاں تک جائداد اور املاک کی حفاظت کا سوال ہے، شہری حکومتیں دراصل صرف غریبوں کے خلاف امیروں کی حفاظت کے لئے قائم ہیں، یہ صرف ان کو جو جائداد اور املاک رکھتے ہیں، غریبوں سے جن کے پاس کچھ نہیں ہے، بچاتی ہیں۔"

یہ حقیقت اب بڑے تلخ تجربوں کے بعد اب محنت کشوں کی سمجھ میں آنے لگی تھی۔ وہ اس صورت حال کا کیا علاج کرتے؟ ایک تدبیر جو بظاہر بہت مناسب معلوم ہوتی تھی، ان کی سمجھ میں آئی۔ اگر وہ رائے دہندگی کا حق حاصل کر سکتے تو بڑا کام چل جاتا۔ وہ اس لائق ہو سکتے کہ قانون سازوں پر دباؤ ڈال کر ایسی حکومت بنالیں جو چند افراد کے بجائے بہتوں کے مفاد کے لئے کام کر سکے۔ وہ اب محسوس کر رہے تھے کہ انھیں قانون سازوں کے انتخاب میں حصہ لینے کا حق ملنے کی ضرورت تھی۔ جو قانون محنت کشوں کی رائے سے بنے گا وہی ان کے حقوق کی نگہداشت کر سکے گا۔ لیکن اس وقت کے مروجہ قوانین ان کی راہ کا پتھر بنے ہوئے تھے۔ یہ قوانین ان کے مالکوں کے بنائے ہوئے تھے، اگر مزدور قانون ساز جماعت پر اثر ڈال سکتے تو ان کی بہبودی کے مواقع نکل سکتے تھے۔ اگر حکومت غلہ فروشی کے قوانین بنا کر زمین کے مالکوں کے مفاد کی حفاظت کر سکتی ہے، اور اگر بیرونی مال پر محصول لگا کر کارخانے کے مالکوں کے حقوق کی نگہداشت ہو سکتی تھی تو یہ بھی ہو سکتا تھا کہ حکومت ایسے قوانین بناتی جن کی مدد سے مزدوروں کی اجرت اور ان کے کام کرنے کے اوقات کے مسئلوں کو بھی ہمدردی

سے حل کیا جا سکتا۔ اب انھوں نے حق رائے دہندگی کے حصول کے لئے اپنی مہم شروع کی :۔

ہم لوگ، جو ریاست ہائے متحدہ امریکہ اور انگلستان کے باشندے ہیں یقین رکھتے ہیں کہ سیاسی جمہوریت جیسی آج کل قائم ہے دنیا میں ہمیشہ قائم رہی ہے لیکن یہ یقین حقیقت سے دور کا بھی تعلق نہیں رکھتا ہے رائے دہندگی کا حق جو آج کل امریکہ اور یورپی ممالک میں ہر شہری کو حاصل ہے آسانی سے نہیں ملا تھا۔ یہ حق نتیجہ ہے ایک سخت کشاکش کا۔ انگلستان کے محنت کشوں نے تحریک منشوریت[۵۱] میں شریک ہو کر اپنی صف بندی کی۔ تحریک منشوریت کے مطالبات حسب ذیل تھے :۔

۱۔ رائے دہندگی کا عالمگیر حق (مردوں کے لئے)

۲۔ ممبران دارالعوام کے لئے الاونس (تاکہ غریب لوگ بھی عہدہ سنبھال سکیں)

۳۔ پارلیمنٹ کی سالانہ نشست

۴۔ امیدواروں کے لئے جائداد کی قید سے استثنار

۵۔ بیلٹ کے ذریعہ سے رائے شماری تاکہ بیجا تخویف اور دباؤ سے بچا جا سکے

۶۔ برابر انتخابی حلقے

تحریک منشوریت آہستہ آہستہ ختم ہو گئی لیکن رفتہ رفتہ یہ سارے مطالبات (پارلیمنٹ کی سالانہ نشست کے علاوہ) ایک ایک کر کے منظور کر لئے گئے۔ منشوری رہنماؤں نے سیاسی جمہوریت کے لئے جدوجہد کی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ اس ہتھیار کے ہاتھ میں آجانے کے بعد حالات کی بہتری کے لئے جدوجہد کامیابی کے ساتھ جاری رکھی جا سکے گی۔ اسٹیفنس نے، جو میتھوڈسٹ تھا اپنے سامعین سے کہا تھا :۔

"میرے دوستو! منشوریت کوئی سیاسی تحریک نہیں ہے۔ اس تحریک کا خاص مقصد بیلٹ حاصل کرنا ہے۔ منشوریت نام ہے، شکم سیری کی تحریک کا، منشور، اچھے گھر، عمدہ کھانے پینے، خوش حالی اور کام کے گھنٹوں میں کمی کرانے کا نام ہے۔"

پارسن اسٹیفنس رجائیت پسند آدمی تھا۔ محنت کش طبقے نے سیاسی جمہوریت کی لڑائی تو جیت لی

---

۵۱ منشوریت (CHARTISM) ۱۸۳۷ء تا ۱۸۴۸ء کی اصلاحی تحریک کے اصول

لیکن اسٹفنس کے خواب کی تعبیر نہ نکلی۔ سیاسی جمہوریت سے جن پھلوں کی وہ امید کرتا تھا وہ حاصل نہ ہوئے آگے چل کر کچھ مانگیں ضرور پوری ہوئیں لیکن ان کے حصول میں صرف حق رائے دہندگی سے کوئی مدد نہ ملی۔ ان محنت کشوں کے مطالبات کے تسلیم کرانے میں خود ان کی انجمن ـــــ ٹریڈ یونین ـــــ کا جو ان کے حقوق کے لئے لڑ رہی تھی، بڑا ہاتھ تھا۔ اس انجمن نے لڑ بھڑ کر اجرتوں میں اضافہ کرایا، کام کے اوقات میں کمی کرائی اور مزدوروں کے لئے ملازمت کی بہتر شرطیں حاصل کیں۔

ٹریڈ یونین کوئی نئی چیز نہ تھی۔ پرانے زمانے میں اجیر کاریگروں کی انجمنیں قائم تھیں یہی انجمنیں اپنی نئی شکل میں ڈھل کر ٹریڈ یونین کے نام سے مشہور ہوئیں۔ جب صنعتوں میں سرمایے کی حیثیت بہت بڑھ گئی، کاریگروں کی انجمنوں نے بھی گلڈ سسٹم کا پرانا چولا اتار کر موجودہ ٹریڈ یونین کا لبادہ پہن لیا۔ آج کل کی ٹریڈ یونین ایک ایسی جماعت ہے جو ایک صنعت کے تمام مزدوروں کو اپنے مشترکہ مفاد کی حفاظت کے لئے متحد ہو کر جدوجہد کرنا سکھاتی ہے۔

یہ ٹریڈ یونینیں یکبارگی نہیں بن گئیں۔ طبقاتی مفاد کے اتحاد اور یکسانیت کا احساس بہت دنوں میں پیدا ہوا، جب تک یہ احساس پیدا نہ ہوتا طبقاتی بنیادوں پر کسی بڑی جماعت کا منظم کرنا ممکن نہ تھا۔ صنعتی انقلاب نے یہ منزل کھول دی اور ٹریڈ یونین کی تحریک دیکھتے ہی دیکھتے بہت آگے بڑھ گئی۔ صنعتی انقلاب کا زمانہ ان جماعتوں کی تنظیم کے لئے بہت سازگار ثابت ہوا۔ صنعتوں نے مزدوروں کی بڑی بڑی بستیاں شہروں میں بسا دیں۔ نقل و حمل اور رسل و رسائل کی آسانیاں ایک بڑی قومی تنظیم کے لئے لازمی ہیں۔ مزدوروں کی تحریک بھی اپنی تنظیم کے لئے ان تمام آسانیوں کی محتاج تھی۔ ان آسانیوں کے ملتے ہی محنت کشوں کی تنظیم نے بھی ترقی کی منزلیں بہت جلد طے کر لیں۔

محنت کشوں کی تنظیم بھی سرمایہ داری نظام کی ترقی اور ہمہ گیری کے ساتھ بڑھتی گئی۔ سرمایہ داری نظام نے طبقاتی تفریق کچھ زیادہ واضح کر دی۔ طبقاتی جذبات نے بھی بڑھ کر الگ الگ طبقوں کی حدبندی کر دی اور ملنے جلنے اور اشتراکِ عمل کی مادی آسانیوں نے راہ کی دشواریاں بڑی حد تک آسان کر دیں۔ ٹریڈ یونین کی تحریک بھی انہیں ملکوں میں زیادہ ترقی پر ہے جو صنعتی ترقی میں بہت آگے بڑھ گئے ہیں۔

اور جہاں فیکٹری سسٹم نے بڑے بڑے شہر بسا دیئے ہیں۔ فریڈرک اینگلز نے ۱۸۴۵ء میں اس حقیقت کی طرف ان الفاظ میں رہنمائی کی تھی:۔

"اگر آبادی کا ایک مرکز پر اکٹھا ہو جانا املاک رکھنے والے طبقے میں تحریک پیدا کرتا ہے اور اس کو ترقی دیتا ہے تو وہ محنت کش طبقوں میں بھی ترقی کی رو بہت تیز کر دیتا ہے۔ مزدور بھی ایک طبقے اور ایک جماعت کی حیثیت سے سوچنا اور محسوس کرنا شروع کر دیتے ہیں اور خیال کرنے لگتے ہیں کہ اگرچہ وہ فرد کی حیثیت سے بہت کمزور ہیں لیکن اگر وہ متفق ہو جائیں تو ایک طاقت بن جاتے ہیں۔ بورژوا طبقے سے ان کی علیحدگی عمل میں آتی ہے اور وہ خیالات پرورش پاتے ہیں جو محنت کش طبقوں اور ان کی جیسی حالت رکھنے والوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ پسماندگی کا احساس جاگ اٹھتا ہے اور یہ محنت کش سماجی اور سیاسی طور پر ایک خاص اہمیت حاصل کر لیتے ہیں۔ بڑے شہر مزدوروں کی تحریکوں کا جنم استھان ہیں۔ ان بڑے شہروں میں وہ سب سے پہلے اپنی حالت پر غور کرتے ہیں اور اس سے نکلنے کی جد و جہد شروع کر دیتے ہیں اور اس طرح پرولتاری اور بورژوا طبقوں میں مخالفت اپنی پہلی جھلک دکھاتی ہے۔ یہی منزل ہے جہاں سے ٹریڈ یونین، منشوریت اور اشتراکیت کی حدیں شروع ہو جاتی ہیں۔"

صنعتی انقلاب، جو سب سے پہلے انگلستان میں شروع ہوا تھا، دوسرے ملکوں میں بھی پھیل گیا۔ جو ملک ابھی تک پیچھے ہوئے تھے ان کی طرف بھی یہ دبے پاؤں آگے بڑھ رہا ہے۔ یہ انقلاب ہر ملک میں انگلستان کے نقش قدم پر نہیں چلا۔ امیروں کے برتاؤ اور حکومت کے اصلاحی قوانین نے اس کی رفتار اور ظاہری شکل میں بہت تغیرات پیدا کئے لیکن ٹریڈ یونین کی مخالفت میں، کوئی ملک ایسا نہ تھا جس نے انگلستان کی پیروی نہ کی ہو۔

یہ لڑائی بہت پرانی ہے۔ محنت کشوں کا اپنی حالت سدھارنے کے لئے منظم ہونا ہر زمانے میں جرم خیال کیا گیا۔ چودھویں صدی عیسوی میں بھی مزدوروں کی باہمی تنظیم خلاف قانون قرار دی گئی تھی اور اس کے بعد تو ہر صدی نے ان کی جماعت بندی کو، جو وہ صرف اپنی جماعتی فلاح اور بہبود کے لئے کرتے تھے، گناہ خیال کیا۔ ۱۷۷۶ء میں آدم اسمتھ نے لکھا:۔

مزدور کی عام اجرت، ہر جگہ اس معاہدہ پر منحصر ہے جو دونوں جماعتوں کے درمیان انجام پاتا ہے۔ یہ دونوں جماعتیں دو طرح کے مفاد رکھتی ہیں اور ان دونوں میں اشتراکِ مقاصد کا کوئی امکان نہیں ہے، مزدور چاہتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ اجرت حاصل کرے لیکن مالک یہ جہاں تک بن پڑتا ہے اجرت کی شرح کم سے کم تر رکھتا ہے، مزدور اپنی جماعتی تنظیم کرتے ہیں تاکہ اجرت کی شرح بڑھا سکیں اور مالک متحد ہوتے ہیں تاکہ یہ شرح جتنی کم کی جاسکے کرلی جائے۔"

یہ اندازہ لگانا کہ اس مقابلے میں کس جماعت کو کامیابی نصیب ہوتی ہے زیادہ دشوار نہیں ہے، مالک تعداد میں کم ہونے کی وجہ سے آسانی سے منظم ہوسکتے ہیں اور قانون بھی ان کو اس کی اجازت دیتا ہے یا اگر اجازت نہیں دیتا ہے تو کم سے کم تنظیم سے تو منع نہیں کرتا ہے لیکن مزدوروں کو یہ رعایت بھی حاصل نہیں ہے۔ پارلیمنٹ نے کوئی ایسا قانون پاس نہیں کیا ہے جو محنت کی اجرت کم کرنے سے منع کرتا ہو لیکن ایسے بہت سے قوانین موجود ہیں جو مزدوروں کو متفق ہوکر اپنی اجرت کی شرح بڑھانے سے روکتے ہیں۔"

آدم اسمتھ نے ۱۷۷۶ء میں جو کچھ لکھا تھا وہ ہمیشہ کی طرح آج بھی ہر سرمایہ دار ملک میں پیش آرہا ہے جن ملکوں میں مالک کارخانہ داروں اور محنت کش مزدوروں کو اپنی انجمنیں بنانے کی اجازت نہ تھی۔ وہاں بھی قانون کی تلوار مالکوں کے سروں پر بہت کم اور غریبوں کے سروں پر اکثر چمکتی رہتی تھی۔ انگلستان فرانس، جرمنی اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں قانون کا پہیہ صرف ٹریڈ یونینوں کو کچلتا رہا ہے۔

چوتھائی صدی تک انگلستان میں، ان قوانین نے جو جماعت بندی کے خلاف بنائے گئے تھے مزدوروں کو منظم ہوکر اپنے حقوق کی حفاظت سے باز رکھا۔ جب انھوں نے انجمنیں بنائیں۔ قانون نے ان کے خلاف فیصلہ صادر کرنے میں دیر نہیں لگائی:۔

"اسٹاکپورٹ کے ٹوپی بنانے والوں کو ۱۸۱۶ء کی سازش کے سلسلے میں دو سال کی قید کی سزا دی جاتی ہے۔ جج سر ولیم گیرو نے مقدمہ کی روداد کا خلاصہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔

"اس بھلے پھولے ملک میں جہاں قانون ایک ارذل طبقے کے آدمی کو بھی، ایک بہت اونچے

۱

طبقے کی ممتاز شخصیت کے ساتھ مساوات حسنا کرتا ہے اور جہاں ہر طبقے کی برابر حفاظت کی جاتی ہے انجمن بنانے کی کوئی ضرورت نہیں رہتی۔ مسٹر جیکسن جنھوں نے سوسے لے کر ایک سو بیس آدمیوں تک کو نوکری دے رکھی ہے ہم سب کے شکریے کے مستحق ہیں اور یہی جذبہ شکر گذاری ہم کو سکھاتا ہے کہ ہم اس محسن قوم کی عزت کریں۔"

ٹوپیاں بنانے والوں کو، جنھوں نے یونین میں شریک ہونے کی جرأت کی، دو سال کی سزا اور مسٹر جیکسن کو، جنھوں نے ازراہِ کرم و مہربانی ان کو کام کا موقع دیا تھا ہدیۂ صد شکر و احترام۔ جج کے پہلے جملے پر غور کرنے کی ضرورت ہے، کیا اس نے جو کچھ لکھا ہے اس سے اس کی مراد بھی وہی ہے؟

فرانس اور انگلستان میں اجرت کی شرح بڑھانے کی نیت سے انجمنیں بنانا خلاف قانون قرار دے دیا گیا۔ اور ججوں کو ان محنت کشوں کے حال پر افسوس کرنے کا موقع ملا جو قانون کی بے حرمتی پر اصرار کر رہے تھے۔ ٹوکیسر کا بیان ہے کہ ان ملکوں میں محنت کشوں کو اپنی باہمی تنظیم سے روکا گیا لیکن مزدوروں کی سمجھ میں یہ حقیقت اچھی طرح آ چکی تھی کہ وہ الگ کوئی اثر نہیں رکھتے لیکن متفق ہو کر زبردست طاقت بن جاتے ہیں۔ اس لئے انھوں نے ان قوانین کی پروا کئے بغیر اپنی تنظیم کی فکر کی:۔

"ججوں نے سزائیں دیں، اگرچہ انھوں نے (بزعم خود) ہر معاملے میں قانون کا احترام پوری سختی سے نہیں کیا۔ انھوں نے کہا کہ "عدالت نے بہت نرمی اور شفقت سے تمھارے معاملات پر غور کیا ہے لیکن تم کو اس سے سبق لینا چاہئے اور خوب سمجھ لینا چاہئے کہ جس طرح کام تم کو آرام اور نیک سلوک کا مستحق قرار دیتا ہے اسی طرح یہ گٹھ بندی تم کو قید اور افلاس کا سزاوار ٹھہراتی ہے۔"

"لیکن محنت کشوں نے کوئی سبق نہیں حاصل کیا۔ ان واقعات کی جو یاد ان کے ذہنوں میں محفوظ رہ گئی وہ صرف یہ تھی کہ ۱۸۲۰ء کی اسٹرائک نے ان کی اجرت کی شرح بڑھا کر پینتیس سنٹم فی گھنٹہ کر دی تھی ۱۸۳۳ء کی اسٹرائک نے یہ شرح بڑھا کر چالیس سنٹم کر دی اور انھوں نے ۱۸۴۵ء میں اس لئے ہڑتال کی تھی کہ ان کی مزدوری کی شرح پچاس سنٹم ہو جائے۔"

جرمنی میں بھی مزدوروں کا عقیدہ یہی تھا کہ ٹریڈ یونین نے ان کو وہ طاقت بخشی جس کے بغیر وہ اپنی

حالت سدھار نہیں سکتے تھے ۱۸۶۴ء میں برلن کے چھاپنے والوں نے پرشین چیمبر آف ڈپٹیز سے درخواست کی تھی کہ:۔

"ہم پوری طرح یقین کرتے ہیں کہ مزدوروں کی سماجی حالت میں ترقی اُسی وقت ممکن ہے جب وہ تمام پابندیاں جو موجودہ قانون نے عائد کر رکھی ہیں اُٹھالی جائیں۔ اسی لئے ہم چھاپنے والے اجیر کاریگر یہ عرضداشت پیش کرتے ہیں یہ خیال کرتے ہوئے ــــــــ کہ معاشیات کا قانونِ طلب اور رسد مزدوروں کو اتنا بھی نہیں دلاتا جس سے وہ اپنی زندگی کی موٹی موٹی ضرورتیں پوری کر سکیں، کوئی محنت کش فرد اپنی انفرادی حیثیت سے اس لائق نہیں ہے کہ اپنی اجرت کی شرح میں اضافہ کرا سکے اس لئے ہم جماعت بندی کا حق مانگتے ہیں۔ ہمارا یہ حق عقل اور انصاف کی رُو سے بالکل جائز اور درست ہے، اس لئے ۱۸۴۵ء کا قانون جو مزدوروں کو تنظیم سے روکتا ہے منسوخ کر دیا جائے۔"

یہی داستان ہر جگہ دُہرائی گئی۔ مزدور ہر جگہ اپنی تنظیم کے حق کے لئے لڑ رہے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ ان کو مل جل کر اپنی دشواریاں حل کرنے کا موقع دیا جائے۔ ہم میتھوڈسٹ فیڈریشن کی رپورٹ سے جو اُس نے ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں سماجی خدمات کے متعلق ۱۹۳۵ء میں پیش کی تھی، دو اقتباسات پیش کرتے ہیں ان سے پتہ چل جائے گا کہ امریکہ میں بھی ٹریڈ یونین کا حق حاصل کرنے کے لئے کتنی بھیانک لڑائی لڑی گئی تھی:۔

"........ ایک بہت بُری اور بھیانک تحریک یونین کے ممبروں کے خلاف شروع کی گئی ہے......... ہر روز ایک برقع پوش گروہ کے ممبر یونین کے کسی نہ کسی ممبر کو پیٹتے رہتے ہیں۔ پہلا شخص، جو ان کی بدسلوکی کا شکار ہوا، شہر سے پندرہ میل دور لے جایا گیا۔ وہاں حملہ آوروں نے اُس کو مردہ سمجھ کر چھوڑ دیا......... آج پانچ آدمیوں کو بُری طرح مارا پیٹا گیا...... سب سے آخر میں یونین کی ایک شاخ کے صدر کو مارا گیا ہے۔

"........ اس پورے ریکارڈ سے یہ اچھی طرح اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس ملک میں امیروں

اور غریبوں کے درمیان کشاکش بدترین شکل اختیار کرتی جاتی ہے۔ کم سے کم تہتر مزدور معاشی ہنگاموں اور خلاف قانون سزائے موت کا شکار ہوئے ہیں۔ ـــــــــ لیکن کسی مالک کا بال بیکا نہیں ہوا۔"

لیکن ان تمام آئینی اور غیر آئینی تدبیروں کے باوجود جو ٹریڈ یونین کی تحریک کو کچلنے کے لئے اختیار کی گئیں، کوئی نتیجہ نہیں نکلا اور ٹریڈ یونین کی بنیادیں مستقل طور پر جمتی گئیں۔ اس تحریک کو فنا کرنا آسان نہیں تھا۔ یونین کے ممبروں کو قید خانوں میں بند کیا گیا۔ اُس کے فنڈ پر قبضہ کیا گیا اور یونینیں چھپ چھپ کر کام کرنے پر مجبور کی گئیں۔ انھوں نے رفاہ عام کی انجمنوں اور سوشل کلب کے نام سے اپنی زندگی بچائی۔ یونین کی لڑائی کے ہتھیار (اسٹرائک کرنا اور دھرنا دینا) بیکار کر دیئے گئے لیکن ٹریڈ یونینیں پھر بھی زندہ رہیں۔ اور اب بھی وہ مزدوروں کا سب سے زیادہ موثر ہتھیار ہیں جن کے ذریعہ سے وہ اونچا معیار رہائش حاصل کرنے کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں۔

انگلستان کے مشہور اور بڑے شاعر شیلی نے سو سال سے بھی کچھ زیادہ ہوئے ایک نظم کہی تھی۔ اس نظم کا عنوان ہے:۔

"انگلستان کے باشندوں سے"

وہ اس نظم میں اپنے آپ کو مخاطب کر کے صنعتی انقلاب کے بعد انگلستان کی جو حالت ہو گئی تھی، اس کا نقشہ کھینچتا ہے۔ یہ نظم پورے باب کا خلاصہ قرار دی جا سکتی ہے۔ شیلی کہتا ہے:۔

"انگلستان کے باشندو! تم کس کے لئے زمین جوتتے ہو،
اُس مالک کے لئے جو تمھاری پستی اور تباہی کا ذمہ دار ہے؟
کیا تم اس لئے محنت اور ہنرمندی سے کپڑے بُنتے ہو
کہ ظالم دولتمند اس کے کپڑے بنا کر پہنیں؟"

تم کس لئے مہد سے لے کر لحد تک کھلاتے، پہناتے

اور بچاتے رہتے ہو

ان ناشکرے مفت خوروں کو

جو تمہارا پسینہ نہیں — تمہارا خون چوستے ہیں؟"

"اے انگلستان کی شہد کی مکھیو! تم کیوں اپنے

بہت سے ہتھیار اور زنجیریں ڈھالتی ہو تاکہ یہ

بے ہتھیار کے مفت خورے کاہل تمہاری

محنت کی گاڑھی کمائی کو برباد کریں؟"

کیا تم بھی آرام، سکون اور اطمینان پاتے ہو

ٹھنڈا سایہ، غذا اور محبت کی نرم اور بھینی خوشبو؟

وہ چیز کیا ہے جو تم اتنی مہنگی خریدتے ہو

اس قدر مصیبت اور خطرات برداشت کر کے؟"

"تم جو بیج بوتے ہو، دوسرے کاٹتے ہیں

تم جو دولت ڈھوتے ہوئے دوسرے بٹورلے جاتے ہیں

تم جو لباس بُنتے ہوئے دوسرے پہن ڈالتے ہیں

تم جو ہتھیار ڈالتے ہوئے دوسرے اُٹھالے جاتے ہیں"

"بیج بو لیکن کسی ظالم کو اپنی فصل کاٹنے نہ دو

دولت پیدا کرو لیکن کسی مکار کو لوٹ کر اکٹھا نہ کرنے دو

کپڑے بنو لیکن کاہلوں کے پہننے کے لئے نہیں

ہتھیار ڈھالو لیکن صرف اپنی حفاظت کے لئے"

کس کے "قدرتی قانون"؟

چیزیں گرتی ہیں تو نیچے آتی ہیں اوپر نہیں جاتیں، ہم خوب جانتے ہیں کہ اگر ہم کھڑکی کے باہر کود پڑیں تو کیا نتیجہ ہوگا۔ ماہرین طبیعیات نے قدرت کے ان قوانین کی تشریح کر کے بڑا احسان کیا ہے۔ نیوٹن نے کشش ثقل کا قانون معلوم کیا۔ اس کا قانون اس سلسلۂ قوانین کی ایک کڑی ہے جو اب تک اس مادی دنیا کے قدرتی عمل کے متعلق معلوم کئے گئے ہیں۔ ان قدرتی قوانین کا علم ہم کو اس قابل بناتا ہے کہ ہم اپنے اعمال کو ان قوانین کے بموجب ڈھال کر مطلوبہ نتائج تک پہونچ سکیں۔ اگر ہم بغیر سمجھے بوجھے کوئی قدم اٹھائیں گے یا ان قوانین کی پروا کئے بغیر آگے بڑھیں گے تو اس خلاف ورزی کے نتائج ہم کو ضرور برداشت کرنے پڑیں گے۔

ماہرین طبیعیات کی طرح معاشیات کے ماہرین نے بھی صنعتی انقلاب کے زمانے میں کچھ معاشی قوانین دریافت کئے تھے۔ ان کا دعویٰ تھا کہ سماجی اور اقتصادی دنیا ان کے انھیں قوانین کے بموجب گردش کرتی رہتی ہے۔ انھوں نے کچھ نظریات پیش کئے تھے اور ان کا دعویٰ تھا کہ معاشیات کے یہی قدرتی قوانین ہیں۔ وہ اپنی دریافت پر بہت نازاں تھے۔ وہ ان قوانین کی اچھائی برائی سے کوئی سروکار نہیں رکھتے تھے۔ اس جھگڑے میں پڑنے کی ان کو کوئی ضرورت بھی نہ تھی۔ ان کے قوانین اٹل اور دائمی تھے۔ اگر لوگ عقلمندی سے کام لیتے اور ان قوانین کے بموجب جو انھوں نے دریافت کئے تھے، اپنی زندگیاں ڈھال لیتے تو بڑا اچھا ہوتا لیکن اگر لوگوں میں اتنی عقل نہ تھی اور وہ ان قدرتی قوانین کی پروا کئے بغیر جو چاہتے تھے کرتے رہتے تھے تو وہ اپنے اعمال کے برے نتائج کے خود ذمہ دار تھے۔ یہ ماہرین اقتصادیات سچائی اور حقیقت کی تلاش میں سرگرداں تھے لیکن ان کی تحقیقات کے

جو عملی نتائج نکل رہے تھے ان سے وہ بے انتہا بے خبر تھے ممکن ہے یہ الزام صحیح نہ ہو لیکن یہ ماہرین معاشیات بھی انسان ہی تھے۔ وہ بھی ایک خاص زمانے میں اور خاص ملکوں میں رہتے تھے۔ زمانے اور مقامی حالات نے ان کے طرزِ فکر پر اثر ڈالا تھا اور انھوں نے بھی ان مخصوص حالات پر اپنے ماحول کی روشنی میں جو اُس خاص زمانے کی پیداوار تھے غور کیا تھا۔ ان کے فکری نتیجوں سے اُس زمانے کی بڑی بڑی طاقتور جماعتیں متاثر ہوئیں۔ سماج کے بعض گروہوں نے ان کے نظریات میں اپنا نفع دیکھ کر سچائی کی جھلک محسوس کی اور ان کی تعلیمات کو اپنا لیا، لیکن بعض دوسرے گروہوں نے جو ان کی تعلیمات سے کسی نفع کی امید نہیں رکھتے تھے ان کو غلط سمجھ کے ٹھکرا دیا۔

تجارتی انقلاب نے تجارتی طبقے کے اُبھار کے لئے راستہ صاف کر دیا اور تجارتی نظریہ زر[1] جو اُس زمانے کے مخصوص حالات کا تقاضا تھا وجود میں آ گیا۔ فرانس ایک زرعی ملک تھا، اُس کی زمین ہی اُس کی دولت اور فارغ البالی کا ذریعہ تھی۔ اس لئے فطری حکومت[2] کے نظریہ نے فرانس میں آنکھیں کھولیں۔ اسی طرح انگلستان کے صنعتی انقلاب نے بڑے بڑے کارخانوں کو جنم دیا اور "معاشی نظریات" نے جو اس زمانے کے حالات کا تقاضا تھے، انگلستان میں آب و رنگ حاصل کیا۔ ہم صنعتی انقلاب کے نظریات کو "کلاسیکی معاشیات[3]" کے نام سے موسوم کرتے ہیں

تم آدم اسمتھ کی بعض تعلیمات سے واقف ہو۔ اس کو "کلاسکی معاشیات" کا بانی کہا جا سکتا ہے۔

دوسرے ماہرینِ معاشیات، جو اسی جماعت سے تعلق رکھتے ہیں حسب ذیل ہیں:۔

ریکارڈو، مالتھس، جیمس مل، میک کلاک، سینیر، جان اسٹوارٹ مل۔

یہ لوگ نہ آدم اسمتھ کے نظریات کو تسلیم کرتے تھے اور نہ آپس میں ایک دوسرے کی تعلیمات کی تائید کرتے تھے لیکن بعض بنیادی اصولوں میں ایک دوسرے سے ضرور متفق تھے۔

اُس زمانے کے تاجروں نے ان اصولوں کو بڑی خوشی سے قبول کر لیا۔ اس کی ایک خاص وجہ تھی۔ کلاسکی معاشیات کے نظریات ان کے مفاد کے لئے ہر طرح موزوں تھے۔ ان نظریات کی پشت اور

1-MERCANTILSM 2 PHYSOCRACY 3-CLASSICAL ECONOMICS

قدرتی قوانین کی کھیپ سے وہ اپنے تمام اعمال کے لئے سند جواز ڈھونڈھ نکالتے تھے۔ تجارت پیشہ جماعتیں اس قسم کے خاص مواقعہ کی تلاش میں رہتی تھیں۔ وہ منافع کے حریص تھے۔ کلاسکی معاشیات کے ماہروں نے ان کے دل کی باتیں کہی تھیں۔ وہ کچھ اور بھی آگے بڑھے اور حوصلہ مند تاجروں کے حوصلے بڑھانے کے لئے کچھ اور بھی تعلیم دی۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ تمھارا ایک ایک لمحہ جو تم اپنے کاروبار کی دیکھ بھال اور ذاتی نفع کمانے میں صرف کرتے ہو ریاست ہی کی خدمت میں لگا ہوا ہے۔ آدم اسمتھ کی تعلیم یہی تھی۔ اُس نے ان لالچی روپیہ پیدا کرنے والوں کے لئے جو ابھی تک دن و رات ضمیر کے کچوکے سہتے رہتے تھے، ایک نسخہ تجویز کیا تاکہ وہ ضمیر کی سرزنش سے نجات پاکر اپنے کام میں لگے رہیں۔

> "ہر شخص برابر یہی کوشش کرتا رہتا ہے کہ اپنے سرمایے کے لئے جو وہ لگا سکتا ہے، کوئی بہت ہی نفع بخش بیوپار ڈھونڈھ نکالے۔ کوئی شبہ نہیں وہ ساری دوادوش صرف اپنے ہی نفع کی نیت سے کرتا ہے لیکن اپنے نفع ہی کی تلاش میں رہتے ہوئے بھی وہ ترجیح اُسی کاروبار کو دیتا ہے جو سماج کے لئے زیادہ سے زیادہ مفید ہو!"

بات سمجھ میں آتی ہے؛ سماج کا نفع بھی افراد کے انفرادی نفع کے ساتھ وابستہ ہے۔ ہر شخص کو پوری آزادی دو، اُس سے کہدو کہ وہ جتنا منافع بٹور سکے بٹور لے اور کہیں اپنے ذاتی فائدے کو نظرانداز نہ کرے۔ جب یہ سب کچھ ہو جائے پھر سماج کتنا فارغ البال ہو گیا ہے! تم صرف اپنے ذاتی مفاد کے لئے کام کرو اور فکرمند نہ ہو تمھارا ذاتی کام ہی پورے سماج کی خدمت ہے۔ ان تاجروں کو جو ابھی تک ضمیر کے کچے دھاگے میں بندھے ہوئے تھے، آزادی ہے ہاتھ پیر ہلانے کا موقع ملا اور وہ زیادہ سے زیادہ نفع کمانے کی نیت سے چل کھڑے ہوئے ——— "ہم کو تنہا چھوڑ دو" کی اسپشل ٹرین جا رہی ہے۔ اس لئے ہر کس و ناکس کا فرض ہے کہ اُس کا راستہ چھوڑ کر علیحدہ ہو جائے۔

کیا کوئی حکومت کام کے اوقات اور اجرت کی شرح پر کوئی پابندی عائد کر سکتی ہے، کلاسکی معاشیات کے ماہرین کسی حکومت کو اس قسم کا کوئی اختیار نہیں دیتے۔ ان کے نزدیک "قدرتی قوانین" میں مداخلت ممکن نہیں، اور اگر اس قسم کی کوئی کوشش کی جائے گی تو کبھی کامیاب نہ ہو گی۔

پھر آخر حکومت کے فرائض کیا ہیں؟ قیامِ امن، جائداد و املاک کی حفاظت اور مداخلت بے جا کی روک تھام۔

تجارت کو مقابلے کی اجازت عام ملنی چاہئے۔ اسی تدبیر سے قیمتیں کم رہ سکتی ہیں۔ اسی صورت سے مضبوط اور کارکردہ لوگوں کی ترقی کی راہیں کھل سکتی ہیں اور کمزور اور ناکارہ اشخاص سے نجات حاصل کی جا سکتی ہے۔ اس طرزِ فکر کے بموجب سرمایہ داروں کا قیمتیں بڑھانے کا خیال اور مزدوروں کا زیادہ اجرت پر اصرار قدرتی قانون کی خلاف ورزی کے مرادف تھا۔

تم کو یاد ہوگا، آدم اسمتھ نے "نظریۂ زر" کے حامیوں کے عائد کردہ ضابطوں اور پابندیوں کے خلاف، ان عام تصورات کی تبلیغ کی تھی۔ اس نے اپنی اہم کتاب ۱۷۷۶ء میں جب صنعتی انقلاب ہونے جا رہا تھا، لکھی تھی۔ "کلاسکی معاشیات" کے حامیوں نے انھیں تعلیمات کو اپنا لیا اور ان کی مزید تشریح اور توضیح کر کے اس زمانے میں پیش کیا جب صنعتی انقلاب نے سرمایہ دار طبقے کو اثر و اقتدار کے سنگھاسن پر بٹھا دیا تھا۔

اس زمانے میں مالتھس کی مشہور کتاب "آبادی کے اصول" شائع ہوئی۔ یہ کتاب سب سے پہلے ۱۷۹۸ء میں ولیم گاڈون کے جواب میں (جو مشہور شاعر شیلی کا خسر تھا) شائع ہوئی تھی، گاڈون نے اپنی کتاب "سیاسی انصاف کے متعلق تحقیق" میں جو ۱۷۹۳ء میں شائع ہوئی تھی، لکھا تھا کہ:۔

"تمام حکومتیں شر اور فساد کی بنیاد ہیں۔ انسان صرف اپنی عقل کے استعمال سے خوشی اور مسرت حاصل کر سکتا ہے"

مالتھس گاڈون کے خطرناک خیالات کی تردید کرنا چاہتا تھا۔ وہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ انسان کے حالات میں کسی زبردست تبدیلی کا جو اس کی خوشی اور مسرت سے ہمکنار کر سکے کوئی امکان نہیں ہے۔ اس لئے انسان جس حال میں ہے اسی میں قناعت کرے اور کبھی کسی ایسے انقلاب کی، جو فرانس والوں نے برپا کیا تھا آرزو نہ کرے، اس نے گاڈون پر ان الفاظ میں تنقید کی:۔

"گاڈون کا خیال ہے کہ سماج میں جتنی خرابیاں اور تباہ کاریاں پائی جاتی ہیں سب کی

ذمہ داری ان منظم اداروں پر عائد ہوتی ہے جو انسانوں نے قائم کئے ہیں۔ یہ ایک ایسی بنیادی غلطی ہے جو پوری کتاب میں گاڈون کی گمراہی کا سبب بنی رہی ہے۔ سیاسی ضابطے، املاک کی حفاظت اور دیکھ بھال کے انتظامی ادارے، اُس کے نزدیک خرابی کی جڑ اور ہر طرح کے جرائم کا سبب ہیں۔ وہ دعویٰ کرتا ہے کہ یہی جرائم دراصل انسان کی پستی کی بنیادی وجہ ہیں۔ اگر خرابیوں کی جڑ بس اسی حد تک ہوتی تو بہت آسان بات تھی اور ہم آسانی سے اس کا ازالہ کرسکتے تھے عقل سے مدد لے کر اتنے بڑے مقصد میں کامیابی حاصل کرسکتے تھے لیکن حقیقت یہ نہیں ہے۔ یہ انسانی ادارے جو بظاہر انسان کی بربادی کا کھلا ہوا سبب معلوم ہوتے ہیں اتنے بُرے نہیں ہیں۔ یہ تو دراصل صرف تنکے ہیں جو پانی کی ظاہری سطح پر بہہ رہے ہیں۔ اس سے کہیں زیادہ بُرے نجاست کے وہ بنیادی اور گہرے وجوہ ہیں جو انسانی زندگی کے پورے سرچشمے کو گندا بنائے دے رہے ہیں۔"

وہ بنیادی اور گہرے وجوہ کیا تھے جو انسانی تباہی کے ذمہ دار تھے؟ مالتھس کے نزدیک انسانی آبادی کا اتنا بڑھنا کہ غذا اُس کی کفالت کے لئے کافی نہ ہوسکے، اصل وجہ تھی جو انسان کو تباہی کی طرف لئے جارہی تھی۔ وہ کہتا ہے:-

"اگر روک تھام نہ کی جائے تو انسانی آبادی غذا کے مقابلے میں دونی رفتار سے بڑھتی ہے۔ اس لئے ضرورت ہے کہ مستقل طور پر مضبوطی سے آبادی کے اضافے پر قابو حاصل کیا جائے تاکہ مزید غذا کی فراہمی کا سوال نہ پیدا ہو۔ یہ دشواری کسی ایک حصے میں پیش آتی ہے لیکن اس کا خمیازہ پوری انسانی برادری کے ایک بڑے حصے کو برداشت کرنا پڑتا ہے۔ ......

انگلستان کی آبادی سات ملین بتائی جاتی ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ اس وقت جتنی غذا پیدا ہوتی ہے وہ اتنی آبادی کے لئے کافی ہے۔ پہلے پچیس سالوں میں یہ آبادی بڑھ کر چودہ ملین ہوجائے گی اور غذا کی پیداوار بھی اسی اضافے کی مناسبت سے دوگنی ہوجائے گی لیکن اُس کے بعد کی چوتھائی صدی میں یہ آبادی بڑھ کر اٹھائیس ملین ہوجائے گی لیکن غذا جو

اس ملک میں پیدا ہو سکے گی صرف اکیس ملین آدمیوں کے لئے کافی ہو سکے گی۔ اس کے بعد کی چوتھائی صدی میں آبادی بڑھ کر چھپن ملین ہو جائے گی لیکن غذا صرف آدھے آدمیوں کے لئے فراہم کی جاسکے گی۔ اس صدی کے خاتمے پر یہ آبادی ایک سو بارہ ملین ہو جائے گی اور صرف پینتیس ملین آبادی کی غذا کا بندوبست ہو سکے گا اور باقی ستتر ملین آبادی کیلئے غذا کا کوئی انتظام نہ کیا جاسکے گا۔"

مالتھس کہتا تھا کہ درحقیقت یہ صورت حال کبھی پیش نہیں آتی ہے۔ موت کسی نہ کسی شکل (وبا۔ پلیگ۔ قحط وغیرہ) میں آکر بڑھتی ہوئی آبادی کو ختم کر کے اپنی قدرتی سطح پر لے آتی ہے اور اتنے ہی انسان جن کے لئے غذا کی فراہمی کا امکان ہے، باقی بچتے ہیں۔ وہ کہتا ہے :۔

"فاضل آبادی مصیبتوں اور تباہیوں کے ہاتھوں ختم ہو جاتی ہے اور غذا کی پیداوار کے جتنے ذرائع ہوتے ہیں اتنی ہی آبادی باقی بچتی ہے۔"

مالتھس کے نزدیک محنت کش طبقوں کی غریبی کی وجہ منافع کی زیادتی (انسان کا پیدا کیا ہوا سبب) نہ تھی بلکہ آبادی کا اتنی تیز رفتاری سے بڑھنا جتنی تیز رفتاری سے غذا کی پیداوار کے ذرائع نہیں بڑھتے۔ ان طبقوں کی مفلسی کا اصل سبب (قدرتی سبب) تھا، پھر کیا ان غریبوں کی حالت سدھارنے کی کوئی تدبیر ممکن نہ تھی؟ "نہیں"، مالتھس نے اپنی کتاب کے پہلے ایڈیشن میں لکھا ہے :۔

"کوئی شبہ نہیں یہ بڑی حوصلہ شکن حقیقت ہے کہ سماج کی غیر معمولی ترقی میں جو دشواریاں حائل ہیں وہ اس قسم کی ہیں کہ ان کو دور کرنے کی کبھی امید نہیں کی جاسکتی۔"

لیکن مالتھس نے، اپنی کتاب کے دوسرے ایڈیشن میں جو ۱۸۰۳ء میں شائع ہوا ان دشواریوں کا ایک حل دریافت کر لیا۔ اس کے نزدیک مصیبتوں اور تباہیوں کے علاوہ ایک تیسری تدبیر ضبط نفس بھی ممکن تھی۔ ہڑتال، انقلاب، خیرات، حکومت کے قوانین اور ضابطے کوئی ان غریبوں کی غربت کا علاج نہیں کر سکتا تھا۔ وہ اپنی تباہی کے خود ذمہ دار تھے۔ آخر اس قدر تیزی سے ان کی آبادیاں کیوں بڑھتی تھیں! ان کو اس قدر جلد شادی نہ کرنی چاہیے تھی۔ اگر وہ شادی کر چکے تھے تو ان کو ضبط نفس"

کا نسخہ آزمانا چاہیے تھا تاکہ آئندہ ان کے خاندان نہ بڑھتے اور اس طرح جب ان کی تعداد کم ہوجاتی وہ اپنی مدد آپ کرنے کے لائق ہوجاتے۔

سماج کی مدد سب سے زیادہ کون کرتا ہے۔ ایک شادی شدہ عورت جو بہت سے بچوں کی ماں ہے یا ایک بوڑھی دوشیزہ؟ مالتھس بوڑھی دوشیزہ کے حق میں رائے دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے:۔

"ماں جس نے دس بارہ بچوں کو پال پوس کر جوان کیا ہے یقیناً سوچتی ہوگی کہ اس نے ملک اور قوم کی بڑی خدمت کی ہے اور شاید وہ دن آئے جب اس کے بچے اپنی ملک کی حفاظت کیلئے جنگ کرسکیں............ لیکن اگر اس موضوع پر غیر جانبداری سے غور کیا جائے تو انصاف کی ترازو میں اس بوڑھی دوشیزہ کا پلہ بھاری رہے گا جس کی طرف کوئی توجہ نہیں کرتا ہے"۔

امیروں کے لئے اس سے بڑی خوش خبری اور کیا ہوسکتی تھی کہ غریب خود اپنے افلاس کے ذمہ دار تھے اور امیروں پر اس صورت حال کی کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی تھی۔

آدم اسمتھ کے بعد کلاسکی ماہرین معاشیات میں ڈیوڈ ریکارڈو کا خاص درجہ ہے۔ یہ لندن کا ایک یہودی تھا۔ اس نے اسٹاک کی دلالی میں بڑی دولت پیدا کرلی تھی۔ اُن کی کتاب "معاشیات اور تخصیص محاصل کے اصول" ۱۸۱۷ء میں چھپی تھی۔ بہت سے لوگوں کا خیال ہے کہ یہ پہلی کتاب ہے جس میں معاشیات کو ایک سائنس سمجھ کر غور کیا گیا ہے۔ تم کو آدم اسمتھ کی کتاب بہت آسان معلوم ہوگی لیکن ریکارڈو کی کتاب اس کے مقابلے میں مشکل محسوس ہوگی۔ آدم اسمتھ کو عمدہ زبان لکھنے کا بہت اچھا ملکہ حاصل تھا۔ وہ آس پاس کی مانوس اور نظر آنے والی مثالیں دے کر اپنی بات سمجھاتا ہے لیکن ریکارڈو خیالی مثالیں پیش کرنے کا عادی ہے جو ممکن ہے حقیقت سے کوئی مماثلت نہ رکھتی ہوں سائنس کی کتابیں عام طور سے بہت مشکل اور بے لطف ہوتی ہیں۔ ریکارڈو کی کتاب کا بھی یہی حال ہے۔ بہرکیف وہ جو کچھ کہنا چاہتا ہے وہ اپنی جگہ پر بہت اہم ہے۔ اس کے اس کارنامے نے دنیا کے بڑے ماہرین معاشیات کے ساتھ اس کے نام کو بھی زندہ جاوید بنا دیا ہے۔

ہم اس مختصر سی کتاب میں اس کے صرف چند نظریات پر بہت مختصر گفتگو کریں گے پہلا نظریہ

جس پر ہم بحث کریں گے "اجرتوں کے آہنی قانون"[۵۱] کے نام سے مشہور رہے۔ مزدور اپنی محنت کے معاوضے میں جو اجرت طلب کرتے ہیں اس پر ریکارڈو سے پہلے بھی بہت سے اہلِ قلم توجہ کر چکے ہیں۔ بیت ۱۷۷۰ء میں ٹرگاٹ کی ایک چھوٹی سی کتاب "دولت کی پیدائش اور تقسیم پر کچھ خیالات" شائع ہوئی تھی۔ اس کتاب میں وہ لکھتا ہے:-

محنت کش مزدور اپنی محنت اور ہنرمندی کے سوا کوئی چیز نہیں رکھتا جسے وہ دوسروں کے ہاتھ فروخت کر سکے وہ اسے سستی یا مہنگی قیمت لے کر بیچ ڈالتا ہے لیکن اُس کی محنت کی یہ کم و بیش قیمت صرف اس کی مرضی پر منحصر نہیں ہے۔ اس کا دارومدار اُس معاہدے پر ہے جو اُس شخص سے جس کے ہاتھ وہ اپنی محنت بیچ رہا ہے، کرتا ہے۔ خریدار اُس کی محنت کی قیمت جتنی کم لگا سکتا ہے لگاتا ہے۔ اب اُس کو ان دوسرے محنت کشوں کو بھی سامنے رکھ کر فیصلہ کرتا ہے جو ایک دوسرے کے مقابلے میں کم سے کم اجرت لینے کے لئے تیار رہیں۔ خریدار اسی کی محنت خریدے گا جو اُس سے کم سے کم دام قبول کرے گا۔ یہ محنت کش دوسرے مزدوروں کے مقابلے میں اپنی قیمت کم کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے عام طور سے یہی ہوتا ہے کہ مزدور اپنی محنت کی قیمت اُتنی ہی پاتا ہے جتنی اُس کو صرف زندہ رکھنے کے لئے ضروری ہے۔"

ٹرگاٹ نے اپنی بات جہاں ختم کی ریکارڈو نے اپنی بحث وہیں سے شروع کی۔ اسی لئے "اجرت کا آہنی قانون" اُس کے نام سے منسوب ہوا۔

مزدور صرف اتنا ہی پاتے ہیں جتنا اُن کے اور اُن کے متعلقین کے زندہ رکھنے کے لئے ضروری ہو، ریکارڈو یہ بات ان الفاظ میں لکھتا ہے:-

محنت کی قدرتی قیمت غذا اور دوسری ضروریاتِ زندگی اور سہولتوں کی قیمت پر منحصر ہے۔ جن کی ایک مزدور خاندان کو زندگی بسر کرنے کے لئے ضرورت پڑتی ہے۔ غذا اور دوسری ضروریاتِ زندگی کی قیمتوں میں اضافے کے ساتھ اجرت کی قیمت میں بھی اضافہ ہوگا اور

---

[۵۱] THE IRON LAW OF WAGES

ان چیزوں کی قیمتوں میں کمی کے ساتھ اجرت کی قیمت میں بھی کمی ہو جائے گی۔"

یہ بات ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ مزدوروں کو کبھی کبھی اتنا بھی ملتا ہے کہ ان کی زندگی کی ضرورتیں پوری ہو کر کچھ بچ بھی جائے۔ کبھی کبھی ان کو اتنی کم اجرت ملتی ہے کہ ان کو زندگی بسر کرنے میں بھی بڑی تنگی اور دشواری کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ریکارڈو ان حالات پر بھی غور کرتا ہے اور بازار کی قیمت" اور "قدرتی قیمت" میں امتیاز کرتے ہوئے لکھتا ہے:-

"محنت کی بازار کی قیمت" وہی ہے جو دراصل مزدور کو طلب اور رسد کے اصولوں کی بنیاد پر دی جاتی ہے۔ محنت کی اجرت، جب محنت بازار میں کم پائی جاتی ہے بڑھ جاتی ہے اور جب بازار میں اُس کی افراط ہوتی ہے اُس کی قیمت گر جاتی ہے۔ اُجرت کی بازار کی قیمت اُس کی قدرتی قیمت سے کتنی ہی کم یا زیادہ ہو جائے، یہ دوسری اشیا کی طرح قدر و قیمت سے مطابق ہونے کا رجحان رکھتی ہے۔"

ریکارڈو اس حقیقت کے ثبوت کے لئے جس کا تذکرہ اُس نے آخری جملے میں کیا ہے۔ مالتھس کی کتاب سے ایک صفحہ پیش کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جب محنت کی قیمت زیادہ ہو گی مزدور اپنی ضروریات سے زیادہ پا رہے ہوں گے اور اس حالت میں ان کی تعداد میں اضافے کے رجحانات بڑھ جائیں گے اور جب ان کی تعداد بڑھ جائے گی محنت کی افراط کی وجہ سے ان کی اجرت کی قیمت کم ہو جائیگی جب بازار کی قیمت کم ہو جائے گی اور مزدور اپنی اور اپنے خاندان والوں کی ضروریات زندگی سے بہت کم پانے لگیں گے تب ان کی تعداد گھٹ جائے گی اور تعداد کی کمی ان کی اجرت کی قیمت میں اضافے کا موجب ہو جائے گی۔

ریکارڈو کا یہ قانونِ اجرت بتاتا ہے کہ گھوم پھر کر مزدور اتنا ہی پا سکیں گے جو ان کو صرف زندہ رکھنے کے لئے کافی ہو گا۔ وہ بس اس طرح جی سکیں گے کہ اپنی نسل کو باقی رکھ سکیں، یہ نسل کبھی گھٹ اور بڑھ نہ سکے گی۔

ریکارڈو کے "قانون لگان" نے بھی بڑی شہرت پائی ہے۔ ہم کو اُس کی یہ تعلیم پوری طرح

سمجھنے کے لئے ان اختلافی مباحث پر نگاہ ڈال لینی چاہئے جو انگلستان کے "قانونِ غلہ فروشی" (CORN LAWS) کے سلسلے میں زیرِ بحث آئے تھے۔ زمینوں اور کارخانوں کے مالک اس نزاع کے دو فریق تھے

قانون غلہ فروشی کے بموجب گیہوں کی درآمد اور برآمد پر حفاظتی محصول عائد کیا گیا تھا۔ جب تک گیہوں کی قیمت ایک خاص حد تک (جو وقتاً فوقتاً بدلتی رہتی تھی) نہ پہونچ جاتی، گیہوں کی برآمد کی اجازت نہ تھی۔ اس قانون سے صرف یہ غرض تھی کہ انگلستان میں گیہوں کی پیداوار بڑھائی جائے تاکہ ہنگامی ضرورتوں کے وقت اُس کی کافی مقدار مہیا کی جائے۔ غلے کی قیمت میں اضافہ کرکے انگلستان کے کاشتکاروں کی حوصلہ افزائی کی جا رہی تھی تاکہ زرعی پیداوار میں کسی قسم کی کوئی کمی نہ ہو۔ اس قانون کی موجودگی میں غیر ملکی بازار کے مقابلے کا کوئی خطرہ نہ تھا۔ غیر ممالک کے غلے کے تاجروں کو ملک میں قدم رکھنے کی اُس وقت تک اجازت نہ تھی جب تک گیہوں کی قیمت ایک خاص حد تک نہ پہونچ جاتی جب تک انگلستان کا گیہوں طلب سے زیادہ نہ ہوتا (جس کی نوبت ۱۷۹۰ء سے نہ آئی تھی) زراعت کرنے والوں کے لئے نفع کے بڑے مواقع تھے۔

نپولینی محاربات کی وجہ سے گیہوں کی قیمت بہت ازبر چڑھ گئی اور یکے بعد دیگرے زمین کے افتادہ ٹکڑے کاشت میں آنے لگے۔ زمین کے مالک گیہوں کی قیمت بڑھانا چاہتے تھے۔ اس صورت میں ان کو زیادہ لگان ملنے کی امید تھی۔ زیادہ لگان سے مراد ان کی ذاتی آمدنی میں اضافہ تھا لیکن کارخانہ کے مالک گیہوں کی قیمت میں اضافے سے خوش نہ تھے۔ ان کو کھٹکا تھا کہ اگر گیہوں کی قیمت بڑھ گئی تو مزدور کی ضروریات زندگی کی قیمتوں میں بھی اضافہ ہوجائے گا اور عام بے چینی پھیل جائے گی، ہڑتالیں ہوں گی اس کے نتیجے میں ان کی اجرتوں میں اضافہ ہوگا اور اس کا نقصان گھوم پھر کر ان کی جیبوں کو برداشت کرنا پڑے گا۔ کشاکش شروع ہوئی۔ مالکانِ زمین حفاظتی قوانین کا مطالبہ کرنے لگے اور مالکان کارخانہ تجارت کی آزادی کے لئے جد وجہد کرنے لگے

ریکارڈو اُبھرتے ہوئے بورژوا طبقے سے تعلق رکھتا تھا، اُس کی ہمدردیاں کارخانوں

ے مالکوں کے ساتھ تھیں۔ اس لئے یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ اس نے لگان کے متعلق جو قدرتی قوانین دریافت کئے ہیں وہ بتاتے ہیں کہ :۔

"زمینداروں کے سوا تمام طبقے غلے کی قیمتوں میں اضافے سے متاثر ہوں گے"

ریکارڈو اس نتیجے تک کیسے پہونچا ؟ وہ ثابت کرتا ہے کہ قیمتوں میں جتنا اضافہ ہوگا لگان بھی اسی قدر بڑھ جائے گا۔ زمین محدود ہے اور زمین کے ٹکڑے اپنی زرخیزی میں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ اسی حقیقت پر لگان کا وجود قائم ہے :۔

"اگر تمام زمینیں ایک ہی طرح کی خصوصیات رکھتی ہوتیں۔ اپنی وسعت میں لامحدود اور اپنی صلاحیت میں یکساں ہوتیں تو ان کے استعمال کے معاوضے میں کسی قسم کا محصول عائد نہ کیا جا سکتا چونکہ زمین غیر محدود نہ اپنی صلاحیت میں یکساں نہیں ہے اور آبادی کے اضافے کی وجہ سے کم درجے اور حیثیت کی زمین زیر کاشت لائی جاتی ہے، اس لئے اس کے استعمال کے لئے کرایہ ادا کرنا پڑتا ہے۔ جب سماج کی ترقی کے سلسلے میں دوسرے درجے کی زرخیز زمین کاشت میں لائی جاتی ہے، پہلے درجے کی زرخیز زمین پر لگان تشخیص ہو جاتا ہے، لگان کی رقم اس فرق پر منحصر ہے جو ان دونوں زمینوں کی صلاحیتوں میں پایا جاتا ہے"

"جب تیسرے درجے کی زمین کاشت میں لائی جاتی ہے، زمین کی دوسری قسم پر لگان فوراً تشخیص ہو جاتا ہے اور ان کے لگان کا فرق ان کی پیداوار کی طاقت پر منحصر ہوتا ہے۔ آبادی کی ترقی کی رفتار جتنی آگے بڑھتی جائے گی نئی خراب زمینوں کو زیر کاشت لانے کی ضرورت بڑھتی جائے گی تاکہ غذا کی رسد بڑھائی جا سکے اور اس صورت میں تمام زرخیز رقبوں کا لگان بڑھ جائے گا"

ریکارڈو کے نزدیک انگلستان کے "قانون غلہ فروشی" نے گیہوں کی قیمت بڑھا کر کسانوں کو گھٹیا زمینوں کے استعمال پر آمادہ کر دیا تھا تاکہ وہ زیادہ گیہوں پیدا کر سکیں۔ جب یہ صورت پیش آئی تو زیادہ زرخیز زمینوں پر لگان عائد کیا جانے لگا۔ وقت جتنا گذرتا گیا زیادہ خراب زمینوں

پر کاشت ہونے لگی اور لگان بتدریج بڑھتا گیا۔ اس طرح جو لگان وصول ہوتا تھا وہ زمینوں کے مالکوں کی جیبوں میں جاتا تھا، حالانکہ اس کی پیداوار میں ان کی کسی قسم کی محنت کو کوئی دخل نہ تھا۔ وہ کچھ کرتے نہ تھے لیکن پھر بھی ان کی زمینوں کا کرایہ بڑھتا جاتا تھا۔ وہ لکھتا ہے:-

زمینوں کے مالکوں کا یہ منافع کارخانہ داروں اور چیزوں کے استعمال کرنے والوں کے مفاد کے خلاف تھا۔ غلے کی قیمت ہمیشہ بڑھ سکتی ہے کیونکہ اُس کو پیدا کرنے کے لئے مزید محنت کی ضرورت پڑتی رہتی ہے اور اس کی پیدائش کے مصارف بڑھتے رہتے ہیں پیدائش کے یہی مصارف لگان کے اضافے کے بھی موجب ہوتے ہیں۔ اس لئے زمین کے مالکوں کا مفاد اسی میں ہے کہ پیدائش کے مصارف بڑھ جائیں۔ استعمال کرنے والے کا مفاد اس میں نہیں ہے۔ اُس کا فائدہ اس میں ہے کہ دوسری اشیاء سے اُس کی قیمت نسبتہً کم ہو، کارخانہ داروں کا فائدہ بھی اسی میں ہے کہ غلے کی قیمت میں اضافہ نہ ہو اس لئے کہ قیمتوں کا اضافہ اجرتوں میں اضافے کا موجب ہوگا لیکن ان کی مصنوعات کی قیمتوں میں کسی قسم کا اضافہ نہ ہوگا۔"

کوئی شبہ نہیں، یہی آخری بات اُس کی اصل دشواری تھی۔ ریکارڈو کے قانون اجرت کے بموجب مزدوروں کو اتنی ہی اجرت ملتی تھی جو صرف اُن کے خورد و نوش کے مصارف کے لئے کافی ہوتا کہ وہ زندہ رہ سکیں۔ اس لئے مزدوروں پر غلے کی ارزانی اور گرانی کا کیا اثر پڑ سکتا تھا، غلے کی گرانی کے ساتھ ان کی اجرتیں بڑھتی تھیں اور ارزانی کے ساتھ ان میں تخفیف ہو جاتی تھی۔ اس کا اثر تو صرف کارخانہ داروں پر پڑتا تھا جو اجرتیں بڑھ جانے کی وجہ سے اپنی مصنوعات پر زیادہ نفع نہیں کما سکتے تھے۔ ریکارڈو نے زمین کے مالکوں اور کارخانہ داروں کا ایک مرتبہ پھر مقابلہ کیا اور اس کو اِس مقابلے میں بھی زمینوں کے مالک ہی بازی ہارتے ہوئے نظر آئے۔ وہ لکھتا ہے:-

زمین کے مالک اور عوام میں وہ معاملت نہیں ہوتی ہے جو تجارت میں بیچنے اور خریدنے

والے کے درمیان پیش آتی ہے۔ تجارتی معاملت میں دونوں فریق برابر فائدہ اٹھاتے ہیں لیکن زمین کے مالک اور دوسرے فریق کی معاملت میں نفع صرف زمین کے مالک کو ملتا ہے اور نقصان دوسرے فریق کے نصیب میں آتا ہے۔"

کارخانے کے مالکوں نے ریکارڈو کے "قدرتی قوانین" کو اپنے اسلحہ خانے میں احتیاط سے رکھ لیا تاکہ ان حفاظتی قوانین کے خلاف، جو آزاد تجارت میں مزاحم ہوتے تھے، کام آسکیں۔ وہ غلہ فروشی کے قانون کی تنسیخ کا مطالبہ کر رہے تھے تاکہ آزاد تجارت کا دور پھر شروع ہو سکے، پارلیمنٹ پر مالکانِ زمین کا قبضہ تھا اس لئے "قوانین غلہ فروشی" ایک مدت (۱۸۴۶ء) تک ہٹائے نہ جاسکے۔ اسی زمانے میں بعض امیروں نے غلہ کی ارزانی میں مالک کا کوئی نفع نہ دیکھ کر کارخانوں کی حالت سدھارنے اور کام کے اوقات میں کمی کرانے کی طرف توجہ کی۔ حامیانِ انسانیت (HUMANIT-ARIANS) بہت پہلے سے صنعتی نظام کی خرابیوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کر رہے تھے، اب ان کو طاقتور امراء کی تائید بھی حاصل ہو گئی۔ یہ امراء بھی ان مالکان کارخانہ سے، جنھوں نے "قانونِ غلہ فروشی" کے خلاف محاذ قائم کیا تھا، اچھی طرح نپٹنا چاہتے تھے۔ پارلیمنٹ نے تحقیقاتی کمیٹیاں مقرر کیں جنھوں نے حالات کی تحقیقات کر کے رپورٹیں پیش کیں۔ ان معلومات کے نتیجے میں، جو کمیٹیوں نے اپنی رپورٹوں میں پیش کئے تھے، کچھ قوانین پیش کئے گئے اور کام کے اوقات میں کمی کی مہم شروع ہوئی۔

صنعتوں کے مالکوں نے ہر اس تحریک کی، جو کام کے اوقات پر اثر انداز ہو رہی تھی سخت مخالفت کی۔ وہ کہتے تھے کہ اگر مزدوروں نے پہلے کی طرح زیادہ دیر تک مشینوں پر کام نہ کیا تو صنعتیں تباہ ہو جائیں گی لیکن ان کی کوششوں کا کوئی اثر نہ ہوا اور مزدوروں، امراء اور حامیانِ انسانیت کی متفقہ جدوجہد سے "فیکٹریوں کے قوانین" (FACTORY ACTS) منظور ہو گئے۔ ان قوانین کے بموجب کام کے اوقات میں بھی کمی کی گئی اور مزدوروں کے حالات کی اصلاح کی طرف بھی توجہ مبذول کی گئی لیکن مالکوں کی مطلق العنانیوں کے خلاف جدوجہد جاری رہی اور ان کے خلاف مزید پابندیاں عائد کرنے کے مطالبے پیش ہوتے رہے۔

اسی زمانے میں کلاسکی معاشیات کے ایک ماہر ناساسینیر نے اپنا نظریہ پیش کیا، اس کا دعویٰ تھا کہ مالکانِ کارخانہ جو نفع پاتے ہیں وہ صرف کام کے آخری گھنٹے میں حاصل ہوتا ہے اس لئے اب کام کے اوقات میں مزید کمی ممکن نہیں ہے۔ اگر کام کا یہ آخری گھنٹہ بھی لے لیا جائے گا تو مالک کا نفع بالکل ختم ہو جائے گا اور صنعت برباد ہو جائے گی۔ وہ لکھتا ہے:۔

"موجودہ قانون کے موجب کسی ایسے مل میں جس میں اٹھارہ سال سے کم عمر کے مزدور کام کر رہے ہوں ہفتے میں پانچ دن صرف بارہ گھنٹے یومیہ کے حساب سے کام ہوگا اور سنیچر کے روز صرف نو گھنٹے کام لیا جائے گا.......... اب ذیل کی تشریح سے ظاہر ہو جائے گا کہ جس مل میں اس طرح کام ہوگا اس میں اصل نفع صرف آخری گھنٹے سے حاصل ہوگا۔"

سینیر نے خیالی مثالوں سے یہ نتیجہ اخذ کیا تھا۔ ان مثالوں میں اس نے ریاضی کے جو سوالات حل کئے تھے وہ تو اپنی جگہ پر صحیح تھے لیکن ان سے اس نے جو بات ثابت کرنی چاہی تھی وہ بات ثابت نہیں ہو سکی۔ فیکٹریوں کے گھنٹے کم ہوتے رہے اور ان کی تجارت میں کسی قسم کی کوئی کمی نہ آئی۔

سینیر کے آخری گھنٹے کے نظریہ سے زیادہ اس کا "اجرت کے فنڈ" کا نظریہ نقصان رساں تھا۔ اس نظریے کو بعض اور معاشئین بھی صحیح سمجھتے تھے۔ اس لئے اس کی مضرت اور بھی دور رس ہو گئی تھی۔ آخری گھنٹے کا نظریہ تو کام کے اوقات میں کمی کے خلاف محاذ قائم کرنے کے لئے پیش کیا گیا تھا۔ اجرت کے فنڈ کا نظریہ اجرت میں اضافے کی جد و جہد کو بے اثر رکھنے کے لئے پیش کیا جا رہا تھا۔

محنت کشوں نے ٹریڈ یونینوں میں حصہ لیا اور ہڑتال کرتے رہے۔ اب وہ اپنی اجرتیں بڑھوانے پر تلے ہوئے تھے لیکن ان کی اس ضد کو "ماہرین معاشیات" حماقت سمجھتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ مزدوروں کی اجرتیں ادا کرنے کے لئے ایک خاص فنڈ علیحدہ کر کے رکھ دیا جاتا تھا، مزدوروں کی ایک خاص تعداد" ملوں میں کام کرتی تھی۔ فنڈ اور مزدور کی تعداد ہی عوامل اجرت کی شرح مقرر کرتے تھے اس لئے مزدوروں کے لئے ممکن نہ تھا کہ ٹھوس حقائق کو اپنی آرزوؤں کے مطابق بدل سکتے۔ اس لئے ٹریڈ یونینوں کے اس احتجاج سے کوئی فائدہ نہ تھا۔

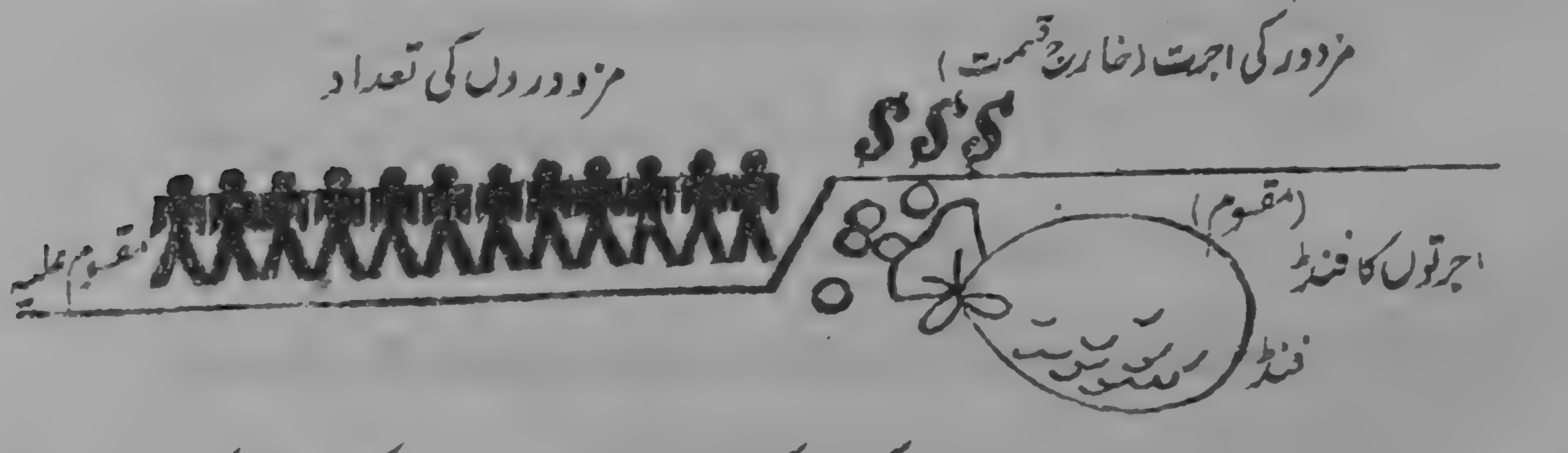
جان اسٹورٹ مل نے مذکورہ بالا دلیل اس طرح پیش کی :-

"اجرتیں صرف سرمایہ اور آبادی کے باہمی تعلق ہی پر منحصر نہیں ہیں بلکہ مقابلے کے قاعدے کے تحت کسی دوسری چیز سے متاثر بھی نہیں ہو سکتی ہیں۔ اجرتیں، جب تک وہ زیادہ سے زیادہ فنڈ، جو مزدوروں کو اجرت پر رکھنے کے لئے رکھا جاتا ہے بڑھایا نہ جائے۔ یا مزدوروں کی تعداد میں جن کو اس فنڈ سے اجرت ملتی ہے، کمی نہ کر دی جائے بڑھ نہیں سکتی ہیں۔ اسی طرح یہ اجرتیں تاوقتیکہ فنڈ کو کم یا مزدوروں کی تعداد میں اضافہ نہ کیا جائے گھٹائی بھی نہیں جا سکتی ہیں۔"

بات تو بہت صاف تھی۔ مزدوروں کی اجرتوں میں تاوقتیکہ فنڈ بڑھایا نہ جاتا یا مزدوروں کی تعداد میں کمی نہ کی جاتی، اضافہ کیسے ہوتا؛ اگر کسی خودسر مزدور کی سمجھ میں یہ منطق نہ آتی اور وہ اصرار کرتا رہتا کہ اسے زندہ رہنے کے لئے زیادہ اجرت کی ضرورت ہے تو اسے علم ریاضی کے ابتدائی سوالوں کا درس دیا جاتا :-

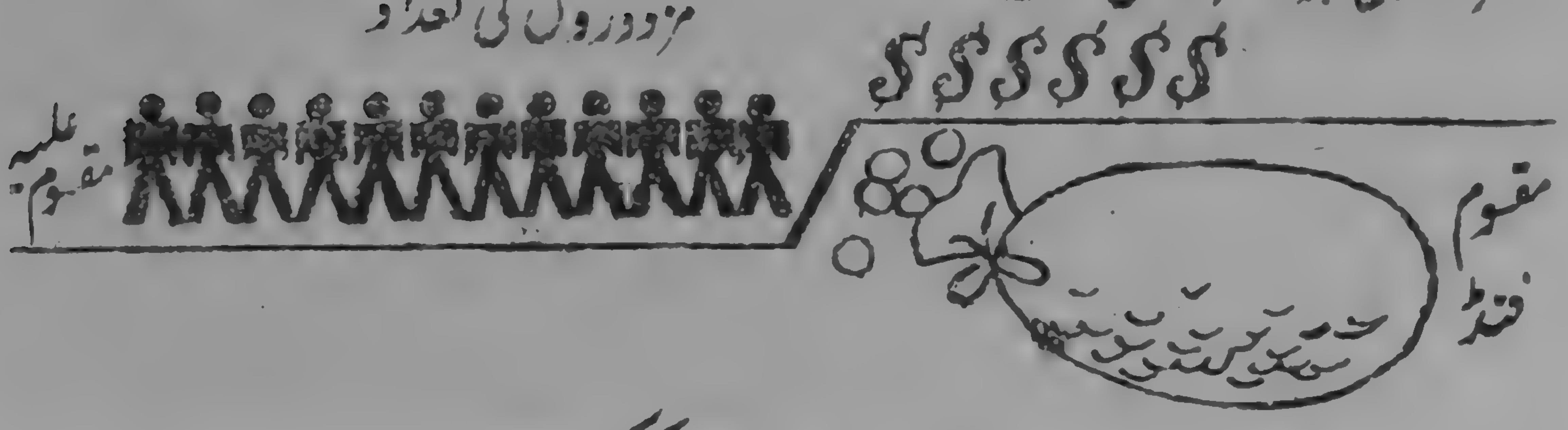
"ریاضی کے چار بنیادی اصولوں کے خلاف استدلال کرنے سے کوئی فائدہ مرتب نہ ہوگا، اجرتوں کا مسئلہ دراصل تقسیم کا سوال ہے، شکایت کی جاتی ہے کہ خارج قسمت کم ہے، اچھا، آؤ غور کریں کہ خارج قسمت کتنے طریقوں سے بڑھایا جا سکتا ہے۔ خارج قسمت بڑھانے کے صرف دو قاعدے ہیں، مقسوم کو بڑھاؤ اور مقسوم علیہ وہی رہنے دو، اب تقسیم کرو خارج قسمت زیادہ ہو جائے گا۔ دوسرا قاعدہ یہ ہے مقسوم علیہ گھٹا دو اور مقسوم اتنا ہی رہنے دو، خارج قسمت زیادہ ہو جائے گا۔"

اگر ہم ریاضی کے اس سوال کو مصور کرنا چاہیں تو اس کی حسب ذیل شکلیں ہوں گی :-

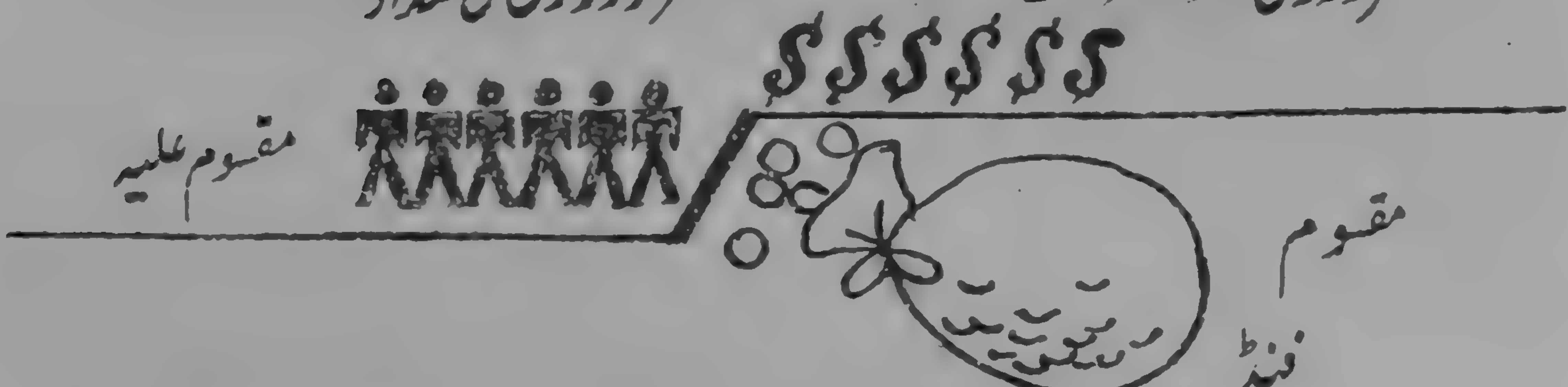


اب اس صورت حال میں تبدیلی کیسے پیدا کی جائے؟ اور زیادہ اجرت کیسے حاصل کی جائے؟

پہلا طریقہ ـــــــــــ مقسوم بڑھا دو:۔



دوسرا طریقہ ـــــــــــ مقسوم علیہ کم کردو



کتنا سادہ حساب ہے! زیادہ اجرت حاصل کرنے کے صرف دو قاعدے! دوسرا قاعدہ کتنا اچھا ہے! "مقسوم علیہ کم کردو" یعنی مزدوروں کی تعداد میں تخفیف کردو، مزدوروں کو سمجھانے کا پرانا طریقہ یہی تھا۔ مالتھس اسی طریقہ کو "ضبطِ نفس" کے نام سے موسوم کرتا تھا۔

پہلا طریقہ "مقسوم میں اضافہ" یعنی اجرتوں کے فنڈ میں اضافہ سینیر کے مشورے کے بموجب اسی صورت سے ہو سکتا ہے کہ:۔

"ہر شخص اپنا سرمایہ اور اپنی قوتیں صرف ایسے طریقے سے جیسے وہ آزما چکا ہے کہ بہت نفع بخش ہے، صرف کرے۔ یہ آزمایا ہوا طریقہ یہی ہے کہ صنعت کو پابندیوں کے جال سے بچائے، امتناعی ضابطوں اور حفاظتی محصولوں سے دور رکھے جنھیں مجلس قانون ساز کبھی کبھی اپنی جاہلانہ نیک نیتی رحم اور کبھی قومی رشک و حسد کے جذبات کی وجہ سے عائد کرتی رہتی ہے۔"

تجارت کو آزادی سے اپنی راہ چلنے دو۔ اجرت کے فنڈ میں روپے کے ڈھیر لگ جائیں گے۔

بس یہی شرط تھی جس پر یہ کارخانوں کے مالک صلح کر سکتے تھے۔

کارخانے کے مالکوں اور معاشیات کے ماہروں نے "اجرتوں کے فنڈ" کا نظریہ مزدوروں اور ان کی ٹریڈ یونینوں کے مطالبات کے جوابات دینے کے لئے تراشا تھا۔ مزدور کو اس سے کوئی سروکار نہ تھا۔ وہ اس کے فریب سے اچھی طرح واقف تھے۔ ان کو یقین تھا کہ ان کی ٹریڈ یونین کا عملی اقدام اجرتوں میں اضافے کی مہم بھی سر کرلے گا۔ وہ یہ نہیں مانتے تھے کہ ان کی اجرتیں ادا کرنے کے لئے پہلے سے کوئی فنڈ الگ کرکے رکھ دیا جاتا تھا۔ انھوں نے جو کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا اور اپنے تجربوں سے معلوم کیا تھا وہی ایک امریکی ماہر معاشیات فرانسس واکر کے نظریے نے ۱۸۷۶ء میں ثابت کر دکھایا واکر نے "اجرتوں کے فنڈ" کے نظریے کی دھجیاں اڑا دیں۔ اس نے اس مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے لکھا:-

اجرتوں کے فنڈ کا مشہور نظریہ اس مفروضے پر قائم ہے کہ مزدوروں کی اجرتوں کے لئے ایک سرمایہ جو گذشتہ صنعت کا نتیجہ ہوتا ہے محفوظ کر دیا جاتا ہے۔ اس لئے سرمایہ ہی کو دیکھ کر اجرت کی شرح مقرر کی جاتی ہے لیکن مجھ کو اس خیال سے اتفاق نہیں ہے۔ میرا فیصلہ ہے کہ اجرتیں موجودہ صنعت کی پیداوار کی آمدنی سے ادا کی جاتی ہیں اس لئے یہی موجودہ پیداوار اجرت کا صحیح معیار مقرر کرسکتی ہے۔ ایک کارخانہ کا مالک محنت خریدنے کے لئے محنت کی قیمت ادا کرتا ہے، وہ اس فنڈ کو خرچ کرنے کے لئے، جو اس کے پاس ہو سکتا ہے ایسا نہیں کرتا۔ کارخانے کا مالک محنت کی پیداوار کی امید پر محنت کی قیمت ادا کرتا ہے۔ اس لئے پیداوار کی قسم اور مقدار ہی یہ فیصلہ کرسکتی ہے کہ محنت کی کیا اجرت ادا کی جاسکتی ہے .... اس لئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ مزدور آئندہ پیداوار کے لئے لگائے جارہے ہیں، اس فنڈ کے لئے نہیں لگائے جارہے ہیں جو مالک کے پاس موجود ہے اور جو اسے ہر حال میں خرچ کردینا ہے۔ یہ پیداوار کی قیمت ہی ہو سکتی ہے جو اجرتوں کی مقدار جو ادا کی جاسکتی ہے۔ مقرر کرتی ہے۔ نہ کہ دولت کی وہ مقدار جو مالک کے قبضے میں موجود ہے یا جو اس کے قبضے میں آسکتی ہے۔ اس لئے صرف پیداوار ہی (نہ کہ سرمایہ) ملازمت کی غرض اور اجرت کی شرح مقرر کرسکتی ہے۔"

واکر کے نظریہ کی سچائی کا بہت اچھا ثبوت ہندوستان اور جاپان کی ملوں میں مل سکتا ہے۔

واکر کہتا تھا کہ مزدوروں کو پیشگی اجرت کسی محفوظ سرمایے سے نہیں دی جاتی ہے۔ جاپان اور ہندوستان کی ملوں میں اجرتیں روک لی جاتی ہیں۔ جاپان میں ریشم اور سوتی کپڑوں کی ملوں میں کام کرنے والی لڑکیاں چھ مہینے یا سال بھر کے بعد اپنی اجرت پاتی ہیں۔ عام طور سے یہ رقم ان کے والدین کے نام بھیج دی جاتی ہے۔ ریشم کا کام کرنے والی لڑکیوں کو ان کی محنت کا سال ختم ہونے کے بعد اجرت ادا کی جاتی ہے۔......... ہندوستان میں بھی ایک مہینے یا چھ ہفتے کے بعد مزدوروں کی مزدوری ادا کی جاتی ہے۔ اگر کسی مزدور کو کسی پیشگی رقم کی ضرورت پڑتی ہے تو مل والے اس کو نو فیصدی شرح سود پر مزدوری تقسیم ہونے کے دن تک کے لئے قرض دیتے ہیں

لیکن مزدوروں کو قانون اجرت کے غلط ثابت کرنے کے لئے بیسویں صدی کی راہ تکنے کی ضرورت نہ تھی۔ وہ شروع ہی سے اس نظریہ کو اپنے تجربات کی روشنی میں جھٹلاتے چلے آرہے تھے۔ واکر نے ۱۸۷۶ء میں امریکی زندگی کی بہت سی مثالیں پیش کر کے اس دعویٰ کا کھوکھلا پن اچھی طرح سے کھول کر رکھ دیا تھا۔ واکر نے جس زمانے میں اس نظریئے کی تجہیز و تکفین کی آخری رسم ادا کی ہے اس سے سات سال پہلے لوگ اس کے وجود کی حقیقت سے انکار کرنے لگے تھے اور یہ تسلیم کرنے لگے تھے کہ اس "قدرتی قانون" کو قانون کا نام بھی نہیں دیا جا سکتا

جان اسٹورٹ مل نے، جس کی کتاب "معاشیات کے اصول"[۵۱] ۱۸۴۸ء میں چھپ چکی تھی، اس نظریے کی اشاعت میں بڑا حصہ لیا تھا۔ اس نے ایک کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے "فورٹ نائٹلی ریویو"[۵۲] ہی ۱۸۶۹ء میں اپنے پرانے خیال سے دست برداری کا اعلان کیا، وہ لکھتا ہے:-

> "اس وقت تک عام معاشیین جن میں میں بھی شامل ہوں، یہ کہتے آئے ہیں کہ مزدوروں کی جماعتیں (ٹریڈ یونینیں) اپنی اجرتوں کی شرح میں کوئی اضافہ نہیں کرا سکتی ہیں اور اب تک جو اضافے ہوئے ہیں وہ بازار کے تجارتی مقابلے کا نتیجہ ہیں۔ اگر یہ یونینیں نہ ہوتیں تب بھی یہ اضافے ہوتے۔ اس نظریہ کی کوئی علمی بنیاد نہیں ہے۔ اب اس کو ترک کر دینا چاہیے"

---

[۵۱] PRINCIPLE OF POLITICAL ECONOMY [۵۲] FORTNIGHTLY REVIEW

جان اسٹورٹ مل نے بڑی اخلاقی جرأت سے کام لیا کسی غلطی کے ارتکاب کے بعد اپنی لغزش کا پوری ایمانداری سے اعتراف بڑی مردانہ صفت ہے لیکن اس اعتراف سے اب مزدوروں کو کیا فائدہ پہونچ سکتا تھا۔ اس نظریے کی تنسیخ ہوئی لیکن اس وقت، جب مزدوروں کو دُکھ جھیلتے اور صدمے سہتے ہوئے آدھی صدی بیت گئی تھی۔ اُن کو اس سائنس کی کوئی ضرورت نہیں تھی جس نے دشمنوں کے ہاتھوں میں گولے بارود کا پورا میگزین ہمیشہ اس وقت دے دیا جب یہ فاقہ کش مزدور اپنی قسمت کے دن پھیرنے کے لئے ذرا سی جنبش پر آمادہ ہوئے۔ ان کو اس سائنس کی کوئی ضرورت نہ تھی جس نے ان کو اپنی زندگی بدلنے میں کبھی کوئی عملی مدد نہ دی۔ اُن کو اس سائنس کی کوئی ضرورت نہ تھی جس نے ہمیشہ مزدوروں کے مالکوں کی خدمت کی اور انہیں کے مفاد کی حفاظت میں لگی رہی۔

پروفیسر جے۔ ای۔ کیرنس نے، جو "کلاسکی معاشیات" کے اسکول سے تعلق رکھتا تھا، تسلیم کیا ہے کہ مزدوروں کے دلوں میں معاشیات کی سائنس کے لئے کوئی گنجائش نہ تھی اور وہ اپنی نفرت میں حق بجانب بھی تھے۔ اپنی کتاب "معاشیات پر چند مضامین" جو ۱۸۷۳ء میں شائع ہوئی تھی، کیرنس نے تسلیم کیا ہے کہ یہ سائنس بورژوا طبقے کا ہتھیار بن کر رہ گئی ہے۔ وہ لکھتا ہے:۔

"معاشیات ڈھلے ڈھلائے ہوئے ضابطوں کے بھیس میں ایک تحکمانہ انداز سے (خاص طور سے جب اس کو مزدوروں کے مسائل پر غور کرنا ہو) سامنے آتی ہے۔ یہ ضابطے بھی ایک ایسے نظام سے روشناس کرتے ہیں جو فرمان نافذ کرنے کا عادی ہے۔ یہ ایک سماجی نظام کو آسمان پر چڑھاتا اور دوسرے کو اسی وقت نیچے گراتا ہے۔ یہ ہم سے غور و فکر کا نہیں، اطاعت اور فرمانبرداری کا مطالبہ کرتا ہے۔ اگر ہم ان فرامین پر غور کریں جو عام حالات میں دنیا میں معاشیات کے نام سے دئے گئے ہیں اور جو میری رائے میں سماج کی موجودہ شکل کو اپنی جگہ پر مکمل مانتے ہیں تو میرا خیال ہے کہ ہم اس لائق ہو سکیں گے کہ اس نفرت اور شدید اختلاف کا اندازہ کر سکیں جو ان لوگوں کے دلوں میں پیدا ہو رہا ہے، جو اس صنعتی نظام کو ہمارے ماہرینِ معاشیات کی طرح اچھا نہیں سمجھتے، جب کسی مزدور سے کہا جاتا ہے کہ معاشیات ہڑتالوں کو بُرا کہتی ہے

اور کام کے اوقات کی کمی کو بھی پسند نہیں کرتی لیکن سرمایے کے اکٹھا اور جمع ہونے کی تائید کرتی ہو اور اجرت کی بازاری شرح کو مناسب خیال کرتی ہے تو اس کا یہ جواب غیر قدرتی نہیں معلوم ہوتا کہ چونکہ معاشیات مزدوروں کے خلاف ہے اس لئے مزدوروں کے لئے بھی مناسب ہے کہ وہ اُس کے خلاف کھڑے ہو جائیں۔ یہ غیر فطری نہیں معلوم ہوتا کہ یہ ضوابط شبہ کی نگاہ سے دیکھے جائیں اور یہ یقین کیا جائے کہ یہ نظام صرف مالکانِ کارخانہ کے مفاد کے لئے قائم کیا گیا ہے اور ایسی صورت میں مزدور کی مصلحت اندیشی کا تقاضا یہی ہوگا کہ وہ اُس کی مخالفت کرے اور کبھی اُس کے قریب نہ پھٹکے۔"

یہ صحیح ہے کہ معاشیات مزدوروں کے مفاد کے خلاف تھی۔ یہ بھی صحیح ہے کہ وہ صرف تاجر طبقے اور خاص طور سے انگلستان کے تاجر طبقے کے مفاد کی نگراں تھی۔ کلاسکی معاشیین کی تعلیمات کا چرچا فرانس میں بھی ہوا اور جرمنی میں بھی! اور انیسویں صدی کے ربع اول میں معاشیات کی جو کتابیں ان ملکوں میں چھپیں وہ زیادہ تر یا تو انگریزی ماہرین معاشیات کی کتابوں کا ترجمہ تھیں یا ان کے نظریات کی توضیح اور تشریح پر مشتمل تھیں۔ رفتہ رفتہ ان دونوں ملکوں کے اربابِ فکر یہ خوب سمجھنے لگے تھے کہ یہ نظریات صرف تاجر طبقے ہی کے نظریات تھے اور تاجر طبقے میں بھی یہ نظریات خاص طور سے انگلستان کے تاجروں کی ترجمانی کا فرض انجام دیتے تھے۔ یہ نہیں کہا جاتا کہ کلاسکی معاشیات کے ماہرین نے جان بوجھ کر انگلستان کے تاجروں کی مدد کے خیال سے یہ نظریات تراشے تھے۔ یہ ضروری نہیں کہ واقعات کی یہی شکل رہی ہو لیکن اس میں شبہ نہیں کہ ان کے ماحول نے ان کے طرزِ فکر پر اثر ڈالا تھا۔ وہ انگلستان کے رہنے والے تھے اس لئے انگلستان کے اُس زمانے کے مخصوص حالات سے متاثر نہ ہونا ان کے امکان سے باہر تھا۔ حقیقت یہی تھی۔ دوسرے ملکوں کے ماہرین معاشیات اور تاجروں نے بہت جلد یہ حقیقت معلوم کر لی۔

مثال کے طور پر آزاد تجارت کے مسئلہ پر غور کرو۔ آدم اسمتھ نے اس نظریے کی تبلیغ کی۔ ریکارڈو اور دوسرے لوگوں نے اس کی پیروی بھی کی اور اُس کے خیالات کی اشاعت میں بھی سرگرمی سے حصّہ لیا۔ یہ معاشیین عالمی تجارت کی آزادی کے علمبردار تھے۔ وہ صرف اندرونی پابندی کے خلاف ہی جدوجہد

نہیں کر رہے تھے بلکہ ان تمام پابندیوں کے خلاف لڑ رہے تھے جو ایک ملک کو دوسرے ملک سے الگ کر رہی تھیں۔ ریکارڈو نے بین الاقوامی تجارت کے آزاد مبادلے پر بڑی واضح گفتگو کی ہے۔ وہ لکھتا ہے :-

"آزاد تجارت کے نظام میں ہر ملک اپنی محنت اور اپنا سرمایہ ایسے کاروبار میں لگانا پسند کرتا ہے جس میں ہر ایک کو پورا فائدہ حاصل ہو، ایک فرد کے ملک کا نفع قابل تعریف حد تک عالمگیر فائدہ کا موجب ہے صنعت کو فروغ دے کر، ہنر مندی کی حوصلہ افزائی کر کے، اور ان طاقتوں کا جو خاص طور سے قدرت نے اس ملک کو عطا کی ہیں صحیح استعمال کر کے یہ اپنی محنت کی صحیح اور مناسب معاشی تقسیم کرتا ہے۔ یہ اپنی عام پیداوار بڑھا کر عام فائدے کا موجب ہوتا ہے اور باہمی نفع کے مشترک رشتے میں منسلک ہو کر دنیا کو میل جول بڑھانے کا موقع دیتا ہے اور اس طرح پوری مہذب دنیا میں قوموں کی عالمگیر برادری کی بنیاد رکھتا ہے۔ اسی اصول کی بنیاد پر یہ طے کیا جا سکتا ہے کہ شراب فرانس اور پرتگال میں بنائی جائے گی، غلہ امریکہ اور پولینڈ میں پیدا کیا جائے گا اور لوہے، تانبے اور ہتھیل وغیرہ کی مصنوعات انگلستان میں ڈھالی جائیں گی۔"

ریکارڈو نے اوپر کے اقتباس میں بین الاقوامی تجارت کے آزاد مبادلے کے متعلق جو کچھ لکھا ہے ممکن ہے وہ صحیح رہا ہو اور یہ بھی ممکن ہے اُس میں صحت کا کوئی شائبہ نہ رہا ہو لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں اُس نے جو کچھ لکھا ہے وہ اُس زمانے کے انگلستان کے لئے ضرور صحیح تھا۔ صنعتی انقلاب سب سے پہلے انگلستان میں آیا تھا۔ اس لئے وہاں کے کارخانہ داروں کو باقی ممالک کے کارخانہ داروں پر فوقیت حاصل تھی، وہ تجارت کے ڈھنگ مشینوں کی اختراع اور نقل و حمل کی سہولتوں میں سب سے آگے تھے اور اس لائق ہو چکے تھے کہ پوری دنیا کے بازار اپنی فیکٹریوں کی مصنوعات سے بھر دیں اس لئے بین الاقوامی آزاد تجارت سب سے زیادہ ان کے نفع کی چیز تھی اور اسی لئے وہ دوسرے ملکوں کے تاجروں کے لئے موزوں نہ تھی۔ الگزینڈر ہملٹن نے واشنگٹن کے دورِ حکومت میں ایک حفاظتی محصول کے ذریعہ سے برآمد پر پابندیاں عائد کی تھیں۔ دوسرے ممالک نے بھی محصول کی بندشیں لگائیں لیکن کلاسکی معاشیات کے انگریز

ماہرین کے اثر سے انھوں نے آزاد تجارت کے خیال سے بھی کچھ لگاؤ ظاہر کرنا شروع کردیا تھا۔

۱۸۴۱ء میں، جب انگریز آزاد تجارت کے راگ الاپ رہے تھے اور اُس کے قابل تعریف پہلو دوسرے ملکوں سے بھی خراج تحسین وصول کر رہے تھے۔ فریڈرک لیسٹ نے اپنی کتاب معاشیات کا قومی نظام شائع کی اور بین الاقوامی آزاد تجارت کے خیال پر شدید حملے کیے، لسٹ جرمن تھا، اُس زمانے کا جرمنی صنعتی ارتقار کی دوڑ میں دوسرے ملکوں سے بہت پیچھے تھا۔ لسٹ ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں بھی چند سال تک رہ چکا تھا اور اُس کو امریکی صنعت بھی جرمنی کی طرح اپنی ابتدائی حالت میں نظر آئی تھی۔ وہ خطرہ محسوس کر رہا تھا کہ اگر آزاد تجارت کا اصول پوری دنیا میں صحیح تسلیم کرلیا گیا تو پسماندہ ممالک انگلستان کی صنعتی پیداوار کا مقابلہ ہرگز نہ کرسکیں گے اور ان کو اپنے قدم جمانے کے لئے بڑی مدت درکار ہوگی۔ وہ آزاد تجارت کے اصول کا مخالف نہ تھا لیکن جب تک پسماندہ قومیں ترقی کرکے ترقی یافتہ قوموں کے برابر نہ ہو جائیں وہ اس آزادی میں ان کا فائدہ نہیں سمجھتا تھا۔ وہ لکھتا ہے :۔

"کوئی بدقسمت قوم جو صنعت، تجارت اور جہاز رانی میں دوسری ترقی یافتہ قوموں سے پیچھے ہے اور وہ ان شعبوں میں ترقی کرنے کے لئے وسائل اور دوسری ضروری چیزیں بھی جن کی اُس کو ضرورت ہے، رکھتی ہے تو اُس کو سب سے پہلے اپنی انفرادی طاقت بڑھانی چاہیے تاکہ وہ اس قابل ہوسکے کہ آزاد تجارت کے بازار مقابلہ میں وہ دوسری ترقی یافتہ قوموں کے دوش بدوش کھڑی ہوسکے"

وہ کہتا تھا کہ چیزوں کا سستا ہونا کافی نہیں ہے۔ سستی چیزیں مہنگی بھی بک سکتی ہیں۔ کوئی ملک صرف اپنی مصنوعات کے ڈھیر کی وجہ سے، جو کسی خاص وقت اکٹھا ہوسکتا ہے، مالدار نہیں ہوسکتا اُس کی دولت مندی کا راز تو صرف اُس کی پیداوار کی صلاحیت میں پوشیدہ ہے۔ وہ لکھتا ہے :۔

"پیدائش دولت کے اسباب دولت سے بالکل مختلف ہیں، ایک آدمی دولت کا مالک ہوسکتا ہے لیکن اگر وہ ان ذرائع کا مالک نہیں ہے جو اُس سے زیادہ قیمت کی چیزیں پیدا کرتے ہیں

تو وہ غریب ہوتا چلا جائے گا۔ اس لئے دولت پیدا کرنے کے ذرائع خود دولت سے کہیں زیادہ اہم ہیں۔ یہ بات ایک فرد کے لئے بھی صحیح ہے اور ایک فرد سے زیادہ پوری قوم کے لئے بھی درست ہے۔"

لسٹ کہتا تھا کہ انگلستان آزاد تجارت کے نعرے سے پہلے دولتمند بن چکا تھا اور اب کوشش کر رہا تھا کہ دوسری قومیں حصول دولت کی راہ میں اُس کے پیچھے نہ چل سکیں:۔

"یہ کتنی اچھی تدبیر ہے کہ ترقی کے بام بلند پر پہونچنے کے بعد سیڑھی کو لات مار کر نیچے گرا دیا جائے تاکہ پھر کوئی دوسرا اوپر پہونچنے کا حوصلہ نہ کر سکے۔"

اس لئے لسٹ نے حفاظتی تدبیروں کا مطالبہ کیا۔ وہ قانونِ محصل کی دیوار قائم کر کے اپنی ملکی صنعت کو ترقی دینا چاہتا تھا، تاکہ وہ گھر کے بازار میں پوری طرح ترقی کا موقع پا سکے اور رفتہ رفتہ اپنے پیروں پر کھڑی ہونے کے لائق ہو سکے، اُس کا خیال تھا کہ جب وہ اتنی طاقتور ہو جائے کہ دنیا کی تجارت کے بازار میں دوسروں کے مقابلے میں قدم جما سکے، تب اُس کو خم ٹھونک کر میدان میں آنا چاہئے۔ لسٹ بین الاقوامی معاشیات کے مقابلے میں قومی معاشیات کا وکیل تھا اس لئے خاص طور سے امریکہ اور جرمنی میں اُس کے خیالات کی بہت قدر ہوئی۔

آدم اسمتھ اور اُس کے پیرو آزاد تجارت کی تعلیم دیتے تھے لیکن لسٹ ان کے خلاف ملکی مصنوعات کے لئے حفاظتی تدبیروں کا قائل تھا۔ وہ معاشیین کی بڑی تعداد کے ساتھ جو اب دن بدن بڑھتی جا رہی تھی، کلاسکی معاشیات کے نظریوں کے غیر فانی ہونے کا یقین نہیں رکھتا تھا۔ یہ نظریات جو انیسویں صدی عیسوی کی ابتدا میں اپنی صحت کا لوہا دنیا سے منوا چکے تھے اب انیسویں صدی کے آخر میں اپنی جگہ چھوڑ رہے تھے۔ اس وقت ایک ایسے شخص کے نظریات منظرِ عام پر آنے لگے تھے، جو اگرچہ کلاسکی ماہرین معاشیات کے بعض اصولوں کو صحیح تسلیم کرتا تھا لیکن ان اصولوں سے دوسری راہ پر چل کر بالکل نئے نتائج دنیا کے سامنے پیش کر رہا تھا اس شخص کا نام کارل مارکس تھا۔

دُنیا کے مَزدُوُرو! ایک ہو جاؤ

"کاش میرے پاس ایک ملین ڈالر ہوتے" کتنا پیارا ہے یہ جملہ! ہم اکثر آرزؤوں کے ان کھلونوں سے کھیلتے رہتے ہیں۔ ان خوش قسمتوں کی تصویریں اکثر اخباروں میں چھپتی رہتی ہیں جو آئرستانی لاٹریوں میں لمبی لمبی رقمیں جیتتے رہتے ہیں۔ دُنیا میں ایسے لوگوں کی بھی کمی نہیں رہی ہے جو اپنا وقت ایک ایسے سماج کے تصور میں صرف کرتے ہیں جو موجودہ سماج کی برائیوں سے پاک ہو۔ وہ اپنے خوابوں کے سنہرے پردے چاک کر کے بہت کم باہر نکلتے ہیں لیکن ان خواب دیکھنے والوں میں بعض ایسے ہمت والے بھی ہوتے ہیں جنھوں نے خواب کی دنیا سے ذرا آگے قدم بڑھایا اور اپنے خیالوں کی دنیا میں آب و رنگ بھر کر ایک تصوری جنت (UTOPIA) کی تعمیر کر ڈالی۔ ان کی یہ تصوری جنت آنے والے زمانے کے ایک معیاری سماج کی خیالی تصویر ہے۔

حقیقت تو یہی ہے کہ یہ مہم کچھ زیادہ دشوار نہ تھی۔ کوئی ایسا شخص جو تخلیلی صلاحیتوں سے بے نصیب نہ ہو، یہ تصویر کشی کر سکتا تھا۔ اس مہم میں کامیاب ہونے کے لئے صرف اتنی ہی ضرورت تھی کہ اپنے ماحول کا پورا جائزہ لے کر یہ معلوم کر لیا جاتا کہ اس میں کون سی ایسی باتیں ہیں جنھیں نہ ہونا چاہئے۔ ہم نے دنیا کے ہر حصے میں غریبوں کی بھیڑ دیکھی ہے۔ ہم نے اپنی فرضی جنت (اٹوپیا) سے غریبی کی لعنت نکال دی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ پیداوار بیکار ضائع ہو رہی ہے اور چیزوں کی تقسیم کے اصول بھی مناسب نہیں ہیں ہم نے اپنی فرضی جنت میں پیداوار اور تقسیم کا ایسا اصول بنا لیا کہ ہم کو پیداوار اور اس کی تقسیم میں سو فیصدی کامیابی نصیب ہوئی۔ ہم کو ہر طرف ہر طرح کی بے انصافی پھیلی ہوئی نظر آ رہی ہے، ہم نے اپنی تصوری دنیا میں ایماندار عدالتیں قائم کر کے منصف جج مقرر کر دئے (ہم نے ایسا سماج ڈھال لیا

جس میں عدالتوں اور ججوں کی ضرورت ہی نہ پڑی اہم بیماری مصیبت اور غم واندوہ کی فراوانی دیکھتے ہیں۔ ہم نے اپنی اٹوپیا میں ہر طرف صحت اور مسرت وشادمانی کی لہریں دوڑا دیں۔

ان خیالی جنتوں میں سرمایہ داری کے خاتمے کا خیال سب سے پہلا اور اہم درجہ رکھتا ہے۔ ان خیالی جنتوں میں رنگ بھرنے والے سرمایہ داری نظام میں ہر طرف خرابیاں ہی دیکھتے تھے۔ اس نظام میں دولت بیکار ضائع ہوتی ہوئی نظر آتی تھی۔ اُس کی تقسیم بھی غیر منصفانہ تھی اور یہ پورا نظام کسی سوچی سمجھی تجویز کے بغیر ہی اپنی راہ چلتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ وہ ایک ایسے سماج کا خواب دیکھ رہے تھے جس کی بنیاد سوچی سمجھی ہوئی تجویزوں پر رکھی گئی اور جس میں کارکردگی اور انصاف کی کمی نہ ہو۔ سرمایہ داری نظام میں چند افراد، جو کوئی کام نہیں کرتے، ذرائع پیداوار کی ملکیت حاصل کر کے، عیش وآرام کی زندگی گذارتے ہیں۔ ان فرضی جنتوں کی تخلیق کرنے والوں نے ذرائع پیداوار کی عوامی ملکیت ہی میں ایک عمدہ زندگی کا امکان دیکھا۔ انھوں نے اپنی تصوری دنیا میں ایسے سماج بنائے جن میں ہر شخص محنت کرکے اور پیداوار کے عوامی ذرائع پر قبضہ کرکے عیش وآرام کی زندگی بسر کرتا ہے —— یہی اشتراکیت (سوشلزم) ہے ان فرضی جنتوں کے مصوروں کا یہی خواب تھا۔

اسی زمانے میں کارل مارکس سامنے آیا۔

وہ بھی اشتراکی تھا۔ وہ بھی محنت کش طبقوں کی حالت سدھارنا چاہتا تھا۔ اُس نے بھی ایک ایسا سماج بنانا چاہا، جو سوچی سمجھی ہوئی بنیادوں پر قائم ہو۔ وہ بھی چاہتا تھا کہ ذرائع پیداوار پر عوام کا قبضہ ہو۔ لیکن —— یہ بات بہت اہم تھی —— اُس نے کسی "تخیلی جنت" کی تصویر نہیں پیش کی۔ اُس نے عملی طور پر یہ کبھی نہیں لکھا کہ مستقبل کا سماج کس طرح چلے گا۔ وہ حیرت انگیز طور پر گذرے ہوئے سماجوں سے دلچسپی لیتا تھا۔ وہ سوچتا رہتا تھا کہ پچھلے سماج کیسے ابھرے، بڑھے اور ختم ہوگئے اور رفتہ رفتہ یہ دنیا کس طرح موجودہ زمانے تک آ پہونچی۔ وہ اس طرح غور کرکے ان چھپی ہوئی طاقتوں کا پتہ لگانا چاہتا تھا، جو ان انقلابات کا باعث ہوئی تھیں اور جو آنے والے سماج کو بھی جنم دینے والی تھیں لیکن اُس نے کل آنے والے سماجوں کے اقتصادی نظام پر غور نہیں

کیا اور نہ اُس کو اس غور و فکر میں پڑنے کی کوئی ضرورت ہی تھی۔ اُس نے تو صرف موجودہ اقتصادی نظام کی چھان بین پر اپنا سارا قیمتی وقت صرف کیا۔ وہ صرف یہ جاننا چاہتا تھا کہ اُس سرمایہ داری سماج میں جس میں وہ زندگی گذار رہا تھا، معاشی پہیہ کس طرح گردش کر رہا تھا۔ اُس کے عظیم الشان کارنامے کا نام کیپٹل (سرمایہ) ہے۔ یہ سرمایہ داری پیداوار کے تنقیدی تجزیئے پر مشتمل ہے۔

وہ سرمایہ داری سماج کے تجزیے کے بعد اس نتیجہ پر پہونچا تھا کہ اشتراکیت کا دور آنے والا ہے اُس نے اشتراکیت کے وجود کا اس طرح خواب نہیں دیکھا جس طرح فرضی جنتوں کے یہ مصور دیکھتے آئے تھے۔ وہ خیال کرتا تھا کہ اشتراکیت ان خاص قوتوں کی وجہ سے جو سماج میں کام کرتی رہتی ہیں ظہور میں آئے گی۔ یہ اشتراکی انقلاب محنت کش مزدوروں کی منظم جماعتیں برپا کریں گی۔ کلاسکی معاشیات صرف تاجروں کی مددگار تھی۔ اس لئے ہم اُس کو صرف تاجروں کی معاشیات کہتے ہیں۔ اسی طرح کارل مارکس کی معاشیات کو مزدوروں کی معاشیات کہا جاسکتا ہے۔ اس معاشیات سے محنت کشوں کو سماج میں بڑی اہم جگہ ملنے کی امید ہے اور اس کے سہارے ان کا مستقبل ان کی آرزوؤں کے بموجب ڈھلنے والا ہے۔

کارل مارکس کے اقتصادی نظریئے کا اہم نکتہ یہ ہے کہ سرمایہ داری نظام کی بنیاد مزدور کی محنت کی لوٹ پر قائم ہے:۔

یہ اندازہ کرنا دشوار نہیں ہے کہ دورِ غلامی میں، غلام کے ساتھ اچھا برتاؤ نہیں کیا جاتا تھا اس حقیقت سے آج بھی کسی کو انکار نہیں، زیادہ رحمدل لوگ تو ان کی داستانِ غم سن کر غصے سے بیتاب ہو جائیں گے اور چلا اُٹھیں گے کہ:۔

"کتنا عبرت خیز تھا وہ منظر! کسی شخص کا کسی دوسرے شخص کی چاکری پر مجبور ہونا بہت ہی بُرا تھا۔ بڑا اچھا ہوا غلامی کا رواج ہمیشہ کے لئے ختم کردیا گیا۔"

اسی طرح یہ اندازہ کرنا بھی آسان ہے کہ جاگیرداری نظام کے محنت کش، جو سرف کے نام سے پکارے جاتے تھے اچھے برتاؤ کے مستحق نہیں سمجھے جاتے تھے۔ یہ بدقسمت بھی، غلاموں کی طرح، اپنے مالک

(لارڈ) کے لئے کام کرتے تھے۔ ان کو اگر چار دن اپنے کھیتوں میں کام کرنے کی اجازت تھی تو اُس کے بعد بھی وہ دو دن اپنے آقا کی بیگار پر مجبور تھے۔ ان دونوں صورتوں میں غریب کام کرنے والے کی کمائی دوسرے کی جیب میں جاتی تھی لیکن سرمایہ داری نظام میں یہ پتہ لگانا کہ مزدور کے ساتھ بُرا برتاؤ ہو رہا ہے آسان نہیں ہے۔ یہ عام طور سے قیاس کیا جاتا ہے کہ وہ اپنی جگہ پر بالکل آزاد ہے اور اُس کو غلام اور سرف کی طرح اپنے مالک یا آقا کے لئے کام نہیں کرنا پڑتا ہے وہ اگر چاہے تو کام کرے اور نہ چاہے تو آرام کرے۔ اگر وہ کسی کے لئے کام کرتا ہے تو ہفتہ کے آخر میں اپنے کام کا معاوضہ بھی پاتا ہے۔ کوئی شبہ نہیں یہ شکل پہلی صورتوں سے بالکل مختلف ہے اور اسے کسی طرح مزدور کی کمائی پر دست اندازی کے نام سے نہیں پکارا جا سکتا۔

لیکن مارکس اس خیال سے متفق نہیں تھا، وہ کہتا تھا کہ مزدور سرمایہ داری نظام میں بھی اسی طرح سے لوٹا جا رہا ہے جس طرح وہ دورِ غلامی اور جاگیرداری نظام میں لوٹا جاتا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ سرمایہ داری نظام کی لوٹ چھپی ہوئی لوٹ" ہے اور اُس پر بہت سے پردے پڑے ہوئے ہیں۔ اُس نے یہ پردے "قدرِ زائد کا نظریہ"[1] پیش کر کے چاک کر دئے۔

اُس نے اپنے اس نظریہ کی بنیاد ریکارڈو کے "نظریہ قدر" پر رکھی ہے۔ ٹکسالی معاشیات کے بہت سے ماننے والے، جن میں آدم اسمتھ سے لے کر جان اسٹورٹ مل تک شامل ہیں، اس نظریے سے کسی نہ کسی حد تک متفق رہے ہیں۔ اس نظریے کے بموجب کسی چیز کی قدر محنت کی اُس مقدار پر منحصر ہے جو اُس کی تیاری میں صرف ہوتی ہے۔ مارکس نے ایک مشہور ماہر اقتصادیات بنجمن فرینکلن (BENJ-AMIN FRANKLIN) کا بھی حوالہ دیا ہے۔ وہ بھی محنت کے نظریہ قدر سے اتفاق رکھتا تھا مارکس لکھتا ہے :۔

"مشہور معاشی فرینکلن ان ماہرین اقتصادیات میں ہے جنھوں نے ولیم پٹی کے بعد سب سے پہلے

---

[1] قدرِ زائد کا نظریہ (THEORY OF SURPLUS VALUE) محنت کی پیداوار جو مزدور اور اُس کے بیوی بچوں کی خوراک نکالنے کے بعد بچ رہے۔

اقدار کی فطرت پر غور کیا ہے، وہ کہتا ہے کہ "تجارت عام طور پر محنت کے محنت سے مبادلے کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ اشیاء کی اقدار صحیح طور پر صرف محنت سے ناپی جا سکتی ہیں۔"

مارکس عام چیزوں اور تجارتی اشیاء (COMMODITIES) میں فرق کرتا ہے۔ تجارتی اشیا کی پیداوار سرمایہ داری سماج کی ایک خاص چیز ہے۔ وہ لکھتا ہے:-

"ان معاشروں کی دولت، جن میں پیداوار کا سرمایہ داری طرز جاری ہے۔ اپنے آپ کو تجارتی اشیا کے ڈھیر کی شکل میں پیش کرتی ہے۔ اس ڈھیر کی اکائی ایک تجارتی چیز ہے اس لئے ہم کو اپنی تحقیقات اس تجارتی شے کے تجزیے سے شروع کرنی چاہیئے۔"

ایک چیز اُس وقت "تجارتی چیز" بن جاتی ہے جب وہ براہ راست استعمال کے لئے نہیں بلکہ مبادلے کے لئے پیدا کی جائے۔ ایک کوٹ جسے کوئی شخص اپنے استعمال کے لئے تیار کرتا ہے تجارتی چیز نہیں ہے۔ کوٹ جو دوسرے شخص کے ہاتھ روپئے یا کسی دوسری چیز کے مبادلے میں بیچنے کے لئے تیار کیا جائے تجارتی چیز ہے:-

"ایک شخص جو براہ راست اپنی ضرورت کی تسکین کے لئے کوئی چیز پیدا کرتا ہے، بلاشبہ استعمالی قدر کی چیز بناتا ہے لیکن تجارتی چیز نہیں پیدا کرتا ہے۔ تجارتی چیز پیدا کرنے کے لئے اُسے استعمالی قدر ہی کی چیز نہیں بلکہ دوسرے کے لئے استعمالی قدر کی چیز یعنی سماجی استعمالی قدر[ا] کی شے بنانی چاہیئے، ایک شخص جو کوٹ اپنے استعمال کے لئے نہیں بلکہ مبادلے کے لئے اور فروخت کرنے کے لئے تیار کرتا ہے، ایک تجارتی چیز پیدا کر رہا ہے۔"

اب بہت ہی اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس تجارتی چیز کا مبادلہ کس شرح سے ہونا چاہیئے وہ کیا چیز ہے جو اس تجارتی چیز کی قدر متعین کرے گی۔ اس کوٹ کا ایک دوسری تجارتی چیز سے مقابلہ کرو۔ ایک جوڑ جوتہ لو۔ ایک ایسی چیز کی حیثیت سے جو انسانی ضروریات کی تسکین کا ذریعہ ہے اس میں اور کوٹ میں کوئی بات زیادہ مشترک نہیں معلوم ہوتی ہے۔ جوتے کے علاوہ

[ا] SOCIAL USE VALUE

روئی، پنسل اور سایسج[1] وغیرہ میں بھی کوئی ایسی بات نہیں معلوم ہوتی جو ان کے اشتراک کا موجب ہو سکتی ہو لیکن پھر بھی ان کے درمیان کوئی ایسی مشترک صفت ضرور ہے جو ان کے باہمی مبادلے کا موجب ہوتی ہے۔ مارکس کے نزدیک یہ صفت جس کی بنا پر ان کا مبادلہ ہوتا ہے اس کے سوا کچھ اور نہیں ہے کہ "وہ سب محنت کی پیداوار ہیں" تمام تجارتی اشیا محنت کی پیداوار ہوتی ہیں۔ اس لئے ان کی قدر اور شرح جس پر ان کا مبادلہ ہو سکتا ہے محنت کی ایک خاص مقدار ہے، جو ان کی اس مادی شکل میں پنہاں ہے۔ محنت کی اس مقدار کا اندازہ اُس مدت سے کیا جائیگا جو اُس کی پیداوار پر صرف ہوئی ہے، مارکس لکھتا ہے:۔

"ہم دیکھتے ہیں کہ جو چیز کسی تجارتی شے کی قدر کا اندازہ مقرر کرتی ہے وہ محنت کی ایک خاص مقدار کے سوا، جو اس کی پیداوار کے لئے ضروری تھی، اور کوئی دوسری چیز نہیں ہے۔ اس لئے ایک شے کی قدر اُس محنت کے وقت کے اندازے سے مقرر ہوگی جو اُس کی پیداوار پر صرف ہوا ہے۔ اسی طرح دوسری اشیار کی اقدار بھی محنت کے وقت کے اندازے سے، جو اُن کی پیداوار پر صرف ہوا ہے، مقرر کی جائیں گی"

اس لئے اگر کوٹ کے بنانے پر سولہ گھنٹے صرف ہوئے تھے اور جوتوں کے بنانے پر صرف آٹھ گھنٹے کا وقت لگا تو کوٹ کی قیمت جوتوں کی قیمت سے دوگنی ہوگی۔ اور ایک کوٹ کے خریدنے کے لئے دو جوڑ جوتوں کی ضرورت ہوگی۔ مارکس نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ ان دونوں چیزوں (کوٹ اور جوتوں) کی پیداوار پر ایک ہی قسم کی محنت نہیں صرف ہوئی تھی، کوٹ میں کاتنے، بُننے اور سینے والے کی محنت لگی تھی اور جوتے میں بالکل دوسرے قسم کی محنت صرف ہوئی تھی۔ لیکن مارکس کہتا ہے کہ ہر قسم کی محنت یکساں ہے اس لئے تمام محنتوں کا مقابلہ ممکن ہے۔ اُس کے نزدیک تمام اشیار کی پیداوار میں انسانی محنت صرف ہوئی ہے۔ سیدھے سادے، اناڑی اور اوسط درجے کے آدمی کی محنت کا مقابلہ ہوشیار اور تربیت یافتہ آدمی کی محنت سے کیا جا سکتا ہے۔ ان دونوں کی محنت میں صرف اتنا ہی فرق ہے کہ تربیت یافتہ کی محنت دو غیر تربیت یافتہ آدمیوں

---

[1] سایسج (SAUSAGE) انتڑیوں میں قیمہ اور بعض مسالے بھر کر ٹکڑے کر لیتے ہیں

کی محنت کا مجموعہ ہے اور ایک تربیت یافتہ محنت کا ایک گھنٹہ، غیر تربیت یافتہ محنت کے دو گھنٹوں کے برابر ہوگا۔

اس لئے مارکس کے نزدیک ایک تجارتی چیز کی قدر اُس محنت کے وقت سے متعین ہوگی جو اس کی پیدائش کے لئے ضروری ہوگا لیکن تم اعتراض کروگے کہ:۔

"اس کا یہ مطلب ہوا کہ ایک سست اور نااہل مزدور کی بنائی ہوئی تجارتی چیز ایک لائق اور تیز کام کرنے والے مزدور کی بنائی ہوئی چیز سے زیادہ قدر کی مالک ہوگی کیونکہ سست اور نااہل مزدور اپنی چیز کی پیدائش پر زیادہ "سماجی محنت" صرف کرے گا۔"

مارکس کے لئے یہ اعتراض خلاف توقع نہ تھا اُس نے اس پر بھی غور کر لیا تھا، اس کے جواب میں اس نے اس طرح سمجھایا کہ:۔

"بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اگر کسی چیز کی قدر اس محنت کے اندازے سے مقرر ہوگی جو اس کی پیدائش پر صرف ہوئی ہے تو ایک کاہل اور بھوہڑ آدمی کی بنائی ہوئی چیز زیادہ قیمتی ٹھہرے گی کیونکہ وہ اس کی پیدائش پر زیادہ وقت صرف کرے گا۔ یہ اعتراض بڑی غلط فہمی پر مبنی ہے۔ تم یاد کرو میں نے "سماجی محنت" کا لفظ استعمال کیا تھا، لفظ "سماجی" کی شرط میں بہت سے نکتے پوشیدہ ہیں۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ کسی تجارتی چیز کی قدر اُس محنت کی مقدار سے جو اُس کی پیدائش پر صرف ہوئی ہے متعین ہوگی تو اس محنت سے ہم وہ خاص محنت اور اُس کی وہ خاص مقدار مراد لیتے ہیں جو سماج کی ایک خاص حالت میں ایک اوسط درجے کی سماجی رفتار سے صرف کی جاتی ہے اور اُس کو ایک اوسط درجے کی مہارت والا مزدور صرف کرتا ہے۔"

ایک کارخانے میں جس میں دو سو مزدور کام کرتے ہیں بعض بہت اچھا کام کرتے ہوں گے اور بعض کا کام اتنا اچھا نہ ہوگا لیکن محنت کی ایک اوسط درجے کی کیفیت بھی ہوگی۔ ان مزدوروں کی محنت، جو اوسط درجے کے مزدور سے اچھا کام کرتے ہیں، ان مزدوروں کی محنت سے مل کر، جو اوسط

درجے کے مزدوروں سے کم اچھا کام کرتے ہیں، تعدیل پیدا کرے گی۔ فرض کرو ایک کوٹ کی تیاری پر جو اوسط درجے کی سماجی محنت خرچ ہوگی وہ سولہ گھنٹے کے برابر ہوگی بعض مزدور اس سے کم مدت میں کوٹ تیار کر دیں گے اور بعض اس سے زیادہ وقت لیں گے لیکن وقت کا یہ فرق ایک عام معیار سے تھوڑا ہی ہٹا ہوا ہوگا۔ یہی صورت دوسرے ذرائع پیداوار کے ساتھ بھی پیش آئے گی مشینیں بھی جن کو مزدور چیزوں کی پیداوار کے لئے استعمال کرتے ہیں، اس سے مستثنیٰ نہیں ہیں۔ کپڑے کے صنعتی کارخانوں کو مجموعی طور پر لو۔ ان میں بعض مشینیں بہت پرانے قسم کے کرگھوں سے کام لے رہی ہوں گی، اور بعض میں بالکل نئے نمونے کے کرگھے جن کا استعمال ابھی تک عام نہیں ہوا ہے۔ نصب ہوں گے۔ ان دونوں کے درمیان میں ایک اوسط درجے کا سامان بھی ہوگا۔ اوسط درجے سے اوپر کی کلیں اور اوسط درجے سے نیچے کی کلیں ایک دوسرے کے کام کی ناسخ ہیں اور صرف درمیانی درجے کے مزدور جو اوسط درجے کے سماجی وقت میں اوسط درجے کی کلوں پر کام کررہے ہیں معیار قرار پائیں گے۔ یہ اوسط درجے کا معیار وقت اور مقام کی تبدیلی سے بدل جائے گا لیکن ہر ملک میں ایک اوسط درجے کا عام معیار ہوگا جس سے محنت اور ذرائع پیداوار کو مطابقت پیدا کرنی ہوگی۔

لیکن اس سے نتیجہ کیا نکلا؟ ہم نے یہ فرض کر لیا کہ ایک تجارتی چیز کی قیمت محنت کے اس وقت سے متعین ہوگی جو اس کی پیدائش کے لئے ضروری تھا لیکن اس سے یہ تو ثابت نہیں ہوا کہ سرمایہ داری سماج میں محنت کی لوٹ مچی ہوئی ہے اور جائدادوں کے مالک اس طبقے کی محنت پر زندگی بسر کررہے ہیں جو کسی قسم کی کوئی ملکیت نہیں رکھتا۔ اس سے یہ بھی ثابت نہیں ہوا کہ سرفوں کی طرح مزدور بھی وقت کے ایک محدود حصے میں اپنے لئے محنت کرتا ہے اور وقت کے دوسرے حصے میں مالک کے نفع کے لئے پسینہ بہاتا ہے۔

اجرت پر کام کرنے والا مزدور سرمایہ دار سماج میں آزاد فرد سمجھا جاتا ہے، وہ عہدِ غلامی کی طرح وہ کسی مالک کی ملکیت نہیں ہے۔ وہ سرفوں کی طرح اپنی زمین کے ساتھ بندھا ہوا بھی نہیں ہے۔ ہم چودھویں باب میں بتا آئے ہیں کہ سرف اپنے مالکوں کی غلامی ہی سے نہیں چھوٹا تھا بلکہ ذرائع پیداوار سے بھی

آزاد ہو گیا تھا۔ ہم اس باب میں یہ بھی بتا آئے ہیں کہ ذرائع پیداوار (زمین، اوزار اور مشین وغیرہ) ایک چھوٹی سی جماعت کے قبضے میں آ گئے تھے۔ اب جن لوگوں کے پاس روزی پیدا کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں رہ گیا تھا، وہ اپنی روزی صرف اپنے آپ کو ان لوگوں کے ہاتھ جو ذرائع پیداوار کے مالک تھے کرایے پر اٹھا کر کما سکتے تھے۔ کوئی شبہ نہیں مزدور اپنے آپ کو سرمایہ دار کے ہاتھ بیچ نہیں ڈالتا ہے (اگر یہ صورت ہوتی تو وہ غلام ہو جاتا) لیکن وہ اپنی ایک تجارتی چیز، جو اس کے پاس باقی رہ گئی ہے یعنی اپنی کام کرنے کی صلاحیت اپنی محنت کرنے کی طاقت فروخت کرتا ہے:-

"اپنے روپئے کو سرمایے سے تبدیل کرنے کے لئے روپیہ کے مالک کو بازار میں آزاد مزدور ملنے چاہئیں۔ یہ مزدور دو حیثیتوں سے آزاد ہونے چاہئیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ آزاد فرد کی حیثیت سے وہ اپنی محنت کرنے کی طاقت کو اپنی تجارتی شے کی حیثیت سے فروخت کر سکتے ہوں، دوسری بات یہ ہے کہ ان کے پاس اپنی محنت کے سوا کوئی دوسری چیز ایسی نہ ہو جسے وہ بازار میں فروخت کر سکیں تاکہ ان کی محنت کرنے کی پوری طاقت خریدی جا سکے۔"

اس آزاد مزدور کو اپنی یہ تجارتی چیز (COMMODITY) کس شرح پر فروخت کرنی چاہئے؟ اس کی محنت کرنے کی طاقت کی قیمت کیا ہے؟ محنت کرنے کی طاقت کی قیمت بھی دوسری تجارتی اشیا کی قیمتوں کی طرح محنت کی اس مقدار پر منحصر ہے۔ جو اس کی پیدائش کے لئے ضروری ہے۔ دوسرے الفاظ میں ہم اس مفہوم کو اس طرح ادا کر سکتے ہیں کہ مزدور کی محنت کی طاقت برابر ہے ان تمام چیزوں کے جو اس کے اور اس کے خاندان کے زندہ رہنے کے لئے ضروری ہیں تاکہ محنت کی طاقت کی رسد برابر جاری رہ سکے۔ اشیا کے اس مجموعے میں جو چیزیں شامل ہیں وہ زمانے اور مقامات کے اختلاف سے بدلتی رہتی ہیں مثال کے طور پر یہ میزان آج کل ریاست ہائے متحدہ امریکہ اور چین میں بہت مختلف ہوگی) مزدور کو اپنی محنت کی طاقت کے عوض میں اجرت دی جاتی ہے۔ یہ اجرت ہمیشہ اس رقم کے برابر ہوتی چاہیے جس سے مزدور وہ تمام چیزیں خرید سکے جو اس کی اور اس کے بچوں کی ضروریات زندگی کے لئے کافی ہوں تاکہ وہ اپنے اور

اپنے بچوں کے اندر محنت کی طاقت پیدا کرسکے۔

مارکس اپنے نقطۂ نظر کی تشریح اس طرح کرتا ہے:۔

"محنت کی طاقت کی قیمت وہی ہے جو اُن چیزوں کی مجموعی قیمت ہے جو مزدور کے زندہ رہنے کے لئے ضروری ہیں تاکہ محنت کو قائم اور باقی رکھا جاسکے۔ اُس کی روزی کے ذرائع اتنے کافی ہونے چاہئیں کہ وہ اپنی ذات کو، ایک محنت کرنے والے فرد کی حیثیت سے معتدل حالت میں باقی رکھ سکے۔ اُس کی قدرتی ضرورتیں (غذا، کپڑے، ایندھن اور مکان وغیرہ) آب وہوا اور ملک کے طبعی حالات کے بموجب بدلتی رہتی ہیں، یہ بھی ملحوظ رکھنے کی ضرورت ہے کہ اُس کی مفروضہ ضرورتوں کی تعداد اور وسعت بھی تاریخی ارتقاء کی پیداوار ہے اس لئے بڑی حد تک ان تمام چیزوں کا دار و مدار بھی اُس ملک کے تہذیبی درجے، وہاں کے رہنے والوں کی عادتوں اور آرام وآسائش کے اُس معیار پر ہوگا جو وہاں کے باشندوں نے جن کے درمیان آزاد مزدوروں کا یہ طبقہ جنم پا رہا ہے قائم کیا ہے۔

محنت کی طاقت کا مالک بھی فانی وجود رکھتا ہے......... اس لئے جب یہ طاقت گھس گھسا کر یا موت کے ہاتھوں بازار کے باہر ہونے لگے تو اُس کی جگہ کو اسی سلسلے میں اُس کے باہر ہونے سے پہلے دوسری تازہ طاقت سے جو کم سے کم اُسی طاقت کے مساوی ہو بھر لینا چاہیئے اس لئے اُس کی معاش کے ذرائع میں، جو محنت کی طاقت کی پیدائش کے لئے ضروری ہیں۔ وہ ذرائع بھی شامل ہونے چاہئیں جو اس طاقت کے بدل یعنی اُس کے لڑکوں کی معاش کے لئے بھی کافی ہوں تاکہ یہ نسل جو خاص تجارتی شے کی مالک ہے اپنا وجود بازار میں ہمیشہ باقی رکھ سکے"!

اس کا یہ مطلب ہوا کہ مزدور کو اپنی "محنت کی طاقت" کے بدلے میں اتنی اجرت ملنی چاہیئے جو اُس کے اور اُس کے خاندان کے زندہ رکھنے کے لئے کافی ہو، بعض ملکوں میں تو اس کو اس سے بھی زیادہ کی ضرورت ہوگی تاکہ وہ وائرلس، موٹر اور کبھی کبھی سینما کے لئے ٹکٹ بھی خرید سکے۔

اوپر کے اقتباس میں غور سے پڑھو کہ مارکس مزدوروں کو "وہ نسل جو خاص تجارتی شے کی مالک ہے" قرار دیتا ہے۔ مزدور کی اس "تجارتی شے" محنت کرنے کی طاقت میں "خاص" بات کیا ہے؟ یہ دوسری تجارتی اشیا کے بالکل برعکس" اپنی قیمت سے زیادہ قدر" پیدا کر سکتی ہے۔ جب کوئی مزدور اجرت پر کام کرتا ہے تو یہ صرف اپنی اجرت کے بقدر ہی پیدا نہیں کرتا ہے بلکہ کام کے پورے دن یہ عمل جاری رکھتا ہے۔ اگر کام کا دن دس گھنٹوں پر مشتمل ہے اور مزدور اپنی اجرت کے بقدر صرف چھ گھنٹے میں پیدا کر لیتا ہے تو یہ باقی چار گھنٹے مزدور اپنے لئے نہیں بلکہ اپنے مالک کے لئے کام کرتا ہے پہلے چھ گھنٹوں کو مارکس "ضروری محنت کا وقت" قرار دیتا ہے اور باقی چار گھنٹوں کو "زائد محنت کا وقت" کہتا ہے۔ ان دس گھنٹوں کی مجموعی پیداوار کا ⅗ حصہ تو مزدور کی اجرت کے مساوی ہے اور باقی ⅖ حصہ "قدر زائد" ہے جو مالک ہتھیا لیتا ہے اور اس کے نفع کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ مارکس لکھتا ہے:۔

"کسی تجارتی چیز کی قدر محنت کی اس مجموعی مقدار سے۔ جو اس کے اندر شامل ہے متعین ہوتی ہے محنت کی اس مجموعی مقدار کے ایک حصہ کا مساوی۔ جو قیمت میں وصول ہوتا ہے، ادا نہیں کیا جاتا۔ اس تجارتی شے میں مزدور کی محنت کا ایک ایسا حصہ شامل ہے جس کی اجرت ادا کی گئی ہے اور ایک دوسرا ایسا حصہ شامل ہے جس کی اجرت ادا نہیں کی گئی ہے۔ اس لئے محنت کا پہلا حصہ "بامعاوضہ محنت" ہے، اور دوسرا حصہ "بے معاوضہ محنت" ہے۔ کسی تجارتی چیز کا ایسی قیمت پر فروخت کرنا جو محنت کی مجموعی مقدار کے مساوی ہے یقیناً نفع لے کر فروخت کرتا ہے۔ مالک صرف وہی چیز نہیں فروخت کر رہا ہے جس کی اجرت اس کو ادا کرنی پڑی ہے۔ بلکہ وہ چیز بھی بیچ رہا ہے جس کے لئے اس نے ایک حبہ نہیں ادا کیا ہے، حالانکہ اس پر بھی مزدور کی محنت صرف ہو چکی ہے۔ کسی تجارتی شے کی وہ قیمت۔ جو سرمایہ دار کو ادا کرنی پڑی ہے اور چیز ہے اور اس کی واقعی قیمت بالکل دوسری چیز ہے۔ اس لئے میں پھر دہرا رہا ہوں کہ معمولی اور اوسط درجے کا نفع تجارتی اشیاء کو ان کی واقعی قیمت سے زیادہ بیچ کر نہیں بلکہ ان کی واقعی قیمت پر بیچ کر

حاصل کیا جاتا ہے"۔

مارکس "کا قدرِ زاید کا نظریہ" اس طرح یہ راز افشا کرتا ہے کہ مزدور سرمایہ دار سماج میں کس طرح لوٹا جاتا ہے۔ آؤ ہم اوپر کی پوری بحث کا خلاصہ چند جملوں میں بیان کر دیں :۔

صنعتی نظام کا تعلق تجارتی اشیاء کی پیداوار سے ہے جو بیچنے کے لئے پیدا کی جاتی ہیں۔

تجارتی اشیاء (COMMODITIES) کی قدر، اُس محنت کے وقت سے مقرر کی جاتی ہے جو سماجی طور پر ان اشیا کی پیدائش پر صرف ہوا ہے۔

مزدور ذرائع پیداوار (زمین، اوزار، کارخانے وغیرہ) کا مالک نہیں ہوتا ہے۔

زندہ رہنے کے لئے، اُس کو اپنی صرف ایک تجارتی چیز (COMMODITY) محنت کرنے کی طاقت جو اُس کے پاس باقی رہ گئی ہے بیچنی پڑتی ہے۔

اس کی تجارتی چیز کی قدر بھی، دوسری تجارتی اشیاء کی طرح محنت کی اُس مقدار سے متعین کی جائے گی جو اُس کی دوبارہ پیدائش پر صرف ہو گی ——— اس غرض کی تکمیل کے لئے اس کو اس مقدار کی ضرورت ہو گی جو اُس کو زندہ رکھ سکے۔

اُجرت، جو اُس کو ادا کی جائے گی اُس مقدار کے مساوی ہو گی جو اُس کی بقا کے لئے ضروری ہے۔

لیکن یہ مقدار مزدور اپنے کام کرنے کے دن کے ایک حصے میں پیدا کر سکتا ہے (یہ حصہ پورے کام کے دن سے کم ہو گا)

اس کا یہ مطلب ہو گا کہ مزدور وقت کے صرف ایک حصے میں اپنے لئے محنت کرتا ہے وقت کے باقی حصے میں وہ مالک کے لئے کام کرتا ہے۔

مزدور کی اجرت اور تجارتی چیز کی قیمت کا (جس کو وہ پیدا کرتا ہے) فرق ہی "قدر زاید" (SURPLUS VALUE) ہے

یہ "قدر زاید" مالک کی جیب میں جو ذرائع پیداوار کا مالک ہے، جاتی ہے۔

یہی "قدر زاید" ملکیت رکھنے والے طبقے کے منافع کا ذریعہ ہے۔

یہی قدرِ زائد محنت کی لوٹ کا، جو سرمایہ داری نظام میں جاری ہے، پیمانہ ہے
کارل مارکس امریکی تاریخ کا بڑا بالغ نظر طالب علم تھا۔ اس لئے غالباً وہ ابراہیم لنکن کی تحریروں اور تقریروں سے بھی بے خبر نہ رہا ہوگا۔ ہم کو یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ ابراہیم لنکن کی نگاہ سے بھی مارکس کی کوئی تحریر گذری تھی یا نہیں لیکن ہم کو اتنا معلوم ہے کہ بعض مضامین پر دونوں ایک ہی زاویۂ نگاہ سے غور کرنے کے عادی تھے۔ ابراہیم لنکن کے یہ الفاظ ہمارے دعویٰ کے ثبوت کے لئے کافی ہیں

"ہم کسی چیز سے اُس وقت تک نہ فائدہ اُٹھا سکے ہیں اور نہ اٹھا سکیں گے جب تک پہلے اُس پر محنت نہ صرف کرلی جائے۔ چونکہ بہت سی اچھی چیزیں محنت سے پیدا کی جاتی ہیں اس لئے یہ لازمی نتیجہ نکلتا ہے کہ ان چیزوں کی ملکیت کا حق صرف اُن کو پہنچنا چاہئے جن کی محنتوں نے ان کو پیدا کیا ہے۔ لیکن ہر زمانے میں ہوتا کچھ ایسا رہا ہے کہ بعض لوگوں نے محنت کی اور بعض لوگوں نے بغیر پسینہ بہائے ہوئے ان کی محنتوں کے پھلوں سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھایا۔ یہ طریقہ غلط ہے اور عرصہ تک اُس کو جاری رہنے کا موقع نہیں دیا جائے گا۔ ہر محنت کش کو، اُس کی محنت کی پوری پیداوار پر یا اتنی مقدار پر جو پوری مقدار سے قریب تر ہو قبضہ دلانا ایک لائق اور اچھی حکومت کا مقصد ہونا چاہئے۔"

یہ ابراہیم لنکن کے خیالات تھے۔ وہ بھی اس نتیجہ پر پہونچ چکا تھا کہ محنت پیدائش کا کام کرتی ہے لیکن سرمایہ اُس کے ساتھ شریک ہو کر ایک حیثیت سے، اُس کو لوٹ لیتا ہے۔ اُس نے رائے قائم کرنے کے بعد ایک قدم اور بڑھایا۔ اُس کا آخری جملہ پھر پڑھو۔ دیکھو وہ اس صورت حال کی درستی کے لئے کچھ کرنا بھی چاہتا تھا۔ یہی کام تو فرضی جنتوں کے مصوروں نے بھی کیا تھا ایسا ہی مارکس نے بھی کیا، لیکن یہ اپنے طریقِ کار میں ان لوگوں سے بہت مختلف تھا۔

ان فرضی جنتوں کے اشتراکیوں نے اپنی مفروضہ جنتوں کی تصویر کشی میں اس کا بہت کم خیال کیا کہ یہ زبردست صنعتی طاقتیں، جو اس وقت سماج پر چھائی ہوئی ہیں اُن کے مجوزہ انقلاب کا ساتھ نہ دیں گی۔ وہ صرف اتنا کافی سمجھتے تھے کہ ایک نمونے کے سماج کی حسین تصویر دنیا کے سامنے

پیش کردی جائے۔ اربابِ اقتدار اور اصحابِ دولت کو ان تجویزوں کے حسن پر فریفتہ کر کے ایک چھوٹے پیمانہ پر تجربہ کی بنیاد رکھی جائے اور عوام کی معقول پسندی پر بھروسہ کر کے اس آرزو میں زندگی بسر کردی جائے کہ کبھی نہ کبھی خیالی جنت کی یہ حسین تصویر ہماری واقعی دنیا کی شکل اختیار کرے گی۔

رابرٹ اوون نے، جو ایک مشہور انگریز اشتراکی تھا، ایک کتاب نئی اخلاقی دنیا کا صحیفہ (BOOK OF THE NEW MORAL WORLD) لکھی ہے۔ اس کتاب کا مقصد اس کے نام سے ظاہر ہے۔ کیا اس نے محنت کش طبقوں کو کسی انقلاب کی دعوت دی ہے تاکہ وہ اپنی قوت بازو سے اس نئے سماج کی بنیاد رکھ سکیں؟ نہیں، ایسا نہیں ہے۔ اس نے کتاب کے آخر میں شہنشاہ انگلستان ولیم چہارم کے نام ایک خط لکھا ہے۔ اس خط میں وہ لکھتا ہے:۔

یہ کتاب نئی اخلاقی دنیا کے بنیادی اصولوں کی نقاب کشائی کرتی ہے اور ایک ایسی نئی بنیاد رکھتی ہے جس پر سماج کی تعمیر نو کا کام کیا جا سکتا ہے اور جس پر نسل انسانی کی ایک نئے کردار کی تشکیل کی جا سکتی ہے۔ سماج نے تخیل کی بنیادی غلطیوں پر اپنی زندگی کی بنیاد رکھی اور تمام انسانی ادارے اور سماجی نظام پوری دنیا میں انھیں غلطیوں سے گمراہ ہوئے۔

جناب والا! آپ کے دورِ حکومت میں ایک ایسا تغیر، جو دنیا کے موجودہ نظام کو اپنی تمام غلط انجامیوں سے نکال کر سچائی کی راہوں پر ڈال دے، ظہور پذیر ہو جائے تو ایسی ابدی مسرت کا حصول ممکن ہو جائے گا جو ہر انسان کو نصیب ہو گی۔"

مشہور فرانسیسی اشتراکی چارلس فوریر (FOURIER) نے بھی ایک کتاب لکھی تھی۔ اس کی نظر بھی محنت کش طبقوں کو چھوڑ کر اربابِ دولت کی طرف اٹھی تھی تاکہ وہ اس کو نظامِ نو کے تجربے کے لئے اپنی دولت کے ذرائع سے فائدہ پہونچائیں:۔

"ایک مرتبہ اس نے اعلان عام کے ذریعہ سے ظاہر کیا تھا کہ وہ ہر روز ایک خاص معین وقت پر کہیں نہ جائے گا بلکہ اپنے گھر پر کسی ایسے حامی انسانیت کا انتظار کیا کرے گا جو اس کو ایک ملین

فراکَ اس لئے عطا کرے کہ وہ اپنے اصولوں پر ایک نو آبادی بسا کر نظامِ نو کا تجربہ کرے۔ وہ بارہ سال تک اپنے گھر میں ٹھیک دوپہر کے وقت ایسے فیاض اجنبی کی راہ دیکھتا رہا لیکن بدقسمتی سے کوئی کروڑپتی اُس سے ملنے نہیں آیا۔"

سینٹ سائمن بھی ایک فرانسیسی اشتراکی تھا اُس کے پیرو فوریر کی تجاویز کا مذاق اُڑاتے تھے لیکن وہ بھی یقین رکھتے تھے کہ بورژوا طبقے کی مدد کے بغیر کوئی سماجی انقلاب ممکن نہ ہوسکے گا۔ انھوں نے اپنے میگزین گلوب (GLOBE) میں ۲۸ نومبر ۱۸۳۱ء کو یہ حیرت انگیز انکشاف کیا تھا:-

"جب تک اوپر طبقے کے لوگ مدد کے لئے ہاتھ نہ بڑھائیں محنت کش طبقے کبھی اُبھرنے کے لائق نہ ہوسکیں گے درِاصل آغاز اسی دولت مند طبقے کی طرف سے ہونا چاہیے۔"

مارکس ان خیالی جنتوں کے مصوروں سے متفق نہ تھا۔ اُس نے اپنی تحریروں میں ان کا بہت مذاق اُڑایا ہے۔ وہ ان کو خیالی منصوبہ باز سمجھتا تھا۔ کیمونسٹ مینی فسٹو میں، جو ۱۸۴۷ء میں مارکس اور اینگلز نے (جو مارکس کا ساری زندگی کا دوست اور رفیق کار تھا) مشترکہ طور پر لکھا تھا:-

"یہ لوگ سماج کے ہر ممبر کی حالت بہتر کرنا چاہتے ہیں۔ ان کی نگاہِ کرم سے جو زیادہ خوش قسمت لوگ ہیں وہ بھی محروم نہیں ہیں۔ اس لئے وہ عادتاً پورے سماج سے طبقات کے فرق کا لحاظ کئے بغیر اپیل کرتے ہیں۔ ان کے مخاطب بھی زیادہ تر حاکم طبقے ہی کے لوگ ہوتے ہیں۔ جب عوام ان کے نظام اور طریقِ کار سے اچھی طرح واقف ہوجاتے ہیں تو ان کو اندازہ کرنے میں دشواری نہیں ہوتی کہ یہ لوگ کتنی اچھی تجویزیں رکھتے ہیں اور ان تجویزوں کے ذریعہ سے کتنے اچھے سماج کے وجود میں آنے کا امکان ہے۔

یہ لوگ تمام سیاسی اور خاص طور سے انقلابی تحریکوں کے مخالف ہیں۔ یہ امن اور شانتی سے اپنے مقاصد حاصل کرنا چاہتے ہیں اور چھوٹے چھوٹے تجربوں کے ذریعہ سے جن کا ناکام ہونا بالکل یقینی ہے نئے سماجی مذہب کی بنیاد رکھنا چاہتے ہیں

یہ لوگ ابھی تک اپنی مفروضہ سماجی جنتوں کے خواب دیکھ رہے ہیں یہ امید کرتے ہیں کہ ان خوابوں کی کوئی عملی تعبیر بھی نکل سکے گی اور وہ دنیا سے دور اپنی معیاری نو آبادیاں بسا سکیں گے۔ ان ہوائی

قلعوں کو زمین پر لانے کے لئے وہ بورژوا جماعتوں کے جذبات اور ان کے خزانوں سے اپیل کرتے رہتے ہیں۔"

مارکس اور اینگلز کو ان کی یہی التجائیں، جو وہ ان دولتمندوں کے جذبات اور ان کے خزانوں سے کرتے رہتے تھے، بہت بُری معلوم ہوتی تھیں۔ ان کے نزدیک حاکم طبقوں کی نیک آرزوؤں سے کسی نتیجے کی امید نہ تھی۔ وہ یقین کرتے تھے کہ انقلاب صرف محنت کش جماعتوں کے انقلابی اقدام سے عملی شکل اختیار کر سکے گا۔ انھوں نے ستمبر ۱۸۷۹ء میں ببیل (BEBEL) لبنیشٹ (LIEB NECHT) اور دوسرے جرمن انتہا پسندوں کو اپنے نقطۂ نظر کی پوری طرح وضاحت کرتے ہوئے لکھا تھا:۔

"ہم چالیس سال سے طبقاتی کشاکش کو تاریخ کی "فوری محرک طاقت" بتاتے آئے ہیں۔ ہم خاص طور سے موجودہ سماجی انقلاب کے لئے بورژوا اور پرولتاری طبقوں کی کشاکش کو بڑا اہم محرک سمجھتے ہیں۔ اس لئے ہم ان لوگوں سے کسی قسم کا تعاون نہیں کر سکتے جو اس طبقاتی کشاکش کو تحریک سے خارج کر دینا چاہتے ہیں۔ جب مزدوروں کی بین الاقوامی مجلس قائم ہوئی تھی ہم نے صاف طور سے اپنا یہ نعرۂ جنگ مقرر کیا تھا کہ "محنت کشوں کی نجات محنت کشوں ہی کے ہاتھوں ہوگی"۔ اس لئے ہم ان لوگوں سے اشتراک عمل نہیں کر سکتے۔ جو یہ کہتے ہیں کہ مزدور غیر تعلیم یافتہ ہیں اس لئے اپنی نجات کے موجب نہیں ہو سکتے اور ان کی رہائی کے لئے ضروری ہے کہ پہلے حامیانِ انسانیت اور کم حیثیت کے بورژوا ان کی مدد کے لئے ہاتھ بڑھائیں۔"

مارکس اور اینگلز جب طبقاتی کشاکش کو "تاریخ کی فوری محرک طاقت" اور بورژوا اور محنت کش طبقوں کی کشاکش کو موجودہ سماجی انقلاب کے لئے ایک زبردست محرک قرار دیتے تھے تو اس سے ان کی مراد کیا ہوتی تھی؟ اس سوال کے جواب کے لئے ہم کو اس نقطۂ نظر کی چھان بین کرنی ہو گی جس سے وہ تاریخ کا مطالعہ کرتے تھے۔

تمھارا فلسفۂ تاریخ کیا ہے؟ کیا تم یقین کرتے ہو کہ تاریخی واقعات کا دارومدار محض بخت و اتفاق پر ہے اور ان کے درمیان کوئی ایسی کڑی نہیں ہے جو ان واقعات کی بکھری ہوئی کڑیوں

کو ایک مسلسل زنجیر سے تبدیل کر سکے؛ کیا تمھارا یہ خیال ہے کہ خیالات اور نظریات کی قوتیں تاریخی تغیرات کی موجب ہوتی ہیں؟ یا چند بڑے لوگ اپنے اثر و اقتدار سے تاریخی واقعات اور حادثات کا دھارا بدلتے رہتے ہیں؛ اگر تم اسی طرح کا کوئی خیال رکھتے ہو تو تم کسی طرح مارکسی طرزِ فکر کے حامل نہیں سمجھے جا سکتے مارکس ایک خاص فلسفۂ تاریخ کا ماننے والا ہے۔ یہ فلسفہ خود اس کی ذہنی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ اس فلسفۂ تاریخ کے جو لوگ ماننے والے ہیں ان کا عقیدہ ہے کہ وہ تغیرات جو سماج میں پیش آتے ہیں، ان اقتصادی قوتوں کا نتیجہ ہیں جو سماج پر اثر انداز ہوتی رہتی ہیں۔

اس خیال کے لوگوں کے نزدیک تاریخ کے واقعات اپنی جگہ پر مستقل بالذات نہیں ہیں بلکہ یہ اپنے وقوع کے لئے ایک دوسرے پر منحصر رہتے ہیں۔ تاریخ بظاہر غیر منتظم اور غیر مرتب واقعات کا ڈھیر معلوم ہوتی ہے لیکن حقیقت یہ نہیں ہے۔ تاریخ کے واقعات بھی ایک خاص اور منظم قانون کے پابند ہیں۔ اگر تاریخ کا غور سے مطالعہ کیا جائے تو ان کا پتہ لگایا جا سکتا ہے۔

اینگلز مارکس کے فلسفہ کی حقیقت ان الفاظ میں بیان کرتا ہے:۔

> "دنیا کی تاریخ میں پہلی مرتبہ پوری قدرتی تاریخی اور ذہنی دنیا ایک عمل قوت کی حیثیت سے پیش کی گئی ہے۔ یہ دنیا مسلسل حرکت میں رہتی، بدلتی اور نئی نئی شکلیں اختیار کرتی رہتی ہے اور مسلسل ارتقا کے زینوں پر چڑھتی چلی جاتی ہے۔ دنیا میں پہلی مرتبہ یہ کوشش کی گئی ہے کہ اس اندرونی رابطے کا پتہ لگایا جائے جو ان تمام حرکتوں اور ارتقائی کڑیوں کو ملا کر ایک مسلسل وجود بنا دیتا ہے۔ اس نقطۂ نظر سے انسانی تاریخ کچھ بے معنی خیالات کا احمقانہ مجموعہ نہیں رہ جاتی بلکہ انسانی ارتقا کا عمل بن جاتی ہے۔"

معاشیات، سیاسیات، قانون، مذہب اور تعلیم، تہذیب کی یہ تمام شاخیں ایک دوسرے سے بندھی ہوئی ہیں اور اپنے وجود کے لئے ایک دوسرے پر منحصر ہیں۔ ان میں سے ہر شاخ وجود میں اس لئے آئی ہے کہ دوسری شاخیں وجود میں آ چکی ہیں۔ ان تمام طاقتوں میں جو سرگرم عمل ہیں معاشیات بنیادی طور پر بڑی اہم طاقت ہے۔ اس پوری عمارت کا بنیادی پتھر وہ رشتہ ہے جو لوگ آپس میں

پیدا کرنے والے کی حیثیت سے رکھتے ہیں۔ لوگوں کے رہن سہن کا ڈھنگ وہ طریقہ مقرر کرتا ہے جس سے وہ روزی پیدا کرتے ہیں، ان کی بود و باش کے انداز پر پیدائش کا وہ خاص طرز اثر ڈالتا ہے۔ وہ ایک خاص وقت میں، ایک خاص سماج میں رائج ہوتا ہے۔

مارکس یہی بات اس طرح سمجھاتا ہے :۔

میں بڑے گہرے مطالعہ کے بعد اس نتیجہ پر پہونچا ہوں کہ آئینی تعلقات اور ریاست کی شکلیں نہ اپنی جگہ پر سمجھی جا سکتی ہیں اور نہ انسانی دماغ کی نام نہاد عام ترقی کے سہارے ان کی تشریح ہی کا کوئی امکان ہے۔ ان کی جڑ انسانی زندگی کے مادی حالات کی گہرائی میں چھپی ہوئی سماجی پیداوار کے ذریعہ سے لوگ آپس میں رشتے پیدا کرتے ہیں۔ پیداوار کے یہ رشتے پیداوار کی مادی طاقت سے، جو ایک خاص دور کی پیداوار کے مادی ارتقا کے وقت ہو جاتی ہے، مطابق ہوتے ہیں۔ پیداوار کے انھیں تعلقات کی مجموعی مقدار سماج کا معاشی تانا بانا تیار کرتی ہے۔ اسی کی بنیاد پر آئینی اور سیاسی عمارتیں کھڑی ہوتی ہیں اور سماجی بیداری کی مختلف شکلیں انھا سے مطابقت پیدا کرتی ہیں۔ مادی دنیا کی پیداوار کا ڈھنگ ہی سماجی سیاسی اور روحانی عمل کا عام کردار متعین کرتا ہے، لوگوں کا شعور ان کے سماجی وجود کا باعث نہیں ہوتا ہے بلکہ اس کے بالکل برعکس ان کا سماجی وجود ہی ان کے شعور کی راہ متعین کرتا ہے۔"

یہ فلسفہ ہمارے ہاتھ میں ایک ایسا آلہ دے دیتا ہے جس کی مدد سے ہم تاریخ کی بڑی نتیجہ خیز تشریح کر سکتے ہیں۔ ہر سماج کی بنیاد صرف اس طریقے پر قائم ہے جس کے ذریعہ سے وہ اپنی روزی پیدا کرتے ہیں۔ پیدا کرنے کا ڈھنگ اور مبادلے کا طرز ہی وہ حقیقت ہے جو کسی سماج کے وجود کے لئے ضروری ہے۔ دولت کی تقسیم کس طرح عمل میں آتی ہے اور سماج کس طرح طبقوں میں بٹتا ہے۔ اس کا انحصار صرف اس پر ہے کہ کیا پیدا ہوا ہے، کیونکر پیدا ہوا ہے، پیداوار کا مبادلہ کس طرح عمل میں آیا ہے! اسی طرح حق، انصاف اور تعلیم کے تصورات اور نظریات معاشی ارتقا کی اس خاص منزل کے لئے موزوں ہیں جہاں کوئی خاص سماج پہونچ چکا ہے۔ آخر وہ کیا عوامل ہیں جو سماجی اور سیاسی

تغیرات برپا کرتے ہیں؟ کیا یہ تبدیلیاں ان تغیرات کی وجہ سے ہوتی ہیں جو لوگوں کے خیالات میں پیدا ہوتے رہتے ہیں؟ حقیقت یہ نہیں ہے۔ لوگوں کے خیالات میں تغیرات تو ان تبدیلیوں کی وجہ سے ہوتے ہیں جو معاشیات، پیدا کرنے کے طریقے اور مبادلے کے طرز میں اس سے پہلے ہی ہو جاتے ہیں۔

دنیا تسخیر فطرت کی راہ میں ارتقائی منزلیں طے کرتی رہتی ہے اور پیداوار کے نت نئے ڈھنگ اور مبادلۂ اشیا کے جدید طریقے دریافت اور ایجاد ہوتے رہتے ہیں۔ یہ تغیرات اپنی جگہ پر بڑی بنیادی حیثیت رکھتے ہیں اور ان کے نتائج بہت دوررس ہوتے ہیں جب یہ حقیقت اپنی جگہ پر صحیح ہے تو نئی نئی سماجی کش مکشوں کا پیش آتے رہنا بھی یقینی ہے۔ پرانے نظام پیداوار کی بنا پر جو تعلقات اور رابطے پیدا ہوتے ہیں وہ اپنی جگہ پر پہاڑوں کی طرح اٹل ہو جاتے ہیں روزی پیدا کرنے کے پرانے طریقے قانون، سیاسیات، مذہب اور تعلیم کی حدوں میں اپنی مستقل جگہ بنا لیتے ہیں۔ جو طبقہ سماج میں طاقتور ہوتا ہے، ان قدیم روایات کی حمایت میں اپنے قدم اور گاڑ دیتا ہے لیکن وہ طبقے جو پیداوار کے نئے طرز کے پجاری ہوتے ہیں آگے بڑھتے ہیں اور اپنی جگہ بنانا چاہتے ہیں۔ کشاکش شروع ہوتی ہے اور اس کشاکش کا نتیجہ انقلاب کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔

تاریخ کے مطالعہ کا یہ نیا طریقہ مارکس کے نزدیک ہم کو اس قابل بنا دیتا ہے کہ ہم ان حقیقتوں تک رسائی حاصل کر سکیں جو اب تک کسی دوسرے طریقے سے ممکن نہ تھی۔ اب تک یہ حقیقت ناقابل فہم تھی کہ تاریخی واقعات کی صحیح توجیہ طبقاتی رابطوں کے مطالعہ پر منحصر ہے یہ طبقات حصول معاش کے طریقوں کے اختلاف سے پیدا ہوتے ہیں۔ مارکس نے سب سے پہلے یہ خیال دنیا کے سامنے پیش کیا۔ اس تصور کی مدد سے ہمارے لئے یہ سمجھنا آسان ہو گیا کہ جاگیرداری نظام نے سرمایہ داری نظام کے لئے کس طرح جگہ چھوڑی اور سرمایہ داری نظام کس طرح اشتمالیت کے لئے راستہ صاف کر رہا ہے۔

مارکس اور اینگلز نے ماضی کی تاریخ کا مطالعہ اسی نقطۂ نظر سے کیا تھا اس لئے ان کے لئے یہ ممکن ہو سکا کہ وہ بورژوا طبقے کا صحیح تاریخی مقام متعین کر سکیں۔ انھوں نے یہ کبھی نہیں کہا کہ سرمایہ داری بُری ہے اور سرمایہ دار لوگ اچھے نہیں ہوتے ہیں۔ انھوں نے صرف یہ پتہ لگایا کہ کس طرح سرمایہ داری نظام ابتدائی حالات کے اثر سے خود بخود پیدا ہو گیا۔ انھوں نے بورژوا طبقے کے انقلابی کردار کے تذکرے میں کسی بخل سے کام نہیں لیا۔ وہ اُن کی اس انقلابی کشاکش کا فیاضی سے تذکرہ کرتے ہیں جو انھوں نے جاگیرداری نظام کے خلاف اپنے ارتقا کے زمانے میں کی تھی، وہ کہتے ہیں:-

> ہم دیکھتے ہیں کہ ذرائع پیداوار اور مبادلے کے طریقے جس پر بورژوا طبقے نے اپنی تعمیر کی جاگیرداری نظام میں جڑ پکڑ چکے تھے، ذرائع پیداوار اور مبادلے کے ارتقا کی ایک خاص منزل میں املاک کے جاگیرداری رابطے، زیادہ عرصے تک ان نئی پیدا کرنے والی طاقتوں کے ارتقا کا مقابلہ نہ کر سکے۔ اور وہ ان کی ترقی کی راہ میں سنگِ گراں بن کر رہ گئے۔ اب جاگیرداری نظام کے ان رابطوں کو، ان ترقی یافتہ حالات میں ختم ہونا ہی تھا۔ اور وہ اپنے وقت پر ختم ہو ہی گئے۔
>
> ان رابطوں کی جگہوں پر نئے مقابلوں نے نئے سماجی اور سیاسی دستور کے ساتھ، جو ان حالات کے مطابق تھے قدم جمائے۔ اور بورژوا طبقے کے اقتصادی اور سیاسی تسلط کے لئے راستہ صاف کر دیا۔"

جاگیرداری نظام سرمایہ داری نظام کے لئے راستہ چھوڑنے پر صرف اس لئے مجبور ہوا تھا کہ نئی پیدا کرنے والی طاقتیں اور ایک انقلابی طبقہ (بورژوا) دونوں موجود تھے۔ ایسا ہی ہمیشہ ہوتا ہے۔ پرانا نظام صرف اس لئے نئے نظام کے لئے جگہ نہیں چھوڑتا کہ لوگ اس کے آرزومند ہوتے ہیں اس کے لئے پہلی شرط یہی ہے کہ نئی پیدا کرنے والی طاقتیں پیدا ہو جائیں اور ایک انقلابی طبقہ بھی وجود میں آ جائے جو ان طاقتوں کو سمجھ کر راہ پر لگا سکے۔ یہی وجوہ تھے جنھوں نے جاگیرداری نظام

کو ختم کر کے سرمایہ داری نظام کے لئے جگہ بنائی اور یہی وجوہ ہیں جو سرمایہ داری نظام کے ملبے پر اشتمالیت کی بنیاد کھڑی کریں گے۔

یہ اور بات ہے کہ ماضی کے سماج پر نگاہ ڈال کر بتایا جائے کہ کیا واقعات پیش آئے تھے لیکن یہ بالکل دوسری بات ہے کہ موجودہ سماج کے حالات کا مطالعہ کر کے حکم لگایا جائے کہ یہ پیش آنے والا ہے لیکن اس دعوے کے ثبوت میں کہ سرمایہ داری نظام خود اپنی جگہ پر ختم ہونے جا رہا ہے۔ مارکس اور اینگلز کیا کہتے تھے؟ وہ یہ کیسے ثابت کرتے تھے کہ پیداوار کی طاقتیں ایک جگہ اکٹھا ہو گئی ہیں اور ان کو پیداوار کے رابطوں کی وجہ سے آزادی سے بڑھنے اور پھیلنے کا موقع نہیں مل رہا ہے۔

مارکس اور اینگلز نے ۱۸۴۸ء میں سرمایہ دار سماج کا تجزیہ کر کے بعض ان خصوصیات کی طرف اشارہ کیا تھا جو خود نظام پیداوار کے اندر موجود ہیں اور اُس کی بربادی کا سبب بن رہی ہیں۔ ان کے نزدیک یہ خصوصیات حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ دولت کا چند آدمیوں کے ہاتھوں میں اکٹھا ہونا۔

۲۔ چند بڑے لوگوں کا چھوٹے پیدا کرنے والوں کی بہت بڑی تعداد کا کچلنا۔

۳۔ مشینوں کا بڑھتا ہوا استعمال اور مزدوروں کی بہت بڑی تعداد کی بیکاری ——— اور اس طرح ایک "محفوظ صنعتی لشکر" کا پیدا ہو جانا

۴۔ عوام کی بڑھتی ہوئی پریشانی

۵۔ اس نظام میں ابتریوں کا متواتر پیدا ہوتے رہنا ——— تجارتی بحران ——— ایک سے دوسرا بڑھا ہوا۔

ان سب سے زیادہ اہم وہ بنیادی تضاد ہے جو سرمایہ داری نظام میں پایا جاتا ہے۔ پیداوار تو زیادہ سے زیادہ اشتراکی (SOCIALIZED) ہوتی جاتی ہے لیکن اجتماعی محنتوں کے نتائج نجی اور انفرادی طور پر غصب کئے جاتے ہیں محنت پیدا کرتی ہے سرمایہ ہضم کرتا ہے۔ سرمایہ داری نظام میں محنت کے ذریعہ سے پیدا کرنے کی ذمہ داری مشترکہ ہوتی ہے دا کثر یہ مزدور مل جل کر صرف ایک چیز

جیسے ـــــــ کار ـــــــ پیدا کرتے ہیں) لیکن پیداوار جو اجتماعی طور پر پیدا کی گئی ہے غصب کرلی جاتی ہے۔ یہ غصب وہ لوگ نہیں کرتے ہیں جنھوں نے ان چیزوں کو پیدا کیا ہے بلکہ وہ لوگ کرتے ہیں جو ذرائع پیداوار پر قابض ہیں یعنی ـــــــ سرمایہ دار۔ یہی دشواری ہے اور یہیں سے پریشانی کا سرچشمہ پھوٹتا ہے۔ ایک طرف چیزوں کی اشتراکی پیداوار ہے اور دوسری طرف ان کا سرمایہ دارانہ غصب ہے۔

مارکس نے اپنی کتاب کیپٹل میں یہی بات یوں بیان کی ہے :۔

ایک سرمایہ دار ہمیشہ بہت سے سرمایہ داریوں کے قتل کا سبب بنتا ہے۔ جب دولت ان چھوٹے سرمایہ داروں کے خاتمے کے بعد صرف چند اشخاص کے ہاتھوں میں سمٹ کر آجاتی ہے تو تیزی سے بڑھتے ہوئے پیمانے پر محنت کا عمل اشتراک باہمی کی شکل اختیار کرلیتا ہے۔ محنت کے ذرائع اپنی شکل بدل کر محنت کے ایسے ذرائع بن جاتے ہیں جن کو صرف مشترکہ طور پر استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ بڑے بڑے سرمایہ داروں کی تعداد بھی گھٹتی رہتی ہے اور پریشاں حالی، تباہی، غلامی، پسماندگی اور لوٹ کھسوٹ کا حلقہ بڑھتا جاتا ہے۔ انھیں حالات میں محنت کشوں کی بغاوت بھی بڑھتی جاتی ہے۔ یہ بغاوت منظم اور متفقہ ہوتی ہے۔ اور اس کی تنظیم بھی اسی سرمایہ داری پیداوار کے عمل کے ذریعہ سے مکمل ہوتی ہے۔ سرمایے کی اجارہ داری پیداوار کے ڈھنگ پر اثر انداز ہوتی ہے اور اس کو بڑھنے سے روکتی ہے۔ پیداوار کے ذرائع صرف ایک جگہ مرکوز ہو کر رہ جاتے ہیں لیکن محنت اشتراکی شکل اختیار کرلیتی ہے۔ یہ دونوں اسی حالت میں عرصے تک اکٹھا نہیں رہ سکتے اور ایک وقت آجاتا ہے کہ بندھے ہوئے بند ٹوٹ جاتے ہیں اور سرمایہ داری کی نجی املاک کا فاتحہ پڑھ دیا جاتا ہے۔ وہ لوگ جو اب تک غصب کرنے آئے تھے خود غصب کرلیے جاتے ہیں۔"

مارکس اور اینگلز اُس وقت کا انتظار کر رہے تھے جب پیداوار کی اجتماعی طاقتیں ان پابندیوں کی وجہ سے جو نجی ملکیت اور انفرادی تغلب کی طرف سے عائد ہوتی رہتی تھیں، محدود نہ رہ سکیں۔ وہ توقع

کرتے تھے کہ یہ کشاکش جو اس صورت حال کا لازمی نتیجہ ہے ایک نئے ہم آہنگ سماج کو جنم دے گی۔ اس سماج میں ذرائع پیداوار چند سرمایہ دار غاصبوں کے ہاتھوں سے نکل کر پیدا کرنے والے عوام کی بڑی تعداد کے ہاتھوں میں آجائیں گے۔

لیکن یہ انقلاب کیسے برپا کیا جاسکے گا؟ یہ انقلاب لوگوں کی قوت عمل لائے گی، جو اتنا بڑا انقلاب برپا کریں گے کون لوگ ہوں گے؟ محنت کش عوام (PROLETARIATE) یہ لوگ کیوں اس انقلاب کے علمبردار ہوں گے؟ اس لئے کہ یہی وہ طبقہ ہے جو سرمایہ داریت کے تضاد کا سب سے زیادہ شکار رہتا ہے یہی وہ طبقہ ہے جو نجی ملکیت کے نظام سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتا، یہی وہ طبقہ ہے جس کو اس نظام میں اپنا پورا اور منصفانہ حق کبھی نہیں ملتا۔ سرمایہ داری نظام ہی میں اشتمالیت کے جراثیم چھپے ہوئے ہیں۔ اور یہ محنت کش عوام ہی ہیں جو اس سرمایہ داری نظام کو ختم کر کے اشتمالیت (COMMUNISM) کو جنم دیں گے۔

مارکس کی انقلاب پسندی صرف دیوان خانے تک محدود نہ تھی۔ وہ ان لوگوں میں نہ تھا جو صرف دوسروں کو وعظ سنا کر خاموش ہو جاتے ہیں۔ وہ مردِ میدان تھا، شیر قالین نہ تھا۔ اس نے جو فلسفہ پیش کیا اس کے مطابق اپنی زندگی ڈھال کر بھی دکھا دی۔ اس کا فلسفہ صرف دنیا کی توجیہ اور تشریح تک محدود نہ تھا بلکہ دنیا میں انقلاب برپا کرنے کا ایک آلہ بھی تھا۔ وہ ایک بے لوث انقلابی کی حیثیت سے، میدان جنگ سے دور رہنا نہیں چاہتا تھا بلکہ اس معرکہ میں نبرد آزمائی کا پورا حق ادا کرنا چاہتا تھا اس نے اپنی پوری زندگی اسی عزم وارادے کے ماتحت بسر کر کے دکھا دی۔

مارکس نے یہ اچھی طرح محسوس کر لیا تھا کہ سرمایہ داری کا زوال محنت کش عوام کے ہاتھوں ہوگا۔ اس لئے اس نے اپنی پوری توجہ مزدوروں کی تربیت اور تنظیم پر صرف کرنی شروع کر دی تا کہ وہ اپنی معاشی اور سیاسی جد وجہد کے لائق ہو سکیں۔ وہ مزدوروں کی بین الاقوامی انجمن (INTERNATION-AL WORKING MANS ASSOCIATION) کا بہت گرم جوش اور با اثر رکن تھا، پہلی بین الاقوامی انجمن لندن میں ۲۸ ستمبر ۱۸۶۴ء کو وجود میں آئی تھی۔ اس کے دو مہینے کے بعد ۲۹ نومبر ۱۸۶۴ء کو اس کا

سنگ بنیاد رکھا گیا۔ مارکس نے اپنے ایک جرمن دوست ڈاکٹر کوگل مین (KUGEL MAN) کو لکھا تھا:۔

"انجمن سے زیادہ اُس کی کمیٹی زیادہ اہم ہے اس لئے کہ لندن کی ٹریڈ یونینوں کے رہنما اور پیرس کے مزدوروں کے قائد بھی اس میں شریک ہیں"

مارکس اور اینگلز دونوں ان ٹریڈ یونینوں کی اہمیت پر بہت زور دیتے تھے:۔

"مزدوروں کی ایک طبقے کی حیثیت سے تنظیم ٹریڈ یونینوں کے ذریعہ سے ہوتی ہے یہی محنت کش طبقے کا واقعی ادارہ ہے جو اپنی روزمرہ کی زندگی میں سرمایے سے کش مکش جاری رکھتا ہے اور اس طرح ان محنت کشوں کو تربیت دیتا ہے"

یہ تربیت کس مقصد سے دی جا رہی تھی؟ کیا اجرتوں میں اضافے کے لئے؟ یا کام کے گھنٹوں میں کمی اور عام شرائط میں بہتری کے لئے؟ ہاں، یہ تربیت ان مقاصد کے حصول کے لئے بھی دی جا رہی تھی لیکن ایک اور مقصد ان سب سے زیادہ اہم تھا۔ مزدوروں کی مکمل آزادی کی راہ میں نجی ملکیت کا پتھر حائل تھا۔ اس پتھر کے ہٹانے کے لئے ایک بڑی کشا کش کا سامنا تھا۔ یہ ساری تربیت اور تیاری اسی مقصد کے حصول کے لئے دی جا رہی تھی۔ سرمایہ داری نظام کی تمام خرابیوں کی ذمہ داری ذرائع پیداوار کے نجی قبضے پر عائد ہوتی ہے اس لئے مارکس اور اینگلز نے اپنے پروگرام میں نجی ملکیت کے کلی استیصال، کو، جو دراصل ہر طرح کی لوٹ کھسوٹ کی جڑ ہے، بنیادی جگہ دی تھی:۔

"اشتمالیوں (COMMUNISTS) کا ابتدائی مقصد یہی ہے کہ وہ محنت کش طبقوں کو ایک جماعت بنا دیں، بورژوا جماعتوں کے ہر قسم کے تسلط کو ختم کر دیں اور سیاسی اقتدار ان محنت کشوں کے ہاتھوں میں دیدیں۔ اشتمالی پروگرام کا امتیازی پہلو ملکیت کا عمومی خاتمہ نہیں ہے بلکہ بورژوا طبقے کی ملکیت کا کلی استیصال ہے۔ "نئے زمانے کی نجی بورژوا ملکیت" پیداوار کے نجی طور پر غصب کی آخری اور مکمل مثال ہے۔ اس کی بنیاد طبقاتی جدلیت (ANTAGONISM) پر قائم ہے جو چند آدمیوں کا بہتوں کو لوٹنے کا دوسرا نام ہے۔

اس لئے اگر ہم اشتمالیوں کے نظریے کا خلاصہ ایک جملے میں بیان کرنا چاہیں تو کہہ سکتے

ہیں کہ کیمونزم نام ہے نجی ملکیت کے خاتمے کا:

تم بورژوا طبقے کے لوگو! ہمارے خاتمۂ ملکیت کے عزائم سے گھبراتے ہو، لیکن تمہارے نظام میں تو نجی ملکیت آبادی کے ۹/۱۰ حصے کے حق میں پہلے ہی ختم ہو چکی ہے، اس کا وجود چند لوگوں کے ہاتھوں میں صرف اس وجہ سے ہے کہ بڑی اکثریت کے ہاتھوں سے یہ چھینی جا چکی ہے۔ تم ہم کو ملامت کرتے ہو کہ ہم نجی ملکیت کی اس شکل کو ختم کرنا چاہتے ہیں جس کو باقی رکھنے کی لازمی شرط یہی ہے کہ آبادی کے ۹/۱۰ حصے کو، جو بہت بڑی تعداد پر مشتمل ہے، ہر طرح کی جائداد سے محروم رکھا ہے۔"

"تم ہم کو اس لئے کہ ہم تمہارے حق ملکیت کا خاتمہ کرنا چاہتے ہیں، کوستے ہو! بات بالکل یہی ہے ——— ہمارا ارادہ یہی ہے۔" ......

"یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ نجی ملکیت کے ختم ہونے کے بعد تمام کام رک جائے گا اور عالمگیر تعطل ہمیں گھیر لے گا۔ اگر یہ اعتراض صحیح ہوتا تو آج سے بہت پہلے بورژوا سوسائٹی صریحی ناکاردپن کے ہاتھوں موت کی نیند سو چکی ہوتی، اس لئے کہ اس سماج کے جو لوگ محنت کرتے ہیں انھیں کے پاس کچھ نہیں ہے اور جن کے پاس کچھ ہے، وہی کوئی کام نہیں کرتے ہیں۔"

اس لئے نجی ملکیت کی یہ شکل جو موجودہ سرمایہ داری نظام میں پائی جاتی ہے ختم ہونی چاہیئے اور ملکیت رکھنے والے طبقے کو، دوسروں کے لوٹنے کا حق نہ ملنا چاہیئے۔ لیکن یہ مہم اپنے انجام تک کیسے پہونچائی جائے؟ کیا ملکیت رکھنے والے لوگوں سے التجا کی جائے کہ وہ اپنی ملکیت کے حق سے دستبردار ہو جائیں؟ یا مجالس قانون ساز میں اپنی رائے کے زور سے ان کی ملکیت کے حق کو خلاف آئین قرار دیا جائے؟ نہیں، مارکس اور اینگلز کی تعلیم یہ نہ تھی۔

پھر آخر کیا تدبیر تھی؟ وہ کون طریقہ تھا جس کی طرف یہ لوگ رہنمائی کرتے تھے؟ وہ طریقہ تھا ——— "انقلاب"

"کیمونسٹ پسند نہیں کرتے کہ اپنے نقطۂ نظر اور مقاصد کو چھپائے رکھیں۔ وہ کھلم کھلا اعلان

کرتے ہیں کہ ان کے مقاصد کے حصول کا صرف یہی طریقہ ہے کہ موجودہ معاشرتی نظام کو اُلٹ دیا جائے۔ حاکم طبقوں کو اشتمالی انقلاب کے نام سے لرزہ براندام ہونے دو محنت کش طبقوں کے پاس کھونے کے لئے غلامی کی بیڑیوں کے سوا اور دھرا کیا ہے؟ ان کے جیتنے کے لئے ایک دنیا پڑی ہوئی ہے۔"

"تمام ملکوں کے محنت کشو! متحد ہو جاؤ"

حاکم طبقے کے نام یہ گونجتی ہوئی للکار اور انقلاب کی ندائے عام سب سے پہلے فروری ۱۸۴۸ء میں شائع ہوئی تھی۔ یہ حقیقت اپنی جگہ پر بہت دلچسپ ہے کہ اس کی اشاعت سے ٹھیک ایک مہینے پہلے ۱۲ جنوری ۱۸۴۸ء کو امریکہ کے مدبرِ اعظم ابراہیم لنکن نے امریکی مجلس نمائندگان میں انقلاب کے غیر محدود حق کا اعلان کیا تھا:۔

"ہر جگہ کے عوام کو، اگر ان کا یہی رجحان ہو اور وہ اس کی طاقت بھی رکھتے ہوں، حق حاصل ہے کہ علم بغاوت بلند کریں اور موجودہ حکومت کا تختہ اُلٹ دیں اور اپنی نئی حکومت، جو ان کے نزدیک زیادہ بہتر ہو بنالیں، یہ بہت قیمتی اور مقدس حق ہے ــــ ایسا حق جس سے ہم امید کرتے ہیں کہ دنیا کی آزادی کا موجب ہو سکتا ہے۔"

لنکن نے اس حق کا "علم بغاوت بلند کریں اور موجودہ حکومت کا تختہ اُلٹ دیں" کیوں ذکر کیا؟ اس نے یہ مشورہ کیوں نہیں دیا کہ پرانی حکومت کے حدود عمل میں رہ کر مطلوبہ تغیرات پیدا کرنے کی کوشش کی جائے؟

شاید لنکن خیال کرتا تھا کہ ایسا ممکن نہ ہو سکے گا۔ شاید مارکس اور اینگلز کی طرح وہ بھی رائے قائم کر چکا تھا کہ:۔

"موجودہ حکومت کا انتظامیہ شعبہ (EXECUTIVE) صرف بورژوا طبقے کے معاملات کی نگرانی اور سربراہی کے لئے قائم تھا۔"

اس کا مطلب یہ تھا کہ "کچھ رکھنے والوں" اور "کچھ نہ رکھنے والوں" کے درمیان جنگ چھڑی ہوئی

تھی، کچھ رکھنے والے حکومت کے حلقوں میں بھی اپنی حمایت کے لئے ایک اہم ہتھیار کے مالک تھے۔ ہمارے سماج میں حکومت کی طاقت حاکم طبقے کے مفاد کے لئے، جو دراصل سرمایہ دار طبقے پر مشتمل ہے، استعمال کی جاتی ہے۔

مارکسی خیال کے لوگوں کے نزدیک تو اسی وجہ کی بنا پر پہلے پہل "ریاست" عالم وجود میں آئی تھی۔ موجودہ سماج دو حصوں میں بٹا ہوا ہے۔ ایک حصہ جابر ہے اور دوسرا مجبور۔ پہلے کا نام بورژوا ہے اور دوسرے کا محنت کش (PROLITARIATE) انھیں دونوں طبقوں کے درمیان کشاکش جاری ہے، جو طبقہ معاشی طور پر حکومت کر رہا ہے، وہی طبقہ سیاسی طور پر بھی چھایا ہوا ہے" سیاسی طاقت"... ...... دراصل نام ہے اُس منظم طاقت کا جو ایک طبقہ دوسرے طبقے کو اپنے قبضے میں رکھنے کے لئے استعمال کرتا ہے۔

ہم کو یہ یقین دلایا جاتا ہے کہ ریاست طبقوں کے اوپر ایک بلند و بالا وجود ہے اور حکومت کسی ایک طبقے کی نہیں بلکہ امیر و غریب سب کی ترجمان ہے لیکن حقیقت یہ نہیں ہے چونکہ معاشی سماج کی بنیاد "نجی ملکیت" پر قائم ہے اس لئے سرمایہ داری کے قلعے پر جو بھی حملہ کیا جائے اُس کی زد نجی ملکیت ہی پر پڑے گی اور اُس کی مدافعت میں حکومت کی تمام طاقتیں میدان میں آجائیں گی۔ اگر ضرورت محسوس ہوگی تو وہ تشدد کے استعمال سے بھی گریز نہ کریں گی۔ اس لئے جب تک طبقات کا وجود باقی ہے، حکومت طبقات سے اوپر ایک غیر جانبدار نظام نہیں بن سکتی، وہ مجبور ہے کہ حاکم طبقے کی طرف جھکی رہے۔ آدم اسمتھ نے اس حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کیا تھا:۔

"جب مجلسِ قانون ساز کوشش کرتی ہے کہ مالکوں اور مزدوروں کے فرق میں اعتدال پیدا کردے تو یہ حقیقت فوراً بے نقاب ہو جاتی ہے کہ اُس کے ارکان مالکوں کے طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔"

ایک معتدر ہستی نے جو ہمارے زمانے سے قریب تر ہے بہت ہی واضح الفاظ میں اپنی رائے ظاہر کی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی حکومت پر وہی لوگ قابض ہیں جن کے ہاتھوں میں اُس کی معاشی لگام بھی ہے۔ ۱۹۱۳ء میں پریسیڈنٹ ووڈرو ولسن (WILSON) نے لکھا تھا:۔

"اس صورت حال کی وجہ یہ ہے کہ ایک بہت ہی چھوٹی تعداد اس ملک کے پورے خام مال پر قابو رکھتی ہے اور نسبتہً لوگوں کی بہت ہی چھوٹی تعداد پانی کی طاقت (WATER POWER) پر قابض ہے۔ لوگوں کی یہی تعداد ریل کے راستوں کی مالک ہے اور یہی لوگ اپنے باہمی معاہدوں کی بنا پر قیمتوں پر بھی قابو کرتے ہیں اور یہی لوگ ملک کے لین دین کی بہت بڑی مقدار پر چھائے ہوئے ہیں......... ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی حکومت کی مالک ایک جماعت ہے جو امریکہ کے سرمایہ داروں اور کارخانوں کے مالکوں پر مشتمل ہے۔"

یہ تسلیم کر لینے کے بعد بھی کہ حکومت کی پوری مشین پر حاکم طبقے کا قبضہ ہے، یہ بات غور طلب باقی رہ جاتی ہے کہ کیا محنت کش عوام کے لئے زبردستی حکومت کا تختہ اُلٹنے کے سوا اور کوئی چارہ کار باقی نہیں ہے؟ یہ انقلاب بیلٹ بکسوں کے ذریعہ سے کیوں نہ برپا کیا جائے؟ طاقت حاصل کرنے کے لئے جمہوری طریقے کیوں نہ آزمائے جائیں اور محنت کش عوام رائے عامہ کو اپنے حق میں ہموار کر کے حکومت کی کرسیوں پر کیوں نہ قابض ہو جائیں؟

یہ سوالات بہت اہم ہیں محنت کش ارباب فکر بھی ان مسائل پر کبھی متفق الرائے نہیں ہو سکے انقلاب پسند لوگ عام طور سے جواب دیتے ہیں کہ حاکم طبقے اپنی جگہ چھوڑنے کے لئے کسی طرح آمادہ نہ ہوں گے اس لئے طاقت بھی استعمال کرنی پڑے گی اور خون خرابے کی بھی نوبت آئے گی۔ ان کے دلائل کی بنیاد بھی کچھ تلخ حقائق پر قائم ہے۔ اگر مارکس ۱۹۳۲ء میں زندہ ہوتا تو اس نے نیویارک ہرالڈ ٹریبیون کا یہ مراسلہ اپنی تائید میں پیش کیا ہوتا:۔

بلغاریہ کی شاہی کا دارالحکومت کمیونسٹ ہو گیا

لیکن کمیونسٹ صوفیہ کی کونسل میں نہ رہ سکیں گے

"صوفیہ۔ بلغاریہ۔ ۲۶ ستمبر۔ میونسپل الکشن میں کمیونسٹ پارٹی کی بڑی زبردست کامیابی نے کل یہاں بڑی گھبراہٹ اور پریشانی پیدا کر دی۔ صوفیہ کی پینتیس جگہوں میں سے بائیس جگہیں کمیونسٹ پارٹی نے جیت لیں۔ دس جگہیں حکومت اور جمہوری پارٹی کو ملیں تین نشستیں زنکوف

پارٹی کے ہاتھ آئیں کمیونسٹ پارٹی نے ۱۹۳۱ء کے الکشن کے بعد اپنے رائے دہندگان کی تعداد دوگنی کرلی، لیکن حکومت کے حلقے کے پچاس فی صدی رائے دہندگان اُس کے مخالف ہوگئے۔"

"صوفیہ، روس کے باہر یورپ کا پہلا دارالسلطنت ہے جو کمیونسٹ ہوگیا ہے یہ بے ربطی اُس وقت اور بھی واضح ہوجاتی ہے جب یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ بلغاریہ میں ابھی تک شاہی قائم ہے اور شاہ بورس کا محل کونسل ہاؤس سے چند قدم کے فاصلے پر واقع ہے۔"

"اس سبب کے علاوہ اور دوسرے اسباب کی بنا پر بھی کمیونسٹ حکومت برداشت نہیں کی جائے گی۔ الکشن کے نتائج کے ظاہر ہوتے ہی وزیر اعظم نکولس نشانا ف نے اپنے اس ارادہ کا اظہار کردیا ہے کہ وہ کونسل کو اُس کے اجتماع سے پہلے برخاست کردیں گے اس کا بھی امکان ہے کہ کمیونسٹ پارٹی خلاف قانون قرار دے دی جائے اور پوری مملکت میں اس کے وجود کو ممنوع کر دیا جائے۔"

"کمیونسٹ پارٹی اقتصادی حالات کی غیر معمولی ابتری کی وجہ سے کامیاب ہوگئی ہے جو لوگ کمیونسٹ نہیں تھے۔ انھوں نے بھی اس صورت حال کے خلاف احتجاج کے طور پر کمیونسٹ پارٹی کو ووٹ دئے ہیں۔"

اس کنزرویٹوری پبلکن اخبار کی اطلاع کے بموجب کمیونسٹ پارٹی نے الکشن میں کامیابی تو حاصل کرلی لیکن اُس کو عہدے سنبھالنے کا حق نہیں دیا گیا اور مستقبل میں ان کے زندہ رہنے کے امکانات بھی ختم کردئے گئے۔ اس اخبار کے نمائندے کے ذہن میں کیا بات تھی۔ جب اُس نے "اس سبب کے علاوہ دوسرے اسباب کے فقرے لکھے تھے کوئی شبہ نہیں وہ سمجھ رہا تھا کہ کمیونسٹ پارٹی کی کامیابی کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ حاکم طبقے کے نجی ملکیت رکھنے کے حق پر زد پڑے گی۔

مارکس اور اینگلز نے انتہائی کوشش کی کہ آنے والے واقعات کے مقابلے کے لئے محنت کش طبقوں کو تیار کیا جائے۔ اس تیاری کی پہلی شرط یہ تھی کہ مزدوروں میں "جماعتی بیداری" پیدا

ہو جائے۔ وہ ایک جماعت کی حیثیت سے اپنی تنظیم کرلیں اور تاریخی ارتقا کی اس دوڑ میں اپنے فرائض کا پوری طرح سے احساس کرلیں۔ ان کو ان طبقوں کے خاتمے کے لئے کمر ہمت باندھنی تھی جو اب تک دوسروں کو ختم کرتے آئے تھے۔ ان کو نجی ملکیت کی بنیاد اکھاڑ پھینکنی تھی اور اس بنیاد کے ساتھ طبقوں اور طبقاتی حکومتوں کی بنیادوں کو بھی اکھاڑ پھینکنا تھا۔

مارکس اور اینگلز نے یہ محسوس کرلیا تھا کہ سرمایہ داری نظام کا خاتمہ قریب ہے۔ اگر اس نظام کے خاتمے کے وقت محنت کش طبقے ذمہ داری سنبھالنے کے لئے تیار نہ ہوئے تو سخت بدنظمی پھیل جائے گی اور اگر محنت کشوں نے اپنی تیاری کا ثبوت دے دیا تو اشتراکیت کی بنیادیں قائم ہو جائیں گی اور اسی وقت:۔

"تاریخ میں پہلی مرتبہ انسان حیوانی بادشاہت سے نکل کر اپنا انسانی امتیاز حاصل کرے گا اور زندگی کی حیوانی سطح سے بلند ہو کر انسانی عظمتوں کا حقدار بن سکے گا۔ اسی وقت انسان سمجھ بوجھ کر اپنی تاریخ بنا سکے گا۔ اور اسی وقت وہ اجتماعی وجوہ اور اسباب جن کی وہ تخلیق کرے گا اس کو منزل مقصود تک پہونچا سکیں گے یہی وہ شاہراہ ہے جو انسان کو مجبوریوں کی تنگ وادیوں سے نکال کر آزادی کی بادشاہت کی طرف لے جائے گی۔"

اگر میرا بس چلا تو

میں ستاروں پر بھی قبضہ کر لوں گا

اس میں کوئی شک نہیں یہ بڑی ہی خطرناک بات ہے۔

صنعتی انقلاب کی ابتدا میں کلاسکی ماہرین معاشیات کے قدر کے نظریہ محنت[۵۱] کی جو تشریح کی تھی وہ اُس وقت بہت مفید ثابت ہوئی تھی بورژوا طبقے نے جو اُس زمانے میں ایک ترقی یافتہ طبقہ تھا، اس نظریے کو ہتھیار کی طرح استعمال کیا! ور مالکان زمین کے خلاف جو اگرچہ رجعت پسند تھے لیکن سیاسی طور پر بہت طاقتور تھے، اس ہتھیار کو لے کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ خیال کیا جاتا تھا کہ مالکانِ زمین کا یہ طبقہ کام کئے بغیر زندگی کا لطف اُٹھاتا ہے اور اپنا پسینہ بہائے بغیر دوسرے کی محنت کے پھلوں سے فائدہ حاصل کرتا ہے۔ ریکارڈو نے بھی جس نے نظریہ لگان (THEORY OF RENT) کے ساتھ اس نظریہ (قدر کے نظریۂ محنت) سے بھی فائدہ اُٹھا کر مالکان زمین پر حملے کئے تھے اس نظریہ کو موزوں خیال کیا۔

لیکن مارکس نے اس کو صحیح نہیں خیال کیا۔ اُس نے اس کو قبول تو کیا لیکن اُس میں ترمیم کر کے اُسے وہاں پہونچا دیا جہاں اُسے منطقی طور پر پہونچنا چاہیے تھا۔ بورژوا طبقے کی نگاہ میں یہ نتائج بہت تباہ کن تھے، اب پانسہ پلٹ چکا تھا۔ ان کا ہتھیار جس کو اُنھوں نے اپنے دشمنوں کے خلاف استعمال کیا تھا اب نئے انداز سے ڈھل کر محنت کش عوام کے ہاتھوں میں جا رہا تھا تاکہ خود اسی بورژوا طبقے کے خلاف استعمال کیا جا سکے۔

---

۵۱ LABOUR THEORY OF VALUE

نجات کا وقت بہرحال اب قریب تھا۔ "کیپٹل" کی اشاعت کے چند سال کے بعد ماہرین معاشیات نے بالکل بدلا ہوا "نظریۂ قدر" پیش کرنا شروع کیا۔ تین آدمی تین مختلف ملکوں میں پیدا ہوئے۔ اسٹینلے جیونس (STANLEY JEVONS) انگلستان میں (۱۸۷۱ء)، کارل منجر (KARL MENGER) آسٹریا میں (۱۸۷۱ء) اور لین ولراس (LEON WALRAS) سوئٹزرلینڈ میں (۱۸۷۴ء) ہر ایک نے علیحدہ علیحدہ کام کیا، لیکن ہر ایک، ایک ہی زمانے میں قریب قریب ایک ہی نتیجے تک پہونچا۔ کلاسکی معاشئین اور کارل مارکس اور اینگلز کی طرح انھوں نے بھی اپنے ماننے والوں کی بہت بڑی تعداد پیدا کرلی۔ ان کے ماننے والوں نے ان کے نظریات کی تشریح کی اور ان کے حلقے کی توسیع کی۔ اصلاح، نظرثانی، اور اضافے کی بھی نوبت آئی لیکن ان کے نظریے کا مرکزی خیال ابھی تک قدیم معاشیات کا محور بنا ہوا ہے۔

ان معاشئین نے "قدر" کی جو تشریح کی ہے وہ افادۂ مختتم کا نظریہ کہلاتی ہے۔ جیونس نے اپنی کتاب نظریۂ معاشیات" (THEORY OF POLITICAL ECONOMY) کے دوسرے صفحے پر اپنے ماضی سے کٹ جانے کا اعلان کردیا ہے۔ وہ لکھتا ہے :-

"میں مسلسل غور و فکر اور مطالعہ کے بعد اس نئے نتیجے پر پہونچا ہوں کہ کسی چیز کی قدر اس کی افادیت پر منحصر ہے۔"

افادیت فائدہ مندی کا مرادف ہے اور اس آدمی کے احساس کا ترجمان ہے جو وہ کسی چیز کی خریداری کے وقت اُس چیز کے متعلق رکھتا ہے۔ اگر اُس کو اس چیز کی ضرورت کا شدید احساس ہے تو یہ چیز اُس کے لئے بڑی افادیت رکھے گی۔ ضرورت کا احساس جتنا شدید ہوتا جائے گا افادیت اتنی ہی بڑھتی جائے گی۔ اس کی ضرورت جتنی کم ہوجائے گی افادیت بھی اتنی ہی گھٹ جائے گی۔ اس شخص کے لئے اس چیز کی افادیت اُس چیز کی قدر کا پیمانہ ہے۔ اس لئے یہی افادیت اُس چیز کی وہ قیمت مقرر کرے گی جو وہ شخص ادا کرنے کے لئے رضامند ہوگا۔

یہ بات دیکھنے کے لائق ہے کہ اس نظریے نے ماضی کے طرزِ خیال میں کتنی زبردست تبدیلی پیدا کردی تھی۔ یہ لوگ کلاسکی معاشئین اور کارل مارکس کسی کے نقطۂ نظر سے متفق نہ تھے۔ ان لوگوں

کے نزدیک کسی چیز کی قدر اُس محنت پر منحصر تھی جو اُس کی پیداوار پر صرف کی جاتی تھی لیکن جیون کہتا تھا:-

"محنت ایک مرتبہ صرف ہونے کے بعد کسی چیز کی قدر آئندہ پر اثر انداز نہیں ہوسکتی۔"

اس رائے نے معاشی نظریے کا سارا زور پیداوار سے ہٹا کر استعمال پر ڈال دیا یعنی صیغہ صرف کا سارا زور بازار کی طرف منتقل ہوگیا۔ اس نظریہ کا سمجھنا بہت دشوار ہے۔ یہ سمجھ لینا تو بہت آسان ہے کہ اس چیز کی پیداوار پر اتنی محنت صرف ہوئی ہے لیکن یہ اندازہ کرنا بہت مشکل ہے کہ اس چیز میں اتنی افادیت ہے۔ محنت کی قیمت تو ایسی چیز ہے جس کو خارجی معیار (OBJECTIVE STANDARD) سے ناپا جا سکتا ہے لیکن افادیت ہر شخص کے معاملے میں اُس تشفی کی مقدار کے ساتھ جو وہ اس چیز سے حاصل کرنے کی امید کرتا ہے، بدلتی رہتی ہے۔ اس کے ناپنے کے لئے داخلی معیار (SUBJECTIVE STANDARD) کے استعمال کرنے کی ضرورت ہوگی۔

یہ ظاہر ہے کہ مختلف لوگوں کو ایک ہی چیز سے تشفی کی ایک ہی مقدار حاصل نہیں ہوتی ہے بلکہ جتنے لوگ ہوں گے اُن کی تشفی کی مقداریں بھی اتنی ہی ہوں گی۔ اسی بات کو یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ یہ چیز مختلف لوگوں کے لئے افادیت کی مختلف مقداریں رکھتی ہے لیکن یہ چیز بازار میں ایک ہی قیمت پر فروخت ہوگی، اس لئے یہ کہا جائے گا کہ اس کی قدر بھی ہر حال میں ایک ہی رہے گی (نئے زمانے کے بہت سے معاشئین کے نزدیک قیمت نام ہے اُس قدر کا جو روپئے کی شکل میں ظاہر کی جاتی ہے لیکن مارکس اسے تسلیم نہیں کرتا) اس لئے اگر افادیت قدر کا پیمانہ ہے تو یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ افادیت کی مختلف مقداریں ایک ہی قیمت پر فروخت کی جاسکیں ؟ یہی وہ جگہ ہے جہاں اختتام (MARGIN) کا خیال پیدا ہوتا ہے۔ اس کا اچھی طرح سمجھ لینا بہت ضروری ہے۔ اگر تم کوئی جدید کتاب جو معاشی نظریات پر لکھی گئی ہو، پڑھو گے تو تم کو افادۂ مختتم (MARGINAL UTILITY) پیدائش مختتم (MARGINAL PRODUCTIVITY) اور مصارف مختتم (MARGINAL COST) وغیرہ سے بارہا سابقہ پڑے گا۔

فرض کرلو کہ بازار میں صرف ایک لاکھ کاریں موجود ہیں بعض ایسے خریدار ہوسکتے ہیں جو زیادہ

دولتمند ہوں اور ان کو موٹر کار کی اتنی شدید ضرورت ہو کہ وہ اس کے لئے قریب ہر قیمت ادا کر سکتے ہوں، ان کے علاوہ کچھ اور لوگ بھی ہوں گے جن کو موٹر کار کی ضرورت تو ہو گی لیکن وہ اتنے دولت مند نہ ہوں گے۔ اگر وہ دیکھیں گے کہ کار کی قیمت بہت زیادہ ہے تو وہ کار خریدنے کے بجائے فیصلہ کریں گے کہ اپنا روپیہ کسی دوسری چیز کی خریداری پر صرف کریں۔ ان کے سوا بھی کچھ لوگ ہوں گے جو کار کی صرف مناسب قیمت ادا کر سکیں گے لیکن چونکہ ان کے پاس خرچ کرنے کے لئے روپیہ کی بہت زیادہ مقدار نہ ہو گی، وہ اپنا روپیہ بہت احتیاط سے خرچ کریں گے۔ ان کو کار کے علاوہ بھی بہت سی ایسی چیزیں مل سکتی ہیں جن کو وہ اپنی محدود رقم سے خرید سکیں گے اور ان سے ان کو اتنی ہی تشفی بھی ہو گی جتنی کار سے ہو سکتی تھی۔ اگر کار کی قیمت اُس چیز سے زیادہ ہو گی جو ان کو کار کے برابر تشفی بخش سکتی ہے تو وہ کار ہرگز نہ خریدیں گے۔" ہم صرف اتنے ہی پونڈ چائے یا دوسری چیز خریدتے ہیں جو ہمارے نزدیک اُس قیمت کے برابر ہوتی ہے جو ہم کو ادا کرنی پڑتی ہے۔ ہم اس حد سے آگے نہیں بڑھتے۔ جب قیمتیں زیادہ ہو جاتی ہیں ہم کم چیزیں خریدتے ہیں۔ یہ فرق صرف اُس افادیت کے بدلنے کی وجہ سے ہوتا رہتا ہے جس کی طرف جیونس نے اشارہ کیا ہے۔ اس لئے ہماری آخری خریداری کی افادیت قیمت کے ساتھ چلتی رہتی ہے ...." یہ اسی صورت سے چلتی رہتی ہے۔ یہاں تک کہ دونوں پہلوؤں میں توازن پیدا ہو جاتا ہے اور کہیں نہ کہیں ایسا لاکھواں خریدار نکل آئے گا جو وہ قیمت ادا کرنے پر تیار ہو جائے گا جو کارخانے کا مالک لینا چاہتا ہے۔ بعض ایسے گاہک بھی ہوں گے جو زیادہ قیمت ادا کر سکیں گے اور ہزاروں ایسے بھی مل جائیں گے جو اگر کار کی قیمت کچھ کم ہو جائے تو خریدنے کے لئے تیار ہو جائیں گے لیکن کاریں صرف ایک لاکھ ہیں۔ اگر کارخانے کا مالک ان سب کو بیچ ڈالنا چاہتا ہے تو اُس کو اُن کی وہ قیمت رکھنی چاہئے جو لاکھویں خریدار کی جیب اور مذاق پر گراں نہ ہو۔ اگر وہ سب کاریں نہ فروخت کرنا چاہے تو اُس کو زیادہ قیمت مل سکتی ہے اور اگر وہ ان کو کم قیمت پر بیچنا چاہے تو اُس کی بہت سی کاریں فروخت ہو سکتی ہیں لیکن اگر وہ اپنی پوری ایک لاکھ کاریں بیچ ڈالنا چاہے تو اُس کو اُن کی وہ قیمت متعین کرنی چاہئے۔ جو اُس خریدار کی جیب پر بھی بار

نہ ہو جو صرف اتنا ہی دے سکتا ہے۔ اگر وہ دیکھتا ہے کہ بازار میں ایک لاکھ ایسے خریدار موجود نہیں ہیں جو وہ قیمت ادا کر سکیں جو وہ طلب کرتا ہے تو اُس کو اپنی کچھ کاریں بازار سے ہٹانی پڑیں گی تاکہ وہ باقی چند کاریں اپنی مطلوبہ قیمت پر فروخت کر سکے لیکن اگر وہ اپنی تمام کاریں فروخت کرنا چاہتا ہے تو اس کو اُن کی قیمتیں کم کرنی پڑیں گی تاکہ کم مالدار لوگ اور مختلف ذوق رکھنے والے گاہک بھی خرید سکیں۔ وہ یہ نہیں کر سکتا کہ ایک ہی قسم کی کار آزاد بازار میں ایک شخص کے ہاتھ زیادہ قیمت پر فروخت کرے اور دوسرے کے ہاتھ کم قیمت پر۔

کوئی شبہ نہیں یہ لاکھواں گاہک یا خریدارِ مختتم کوئی خاص شخص نہ ہوگا بلکہ لاکھ گاہکوں میں سے کوئی ایک گاہک ہوگا جو ان ایک لاکھ کاروں میں سے کوئی ایک کار خریدے گا۔ بازار جس طرح کام کرتا ہے، اور جس طرح اشیاء کی قیمتیں مقرر ہوتی ہیں ان کی نظری تشریح کے سلسلے میں کہا جائے گا کہ یہ خریدار طلب مختتم کا ترجمان ہے۔ اگر قیمتیں بہت زیادہ بڑھ جائیں گی تو وہ کار نہ خریدے گا اور اس روپئے سے جو وہ خرچ کر سکتا ہے دوسری چیزیں جن سے اُس کو زیادہ تشفی حاصل ہوگی خریدے گا۔ اگر قیمتیں زیادہ ہوں گی تو خریداروں کی ایک بڑی تعداد میدان میں آئے گی اور طلب کے مقابلے میں رسد بہت کم ہو جائے گی اس صورت میں مالک کارخانہ کو اتنی قیمت مقرر کرنی پڑے گی جو ان خریداروں کو جو "کم قیمت" سے زیادہ ادا کرنے کے لائق نہیں ہیں، بازار باہر کر دے۔

تصویر کے دوسرے رُخ پر بھی نگاہ ڈالو اور اس مسئلہ پر طلب کے نقطۂ نظر سے بھی غور کرو۔ فرض کر لو بازار میں ایک ہزار ایسے خریدار موجود ہیں جو ایک برادہ (REFRIGERATOR) کے لئے ایک ہزار ڈالر ادا کر سکتے ہیں۔ ایک ہزار خریداروں کی دوسری تعداد بھی موجود ہے جو فی برادہ سات سو پچاس ڈالر سے زیادہ نہیں دے سکتی ہے۔ اس طرح تم کو ایسے دو ہزار گاہک نظر آتے ہیں جو ہر برادہ کے لئے کم از کم سات سو پچاس ڈالر پیش کر سکتے ہیں۔ اب رفتہ رفتہ نیچے اترو اور خریداروں کے آخری زینے پر پہونچو۔ یہاں تم کو پچاس لاکھ ایسے گاہک کھڑے ہوئے ملیں گے جو فی برادہ صرف پچاس ڈالر پیش کرنے کے لائق ہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ خریداروں کی اس بھیڑ میں کتنے

ایسے گاہک ہیں جو واقعی برادہ خرید سکیں گے اور ان کی طلب پوری کرنے کے لئے ایک برادہ کی تیاری پر کیا لاگت بیٹھے گی؟ (مسئلہ کو سمجھنے کے لئے مناسب ہوگا کہ ہم فرض کرلیں کہ بازار میں صرف ایک ہی طرح کے برادے موجود ہیں) اتنی بڑی تعداد کی (جو فی برادہ پچاس ڈالر سے زیادہ ادا نہیں کرسکتی) طلب پوری کرنے کے لئے، کارخانے کے مالک کو ایک برادے کی قیمت پچاس ڈالر ہی رکھنی ہوگی لیکن کیا وہ اتنی کم قیمت پر پچاس لاکھ برادے تیار کرسکے گا؟ اگر اتنی بڑی تعداد میں برادے تیار کرنے کے باوجود ایک برادے پر لاگت پچاس ڈالر سے زیادہ آئی یا اس قیمت میں اس کو اتنا کم نفع بیٹھا جو اس کی عرق ریزی کا مناسب معاوضہ نہیں کہا جاسکتا تو وہ یہ صنعت ضرور چھوڑ دے گا اور اپنا سرمایہ کسی ایسے کاروبار میں لگائے گا جو اس کو اس سے زیادہ نفع دے سکے گا۔ اس صورت میں یہ پچاس لاکھ برادے تیار نہ ہوسکیں گے۔ کارخانہ دار اپنے سرمایہ کا ایک استعمال مختتم (MARGINAL USE) رکھتا ہے۔ اسی طرح گاہک بھی اپنے روپئے کے استعمال مختتم سے نگاہ نہیں پھیر سکتا۔ کارخانہ دار کو جب تک یہ امید ہے کہ وہ اپنا روپیہ کہیں اور لگاکر زیادہ نفع کمائے گا، وہ سستے برادے ڈھالنے کا کوئی خیال ہی نہیں کرے گا۔ وہ برادوں کے ڈھالنے میں صرف اتنا سرمایہ لگائے گا جو اس کو مناسب نفع دے سکے، اگر وہ اس کاروبار پر مناسب سرمایہ نہ صرف کرے گا تو نفع حاصل کرنے کا اچھا موقع کھودے گا (یہ اچھا موقع اس کو مجبور کرے گا کہ وہ کچھ اور سرمایہ لگاکر نفع کمائے) اگر وہ برادہ سازی کی صنعت پر ضرورت سے زیادہ سرمایہ (OVER CAPITALISED) لگادے گا تو اس زیادہ سرمایہ سے اس کو زیادہ نفع حاصل نہ ہوگا وہ دیکھتا ہے کہ بازار میں صرف تیس لاکھ ایسے گاہک موجود ہیں جو ایک برادے کے لئے ڈیڑھ سو ڈالر ادا کرسکتے ہیں۔ اور اس قیمت پر برادہ بیچ کر وہ بہت مناسب نفع حاصل کرسکتا ہے اگر وہ اس کاروبار پر کچھ اور سرمایہ لگادے گا تو اس کو اس سے زیادہ نفع حاصل نہ ہوگا۔ اگر وہ اس تعداد سے زیادہ برادے تیار کرے گا تو ان کی قیمت گر جائے گی اور نفع کی مقدار بھی اسی تناسب سے کم ہوجائے گی، اور اس طرح سرمایہ اس صنعت سے نکل کر کوئی اور راہ اختیار کرے گا۔

کوئی شبہ نہیں یہ بحث بہت اُلجھی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ اس بحث کے پیچیدہ ہونے سے انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن ایک عام خیال جو افادہ مختتم (MARGINAL UTILITY) کی چادر اوڑھے ہوئے ہے، درحقیقت مشکل نہیں ہے۔ تم اس کو اپنی روزمرہ زندگی میں آسانی سے سمجھ بھی سکتے ہو۔ تشفی کی مقدار، جو تم کسی چیز سے حاصل کر سکتے ہو صرف اس حقیقت پر منحصر ہے کہ وہ چیز اس وقت تمہارے پاس کتنی مقدار میں موجود ہے۔ یہ چیز تمہارے پاس جتنی مقدار میں موجود ہوگی، اُتنی ہی کم تشفی تم کو اُس کی کسی مزید مقدار یا تعداد سے حاصل ہوگی۔ فرض کرو لڑکوں کی ایک بیس بال (BASE BALL)[٥] کی ٹیم میچ کھیلنے جا رہی ہے لیکن ان کے پاس کوئی بلا نہیں ہے۔ ان کو راہ میں بلا خریدنے کا موقع ملتا ہے۔ کیا وہ اس موقع پر اس کی مطلوبہ قیمت ادا کرنے میں تامل کریں گے؟ نہیں وہ قیمت فوراً ادا کر کے بلا خرید لیں گے۔ لیکن اب فرض کرو ان کے پاس کھیل شروع کرنے کے لئے چار بلے موجود ہیں اور اب پانچواں بلا خریدنے کا موقع آتا ہے۔ کیا وہ اُسی رفتار سے یہ پانچواں بلا خریدنے دوڑیں گے اور اُسی قدر شوق سے اُس کی قیمت ادا کریں گے؟ نہیں، ہرگز نہیں، بلوں کا افادہ مختتم (MARGINAL UTILITY) ان کے لئے اتنا گھٹ چکا ہے کہ شاید اب وہ اس پانچویں بلے کی خریداری کے سوال پر سنجیدگی سے غور کئے بغیر آگے بڑھ جائیں گے۔

اگر کسی چیز کی بہت بڑی مقدار تمہارے پاس موجود ہے تو تم کو اُس چیز کی بہت کم حاجت ہوگی۔ اگر تمہارے پاس کپڑوں کے دس جوڑے ہوں تو تم کو کسی مزید جوڑے کی اُس شخص کے مقابلے میں بہت کم ضرورت ہوگی جو صرف ایک جوڑا رکھتا ہے اور دوسرے جوڑے کے لئے فکرمند ہے۔ جیونس (JEVONS) پانی کی مثال دے کر سمجھاتا ہے:۔

"مثال کے طور پر پانی کو لو۔ شاید ہی کوئی شخص پانی کو بہت زیادہ مفید چیز سمجھتا ہو۔ روزانہ چوتھائی گیلن پانی نہایت پریشان کن حالات میں ایک مرنے والے کی جان بچانے کے لئے بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ ایک دن میں چند گیلن پانی بھی پکانے، ریندھنے اور کپڑوں کے

---

٥ راونڈرز کا سا مگر اُس سے پیچیدہ کھیل جو ممالک متحدہ امریکہ میں رائج ہے۔

دھونے کے لئے اچھی خاصی افادیت اور اہمیت رکھتا ہے لیکن ان تمام ضروریات کے لئے پانی فراہم کرلینے کے بعد پھر اس کی فراہمی کی فکر باقی نہیں رہتی۔ ان تمام صورتوں کو سامنے رکھنے کے بعد ہم کہہ سکتے ہیں کہ پانی کی ایک خاص مقدار انسان کے لئے بہت ضروری ہے لیکن اس خاص مقدار کے بعد پانی کی افادیت کے درجے مختلف ہوتے جائیں گے اور ایک خاص درجے پر پہونچنے کے بعد اُس کی افادیت بالکل ختم ہو جائے گی۔ چیز ایک ہی ہے لیکن ہمارے پاس اُس کی جتنی مقدار ہونی چاہئے اُس کی مناسبت سے ہمارے لئے اُس کی افادیت گھٹتی اور بڑھتی رہتی ہے۔"

افادۂ مختتم (MARGINAL UTILITY) کے نظریے کے ماتحت روٹی اور جواہرات کی قیمتوں کا فرق بھی اچھی طرح سے واضح ہو جاتا ہے۔ پہلی نگاہ میں تم کو خیال ہوگا کہ روٹی جواہرات سے زیادہ قیمتی ہوگی۔ تمہارے نزدیک اس کی وجہ اُس کی غیر معمولی افادیت ہوگی۔ لیکن روٹی اتنی بڑی مقدار میں بازار میں ملتی ہے کہ دو ایک زائد چپاتیاں اُس کی قیمت پر کوئی زیادہ اثر نہیں ڈال سکتیں لیکن جواہرات ان دولت مند لوگوں کے مقابلے میں، جو ان کے لئے لمبی لمبی رقمیں خرچ کر سکتے ہیں، بہت کم ہیں۔ طلب کے مقابلے میں جواہرات کی یہی کمیابی ان کی قیمت بڑھا دیتی ہے۔

یہ دلیل بھی بیان کی جاتی ہے کہ کسی چیز کی افادیت اُس کی قیمت سے مطابقت نہیں رکھتی ہے ورنہ لوہے کی قیمت اپنی افادیت کے لحاظ سے سونے سے کہیں زیادہ ہوتی۔ یہ دلیل ایک پوری جنس کی اہمیت کو اُس کے کسی جزو کی قیمت سے (جو اُس جنس سے علیحدہ کرکے بیچا گیا ہے) اُلجھا کر پورے مسئلہ کو پریشان کن حد تک خبط کر دیتی ہے۔ وہ مقاصد جن کی تکمیل میں کوئی مفید چیز کام آتی ہے مجموعی طور پر زیرِ غور لائے جاتے ہیں۔ کیرنس (CAIRNES) کہتا ہے کہ:-

"دنیا سونے کے بغیر اچھی طرح زندگی گذار سکتی ہے لیکن لوہے کے بغیر اُس کا کام نہیں چل سکتا۔"

اس قول سے اُس کی مراد یہ ہے کہ دنیا سونے کی کسی مقدار کے بغیر کام چلا سکتی ہے لیکن لوہے کی کسی مقدار کے بغیر گذر نہیں کر سکتی لیکن اگر ہم اس سے لوہے یا سونے کی پوری مقدار مراد لیتے ہیں تو ہم کو

ان کی قیمتوں کا اندازہ بھی اسی مناسبت سے کرنا چاہئے اگر ہم اس طرح غور کریں تو افادیت اور قیمت میں جو مفروضہ نامطابقت نظر آتی ہے وہ خود بخود دور ہو جائے گی۔ اگر دنیا کو اختیار دیا جائے کہ وہ پوری دنیا کے پورے لوہے کو ایک ڈھیر میں خریدلے یا پوری دنیا کے سونے کو ایک ڈھیر میں لے لے، تو یقیناً آخری بولی لوہے کے حق میں ختم ہوگی اور پوری دنیا کے پورے لوہے کی قیمت پوری دنیا کے سارے سونے سے زیادہ ٹھہرے گی۔

ایک پوری جنس اور ایک جنس کے کسی جزو کی قیمت کے تقابل میں جو الجھاؤ پیدا ہوتا ہے وہ کوئلے اور جواہرات کے تقابل میں کچھ زیادہ نمایاں ہو جاتا ہے۔ ایک چیز کا مقابلہ اسی قسم کی ایک چیز سے ہونا چاہئے۔ کوئی شبہ نہیں کوئلے کی مکمل جنس جواہرات کی پوری جنس کے مقابلے میں زیادہ مفید ہی نہیں ہے بلکہ زیادہ قیمتی بھی ہے۔

قیمتوں کے متعلق ماہرین اقتصادیات نے جو بھی تعلیم دی ہو قیمت کے مختلف نظریات پر ان کے جو بھی مباحث اور اختلافات رہے ہوں۔ کوئی بھی نظریہ وقتی طور پر صحیح ثابت ہوا ہو اور کسی نظریہ کا کھوکھلا پن منظر عام پر آگیا ہو۔ بہر حال سرمایہ دار نے یہ اچھی طرح محسوس کر لیا تھا کہ وہ جو چیزیں پیدا کر کے بازار میں لا سکتا ہے وہ اُن کی قیمتوں پر بھی قابو رکھ سکتا ہے۔ کسی چیز کی پیداوار پر اگر کم وقت صرف ہوتا تو اُس کی قیمت کم ہو سکتی تھی۔ اگر وہ چیز بہت بڑی مقدار میں پیدا کی جاتی تب بھی اُس کا افادہ مختتم کم ہو جانے کی وجہ سے اُس کی قیمت گر سکتی تھی لیکن اس میں کوئی شبہ نہیں اگر رسد کی خوش تدبیری سے تنظیم کی جاتی تو قیمتوں کی تقرر کا اختیار سرمایہ دار ہی کے ہاتھ میں رہتا اور قیمتوں کی تعین کے اختیار ہی پر نفع کی کمی بیشی منحصر تھی۔

اگر پانچ ہزار چیزیں فی چیز دس ڈالر کے صرف سے تیار کی جائیں اور گیارہ ڈالر فی شے کے حساب سے فروخت کی جائیں تو پانچ ہزار ڈالر نفع ہوتا۔ نفع کی رقم اُس سرمایہ پر، جو ان اشیاء کی تیاری میں لگایا گیا تھا دس فی صدی ہوتی۔ اگر پانچ ہزار کے بجائے یہ چیزیں صرف چار ہزار کی تعداد میں تیار کی جائیں تو ان پر فی چیز ۵ء۱۰ ڈالر کے حساب سے لاگت بیٹھتی، اور اگر اُن کی قیمت فی چیز

۱۲/۵۰ کے حساب سے مقرر کی جاتی تو نفع کی رقم بڑھ کر آٹھ ہزار ڈالر ہو جاتی۔ یہ نفع اُس سرمایہ کا، جو اُس چیز کی تیاری پر صرف ہوتا، اُنیس فی صدی ہوتا۔ جو کمپنی رسد پر قابو رکھ سکتی ہے، وہ اُس کی قیمت پر بھی قابو کر سکتی ہے اور اس طرح زیادہ سے زیادہ نفع کما سکتی ہے۔ وہ اشیا کی پیداوار میں اضافہ اس لئے نہیں کرے گی کہ لوگوں کی بہت بڑی تعداد کی طلب کو نسبتہً کم قیمت پر پورا کر سکے۔ وہ ایسا اُسی وقت کرے گی جب اُس کو پیداوار بڑھانے میں زیادہ نفع کی توقع ہو گی۔

اگر یہی اشیا چار اور پانچ ہزار کے بجائے دس ہزار کی تعداد میں تیار کرائی جائیں تو تکثیر پیداوار کی بنا بران پر فی شے سات ڈالر کی لاگت بھی آسکتی ہے اور بازار میں آٹھ ڈالر فی شے کے حساب سے ان کی کھپت بھی ہو سکتی ہے لیکن اس صورت میں کمپنی کو چودہ فیصدی سے زیادہ نفع نہ ہوگا۔

تم کو یاد ہوگا کہ ڈچ تاجروں نے سولھویں صدی عیسوی میں مسالوں کی پیداوار صرف اس لئے گھٹا دی تھی کہ اِن کی قیمتیں بڑھائی جا سکیں۔ پُرانی اجارہ داریاں ختم ہو چکیں لیکن ہم آگے چل کر دیکھیں گے کہ جب یہ کھٹکا محسوس ہوا کہ نفع کی شرح بہت گر جائے گی۔ ان پُرانی اجارہ داریوں سے کہیں بڑی طاقتور اور عالمگیر اجارہ داریاں وجود میں آگئیں۔

انگلستان کے انگریز مالکانِ صنعت نے صنعتی انقلاب کی ابتدا میں بڑا نفع کما لیا تھا، انیسویں صدی عیسوی کے پہلے حصے میں انگلستان کو اپنی مصنوعات کے لئے بازار ڈھونڈنے کی ضرورت نہ تھی اس کو تو بڑی سے بڑی مقدار میں زیادہ سے زیادہ سامان تیار کرنے کی فکر تھی تاکہ پوری دنیا کی طلب پوری کر سکے لیکن انیسویں صدی عیسوی کے ربع آخر میں صورت حال بدلنے لگی اور بڑے اہم انقلابات سر اُٹھانے لگے۔ انگلستان کا آزاد تجارت کا نظریہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں قدم نہ جما سکا۔ وہاں انیسویں صدی کی ابتدا ہی سے "حفاظتی محصول" راستہ روکے ہوئے کھڑے تھے۔ "خانہ جنگی" کے بعد حفاظتی محصولوں کی یہ دیواریں کچھ اور اونچی کر دی گئیں۔ روس میں ۱۸۷۷ء سے اس قسم کے محصول چلے آرہے تھے۔ جرمنی نے ۱۸۷۹ء میں اور فرانس نے ۱۸۸۱ء میں یہ محصول اپنے یہاں بھی عائد کر دیئے۔ اب انگلستان کے پاس کوئی صاف اور کھلا ہوا بازار نہ تھا۔ اب اُس کو اپنا مال

ان ملکوں تک پہونچانے کے لئے ان دیواروں کو پھاندنا پڑتا تھا۔ جو ممالک انگلستان کے مال کے سب سے اچھے گاہک تھے اب ان کو انگریزی مال منگانے اور خریدنے کی ضرورت نہ رہی تھی۔ اب وہ اپنی ضرورت کی چیزیں اپنے یہاں تیار کرنے لگے تھے۔ ان حفاظتی محصولوں کی اونچی دیواروں کے پیچھے چھوٹی چھوٹی ملکی صنعتیں بڑے زبردست کارخانوں کی شکلیں اختیار کر رہی تھیں۔

۱۸۷۰ء کے بعد ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں ٹرسٹوں (TRUSTS) اور جرمنی میں کارٹلوں (CARTELS) کا دور رہا۔ تجارتی مقابلے (COMPETITIONS) کو اجارہ داری نے بے دخل کر دیا۔ چھوٹے آدمیوں کو بڑے آدمیوں نے کاروبار کے حلقے سے باہر نکال دیا۔ چھوٹی تجارت یا تو بڑی تجارت کے عظیم الشان پہیے کے نیچے کچل کر اپنی موت آپ مر گئی یا بڑی تجارتوں میں شامل ہو کر بہت بڑی تجارت میں گم ہو گئی۔ ہر جگہ اب ترقی کے جلوے تھے۔ سرمایہ سمٹ سمٹ کر بڑے بڑے کارخانوں کی شکل میں جنم پا رہا تھا۔ اور عظیم الشان صنعتی مرکز اپنی اجارہ داری کا پنجہ بازاروں کی طرف بڑھا رہے تھے۔

مقابلے کے بازار پر اجارہ داری کا یہ تدریجی قبضہ کسی بیرونی طاقت کی مداخلت کی وجہ سے نہیں تھا بلکہ خود مقابلے نے اپنی انتہا کو پہونچ کر یہ شکل اختیار کر لی تھی۔ یہ اجارہ داری کہیں باہر سے نہیں آئی تھی بلکہ مقابلہ ہی اس کو جنم دینے کا باعث ہوا تھا۔ ہر نظام اپنی ہیئت کی تبدیلی کے جراثیم اپنے اندر ہی پوشیدہ رکھتا ہے۔ مقابلے کا اجارہ داری کی شکل اختیار کرنا اس صداقت کا ایک بڑا واضح ثبوت ہے۔ اجارہ کوئی بیرونی حملہ آور نہ تھا جس نے باہر سے حملہ کر کے مقابلے کا میدان مار لیا ہو۔ یہ مقابلے کے قدرتی ارتقا کا لازمی نتیجہ تھا۔

اُمو کی خانہ جنگی کے بعد نقل وحمل اور رسل ورسائل کے ذرائع میں جو انقلاب ہوا تھا اس کی داستان سے تم خوب واقف ہو۔ زیادہ اور اچھی ریلیں وجود میں آگئیں۔ بڑے اور اچھے دخانی جہازوں نے دریاؤں اور سمندروں میں اِدھر اور اُدھر گشت لگانا شروع کر دیا۔ تار برقی کے نظام نے ترقی پائی اور اس سے استفادہ ہر طرف عام ہو گیا نقل وحمل اور رسل ورسائل کے ذرائع

کی وسعت، باقاعدگی اور ارزانی سے یہ اچھی طرح ممکن ہو گیا کہ پیداوار کی ضروریات کسی ایک جگہ لاکر اکٹھا کر دی جائیں صنعت و حرفت کے فن کی بڑھتی ہوئی رفتار سے اور نئی اور کامیاب مشینوں کے رجسٹریشن سے، جو آئے دن ہوتا رہتا تھا، کثیر پیداوار اور تقسیم کار کے امکانات بہت بڑھ گئے اب بڑے پیمانے پر پیداوار کا زمانہ آگیا اور یہ ممکن ہو گیا کہ پیداوار بڑھا کر مصنوعات کی لاگت میں کمی کر لی جائے اور اس طرح اب اس کے امکانات پیدا ہو گئے کہ مشترک سرمایہ رکھنے والی کمپنیاں مقابلے کے میدان میں اتریں اور لڑائی جیت کر میدان پر قبضہ کر لیں۔

جو کچھ ممکن تھا وہ کیا گیا۔

تجارت بھی ایک لڑائی ہے کسی شخص سے جو تجارت کر رہا ہو۔ یہ حقیقت پوچھو۔ لڑائی کے کھیلوں کے متعلق ایک کہاوت عام طور سے کہی جاتی ہے کہ "ایک بہت بڑا آدمی ایک بہت چھوٹے آدمی کو چاٹ کر ختم کر دے گا" تجارت کے کھیل میں یہ حقیقت بالکل صحیح ثابت ہوتی ہے۔ دو کمپنیاں ایک خاص تجارت میں ایک دوسرے کا مقابلہ کرتی ہیں۔ ایک کمپنی دوسری کمپنی کو نقصان پہونچانے کی نیت سے اپنی مصنوعات کی قیمت گرا دیتی ہے۔ دوسری کمپنی پہلی کمپنی کے حملے کا جواب دینے کے لئے اپنی قیمتیں اس سے بھی زیادہ کم کر دیتی ہے، یہ مقابلہ چلتا رہتا ہے۔ اس مقابلے میں قیمتیں برابر گرتی رہتی ہیں اور رفتہ رفتہ لاگت کی سطح سے بھی نیچے آجاتی ہیں۔ اب میدان کس کے ہاتھ رہے گا؟ نتیجہ ظاہر ہے جس قدر پیداوار زیادہ ہوگی اُسی قدر لاگت بھی کم بیٹھے گی۔ اس کا یہ مطلب ہوا کہ ان دونوں کمپنیوں میں جس کے پاس سرمایہ زیادہ ہے وہ مقابلے کی ابتدا ہی سے بڑی حد تک محفوظ ہے لیکن "قدم جمانے کی طاقت" اس مقابلے میں اصل چیز ہے۔ لیکن یہ بھی اُسی شخص کے پاس، جو کافی محفوظ سرمایہ رکھتا ہے، زیادہ ہوتی ہے یہی سرمایہ یہ فیصلہ کرتا ہے کہ کوئی کب تک مقابلے کے میدان میں ڈٹا رہ سکے گا۔ وہ مضبوط آدمی جو زیادہ سرمایے کا مالک ہے "بڑا آدمی" ہے۔ قیمتوں کی کمی اُس کو پریشان ضرور کر دیتی ہے لیکن "چھوٹا آدمی" بالکل کھوکھلا ہو جاتا ہے اور مقابلے کے ختم ہونے سے پہلے ہی پوری طرح ہار مان لیتا ہے مارکس نے غالباً کبھی مکہ بازی کا انعامی مقابلہ نہیں دیکھا تھا لیکن وہ تجارتی مقابلوں میں چھوٹے اور

بڑے سرمایوں کا دائمی ٹکراؤ بارہا دیکھ چکا تھا۔ وہ اس کشاکش کی داستان یوں بیان کرتا ہے:۔

"مقابلے (COMPETITIONS) کی لڑائی چیزوں کی قیمتیں کم کرکے لڑی جاتی ہے قیمتوں کی کمی محنت کی قوت پیدائش اور پیداوار کی مقدار پر منحصر ہے۔ اس لئے بڑا سرمایہ چھوٹے سرمایے کو شکست دے دیتا ہے اور یہ مقابلہ ہمیشہ چھوٹے سرمایہ داروں کی مکمل تباہی کی شکل میں ختم ہوتا ہے۔ ان تباہ ہونے والے چھوٹے سرمایہ داروں کا کچھ سرمایہ تو جیتنے والے بڑے سرمایہ دار کے قبضے میں چلا جاتا ہے اور کچھ برباد ہوکر غائب ہو جاتا ہے۔"

آخری جملہ بتاتا ہے کہ معمولی مکہ بازی کے مقابلے اور تجارت کے تجارت سے ٹکراؤ میں بڑا فرق ہے معمولی مکہ بازی کے مقابلے میں ہارنے والا مار کر گرا دیا جاتا ہے اور جیتنے والا یہ مقابلہ چھوڑ کر دوسرے زیادہ نفع بخش مقابلے کی تلاش میں چلا جاتا ہے۔ اس تجارتی مقابلے میں بھی جیتنے والا یہی کرتا ہے لیکن مقابلہ جیتنے سے پہلے یہ ایک آدم خور کی طرح اکثر اپنے مقابل کا خون بھی چوستا ہے اور اُسے پوری طرح ہڑپ کرکے پہلے سے بھی زیادہ موٹا ہو کر ہر سامنے آنے والے کے مقابلے کے لئے آگے بڑھتا ہے وہ جتنا موٹا ہوتا جاتا ہے اُس کو شکست دینا اُسی قدر دشوار ہوتا جاتا ہے۔ دوسرے لڑنے والے مقابلے کے لئے سامنے آتے ہیں لیکن شکست کھاتے ہیں اور "موٹا آدمی" ان کا خون بھی منھ بھر بھر پی جاتا ہے۔ کوئی شخص اُس کے مقابلے کی ہمت نہیں کرتا۔ کم سے کم ایک خاص وقت تک اس کی خدائی کا بازار گرم رہتا ہے۔

ان آزاد مقابلوں نے آگے بڑھ کر ٹرسٹوں کی شکل اختیار کرلی کبھی کبھی ان مقابلوں میں ایمانداری کا خیال رکھا جاتا تھا لیکن عام طور پر ناجائز حربوں کا استعمال بُرا نہیں سمجھا جاتا تھا (تجارتی دنیا کے نقطہ نظر سے بھی جس نے تجارت کی گرم بازاری میں ناجائز حربوں کا استعمال خوب سیکھ لیا تھا، یہ طریقہ موجب ملامت نہ تھا) مقابلہ جائز طریقوں سے ہوتا یا اُس میں ناجائز حربے استعمال ہوتے بہت سخت ہوتا تھا۔ وہ لوگ جو اس تجارتی مقابلے میں ہارتے تھے اکثر بالکل تباہ ہو جاتے تھے اور دوبارہ اپنے پیروں پر کھڑے ہوکر پھر جمنے کی ہمت نہیں کرسکتے تھے کبھی کبھی وہ دماغی توازن

کھو بیٹھتے تھے اور کبھی کبھی جان دے کر اپنی تباہی کے بھیانک احساس سے نجات حاصل کرتے تھے۔

اس فن کے ماہر جان ڈی راک فلر نے، جو سب سے بڑے ٹرسٹ کے بانی کا بیٹا ہے، ان خوفناک نتائج کو، ان کامیابیوں کے مقابلے میں، جو حاصل ہوتی ہیں، ہیچ خیال کیا ہے۔ اُس نے براؤن یونیورسٹی کے لڑکوں کے سامنے "ٹرسٹوں" کے موضوع پر تقریر کرتے ہوئے کہا:۔

"امریکہ کے گلہائے حسن وجمال کو اُن کے کمالِ شباب تک پہونچانے کے لئے ان کلیوں کا خون کرنا ہوگا، جو اُن کے چاروں طرف نکل آتی ہیں۔"

ان ٹرسٹوں کے تختۂ گل پر کمال حسن کا سب سے پہلا گلاب تیل کی شکل میں نظر آیا۔ ۱۹۰۴ء میں اسٹینڈرڈ آئل کمپنی نے ملک کے چھیاسی فی صدی صاف کئے ہوئے روشنی کرنے والے تیل پر قابو حاصل کیا۔ جو تیل کے میدان میں پیش آیا، وہی لوہے، شکر، شراب، کوئلے اور دوسری پیداواروں کے شعبوں میں بھی ہوا۔ ہر طرف ٹرسٹ قائم ہوئے اور انھوں نے اجارہ داری نظام قائم کرکے مقابلے کی ہماہمی ختم کردی۔

یہ ٹرسٹ بہت عظیم الشان اور زبردست تھے۔ ان کی کارکردگی اور طاقت کی بھی کوئی انتہا نہ تھی۔ انھوں نے پیداوار کی لاگت بھی کم کی، اور انتظامی عملے کے مصارف بھی بہت گھٹا دئے انھوں نے ان مقابلوں کے ختم کرنے میں، جو بڑے نقصانات کے موجب ہوتے تھے، جو کچھ بن پڑا سب کچھ کیا، انھوں نے اشیار کی پیداوار پر بھی قابو کیا تاکہ برآمدی مال کی مقدار اور اُس کی قیمت کا تعین اُن کے اختیار سے باہر نہ ہونے پائے۔ انھوں نے پیداوار کی مقدار اور اُس کی قیمت جیسا موقع ہوا زیادہ نفع حاصل کرنے کے لئے گھٹائی بڑھائی۔ ان کو تحریک ٹرسٹ کے متعلق تحقیقات کرنے والوں کی رائے کے بموجب زیادہ سے زیادہ نفع کمانے کی فکر تھی:۔

"ٹرسٹ نام ہے صنعتی تنظیم کی شکل کا جو تجارتی اشیا کی پیداوار یا اُس کی تقسیم سے تعلق رکھتی ہے۔ یہ تنظیم اُس تجارتی چیز کی رسد پر کافی قابو رکھتی ہے تاکہ وہ اس قابل رہے کہ اس چیز کی قیمت اپنے مفاد کا پورا لحاظ کرکے مقرر کرتی رہے۔"

ٹرسٹ اس قابل ہوتا تھا کہ اشیاء کی قیمتوں میں اپنے مفاد کے لحاظ سے تغیر و تبدل کرتا رہے اس قسم کے دوسرے منظم ادارے بھی بڑے پیمانے پر قائم کیے گئے تھے۔ ٹرسٹ کا رواج امریکہ میں ہوا مشترک سرمائے (POOLS) تجارتی جتھے (COMBINES) انجمنیں (ASSOCIATIONS) اور بھاؤ سبھائیں (CARTEL) بھی جو اجارہ داری کی مختلف شکلیں تھیں امریکہ اور دوسرے ممالک میں عام ہوگئیں۔ بھاؤ سبھاؤں (CARTELS) کا رواج جرمنی میں بہت تھا۔ "کارٹل" سے ایک ایسی انجمن مراد تھی جس میں بہت سے تاجر، جو ایک ہی طرح کی اشیاء کی تجارت کرتے تھے، ایک معاہدے کے ماتحت شامل ہوتے تھے۔ وہ اپنے کاروبار کے معاملے میں اپنی جگہ پر بالکل آزاد اور خودمختار رہتے تھے اور آپس میں متحد ہوکر بازار کے اوپر اپنا اجارہ دارانہ اقتدار قائم کرلیتے تھے۔ اس کا تو یہی مطلب ہوا کہ بڑے بڑے پیدا کرنے والے قیمتیں کم کرکے آپس میں ایک دوسرے کا آخری حد تک مقابلہ کرنے کے بجائے ایک کمپنی میں شامل ہوجاتے تھے۔ وہ علیحدہ علیحدہ اپنا مستقل وجود رکھتے تھے لیکن ایک دوسرے سے مقابلہ نہیں کرتے تھے بلکہ وہ بازار کے بٹوارے اور قیمتوں کے بارے میں اتفاق کرلیتے تھے۔

روہر کول کارٹل (RUHR COAL CARTEL) کی خاص مثال سے یہ پتہ چلتا ہے کہ کارٹل کی تشکیل کس طرح عمل میں آتی تھی:-

"ایک مرکزی سنڈیکیٹ، جس کے سپرد پیداوار کی فروخت کا کام ہوتا تھا قائم کیا جاتا تھا مستقل بالذات کمپنیاں اس کی حصہ دار ہوتی تھیں۔ یہی سنڈیکیٹ کوئلے کی فروخت کے لئے سول ایجنٹ کی حیثیت سے کام کرتا تھا۔ یہ کوئلے کی مختلف کمپنیوں سے اعداد و شمار طلب کرتا تھا اور ایک انتظامیہ جماعت کی تشکیل کرکے اور قیمتوں کا ایک یکساں معیار قائم کرکے کوئلے کی فروخت اور قیمتوں کی ادائگی کا خاص بند و بست کرتا تھا۔ کوئلے کی کانوں کے مالک اپنا تمام کوئلہ سنڈیکیٹ کے ہاتھ فروخت کرتے تھے ——— سنڈیکیٹ معاہدوں کی خلاف ورزی کے لئے جرمانے عائد کرتا اور ایک عام پالیسی کا نفاذ کرتا تھا

بھی سنڈیکیٹ ایک کمیشن کا بھی تقرر کرتا تھا جو یہ طے کرتا تھا کہ ہر کان مجموعی طور پر کتنی پیداوار برآمد کرے گی۔ یہ کمیشن قیمت فروخت کی کم سے کم شرح مقرر کردیتا تھا۔ وہ اضلاع جہاں مقابلہ جاری ہوتا تھا یہی شرح قائم رہتی تھی لیکن جہاں مقابلہ نہیں ہوتا تھا وہاں اس کی قیمت طلب، رسد اور پیداوار کے تقاضے کے بموجب اس قیمت سے گھٹتی بڑھتی رہتی تھی۔"

انگلستان میں بھی مختلف جماعتوں سے مقابلہ کرنے کے لئے انجمنیں قائم کرنے کا رجحان موجود تھا تاکہ آپس میں جو کشاکش جاری رہتی تھی اُس کا خاتمہ کیا جاسکتا۔ ٹرسٹ کمیٹی کے سامنے گواہوں نے اپنی داستان یوں بیان کی:۔

ہماری انجمن تجارت کی تنظیم کی غرض سے قائم کی گئی ہے تاکہ کاروبار کو غیر ضروری مقابلے سے بچایا جاسکے ——— ہماری انجمن کے قیام کی غرض یہ تھی کہ قیمتوں کے بارے میں آپس میں کوئی سمجھوتہ کیا جاسکے اور قیمتوں کی اُس غیر معمولی کمی سے نجات حاصل کی جاسکے جو انجمن کے قیام سے پہلے اکثر اِس حد تک پہونچ جاتی تھی کہ بہت سے کارخانوں کو کوئی نفع ہی نہ ہوتا تھا اور اگر ہوتا بھی تھا تو بہت ہی کم ——— مقابلے بہت ہی سخت ہوتے تھے اور کسی کاروباری آدمی کے لئے یہ ممکن نہیں رہا تھا کہ تجارت سے کوئی نفع کما سکے۔ کارخانہ دار ضرورت سے زیادہ پیدا کر رہے تھے، ان کو ایک دوسرے کی گردن کاٹنے کے سوا اور کوئی فکر نہ تھی۔"

ان گواہوں کے بیانات اچھی طرح سننے کے بعد کمیٹی اس اہم نتیجے پر پہونچی تھی کہ:۔

"آج کل (۱۹۱۹ء) دولت متحدہ میں قریب قریب صنعت کی ہر شاخ میں انجمنیں بنانے اور متحدہ ادارے قائم کرنے کا رجحان بڑھ رہا ہے۔ ان انجمنوں اور اداروں کا اس کے سوا اور کوئی مقصد نہیں کہ تجارتی مقابلے پر پابندی عاید کرکے قیمتوں پر قابو کیا جائے۔"

آخری سطر میں داستان "مقابلے پر پابندی اور قیمتوں پر قابو" مکمل ہوگئی ہے۔ یہ عمل جو اس وقت رواج پا رہا تھا۔ کلاسکی معاشین کے نظریات سے بہت مختلف تھا۔ ان کا خیال تھا کہ پیدا کرنے والوں اور بیچنے والوں کا اپنی جماعتوں سے باہمی مقابلہ اشیا کی قیمتوں کو ایک معقول حد تک کم کردے گا اور یہ قیمتیں پیداوار کی لاگت سے مناسبت رکھیں گی (اس مناسب قیمت میں معقول نفع بھی شامل ہوگا)

اس نظریئے کے ماننے والوں کا خیال تھا کہ جب ہر آدمی صرف اپنا ذاتی نفع بڑھانے کی فکر میں لگا رہے گا تو چیزوں کی قیمتیں بھی طلب کی مناسبت سے ایک مناسب سطح پر آجائیں گی۔

اجارہ داری کے ارتقا نے طلب اور رسد کے درمیان قدرتی مطابقت کا دروازہ بند کر دیا۔ اب طلب اور رسد میں مطابقت پیدا کرائی جاتی تھی، اب کھلے ہوئے بازار میں آزاد مقابلوں کے ذریعہ سے قیمتوں کا تقرر خود بخود نہیں ہوتا تھا۔ اب بازار آزاد نہ تھے۔ اب قیمتیں مقرر کی جاتی تھیں

صنعتی اجارہ داری کے علاوہ دوسری اجارہ داری بھی وجود میں آگئی تھی، یہ اگر اُس سے زیادہ اہم نہ تھی تو اُس سے کم بھی نہ تھی۔ یہ بنکوں کی اجارہ داری تھی۔ مارکس کی پیش بیں نگاہوں نے اس کا اندازہ کرلیا تھا، اُس نے کہا تھا کہ بڑے پیمانے پر:-

"صنعتی پیداوار کے ساتھ ساتھ قرض کے لین دین کا نظام ایک نئے حامل کی حیثیت سے وجود میں آگیا ہے تجارتی مقابلے کے میدان میں یہ بڑا زبردست اور نیا ہتھیار ہے۔ یہ اپنے غیر مرئی جال سے، سماج کی اوپری سطح میں، چھوٹی اور بڑی عوامی جماعتوں کے پاس جو کچھ تھوڑا بہت سرمایہ پھیلا پڑا ہے اُسے گھسیٹ کر افراد یا ان انجمنوں کے ہاتھوں میں جنھیں چند سرمایہ داروں نے مل کر قائم کیا ہے دیدیتا ہے۔ یہ نظام ایک خاص مشین ہے جو سرمایوں کو ایک مرکز پر لاکر اکٹھا کرنے کا کام کرتی ہے۔"

صنعتی کاروبار زیادہ تر قرض سے چلتے تھے۔ اس لئے جو لوگ ان کو مالی مدد دیتے تھے، اور جو لین دین کے اس نظام پر قابض تھے، اقتدارِ اعلیٰ بھی انھیں کے ہاتھوں میں تھا جب چھوٹے یا بڑے صنعتی کارخانہ کے مالکوں کو، وہ اجارہ دار ہوتے یا نہ ہوتے، اپنے کاروبار کی توسیع کے لئے سرمایے کی ضرورت ہوتی تھی تو ان کو انھیں بینکروں کے سامنے دستِ سوال دراز کرنا پڑتا تھا جب لوگوں کی کوئی خاص جماعت کوئی کاروبار شروع کرنا چاہتی تھی اور روپیہ اکٹھا کرنے کے لئے اپنا ذخیرہ فروخت کرنے کا ارادہ کرتی تھی تو اُس کو بھی انھیں بینکروں کی خوشامد کرنی پڑتی تھی۔ ان بینکروں کے فرائض میں یہ بھی داخل تھا کہ اسٹاک کی نکاسی کی تدابیر اختیار کریں۔

روپے کی ہر جگہ ضرورت تھی اور قوم کا روپیہ یا تو بینکروں کے تہہ خانوں میں جمع تھا یا ان جگہوں میں تھا جہاں ان کے سوا کسی دوسرے کی رسائی نہ ہوتی تھی۔

یہ بینکر روپے کی جتنی بڑی مقدار پر قابو حاصل کر سکتے۔ ان کا اقتدار اتنا ہی زیادہ بڑھ جاتا تھا ہر بڑے صنعتی ملک میں تولیت زر کے مرکز (MONEY TRUST) قائم ہوئے صنعتی اجارہ داری کا زمانہ بینکوں کی اجارہ داری کا دور بھی ہے۔ یہ حقیقت کم سے کم ۱۹۱۱ء میں نیو جرسی کے گورنر ووڈرو ولسن (WOOD-ROW WILSON) کے اس بیان سے ثابت ہو جاتی ہے:-

"اس ملک میں روپے کی اجارہ داری سب سے بڑی اجارہ داری ہے۔ جب تک یہ باقی ہے ہماری پرانی تنوع پسندی، آزادی اور ترقی کی انفرادی قوتیں سب بیکار ہیں۔ ایک بڑی صنعتی قوم پر اس کے لین دین کا نظام (SYSTEM OF CREDIT) حاوی ہو جاتا ہے ہمارے لین دین کا نظام چند لوگوں کے ہاتھوں میں مرکوز ہے۔ اس لئے ہمارے تمام اعمال اور ہماری تمام تحریکیں انھیں چند انے گنے لوگوں کی مرضی کی پابند ہیں"

اکثر یہ بھی ہوا ہے کہ یہی انے گنے چند بینکر صنعتی اجاروں کے صدر الصدور بھی ہوئے ہیں۔ ان اجاروں میں ڈائرکٹروں کی باہمی اتصال پیدا کرانے والی ایسی جماعتیں ہوتی تھیں جو یہاں جتنی دنیا کے بڑے بڑے آدمیوں کو بڑے بڑے ٹرسٹوں اور عظیم الشان کارپوریشنوں کے بورڈ آف ڈائرکٹرس میں شامل کرتی تھیں۔ ان ٹرسٹوں اور کارپوریشنوں سے ان کی دلچسپی بھی ہوتی تھی۔ اس دلچسپی کا مطلب صرف یہی تھا کہ ان بینکوں نے ان ٹرسٹوں اور کارپوریشنوں میں بڑی زبردست رقمیں لگا رکھی تھیں۔

لیکن یہ بینکر ان اداروں سے کچھ زیادہ قریبی تعلق نہیں رکھتے تھے۔ یہ بات کچھ کم نہ تھی کہ وہ خزانے کے دہانے پر قابض تھے اور صنعتی فرموں کو ہر وقت اپنی پالیسی کا پابند بنا سکتے تھے۔ یہ حقیقت اس خط سے اچھی طرح ثابت ہو جاتی ہے۔ جو برلن کے "چار بڑے بینکوں" نے ۱۹۰۱ء میں "جرمن سیمنٹ سنڈیکیٹ" کے ڈائرکٹروں کو لکھا تھا۔ اس خط میں آیا ہے کہ:-

"ہم کو معلوم ہوا ہے کہ آپ کی کمپنی کا آئندہ ہونے والا جلسۂ عام کوئی ایسا قدم اُٹھانے والا ہے جس سے آپ کی ذمہ داریوں میں، ایسے تغیرات کا امکان ہے، جنھیں ہم پسند نہ کرسکیں گے ہمیں بہت افسوس ہے کہ اس وجہ سے ہم قرض کی رقم، جو ہم نے آپ کے لئے منظور کی ہے واپس لینے پر مجبور رہوں گے۔ اگر آپ کا جلسۂ عام کوئی ایسی بات جو ہمارے لئے قابل تسلیم نہ ہو منظور نہ کرے اور ہمیں اس سلسلے میں اطمینان بھی دلا دیا جائے کہ آئندہ بھی ایسا نہ ہوگا تو ہم کو آپ سے نئے قرضوں کے بارے میں بھی بات چیت شروع کرنے میں کوئی تامل نہ ہوگا"

جب مہاجن اتنے بڑے سنڈیکیٹ کی لگام دفعتہً کھینچ سکتے ہیں تو خیال کرنے کی بات ہے کہ صنعتی دنیا کے چھوٹے چھوٹے کاروباروں پر ان کے اثر و اقتدار کا کیا عالم رہا ہوگا۔

سپریم کورٹ کے جج جسٹس لوئی ڈی برینڈس (LOUIS D. BRANDEIS) نے ۱۹۱۲ء میں اپنی کتاب "دوسرے لوگوں کا روپیہ" (OTHER PEOPLE'S MONEY) میں اس صورتِ حال کا نقشہ بڑی قابلیت سے کھینچا ہے:-

"ہماری چندسری مالی حکومت میں وہ بینکر، جو کاروبار میں اپنا روپیہ لگانے کے لئے دیتے ہیں بڑی موثر شخصیت رکھتے ہیں، بینک، ٹرسٹ اور بیمہ کمپنیاں اُن کی مقصد براری کا آلہ ہیں۔ ریلیں، ملازمتیں اور مشترک سرمایہ سے قائم کی ہوئی انجمنیں اُن کی رعایا کی حیثیت رکھتی ہیں، یہ بینکر، جو درحقیقت صرف دلّال ہیں، امریکہ کی کاروباری دنیا پر، مالکانہ شان سے قبضہ کئے ہوئے ہیں۔ ان کے اثر و اقتدار اور ہمہ گیری کا یہ عالم ہے کہ عملی طور پر کوئی بڑی مہم ان کی شرکت یا منظوری کے بغیر کامیابی سے شروع نہیں کی جاسکتی۔ یہ بینکر درحقیقت بڑے قابل لوگ ہیں اور بڑی دولت کے مالک ہیں لیکن تجارت پر ان کا اقتدار ان کی قابلیت اور دولت کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ اُس کی بنیاد اُس جتھا بندی پر ہے جس نے دولت کی وسعتیں اور اُس کی ہمہ گیری ان کے ہاتھوں میں مرکوز کر دی ہے۔"

سنہ ۱۸۷۰ء کے بعد پُرانے طرز کی سرمایہ داری نے پُرانا چولا بدل کر نئے طرز کی سرمایہ داری

کا لباس پہن لیا۔ آزاد مقابلے کی سرمایہ داری اجارہ دارانہ سرمایہ داری بن گئی۔ یہ انقلاب بہت اہم اور بڑے زبردست تغیرات کا موجب ہوا۔

اجارہ دار صنعتیں بڑے پیمانے پر شروع کی گئیں اور ان کے ساتھ پیدا کرنے والی طاقتوں میں بھی بڑی زبردست ترقی ہوئی۔ اس سے پہلے اس قسم کے تجربے انسانی مشاہدے میں نہیں آئے تھے۔ صنعت گروں کی قوت پیدائش جس رفتار سے بڑھی استعمال کرنے والوں کی قوت استعمال اُس رفتار سے نہیں بڑھ سکی۔ بلا شبہ نفع کی ایک خاص مقدار ادا کر کے چیزیں استعمال کی جا سکتی ہیں لیکن نفع کی اُس مقدار سے زیادہ ادا کرنا عوام کے بس میں نہیں ہے۔ وہ چیزیں تو زیادہ استعمال کر سکتے ہیں لیکن ان کے زیادہ دام ادا کرنا ان کی طاقت سے باہر ہے۔

یہ اجارہ دار اپنے ملک میں طلب کے تقاضوں کے بموجب رسد پر قابو کر سکتے تھے، انھوں نے ایسا کیا بھی۔ یہ ایک معقول تجارت تھی۔ اس میں انھوں نے بڑا نفع بھی کمایا لیکن اس صورت میں انکی پیدا کرنے والی مشینوں کا ایک حصہ بیکار رہتا تھا۔ یہ صورتِ حال صنعت کے نگرانوں کے لئے بڑے دردِ سر کا موجب ہوتی تھی۔ وہ صرف یہی نہیں چاہتے تھے کہ اپنے ملک میں فروخت کرنے کے لئے کافی چیزیں تیار کریں بلکہ ان کو یہ بھی فکر تھی کہ اپنی مشینوں کو بیکاری سے بچائیں اور انھیں ہر وقت چلا کر زیادہ سے زیادہ سامان پیدا کریں۔ اس کا یہ مطلب تھا کہ ان کو اپنی پیدا کی ہوئی چیزوں کے لئے اپنے ملک کے حدود سے باہر بازاروں کی جستجو کرنی پڑتی۔ ان کو ایسے غیر ملکی بازاروں کی ضرورت تھی جہاں ان کی فاضل مصنوعات کی کھپت ہو سکتی۔

لیکن یہ بازار کہاں ڈھونڈھے جاتے؟ وہ اپنا مال انگلستان کی طرح دوسری مالدار قوموں کے ہاتھ فروخت کر سکتے تھے لیکن اب ان ملکوں میں بھی حفاظتی محصولوں کی دیواریں کھڑی ہو گئی تھیں اور ان دیواروں کے پیچھے وہاں کے حریف صنعت گروں نے اپنے ملکوں کے بازاروں پر قبضہ جما لیا تھا۔ فرانس کے وزیر اعظم جولیس فیری (JULES FERRY) نے ۱۸۸۵ء میں شکایت کی تھی کہ:۔

"ہماری عظیم الشان صنعتیں جس بات میں بے انتہا پیچھے ہیں وہ بازار ہیں۔ ایسا کیوں ہے؟ جرمنی نے اپنی سرحدوں کو بند کر رکھا ہے۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ نے بیرونی مال کی درآمد کے خلاف حفاظتی تدابیر اختیار کر رکھی ہیں۔ اور اس معاملے میں ان ملکوں کی انتہا پسندی اپنی آخری حد تک پہونچ چکی ہے۔"

جرمنی اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے بازار دوسری اقوام کی مصنوعات کے لئے اب بند ہو چکے تھے۔ وہ بھی اب دنیا کے بازار میں خم ٹھونک کر مقابلے کے لئے قدم جما رہے تھے۔ اب بڑی نازک صورت حال پیدا ہو گئی تھی۔ ہر صنعتی ملک میں پیدائش کی طاقت استعمال کی گنجائش سے بڑھی ہوئی تھی۔ ہر جگہ فاضل مصنوعات کے ڈھیر پڑے سڑ رہے تھے، اور ان کو اس مال کی کھپت کیلئے بیرونی بازاروں کی ضرورت تھی۔

یہ بازار کہاں "تلاش کئے جاتے؟

اس سوال کا جواب تھا ———————— نوآبادیات ہیں

ہم افریقہ کے نقشے میں مختلف رنگوں کی بھرمار دیکھنے کے عادی ہو چکے ہیں۔ ان رنگوں سے ہم کو مختلف یورپی اقوام کی ملکیت کا پتہ چلتا ہے۔ ہم یہ رنگ عرصے سے دیکھتے چلے آرہے ہیں اس لئے ان کو دیکھ کر ہمیں یہ خیال بھی نہیں ہوتا کہ افریقہ کے نقشے کے یہ رنگ ازلی نہیں ہیں ستر برس بھی نہیں ہوئے افریقہ کی پوری سرزمین وہیں کے باشندوں کی ملکیت تھی۔ اجارہ داری کے دور میں فاضل پیداوار کی گتھی نے ہر جگہ صنعتوں کے نگرانوں کو پریشان کر رکھا تھا، انھوں نے اپنی پریشانی کا علاج "نوآبادیات" کی صورت میں پایا اور اسی وقت افریقہ کا نقشہ بھی بدل گیا۔

مشہور عیسائی مبلغ اور متجسس ڈیوڈ لونگ اسٹون (DAVIDLIVINGSTONE) افریقہ کے اندرونی علاقوں میں غائب ہو گیا۔ نیویارک ہیرالڈ کے مالک جیمس گورڈن بینٹ (BENNETT) نے ہنری مورٹن اسٹینلی (H. MORTON STANLEY) کو اس کی تلاش میں افریقہ بھیجا۔ یہ خدمت بھی، جو اسٹینلی کے سپرد کی گئی تھی عجیب تھی۔ وہ اپنی مہم میں کامیاب ہی نہیں ہوا بلکہ اس کی

جستجو نے کچھ اور باتوں کا بھی کھوج لگایا۔ اُس نے اپنی دریافت کے اوپر لکچروں کا ایک سلسلہ شروع کیا۔ ہم کو یقین کرنا چاہئے کہ اُس کے سامعین بھی اُس کے موضوع سے دلچسپی لینے لگے ہوں گے ہم کو یہ بھی یقین کر لینا چاہئے کہ اُس کے سامعین میں سب سے زیادہ دلچسپی لینے والے لوگ مانچسٹر کے سوتی کپڑوں کے تاجر اور برمنگھم کے لوہے کی مصنوعات کے بیوپاری رہے ہوں گے۔ وہ اس کے ان جملوں کو بڑی توجہ سے سنتے ہوں گے کہ:۔

"کانگو کے پھاٹک کے اُس طرف چار کروڑ انسان بستے ہیں، مانچسٹر کے پارچہ باف ان کی ستر پوشی کے منتظر ہیں۔ برمنگھم کی بھٹیاں سُرخ دھات کو پگھلا رہی ہیں تاکہ اُس سے لوہے کے چھوٹے چھوٹے زیور بنائیں جو ان باشندوں کے سیاہ سینوں کو زینت دے سکیں مسیحی مبلغین کے دل تڑپ رہے ہیں تاکہ ان غریب اور گمراہ بے دینوں کو عیسائیت کے حلقے میں لے آئیں۔"

اسٹینلی ان صنعتوں کے نگرانوں کو، جو فاضل پیداوار کی وجہ سے پریشان دماغی کا شکار تھے ان الجھنوں سے نکلنے کی راہ دکھا رہا تھا۔ نوآبادیات کے سوا ان کی مشکلات کا کوئی دوسرا حل نہ تھا۔ دوسرے صنعتی ملکوں کے ماہرین صنعت بھی وقت کے اس مسئلہ کا وہی جواب پا رہے تھے۔ ۱۸۷۰ء کے بعد انگلستان، فرانس، بلجیم، اٹلی اور جرمنی نے اپنی فاضل پیداوار کی کھپت کے لئے نوآبادیات کی کھوج میں رسہ کشی شروع کی۔ امریکہ نے اس کشاکش میں ۱۸۹۸ء میں حصہ لیا۔ اس سال ریپبلکن سینیٹر البرٹ جے بیورج (ALBERT J. BEVERIDGE) نے بوسٹن کی ایک تاجر جماعت سے کہا:۔

امریکہ کے کارخانے امریکی عوام کی ضرورت سے زیادہ سامان تیار کر رہے ہیں۔ امریکہ کی زمین اتنا غلہ پیدا کر رہی ہے جتنا امریکی باشندے استعمال نہیں کر سکتے۔ قسمت نے ہمارا طریق کار متعین کر دیا۔ دنیا کی تجارت اب ہمارے ہاتھ میں آنی چاہئے اور وہ آئے گی ہم اُسے اسی طرح حاصل کر لیں گے جس طرح مادر انگلستان نے ہم کو حاصل کرنے کا طریقہ سکھایا ہے ہم پوری دنیا میں اپنی تجارتی چوکیاں قائم کریں گے۔ امریکی مصنوعات انہیں

چوکیوں سے تقسیم کی جائیں گی۔ ہم اپنے تجارتی بیڑوں سے سمندروں کو پاٹ دیں گے اور ہم ایک بحری بیڑہ جو ہماری قومی عظمت کے شایان شان ہوگا تیار کریں گے۔ بڑی نوآبادیات جو اپنی حکومت کا نظام خود سنبھالیں گی، ہمارا جھنڈا لہرائیں گی اور ہمارے ساتھ تجارت کرکے ہماری تجارتی چوکیوں کے آس پاس نشو ونما پائیں گی۔"

یہ نوآبادیات صرف فاضل مصنوعات کی کھپت کا بازار ہی نہ تھیں۔ ان کے بازاروں کے ذریعہ سے ایک دوسرے مقصد کی تکمیل بھی ہوتی تھی۔ بڑے وسیع پیمانے پر پیداوار کا کام جاری رکھنے کے لئے خام مال کی غیر محدود رسد کی بھی ضرورت تھی۔ ان اجارہ دار سرمایہ داروں کو شکر، روئی، گرم ممالک کے غذائی سامان اور معدنیات وغیرہ کی ہرجگہ احتیاج تھی۔ وہ اس خام مال کے لئے، جو ان کی صنعتوں کا پیٹ بھرنے کے لئے بہت ضروری تھا، دوسرے ملکوں کے محتاج رہنا نہیں چاہتے تھے۔ انھوں نے اس خام مال کی پیداوار کے سرچشموں پر قابو حاصل کرنا چاہا۔ ۸ اگست ۱۹۳۵ء کے نیویارک ٹائمس نے اٹلی کی ایک اس قسم کی سامراجی مہم کی خبر شائع کی جو اس نے حبش میں اسی بنیاد پر شروع کی تھی:۔

اٹلی حبش میں کپاس کی کاشت بڑھائے گا

اس کا خیال ہے کہ کپاس اور کافی کی پیداوار سے اس کے مصارف کی تلافی ہوجائے گی

زبردست درآمد کی طلبی

روم ۷ اگست حبش میں اٹلی کے منافع کی ابتدائی امیدیں کپاس اور کافی کی پیداوار کی ترقی پر منحصر ہیں جو اس کی شمالی اور جنوبی امریکہ کی تجارت پر اثر انداز ہوں گی۔ سونے لوہے، کچی دھاتوں، پلیٹنیم، تانبے اور دوسری معدنیات کے حصول کی توقعات کا نتیجہ کچھ بھی برآمد ہو لیکن اٹلی کے پاس یہ یقین کرنے کے معقول وجوہ موجود ہیں کہ کپاس اور کافی کی پیداوار سے ان اربوں لیرا مصارف کی تلافی ہو جائے گی جو اس نے مشرقی افریقہ میں

خرچ کیے ہیں، اٹلی اوسطاً جو ہتر کروڑ لیرا سالانہ کی کپاس زیادہ تر امریکہ سے درآمد کرتا رہا ہے۔ اٹھارہ کروڑ پچاس لاکھ لیرا سالانہ کی کانی بھی اُس کی درآمد میں شامل رہی ہے۔ اس طرح تقریباً ایک ارب لیرا جو اٹلی کی برآمد کا ۵ر۱۲ فی صدی ہے۔ ان چیزوں کی درآمد پر صرف ہوتا رہا ہے "

اس طرح خام مال کے سرچشموں پر قابو کی خواہش بھی ان عوامل میں دوسرے درجہ پر آگئی جو سامراج کے لئے راستہ صاف کر رہے تھے۔ پہلا عامل تم کو یاد ہوگا، فاضل پیداوار کے لئے نئے بازار کی ضرورت کی شکل میں ظاہر ہوا تھا۔ ایک دوسری فاضل چیز بھی جو ایک موزوں بازار کی تلاش میں تھی تیسرے عامل کی حیثیت سے کام کر رہی تھی۔ یہ تیسرا عامل جو سرمایہ داری سامراج کے لئے راستہ ہموار کر رہا تھا پہلے دونوں عاملوں سے بھی زیادہ اہم تھا۔ یہ عامل فاضل سرمایہ (SURPLUS OF CAPITAL) تھا۔

اجارہ دارانہ صنعتوں نے اپنے مالکوں کے لئے خوب نفع کمایا۔ نفع پر نفع کے ڈھیر لگے اور اتنی دولت اکٹھا ہوگئی کہ یہ دولت والے یہ سمجھنے سے بھی قاصر رہنے لگے کہ اب اسے کہاں خرچ کریں۔ یہ بات ناقابلِ یقین معلوم ہوتی ہوگی لیکن واقعہ یہی ہے کہ بعض ٹرسٹوں کو اتنا نفع ہوا کہ اگر ٹرسٹ والے چاہتے کہ اپنا سارا نفع خرچ کردیں تو ان کو خرچ کرنے کے ذرائع میسر نہ ہوتے۔

لیکن انھوں نے اپنی دولت خرچ کرنے کا ارادہ ہی نہیں کیا۔ انھوں نے اپنا روپیہ بچایا ایسا ہی ان لاکھوں اشخاص نے بھی کیا جو بہت تھوڑی رقم پس انداز کرسکتے تھے۔ انھوں نے اپنا روپیہ بینکوں، بیمہ کمپنیوں اور تجارتی کاروباروں کے اداروں میں لگایا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سرمایہ کی فراوانی اپنی حد سے بھی آگے نکل گئی۔

یہ بات بظاہر بہت مضحکہ خیز معلوم ہوتی ہے۔ دولت کی اتنی کثرت کیسے ہوسکتی ہے؟ کیا سرمایے کے مفید استعمال کی شکلیں نہیں نکل سکتی تھیں۔ کوئی شبہ نہیں بہت سی سڑکوں کی تعمیر کی ضرورت تھی، ہسپتالوں کے قیام کی بھی حاجت تھی، پرانے گھروں کو گراکر ان کی جگہ پر نئے رہائشی مکانات کا بنوانا بھی وقت کا

بڑا ضروری مسئلہ تھا۔ بیشک ملک کی سیکڑوں ضرورتیں تھیں جن کی تکمیل پر یہ دولت خرچ کی جا سکتی تھی دیہاتی رقبے بھی اچھی سڑکوں کے محتاج تھے۔ مزدوروں کو بھی رہنے کے لئے اچھے مکانات کی ضرورت تھی۔ چھوٹی تجارتیں بھی اپنی توسیع کے لئے سرمایے کی بھیک مانگ رہی تھیں لیکن ان تمام ضرورتوں کے ہوتے ہوئے بھی ماہرین معاشیات "فاضل سرمایے" کا رونا رو رہے تھے اور کروڑوں ڈالر (فرانک، پاؤنڈ اور مارک) فاضل ہونے کی وجہ سے دوسرے ملکوں کو بھیجے جا رہے تھے۔

ایسا کیوں ہو رہا تھا؟

اس لئے کہ سرمایہ دار یہ نہیں پوچھتا کہ "کیا ضرورت ہے؟" اُس کو ضرورت سے کوئی بحث نہیں ہوتی۔ وہ صرف یہ پوچھتا ہے کہ "میں اپنے روپئے پر کیا نفع کما سکتا ہوں" اس سوال کا جواب ہی یہ فیصلہ کرتا ہے کہ وہ اپنا بچایا ہوا فاضل سرمایہ کہاں لگائے۔

لینن نے، جو مارکس کا شاگرد اور روسی انقلاب کا رہنما تھا، ۱۹۱۶ء میں اپنی کتاب سامراج (IMPERIALISM) میں لکھا تھا۔

> کوئی شبہ نہیں اگر سرمایہ داری، زراعت کی ترقی پر، جو ہر جگہ صنعت سے بہت پیچھے ہے توجہ کرتی اور عوام کا معیار رہائش بلند کرنے کی کوشش کرتی تو آج سرمایے کے فاضل ہونے کا رونا نہ ہوتا لیکن اگر سرمایہ یہ فرائض انجام دیتا تو وہ سرمایہ ہی نہ رہتا۔ سرمایہ جب تک سرمایہ ہے، وہ کبھی عوام کے معیار رہائش کی بلندی پر صرف نہیں کیا جا سکتا۔ اس صورت میں سرمایہ داروں کے نفع میں کمی آئے گی۔ وہ ایسا نہ کریں گے بلکہ اس سرمایے کو منافع کی افزائش کے لئے، باہر دوسرے پسماندہ ملکوں میں لگائیں گے۔ پسماندہ ملکوں میں عام طور سے نفع کی شرح زیادہ ہوتی ہے۔ وہاں سرمایے کا فقدان ہوتا ہے، زمین کی قیمت نسبتًہ کم ہوتی ہے، مزدوری بھی کم دینی پڑتی ہے اور مال بھی سستا ملتا ہے۔"

یہی شکل پیش بھی آئی۔ فاضل سرمایے نے ان پسماندہ ممالک ——— نوآبادیات ——— میں اپنے لئے گنجائش پائی۔ یہ جگہیں ریلوں کی محتاج تھیں، ان کو بجلی گیس اور سڑکوں کی بھی ضرورت

تھی۔ یہ مقامات قدرتی وسائل کی دولت سے معمور تھے۔ یہاں کان کنی، باغبانی اور زراعت کے لئے خصوصی رعائتیں حاصل کی گئیں۔ یہی وہ جگہیں تھیں جہاں فاضل سرمایے نے اپنے نفع بخش کاروبار کے لئے میدان پایا۔

بات یہیں پر ختم نہیں ہوتی۔ اس نفع کے علاوہ، جو براہ راست اس کاروبار سے ملتا تھا، کچھ قرض بھی تقسیم کیا جاتا تھا۔ اس قرض کی شرطیں کچھ ایسی رکھی جاتی تھیں کہ قرض کا بڑا حصہ سرمایہ دار ملک ہی میں خرچ ہو جاتا تھا۔ جب انگلینڈ نے ارجنٹینا کو ریلوں کی تعمیر کے لئے قرض دیا تو پٹڑیوں کی بڑی تعداد ریل گاڑیوں اور انجنوں کا بڑا اسٹاک انگلستان ہی سے خریدا گیا اور انگریزی صنعتی کارخانوں کو نفع کی بڑی رقم دلا دی گئی۔ اس طرح فاضل سرمایے کی برآمدگی کے ساتھ ساتھ فاضل پیداوار کی نکاسی کی بھی صورت پیدا کر دی گئی اور سرمایہ دار اور کارخانہ دار دونوں نے نوآبادیات پر تسلط جمانے کی پالیسی میں اپنا نفع دیکھا۔ صنعت اور سرمایے کے درمیان اتحاد کا یہ ایک پہلو تھا۔ یہ اتحاد اس صدی کے معاشی سماج کی امتیازی خصوصیت ہے۔ اسی خصوصیت کی وجہ سے یہ زمانہ مالیاتی سرمایہ داری (FINANCE CAPITAL) کا زمانہ کہلاتا ہے۔ دولت کی بڑی بڑی رقمیں صنعت سے مل کر ایک سرمایہ کی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔ یہ سرمایہ نفع کمانے کے کام میں لگایا جاتا ہے۔ ہماری موجودہ دنیا میں یہی سرمایہ ایک بڑی زبردست طاقت کی حیثیت سے کام کر رہا ہے۔

صنعت اور دولت کا اتحاد، جو مصنوعات اور سرمایے پر نفع کمانے کی نیت سے وجود میں آیا تھا، سامراج کا اصل محرک تھا۔ جے۔ اے۔ ہابسن (HOBSON) نے ۱۹۰۲ء میں اس موضوع پر اپنی کتاب پیش کرتے ہوئے لکھا تھا:۔

> ”بڑے بڑے مالکان صنعت اپنے فاضل سرمایے کو نفع بخش کاروبار میں لگانے کے لئے بیرونی بازاروں کی جستجو کرتے ہیں تاکہ ان کی وہ مصنوعات جو اپنے ملک کے اندر نہیں کھپ سکتیں بک جائیں اور وہ سرمایہ جو بیکار پڑا ہوا ہے کسی نفع بخش کاروبار میں لگ جائے۔ ان تدبیروں کا نام جو ان مقاصد کے حصول کے لئے اختیار کی جاتی ہیں سامراج ہے۔“

یہ وہ اسباب ہیں جنھوں نے سامراج کو جنم دیا۔ ان لوگوں نے جو صنعتوں کے نگرانِ کار تھے وہ کیا تدبیریں اختیار کیں جو اُن ریاستوں کی وسعت کا سبب ہوئیں جن سے گزر کر یہ فاضل دولت دوسرے ملکوں میں قدم جما سکی۔ اس داستان سے غالباً تم ناواقف نہ ہوگے۔ ان ہزاروں تدبیروں میں سے جو اس فاضل دولت کو نفع بخش کاموں میں لگانے کے لئے اختیار کی جا رہی تھیں مسولینی کا تہذیبی مشن بھی تھا جو وہ ابی سینیا لے گیا تھا۔ جاپان کا چین میں داخلہ بھی اسی نیت سے تھا۔ انیسویں صدی کے ربع آخر میں بھی افریقہ میں اسی قسم کا طرزِ عمل اختیار کیا گیا تھا۔

افریقہ میں تاجر اور سرمایہ دار جماعتیں سراغ رسانوں اور اپنے خاص ایجنٹوں کے ذریعہ سے زمینیں تقسیم کرکے اپنی یورپی ریاستوں میں شامل کر رہی تھیں۔ یہ سراغ رساں اور ایجنٹ ملک کے اندرونی حصوں میں جا گھستے تھے اور قبیلوں کے سرداروں اور بادشاہوں کو شرابوں اور کپڑوں کے ہدیے دے کر اپنی جوائنٹ اسٹاک کمپنیوں کے لئے معاہدے لکھوا لیتے تھے۔ ان افریقی حکمرانوں نے اپنی تمام مملکتیں چند گز کپڑوں اور شراب کی چند بوتلوں کے عوض میں دے ڈالیں۔ وسط افریقہ کے تمام مقبوضات کی بنیاد اسی قسم کے معاہدوں پر قائم ہے۔ بیس برس سے بھی کم مدت میں وسط افریقہ بٹ بٹا کر برطانیہ، فرانس، جرمنی، بلجیم، پرتگال اور اٹلی کے سامراجی حلقوں میں شامل ہو گیا۔

بعض سمجھ دار سراغ رساں، تاجر اور سرمایہ دار کبھی کبھی ایمانداری سے سوچتے تھے کہ اصل لینے والوں سے یہ زمینیں چرا کر وہ خدا کی جانب سے سونپا ہوا فریضہ انجام دے رہے تھے اور اس طرح وہ ان دیسی باشندوں کی بھلائی کا سبب ہو رہے تھے۔ سیسل روڈس (CECIL RHODES) بھی جس کا نام ان بڑے لوگوں کے ساتھ لیا جاتا ہے جو سامراج کے زبردست معمار سمجھے جاتے ہیں، یہی خیال کرتا تھا۔ وہ لکھتا ہے:-

> "میری رائے ہے کہ ہماری نسل دنیا میں وہ پہلی نسل ہے جو زمین کا زیادہ سے زیادہ حصہ اپنے زیر نگیں لا کر بنی نوع انسان کا زیادہ سے زیادہ بھلا کر سکتی ہے۔ اگر خدا موجود ہے تو وہ مجھ سے اسی میں خوش ہوگا کہ میں افریقہ کے نقشے کے بڑے سے بڑے حصے کو انگریزوں کے سرخ رنگ

سے رنگین کر دوں۔

افریقہ کی ان مفتوحہ زمینوں پر بسنے والی دیسی قومیں بھی زیادہ تر عجیب و غریب ہی ثابت ہوتی تھیں۔ ان کی سمجھ میں یہی نہیں آتا تھا کہ یہ سفید چمڑے والے جو کچھ کر رہے ہیں وہ سب انھیں کے بھلے کے لئے ہے۔ سفید چمڑے والے عیسائی مبلغین جو کچھ کہتے تھے اور سفید چمڑے والے سرمایہ دار ان کے ساتھ جو کچھ کرتے تھے، اس کا تضاد ان کے دلوں میں بڑی الجھنیں پیدا کر دیتا تھا۔ کبھی کبھی وہ اپنی جہالت سے بغاوت کر بیٹھتے تھے اور اس وقت مجبوراً ان کو سبق دینا پڑتا تھا اور بہت جلد بڑے بڑے جگمگاتے ہوئے جہاز، مادر وطن سے دھواں اڑاتے ہوئے چلتے اور افریقہ کے ساحلوں پر لنگر انداز ہو جاتے۔ رائفلیں سنبھالنے والے سپاہی، مشین گنیں اور بم جو تہذیب کے ہتھیار رہیں "تہذیب کا درس دینے میں مصروف ہو جاتے۔ ان باغیوں کو سبق دے دیا جاتا۔

مرکزی حکومت کی فوجی طاقت یہ سبق سکھاتی تھی۔ حکومتیں اپنی رعایا کی جان اور ان کے مال کی حفاظت کے لئے ہمیشہ مستعد رہتی تھیں۔ وہ بعض دوسرے ذرائع سے بھی ان کی مدد کرتی رہتی تھیں۔ یہ حکومتیں محصول تشخیص کر کے قیام امن کا بندوبست کرتی تھیں، ہسپتال قائم کرتی تھیں اور اسکولوں اور اچھی سڑکوں کا انتظام کرتی تھیں۔ یہ محصول ان دیسی باشندوں کو نقد ادا کرنا پڑتا تھا لیکن اب ان دیسیوں کے پاس سکے کے نام سے رہا کیا تھا! ہاں، ایک شکل تھی۔ وہ اپنے سفید فام مالکوں کے باغوں، فارموں اور ان کی کانوں میں محنت کر کے روپیہ پیدا کر سکتے تھے۔ یہ سچ ہے کہ مزدوری کی شرح بہت کم تھی۔ یہ بھی صحیح ہے کہ دیسی باشندے ان باغوں، فارموں اور کانوں میں محنت کئے بغیر بھی اپنا پیٹ پال سکتے تھے لیکن محصول تو ان کو ادا ہی کرنا تھا اس لئے مزدوری کے سوا ان کے پاس چارہ ہی کیا تھا! اگر وہ یہ محصول نہ ادا کرتے تو کیا ہوتا۔ ایک شاہد جس نے اپنی آنکھوں سے ۱۹۳۵ء میں فرانسیسی مغربی افریقہ کی نوآبادی میں عدم ادائگی محصول کا نتیجہ دیکھا تھا، بیان کرتا ہے:۔

"جنوبی سوڈان کا ایک گاؤں محصول ادا کرنے کے لائق نہ تھا، دیسی پولیس بھیجی گئی، اس نے گاؤں کی تمام عورتوں اور بچوں کو ایک احاطہ کے بیچ میں اکٹھا کر دیا اور ان کے جھونپڑوں

کو پھونک دیا۔ گاؤں کے باشندوں سے کہدیا کہ جب محصول ادا کر دینا اپنے بال بچوں کو واپس لے لینا۔"

نو آبادیات کے باشندوں کے ساتھ جو سلوک روا رکھا جاتا تھا اُس کا کوئی ایک نقشہ نہیں کھینچا جا سکتا۔ زمانے اور مقام کے اختلاف کے ساتھ ساتھ برتاؤ میں بھی فرق ہوتا رہتا تھا لیکن جہاں تک ظالمانہ برتاؤ کا تعلق ہے کوئی نو آبادیاتی حکومت اس سے بری نہ تھی۔ کسی سامراجی قوم کا دامن بے گناہوں کے خون سے بے داغ نہیں ہے۔ لیونارڈ ولف (LEONARD WOOLF) جو ان مسائل کا ماہر سمجھا جاتا ہے، لکھتا ہے :۔

جس طرح پچھلی صدی میں یورپ کے قومی سماجوں میں دو کھلے ہوئے (سرمایہ دار اور مزدور، لوٹنے والے اور لوٹے جانے والے) طبقے پیدا ہو گئے تھے، اسی طرح بین الاقوامی برادری میں بھی دو طبقے نمایاں طور پر پیدا ہو گئے ہیں۔ ایک طرف مغرب کی سامراجی طاقتیں ہیں اور دوسری طرف مشرق اور افریقہ کی محکوم اقوام ہیں۔ پہلا طبقہ حکومت کر رہا ہے اور لوٹ رہا ہے اور دوسرا طبقہ محکوم ہے اور لوٹا جا رہا ہے۔"

کسی ملک کو محکوم بننے اور لوٹے جانے کے لئے "نو آبادی" بننے ہی کی ضرورت نہ تھی، پسماندہ ممالک، جو براہ راست سامراجی حلقے میں شامل نہیں کئے جاتے تھے ان کے "حلقۂ اثر" میں لے آئے جاتے تھے۔ چین کی مثال سامنے ہے۔ وہ بظاہر آزاد ہے لیکن بڑی بڑی طاقتیں اس کے اندر بھی اپنے مسلمہ حقوق کا جال بچھائے ہوئے ہیں۔ اسی طرح جنوبی امریکہ کو بھی انگلستان اور ریاستہائے متحدہ امریکہ نے اپنے اپنے حلقۂ اثر میں تقسیم کر رکھا ہے۔ ان دونوں ملکوں نے جنوبی امریکہ کی جمہوری ریاستوں پر قبضہ تو نہیں کیا لیکن وہاں اپنا سرمایہ لگا کر کچھ معاہدے کر لئے جن کے بموجب ان کو نفع کمانے کے لئے بہت سی رعایتیں حاصل ہو گئیں۔ ان معاملات میں بھی یہ بات ہر جگہ اچھی طرح واضح کر دی گئی کہ اگر ان حقوق کا، جو ان ممالک نے ان ملکوں میں حاصل کئے ہیں، احترام نہ کیا گیا تو بحری بیڑے، ہوائی جہاز اور فوجی دستے آموجود ہوں گے اور اپنے دعوے تسلیم کرائیں گے، رعایتیں

حاصل کریں گے اور تجارتی اجارہ کے شرائط کا نفاذ کرائیں گے۔

یہ محض اتفاق نہ تھا کہ حکومتوں نے اپنے تاجروں اور صنعتوں کے مالکوں کی اُس وقت مدد کی تھی جب وہ اپنی مصنوعات اور سرمایے کے لئے بازار ڈھونڈھنے نکلے تھے۔ ۱۹۲۱ء میں ایک اہل قلم نے جو انگریزی معاملات کا گہرا مطالعہ کر رہا تھا حکومتوں کے اس اقدام کو ضروری خیال کرتے ہوئے لکھا تھا:۔

"اس وقت ۱۹۲۱ء کی خزاں میں انگریزی تجارت تمام تر بڑے بڑے مشترک سرمایوں کے قابو میں ہے۔ ان پر بڑے بڑے بینک ٹرسٹ حکومت کرتے ہیں۔ پوری تجارتی مشین کا لیور جو تجارت کی رفتار پر قابو رکھتا ہے، ان کے ہاتھ میں ہے۔ ان کو حکومتوں پر بھی جو ٹرسٹوں کے مشوروں کے بغیر چل نہیں سکتی ہیں۔ پورا اقتدار حاصل ہے۔"

یہ انگلستان کی داستان تھی۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے صدر ٹیفٹ (PRESIDENT TAFT) کے یہاں انصاف کا راستہ بہت سیدھا تھا لیکن یہ اتنا تنگ نہ تھا کہ "ہمارے سرمایہ داروں" کی مداخلت کی گاڑی نہ نکل سکتی:۔

"ہماری خارجہ حکمت عملی کو انصاف کے سیدھے راستے سے سرمو تجاوز نہ کرنا چاہئے لیکن ہمارے سرمایہ داروں کے نفع بخش کاروبار کے لئے مداخلت کر کے مواقع پیدا کرنا بھی ہماری خارجہ پالیسی میں شامل ہوگا۔"

ایک مرتبہ "ہمارے سرمایہ داروں" کی طرف سے مداخلت کر کے حکومتوں کو ایک ایسی راہ پر جس کا کوئی اور چھور نہ ہو چل دینا پڑا "سرمایہ اڑنے والے جھولے کی طرح" ہوا میں آسانی سے اُڑتا رہتا ہے" یہ دیکھتے رہنا کہ وہ محفوظ ہے اپنی جگہ پر ایک مستقل کام ہے۔ میجر جنرل سمڈلے ڈی بٹلر (SMEDLEY D. BUTLER) کے سپرد یہی کام تھا، اُس نے اپنے بیان میں واقعات کی تصویر کھینچ دی ہے۔ وہ صدر ٹیفٹ سے متفق نہیں ہے۔ وہ اس کا مدعی نہیں ہے کہ بڑے تاجروں کے مفاد کی خاطر مداخلت کر کے بھی انصاف کے ڈھرے پر چلا جا سکتا ہے۔ اُس کا بیان ہے کہ:۔

"میں نے تینتیس برس چار مہینے اپنے ملک کی فوج (بحری بیڑے) میں کام کیا۔ میں نے سکنڈ لفٹنٹ سے لے کر میجر جنرل تک کے عہدے پر اپنے فرائض انجام دیئے۔ میں نے اس تمام مدت میں بڑے تاجروں (وال اسٹریٹ اور بینکروں) کے ایک بڑے زوردار کارکن کی حیثیت سے کام کیا۔ مختصر طور پر کہا جا سکتا ہے کہ میں وہ آدمی تھا جو سرمایہ داری کو نقطۂ عروج پر پہونچانے کے لئے سرگرم عمل تھا۔"

"اس طرح میں نے ۱۹۱۴ء میں میکسیکو اور خاص طور سے ٹمپیکو کو امریکی تیل کے مفاد کے لئے محفوظ بنایا۔ میں نے ہیٹی اور کیوبا کو نیشنل سٹی بینک کے لئے ایک موزوں جگہ بنا دیا تاکہ اس کے کارکن محاصل وصول کر سکیں۔ میں نے ۱۹۰۹ء سے ۱۹۱۲ء تک براؤن برادرس کے بین الاقوامی بینک گھر کے لئے نکارگوا کی تطہیر کی۔ میں نے ۱۹۱۶ء میں امریکہ کی شکر کی کمپنیوں کی خاطر جمہوریہ ڈامنکن کو روشناس کرایا۔ میں نے ۱۹۰۳ء میں امریکہ کی پھل کی کمپنیوں کے لئے ہنڈراس کا حق محفوظ کرایا۔ میں نے ۱۹۲۷ء میں چین میں اسٹینڈرڈ آئل کمپنی کے تیل کی حفاظت کی تاکہ وہ کسی کی مداخلت کا شکار نہ ہو۔"

"اس تمام مدت میں میری حیثیت اس آدمی کی سی رہی جو غبارہ کی طرح پھول رہا ہو۔ مجھ کو خطابات ملے، تمغے عطا ہوئے اور ترقیوں سے میری عزت افزائی کی گئی۔ جب میں گھوم کر اس پچھلی مدت پر نگاہ ڈالتا ہوں تو میں محسوس کرتا ہوں کہ مجھے آل کیپون (AL CAPONE) کو اشارے کنائے میں کچھ اور بھی سمجھانا چاہئے تھا۔ بہت اچھا ہوتا اگر "وہ" اپنے ریکیٹ کو تین شہری ضلعوں میں استعمال کرتا۔ ہم بحری فوج کے لوگ تو تین براعظموں میں مشغول رہے۔"

ہم کو میجر جنرل بٹلر کے تجربات سے پتہ چلتا ہے کہ سرمایہ داری جس کی ابتدا انیسویں صدی میں ہوئی تھی، ابھی تک ہمارے ساتھ ہے۔ اس کی سختیاں پہلے سے بھی کہیں زیادہ بڑھ گئی ہیں۔ یہ سمجھنا دشوار نہیں ہے کہ یہ صورت حال کیوں پیدا ہو گئی۔ صنعت کی اجارہ داری

ابھی تک کم نہیں ہو رہی ہے بلکہ اس کا حلقہ برابر بڑھ رہا ہے اور اس کے ساتھ سامراج کی گرفت بھی مضبوط ہوتی جا رہی ہے۔

"عہد جدید کی کارپوریشن اور نجی ملکیت" (MODERN CORPORATION AND PRIVATE PROPERTY) کے مطالعہ سے جو دو ماہرین فن کی تحقیق کا نتیجہ ہے، ہم کو امریکہ کی موجودہ کارپوریشنوں کی دولت، وسعت اور ان کے اقتدار کے متعلق حیرت انگیز حقائق اور اعداد و شمار کا پتہ چلتا ہے۔ امریکہ میں تین لاکھ نان بینکنگ (NON BANKING) کارپوریشنیں ہیں لیکن ان میں سے صرف دو سو کارپوریشنیں پوری اجتماعی دولت کے نصف پر قابض ہیں۔ ان دو سو کارپوریشنوں میں سے پندرہ ایسی ہیں جن میں سے ہر ایک کے پاس اربوں ڈالر کا اثاثہ ہے۔ ان پندرہ کارپوریشنوں میں سے ایک کارپوریشن امریکن ٹیلیفون اینڈ ٹیلیگرام کمپنی تو اتنی دولت کی مالک ہے جو ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی اکیس [۲۱] ریاستوں میں بھی نہیں ہے۔"

ان کارپوریشنوں کی اجارہ داری کے حلقے کی وسعت کا اندازہ لگانے کے لئے ہم کو مذکورہ بالا مصنفین کی طرف پھر رجوع کرنا چاہیئے۔ اور یہ دیکھنا چاہیئے کہ امریکہ کے ایک شہری کو اپنی روزمرہ زندگی میں ان دو سو کارپوریشنوں سے کس طرح سابقہ پڑتا ہے اور اس کی زندگی ان کی اجارہ داری کے بندھنوں میں کس طرح بندھی ہوئی ہے۔

"یہی بڑی بڑی کمپنیاں، امریکی صنعت کا ڈھانچہ بناتی ہیں۔ امریکہ کے ہر فرد کو اپنی روزمرہ زندگی میں ان کمپنیوں سے برابر سابقہ پڑتا رہتا ہے اور ہر وقت اسے ان کی خدمات کی ضرورت محسوس ہوتی رہتی ہے۔ اگر وہ تھوڑی دور کا بھی سفر کرتا ہے تو اس کو سڑک کی پٹریوں کے زبردست نظام سے دو چار ہونا پڑتا ہے۔ جو انجن اس کے ڈبے کو گھسیٹتا ہے وہ امریکن لوکوموٹیو کمپنی یا بالڈون لوکوموٹیو ورکس کا بنایا ہوا ہے۔ اگر وہ موٹر کار میں سفر کرتا ہے تو وہ بھی امریکن کار اینڈ فاؤنڈری کمپنی یا اس کی کسی ماتحت کمپنی کی بنائی ہوئی ہے۔ پٹریاں تو یقیناً لوہے کی انھیں گیارہ کمپنیوں میں سے جو درج فہرست ہیں کسی ایک نے بنائی ہوں گی

اگر پٹری کی کمپنی کے پاس اپنی کان نہ ہوگی تو کوئلہ کی چار کمپنیوں میں سے کسی ایک نے کوئلہ فراہم کیا ہوگا۔ اگر یہ فرد کسی موٹر میں سفر کر رہا ہوگا تو وہ یا تو فورڈ نے بنائی ہوگی یا جنرل موٹرس، اسٹڈ بیکر یا کرسلر کمپنیوں میں سے کسی ایک نے تیار کی ہوگی۔ ٹائر بھی یا تو فائر اسٹون کے لگے ہوں گے یا گڈ رچ، گڈ ایر یا یونائیٹڈ اسٹیٹس ربر کمپنی کے تیار کئے ہوئے ہوں گے،۔۔۔۔۔“

”اگر یہ فرد اپنے گھر میں اکیلا بیٹھا ہوا تنہائی کے لمحے گذار رہا ہوگا تو اس کو ان دو سو کمپنیوں سے کیا سروکار ہوگا؟ اس کی بجلی یا گیس تو یقیناً انھیں کمپنیوں میں سے کسی ایک نے فراہم کی ہوگی۔ اس کے باورچی خانے کے المونیم کے برتن بھی امریکہ کی المونیم کمپنی کے بنائے ہوئے ہوں گے۔ اس کا ریفریجریٹر (REFRIGERATOR) بھی جنرل موٹرس کمپنی یا بجلی کے ساز و سامان کی دو بڑی کمپنیوں یا جنرل الکٹرک اور وسٹنگ ہاؤس الکٹرک نے تیار کیا ہوگا۔ اس کا بھی امکان ہے کہ کرین کمپنی نے اس کو نل اور امریکن ریڈیئٹر اور اسٹینڈرڈ سینیٹری کارپوریشن نے اس کے لئے گرم کرنے کے آلے فراہم کئے ہوں اس نے اپنی روزمرہ کی ضرورت کی چیزیں گریٹ اٹلانٹک اور پیسفک ٹی کمپنی سے خریدی ہوں گی، اس کی ضرورت کی دوائیں بالواسطہ یا بلا واسطہ یونائیٹڈ ڈرگ کمپنی نے مہیا کی ہوں گی۔ ڈبے، جن میں اس کی روزمرہ کی ضرورت کی چیزیں آتی ہیں، امریکن کین کمپنی کے بنائے ہوئے ہیں۔ اس کی شکر بھی کسی بڑی کمپنی کی صاف کی ہوئی ہے، گوشت بھی جو اس کے استعمال کے لئے آیا ہے سوفٹ، آرمر یا ولسن کمپنی کا تیار کیا ہوا ہے۔ اس کے بسکٹ بھی نیشنل بسکٹ کمپنی کے بنائے ہوئے ہیں۔“

”اگر وہ تفریح کے لئے ریڈیو کی طرف توجہ کرتا ہے تو وہ ایک سیٹ جو ریڈیو کارپوریشن آف امریکہ کے اجازت نامے کے تحت تیار کیا گیا ہوگا، استعمال کرے گا، اگر وہ سینما دیکھنے جائے گا تو وہ پیرا ماؤنٹ، فاکس یا وارنر برادرس کی کھینچی ہوئی تصویریں

کسی ایسی تماشا گاہ میں دیکھے گا جو ان جماعتوں میں سے کسی ایک کی نگرانی میں چل رہی ہوں گی کوئی بھی سگریٹ اُس کو پسند آئے وہ اُس میں وہی تمبا کو استعمال کرسکے گا جو چار بڑی تمباکو کمپنیوں کی تیار کی ہوئی ہو گی اور جو مختلف تجارتی نشانوں کے ساتھ اُس کو یونائیٹڈ سگار اسٹور میں ملے گی۔"

جدھر بھی نظر اٹھاؤ تم کو ہر طرف اجارہ داری کے جال پھیلے ہوئے نظر آئیں گے۔ دنیا کے دوسرے بڑے صنعتی ملکوں کا بھی یہی حال ہے۔ اُس وقت کیا ہوتا ہے جب یہ بڑے بڑے مختلف دیو، جو قومی بازاروں کے مالک ہیں، بین الاقوامی بازار میں ایک دوسرے سے ملتے ہیں؟ آگ کی بارش ہوتی ہے، مقابلے کا میدان گرماتا ہے اور ایک عرصے تک تلخیوں اور سختیوں کی انتہا ہوتی رہتی ہے۔ اس کے بعد معاہدے ہوتے ہیں اور بین الاقوامی بنیادوں پر انجمنوں اور تجارتی مشترک جماعتوں کی تشکیل ہوتی ہے۔

"اجارہ دارانہ سرمایہ داری دنیا کو تقسیم کر لیتی ہے۔ یہ سب کچھ کسی دشمنی کی وجہ سے نہیں ہوتا ہے۔ دولت کے ڈھیر ان کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ کوئی ایسا راستہ نکالیں جو ان کے لئے مزید نفع کا باعث ہو، وہ دنیا کو اپنے سرمائے کی کثرت اور طاقت کی زیادتی کے تناسب سے بانٹ لیتے ہیں .... لیکن طاقت اقتصادی اور سیاسی ارتقا کے ساتھ ساتھ گھٹتی بڑھتی رہتی ہے۔"

جب مشترک سرمایے کی بڑی بڑی بین الاقوامی جماعتیں دنیا کا بازار تقسیم کر لیتی ہیں تو خیال ہونے لگتا ہے کہ شاید اب مقابلے ختم ہو جائیں اور دنیا امن کی نیند سو سکے لیکن یہ خیال خواب کی بات ثابت ہوتا ہے۔ بین الاقوامی جماعتوں کی طاقتیں گھٹتی بڑھتی رہتی ہیں اور اس کا اثر ان کے باہمی رشتوں پر بھی پڑتا رہتا ہے۔ بعض کمپنیاں بڑی اور طاقتور ہو جاتی ہیں اور بعض کمزور ہو کر اپنی حیثیت کھو بیٹھتی ہیں۔ جو بات کسی وقت منصفانہ معلوم ہوتی تھی۔ اب ان بدلے ہوئے حالات میں وہی نامنصفانہ معلوم ہونے لگتی ہے۔ بڑی اور مضبوط جماعت کی

بے اطمینانی بڑھتی ہے، وہ بڑے حصے کے لئے جد و جہد شروع کرتی ہے۔ یہ کشاکش اکثر کسی نئی جنگ کا دروازہ کھول دیتی ہے۔

نو آبادیات پر سیاسی تسلط کے بارے میں بھی یہی بات صحیح ہے۔ ستر برس پہلے ایسے بہت سے آزاد رقبے موجود تھے جن پر کسی نے تسلط نہیں جمایا تھا لیکن اب ایسی کوئی زمین نہیں ہے۔ اگر زمین از سر نو تقسیم کی جائے تو جن لوگوں کے پاس کچھ نہیں ہے وہ اپنی ضرورت کے قطعے ان لوگوں سے پا سکتے ہیں جو سب کچھ دبائے بیٹھے ہیں۔ جرمنی، اٹلی اور جاپان نو آبادیات کی تلاش میں ہیں۔ اٹلی اور جاپان سے جو کچھ بن پڑ رہا ہے ہڑپ کر رہے ہیں، جرمنی اُس دست اندازی کے لئے جس کا وہ ارادہ کر رہا ہے مسلح ہو رہا ہے۔ سامراج دنیا کو جنگ کی طرف لئے جا رہا ہے۔

لیکن جنگ سے کوئی گتھی نہیں سلجھتی، جو جھگڑے پنچایتی گفت و شنید سے نہ طے ہوں وہ بموں، زہریلی گیسوں، لنج، اپاہج آدمیوں اور ہاتھ پیر کٹی ہوئی لاشوں کے زور سے طے نہیں کئے جا سکتے۔ یہ صحیح ہے لیکن اجارہ دارانہ سرمایہ داری کو تو اپنی فاضل پیداوار اور سرمایے کے لئے بازاروں کی ضرورت ہے۔ یہ جھگڑے اُس وقت تک جاری رہیں گے جب تک ان بازاروں کی جستجو باقی رہے گی اس لئے نتائج کچھ بھی نکلیں یہ کشاکش ختم نہ ہو گی۔

سیسل روڈس (CECIL RHODES) جو اس سامراج کا مشہور اور ممتاز علمبردار تھا، اس ضرورت کو بُری طرح محسوس کر رہا تھا۔ نئے بازاروں کی تلاش اُس کی زندگی کا جزو بن چکی تھی اور نئی مملکتوں کا الحاق ہی اُس کی زندگی کا سب سے بڑا سرمایہ تھا۔ اُس نے اپنے دوستوں کو ایک مرتبہ جو بیان دیا تھا اُس میں سامراج کے رجحانات ہم کو اچھی طرح واضح نظر آتے ہیں۔ وہ کہتا ہے :-

پوری دنیا قریب قریب ختم ہو چکی ہے جو کچھ بچی ہے وہ بانٹی جا رہی ہے فتح کی جا رہی ہے اور وہاں نو آبادیات قائم کی جا رہی ہیں۔ ان ستاروں کا خیال کرو جو رات کو ہمارے سروں پر چمکتے ہیں۔ یہ وسیع دنیا۔ ہم یہاں کبھی نہ پہونچ سکیں گے! اگر ہو سکتا تو

میں ان ستاروں کا الحاق کر لیتا۔ میں اکثر یہی سوچتا رہتا ہوں۔ میں ان ستاروں کو روشن اور اس قدر دُور دیکھ کر اپنی نارسائی پر آنسو بہاتا ہوں۔"

روڈس بہت جلد مر گیا کتنے رنج کی بات ہے! نیو میکسیکو کے صحرا میں پروفیسر آر۔ ایچ۔ گوڈرڈ اپنی تجربہ گاہ میں ایک غبارہ تیار کر رہے ہیں جو چاند کا سفر کر سکے گا۔ ویلز کے ایک پہاڑی قلعے میں برٹش انٹرپلینٹری سوسائٹی (INTER PLANETARY SOCIETY) ایک ایسے طیارے کی تیاری میں مصروف ہے جو ستاروں تک سفر کر سکے گا۔ کاش روڈس کچھ دن اور زندہ رہ سکتا! دوسری دنیا میں بھی یہ بات اُس کے سکون کا موجب ہو گی کہ اُس کی رُوح پہلے سے بھی زیادہ زور اور قوت سے گرم عمل ہے۔ جب پہلا غبارہ چاند کی زمین پر اترے گا اور چاند کا باشندہ اس پہلے غبارہ کے مسافر کو خوش آمدید کہے گا تو یہ مسافر اپنے میزبان کے کان میں چپکے سے کہے گا "کیا آپ اپنی پُرانی نہروں کی مرمت اور نئی نہروں کی تعمیر کے لئے کچھ روپیہ قرض لیں گے؟ لیجئے یہاں دستخط کیجئے۔ میرا بینک اس کے بعد کی تمام ذمہ داریاں سنبھال لے گا ——— لیجئے یہاں دستخط کیجئے ——— آپ کا شکریہ۔"

سب سے کمزور کڑی

"تجارتی بحران کے ان زمانوں میں صرف موجودہ پیداوار کا بڑا حصہ ہی نہیں بلکہ گذشتہ زمانے کے پیداشدہ ذرائع پیداوار بھی تھوڑے تھوڑے عرصے کے بعد تباہ کیے جاتے رہتے ہیں۔ ان بحرانی دوروں میں حد سے زیادہ پیداوار کی ایک وبا پھیل جاتی ہے، جو گذشتہ زمانوں میں حماقت سمجھی جاتی۔ سماج اپنے آپ کو اچانک ایک وقتی بربریت کا شکار پاتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے قحط یا کسی عالمگیر بربادی نے رزق کی رسد کے ہر ذریعہ کو ختم کر دیا ہو۔ صنعت اور تجارت ختم سی معلوم ہونے لگتی ہے۔ آخر یہ صورت حال کیوں پیش آتی ہے؟ اس صورت حال کی ذمہ داری، انتہائی تہذیب، رزق کے انتہائی ذرائع، بے انتہا صنعت اور لامحدود تجارت پر عائد ہوتی ہے"

یہ عبارت کل کی لکھی ہوئی نہیں ہے۔ مارکس اور اینگلز نے سو سال پہلے ۱۸۴۸ء میں یہ سطریں کیمونسٹ مینی فسٹو میں لکھی تھیں۔ یہ کوئی حیرت انگیز پیشین گوئی نہ تھی۔ یہ بیان، اُن واقعات کی تشریح پر مشتمل تھا جو اس زمانے کے ہر سرمایہ دار سماج میں ہر چند سال کے بعد پیش آتے رہتے تھے یہ صورتِ حال برابر پیش آتی رہی۔ جو لوگ ۱۹۲۹ء میں دس سال کی عمر سے زیادہ رہے ہوں گے وہ اس حقیقت سے ناواقف نہ ہوں گے۔ اوپر کا اقتباس کچھ مانوس سا معلوم ہوتا ہے۔ وجہ صرف یہی ہے کہ ہم بھی ایک ایسے زمانے میں زندگی گذار رہے ہیں جب دنیا سب سے بڑے اقتصادی بحران سے، جس کا اب تک تجربہ ہو سکا ہے، گذر رہی ہے۔

دنیا کی تاریخ کے ہر دور میں ایسے بحران آتے رہے ہیں لیکن سرمایہ داری کے ارتقا کے بعد

جو حالات پیدا ہوئے ہیں وہ اُن سے بہت مختلف ہیں جو سرمایہ داری زمانے سے پہلے پیش آیا کرتے تھے۔ انیسویں صدی عیسوی سے پہلے فصلوں کی خرابی، جنگ یا اسی قسم کا کوئی غیر معمولی واقعہ ان غیر معمولی حالات کا سبب ہوتا تھا، اور غذا اور دوسری ضروری اشیاء کی غیر معمولی کمی قیمتوں کے اضافے کا موجب ہوتی تھی لیکن سرمایہ داری نظام کے وجود اور اُس کے ارتقا کے ساتھ ساتھ جو بحران پیدا ہوا ہے وہ اس قسم کے غیر معمولی حالات کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ وہ سرمایہ داری نظام کا ایک لازمی نتیجہ ہے۔ اس بحران کی امتیازی وجہ ضروری اشیاء کی کمی نہیں ہے بلکہ اس کے بالکل برعکس یہ بحران ضروری اشیاء کی بے انتہا فراوانی کی وجہ سے ظہور پذیر ہوتا ہے۔ اس بحران میں اشیاء کی قیمتیں چڑھتی نہیں ہیں بلکہ گرتی ہیں۔

اس تجارتی بحران اور کساد بازاری کی دوسری نمایاں خصوصیت ایک عام بے روزگاری بھی ہے۔ سرمایہ اور محنت دونوں اپنی اپنی جگہ پر معطل اور بیکار نظر آتے ہیں۔ منافع کی شرح کم ہو جاتی ہے صنعتی عمل میں بھی غیر معمولی سستی آجاتی ہے۔ پیداوار اور کاروبار کے ہر میدان میں سناٹا نظر آتا ہے۔ بے انتہا افراط کے باوجود بے انتہا غربت اس زمانے میں ہر طرف پھیلی ہوئی نظر آتی ہے۔

کیا یہ حالات خام پیداوار کی کمی کی وجہ سے پیدا ہو جاتے ہیں؟ نہیں، بالکل نہیں، کپاس پیدا کرنے والے اپنی پیداوار کی نکاسی کے لئے بے چین نظر آتے ہیں۔ کیا صنعتی ساز و سامان نہ ہونے کی وجہ سے یہ مشکل پیش آتی ہے؟ نہیں، یہ بات بھی نہیں ہے۔ کارخانوں کے مالک اپنے تکلوں اور کرگھوں کے استعمال کے لئے ہر وقت تیار رہتے ہیں وہ چاہتے ہیں کہ ان کے کارخانے پھر چلنے لگیں، پھر کیا محنت کشوں کا فقدان اس صورتِ حال کا ذمہ دار ہے؟ نہیں، یہ وجہ بھی نہیں ہے۔ پارچہ بافی کے کارخانوں کے مزدور، جو بے روزگاری سے تنگ آچکے ہیں، چاہتے ہیں کہ پھر اپنی پرانی جگہوں پر پہونچ کر وہ سوتی کپڑے تیار کریں جن کے لئے وہ ترس رہے ہیں۔

خام مال، ساز و سامان اور ضروری محنت، پیداوار کے لئے جتنے اجزاء ضروری ہیں سب تو موجود ہیں، پھر آخر پیدائش کی نوبت کیوں نہیں آتی؟ اس سوال کے جواب میں ماہرین

معاشیات کوئی ایک بات نہیں کہتے۔ لیکن اختلاف رائے کے باوجود کم سے کم ایک حقیقت سب کے نزدیک مسلم ہے، بحث کے آغاز ہی میں یہ حقیقت سمجھ لینی چاہیئے۔ ورنہ اس بحران کے وجوہ و اسباب تک رسائی آسان نہ ہوگی۔

سرمایہ داری نظام میں، تجارتی اشیاء استعمال کے لئے نہیں بلکہ مبادلے کے لئے، جو نفع لے کر عمل میں لایا جاتا ہے تیار کی جاتی ہیں۔ ہمارے سماج میں معدنیات کی کھدائی ہوتی ہے فصلیں بوئی اور کاٹی جاتی ہیں، لوگوں کو نوکریاں دی جاتی ہیں، ملوں کی مشینیں جنبش میں آتی ہیں اور چیزیں خریدی اور بیچی جاتی ہیں لیکن یہ سب کچھ اسی وقت ہوتا ہے جب سرمایہ دار طبقہ، جو ذرائع پیداوار کا مالک ہے، ان تمام چیزوں میں اپنا نفع دیکھتا ہے۔ والٹر لپ مین (WALTER LIPMANN) نے ۱۳ر جولائی ۱۹۳۴ء کے ہیرالڈ ٹریبیون میں یہ حقیقت اس طرح بیان کی ہے :۔

> جب تک چھوٹے اور بڑے سرمایہ دار نفع کمانے کی نیت سے تجارتی مہموں میں اپنا سرمایہ نہ لگائیں موجودہ حالات سے نجات پانے کی امید نہ کرنی چاہیئے۔ وہ ایسا کبھی نہ کریں گے ان کی قوم پرستی کا خیال یا خدمتِ خلق کا جذبہ اس اقدام پر آمادہ نہیں کر سکتا۔ وہ یہ قدم صرف اسی وقت اُٹھا سکتے ہیں۔ جب ان کو نفع کمانے کا موقع نظر آئے۔ یہ سرمایہ داری نظام کا زمانہ ہے، اس زمانے کا یہی چلن ہے۔"

پروفیسر ایف۔ اے وون ہے اک (F.A. VON HAYEK) کو بھی لپ مین کی اس رائے سے اتفاق ہے۔ وہ لکھتا ہے :۔

> "موجودہ زمانے کی مبادلتی معاشیات میں کوئی سرمایہ دار کوئی چیز خاص طلب پوری کرنے کے لئے نہیں پیدا کرتا ہے۔ اگرچہ وہ کبھی کبھی اظہار بھی کرتا ہے۔ وہ تو نفع کا پورا تخمینہ لگانے کے بعد قدم اُٹھاتا ہے۔"

پروفیسر ہے اک ممتاز ماہرین معاشیات میں شمار کیا جاتا ہے۔ وہ ابھی زندہ ہے۔ وہ ان معاشیین سے جو معاشیات پر محنت کش طبقے کے نقطۂ نظر سے نگاہ ڈالتے ہیں، بہت سی باتوں سے متفق

نہیں ہے لیکن اس حقیقت سے اُس کو بھی انکار نہیں ہے جو مشینوں کے کل پُرزوں کو چالو رکھتا ہے۔ اس بارے میں وہ فریڈرک اینگلز کا ہم خیال ہے۔ ہم نیچے اینگلز کے ایک خط کا اقتباس پیش کرتے ہیں۔ یہ خط اُس نے ۱۸۸۵ء میں لکھا تھا:۔

"پیداوار بہت کم ہو رہی ہے لیکن اس کی کی وجہ کیا ہے؟ پیدائش کی طاقت اپنی انتہا کو پہنچ کر ختم نہیں ہو گئی ہے۔ پیداوار کی حد بھوکے پیٹوں کا شمار کر کے نہیں مقرر کی جاتی ہے یہ حد تو ان جیبوں کی تعداد پر منحصر ہے جو روپیہ خرچ کر کے ان کو خرید سکتی ہیں۔ بھوکے پیٹ مزدور جن کی جیبیں پیسوں سے خالی ہیں، کوئی نفع دینے کے لائق نہیں ہیں اس لئے وہ خرید بھی نہیں سکتے اور موت کی شرح بڑھانے کے لئے چھوڑ دے جاتے ہیں۔"

تھارسٹن وبلن (THARSTEIN VEBLEN) جو امریکی ماہرین معاشیات کی جماعت میں بڑا آزاد خیال مفکر ہے۔ اپنے مخصوص طنزیہ انداز میں اس حقیقت کا اظہار کرتا ہے:۔

"قدرت کی معاشیات میں تاجروں نے اپنی جگہ صرف نفع کمانے کے لئے بنائی ہے، چیزیں پیدا کرنے کے لئے نہیں۔ تجارت کا کمال یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ نفع بٹورا جائے۔ دنیا میں شاید ہی کوئی ایسی تجارت ہو جس کا خاص مقصد منافع اندوزی نہ ہو۔ تجارت کا نفع صنعتی پیداوار کی راہ سے آتا ہے۔ صنعتیں آزاد نہیں ہیں۔ ان کی رفتار صرف نفع کی امید پر تیز اور سست کی جاتی ہے۔"

مشہور امریکی ماہر معاشیات وزلے سی مائکل نے اپنی کتاب "کاروباری دور" (BUSINE-SS CYCLES) میں لکھا ہے کہ سرمایہ داری نظام میں چیزیں استعمال کے لئے نہیں بلکہ نفع کے لئے تیار کی جاتی ہیں۔ ہم نیچے اس کے بیان کا اقتباس پیش کرتے ہیں:۔

"جہاں تجارتی تنظیم کی گرفت مضبوط ہے۔ پیداوار کے قدرتی ذرائع کو ترقی نہیں دی جاتی مشینی ساز و سامان بیکار پڑا رہتا ہے۔ کارکردگی کی مہارت سے فائدہ نہیں اٹھایا جاتا، سائنس کی ایجادوں کا استعمال نہیں کیا جاتا۔ جب تک حالات بدل نہ جائیں

اور منافع اندوزی کے امکانات واضح نہ ہو جائیں، یہ صورت حال باقی رکھی جاتی ہے۔"

معاشیات کے مختلف حلقوں کے مفکر اس حقیقت سے انکار نہیں کرتے کہ سرمایہ داری نظام میں پیداوار کا عمل، جب تک منافع کی امید نہ ہو، شروع نہیں ہوتا۔ اگر ان ماہروں سے پوچھا جائے کہ آخر ایک خاص وقفے کے بعد وہ دور جب نفع کی امید ختم ہو جاتی ہے کیوں آتا رہتا ہے؟ اس سوال کا جواب ان کو مختلف راہوں پر ڈال دیتا ہے۔ معاشیین کا اتفاق اس پر تو ہے کہ یہ نظام چالو کیوں ہوتا ہے لیکن یہ نظام چلتے چلتے رک کیوں جاتا ہے یہ سوال ان کو اختلاف کے دلدل میں پھنسا دیتا ہے۔ نظام کی ابتری سے مراد بحران کے زمانے میں منافع کا گرنا ہے لیکن آخر اس بحران کا سبب کیا ہے؟ اور یہ ابتری کیوں پیدا ہوتی ہے؟ آؤ اس مسئلہ پر ماہرین معاشیات کی رایوں کا بھی مطالعہ کرتے چلیں۔

ابھی تک ایسے ماہرین اقتصادیات کی کمی نہیں ہے جو اس بحران کا، جو پچھلی صدی سے بار بار اور ایک خاص انداز سے آتا رہا ہے مطالعہ کرتے ہیں اور پھر بھی اس کے وجوہ اس کے اندر نہیں بلکہ اس کے باہر تلاش کرنا چاہتے ہیں۔ پروفیسر مائکل بھی اسی خیال کا آدمی ہے۔ وہ لکھتا ہے:-

> "بعض ماہرین اقتصادیات کوئی ایسا نظریہ دریافت کرنے سے ناامید ہو گئے ہیں جو اس بحران کا، جو ایک ہی طرح آتا رہتا ہے، کوئی تجزیہ کر سکے۔ ان لوگوں کے نزدیک بحران ایک غیر معمولی واقعہ ہے جو بعض اسباب کی وجہ سے (جو خلل انداز ہوتے رہتے ہیں) ظہور پذیر ہوتا ہے۔ ان اسباب میں بعض انقلابی ایجادیں، اتمناعی محصولوں کی تجدید، مالی تغیرات، فصلوں کی خرابی اور رسم و رواج کی تبدیلیاں شامل ہیں۔ اس کا یہ مطلب ہے کہ ہر بحران اپنا ایک مستقل اور علیحدہ سبب رکھتا ہے جس کو صرف دو ایک سال پہلے تلاش کرنا چاہئے۔"

معاشئین کے دوسرے گروہ کے نزدیک بحران کا سبب طبعی ہے۔ ڈبلیو اسٹینلے جیونس (W. STANLEY JEVONS) نے ۱۸۷۵ء میں کہا کہ سورج پر دھبے، ہندوستان میں قحط اور انگلستان میں بحران یہ تینوں واقعات ایک ہی زمانے میں پیش آئے تھے۔ ان کا آپس میں ایک دوسرے سے کیا تعلق ہے؟ ذرا گہرے مطالعہ کرنے کی ضرورت ہے۔ سورج کی کرنیں موسم پر اثرانداز ہوتی ہیں، موسم کا اثر فصل پر پڑتا ہے اور اچھی یا بری فصل کسان کی آمدنی گھٹاتی یا بڑھاتی ہے اور یہ اتار چڑھاؤ مصنوعات کی طلب پر اثرانداز ہوتا ہے۔ اس کا تو یہ مطلب نکلا کہ ان تمام حالات کی ذمہ داری سورج پر عائد ہوتی ہے۔

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس گناہ کا الزام زہرہ ستارے کے سر تھوپا جائے۔ ہنری ایل مور (HENRY L. MOORE) جو "ہشت سالہ نتیجہ خیز دور" کے نظریہ[1] کا دریافت کرنے والا ہے یہی خیال کرتا ہے۔ آخر زہرہ پر یہ الزام کیوں لگایا جائے؟ یہ سیارہ ہر آٹھویں سال زمین اور سورج کے درمیان آجاتا ہے اور سورج کی کرنوں کا بڑا حصہ زمین تک نہیں پہونچ پاتا۔

یہ تو بحران کے طبعی اسباب تھے کیمبرج کا ماہر اقتصادیات پروفیسر اے سی پیگو (A.C.PIGOU) اس جماعت کا سرگروہ ہے جو بحران کے نفسیاتی اسباب دریافت کرنے کا دعویٰ کرتی ہے صنعت کے رہنماؤں کی غلط امیدیں اور ان کی بے بنیاد مایوسیاں، اس ابتری کا موجب ہوتی ہیں۔

پروفیسر پیگو کے نزدیک تاجروں کی امیدوں کا گھٹنا اور بڑھنا صنعت کی ترقی اور اس کے تنزل کا اصل سبب ہے، جب حالات اچھے ہوتے ہیں تاجروں کو زیادہ کمانے کی امید ہوتی ہے وہ پیداوار کا حلقہ بڑھانے کی طرف ہمہ تن متوجہ ہو جاتے ہیں۔ وہ بینکوں سے قرض لیتے ہیں اور اپنے کارخانوں کو نئے ساز و سامان سے آراستہ کرتے ہیں، ان کی توسیع کرتے ہیں اور نئی مشینیں خرید خرید کر نصب کرتے ہیں۔

جب تک یہ امیدیں قائم رہتی ہیں تاجروں کو قرض لینے پر آمادہ کرتی رہتی ہیں۔ وہ بینکوں

---

[1] THEORY OF EIGHT-YEAR GENERATING CYCLES

سے روپیہ لیتے ہیں اور اس طرح براہ راست سود کی شرح بڑھا دیتے ہیں اور بالواسطہ قوت خرید بڑھا کر چیزوں کی قیمتیں بڑھا دیتے ہیں۔"

ان بڑھی ہوئی امیدوں کے دور میں جو چیزیں پیدا کی جاتی ہیں اُن کو بازار کے حالات کا مقابلہ بھی کرنا پڑتا ہے۔ کیا وہ ان بڑھی ہوئی قیمتوں پر بازار میں فروخت ہو سکیں گی؟ نہیں، کبھی نہیں رفتہ رفتہ یہ بات سمجھ میں آنے لگے گی کہ یہ بڑھی ہوئی امیدیں حق بجانب نہ تھیں، ایک گہری نفسیاتی بے اعتمادی اور ناامیدی بازار پر چھا جائے گی اور پیدائش کا عمل بھی سست ہو جائے گا:۔

"بڑھی ہوئی امید کی غلطی صنعتی پیداوار کی رفتار تیز کر دیتی ہے۔ اس زمانے میں جو چیزیں تیار ہوتی ہیں وہ بازار کا رُخ کرتی ہیں۔ جب تک ان کے بننے کی رفتار تیز رہتی ہے، ایک غیر معمولی حرکت جاری رہتی ہے لیکن جب ان امیدوں کے نتائج بازار میں پہونچتے ہیں اور بازار کے حالات کا مقابلہ نہیں کر پاتے ایک عام مایوسی پھیل جاتی ہے۔ جب چیزوں کی بڑی تعداد بازار میں اپنی جگہ نہیں پاتی اعتماد مجروح ہو جاتا ہے اور پتہ چلتا ہے کہ بڑھی ہوئی امیدوں نے زبردست نفع کا جو سبز باغ دکھایا تھا وہ صحیح نہیں تھا۔ اب غلطی ہر طرف تسلیم کی جاتی ہے اور اس کے نتیجے میں تجارتی عمل کی رفتار سست ہو جاتی ہے"۔

اب غیر معمولی امید کی جگہ غیر معمولی ناامیدی لے لیتی ہے اور پیداوار کی رفتار بہت سُست ہو جاتی ہے۔ صنعت میں لوگ سرمایہ لگانا چھوڑ دیتے ہیں۔ اب جو چیزیں بازار میں آتی ہیں وہ پہلے کے اسٹاک سے نکال کر لائی جاتی ہیں لیکن کچھ عرصے کے بعد طلب پھر بڑھ جاتی ہے اور نفع کی شرح پھر زیادہ ہو جاتی ہے۔ تجارت پیشہ لوگوں کے چہروں پر رونق آجاتی ہے اور غیر معمولی امید پھر جنم پاتی ہے۔

پیگو اور نفسیاتی اسکول کے دوسرے ماہرین معاشیات (جو تاجروں کی امیدوں کو تجارتی سرد اور گرم بازاری کی بنیاد سمجھتے ہیں) کی رائیں ذیل کے اقتباس سے اچھی طرح

واضح ہو جائے گی۔

"بالفعل اس کی تحقیق کئے بغیر کہ یہ امیدیں کیسے پیدا ہوتی رہتی ہیں ہم کہتے ہیں کہ ان امیدوں کے سوا صنعتی تجارت کے گھٹاؤ بڑھاؤ کا دائمی اور فوری سبب یا پیش خیمہ کوئی اور دوسرا نہیں ہے۔"

بعض ماہرین معاشیات کے نزدیک پرانی مثل "روپیہ ہی تمام خرابیوں کی جڑ ہے" ایک دائمی حقیقت ہے۔ ان کے نزدیک ہمارا نظام مبادلہ اور نظام مالیات بہت ناقص ہے۔ وہ اس ناقص نظام کی اصلاح چاہتے ہیں۔ پروفیسر جے۔ ایم کینیس (KEYNES) جو روپے کی تنظیم (REGULATION OF MONEY) کے نظریے کا ممتاز شارح ہے لکھتا ہے:۔

بے روزگاری، مزدور کی تباہ حالی، بڑھی ہوئی امیدوں کا مایوسانہ انجام، سرمایوں کا فوری نقصان اور افراد کی بڑھی ہوئی تباہیاں، سٹہ بازوں، منافع خوروں کی بربادی ان سب کی وجہ "قدر کے معیار کی ناپائداری ہے۔"

مذکورہ بالا اقتباس میں آخری فقرہ "قدر کے معیار کی ناپائداری" توجہ کے لائق ہے، ہم کو اپنے سکے کی ناپائداری کا یقین دلانے کے لئے کوئی ثبوت تلاش کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمارا تجربہ بھی ہم کو اس کی قیمت کے عدم استحکام کا یقین دلاتا ہے۔ خرید و فروخت کرنے والے اچھی طرح جانتے ہیں کہ ایک مہینے میں ایک ڈالر سے جتنا مکھن خریدا جاتا ہے۔ دوسرے مہینے میں اسی ڈالر سے اتنا مکھن نہیں خریدا جا سکتا۔ ہم نے لوگوں کو اکثر یہ کہتے ہوئے سنا ہے "ڈالر کی قیمت پہلے کے مقابلے میں کم (یا زیادہ) ہو گئی ہے۔ میں جب پہلے برس میں تھا مجھ کو اپنے ڈالر کے پچیس فرانک ملتے تھے لیکن اس سال مجھ کو صرف سترہ فرانک ملے۔"

ہم کو معاشیات کی ابتدائی کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ روپیہ مبادلہ کا ذریعہ ہے۔ "تنظیم زر" کے ماہرین کہتے ہیں کہ اپنے عدم استحکام کی وجہ سے روپیہ مبادلے کا ایک برا ذریعہ ہے۔" دوسرے پیمانوں کی طرح یہ اپنی جگہ برقائم نہیں ہے۔ ایک درجن سے بارہ چیزیں مراد ہیں

یہ ممکن نہیں ہے کہ ایک دن درجن میں پندرہ چیزیں شامل ہوں اور دوسرے دن آٹھ۔ لیکن ہمارے یہاں زر کی اکائی گھٹتی بڑھتی رہتی ہے۔ یہ بات اچھی نہیں ہے۔ یہ ماہرین معاشیات اس کی اصلاح کا مطالبہ کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر قرض کے اجرا اور زرائج الوقت سکوں پر قابو کرلیا جائے تو مصنوعات کی مقدار اور اُس روپے میں جو خریداروں کی جیب میں ہے مستحکم تناسب پیدا ہو جائے گا۔

صنعت کی ترقی اور پیداوار کی توسیع کے ساتھ ساتھ تجارتی اشیا کی نکاسی بڑھ جاتی ہے، روپے کی وہ مقدار بھی، جو گردش میں ہے اسی مناسبت سے بڑھنی چاہئے۔ اگر اس روپے میں اور چیزوں کی اُس مقدار میں جو بازار میں موجود ہے مطابقت نہ ہوئی تو چیزوں کے دام بڑھ جائیں گے۔ اگر بازار میں پانچ سو قمیصیں ہوں اور خریدار ان کی خریداری پر پانچ سو ڈالر خرچ کر سکتے ہوں تو ہر قمیص ایک ڈالر میں فروخت ہو جائے گی لیکن اگر قمیصیں بنانے والے ترقی یافتہ مشینیں استعمال کریں اور پانچ سو کے بجائے بازار میں ایک ہزار قمیصیں بھیج دیں لیکن اس روپے کی مقدار میں جو خریداروں کی جیب میں ہے کوئی تغیر نہ ہو تو قمیصوں کی قیمتیں گر جائیں گی اور ایک قمیص ایک ڈالر کے بجائے صرف پچاس سینٹ میں بکے گی

معاشیات زر کے ماہرین کہتے ہیں کہ بحران قیمتوں کی عام سطح سے اوپر چڑھنے اور نیچے اترنے کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ روپے کی اُس مقدار میں کمی اور زیادتی کی وجہ سے، جو گردش میں آتی ہے، یہ صورت حال پیدا ہوتی ہے جب تجارت کی گرم بازاری ہوتی ہے روپیہ بہت تیز رفتاری سے گردش کرتا ہے اور بینک بڑی لمبی لمبی رقمیں قرض دیتے ہیں۔ کوئی شبہ نہیں وہ ان رقموں پر سود بھی شرح بڑھا کر لیتے ہیں لیکن سود کی زیادتی کارخانہ دار کو پیداوار سے باز نہیں رکھ سکتی۔ وہ تجارت کی بے اندازہ توسیع اپنی نگاہوں سے دیکھتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اس گرم بازاری سے فائدہ اُٹھا کر زیادہ سے زیادہ نفع پیدا کرلیں۔ اس طرح خوش حالی کی یہ لہر گرم بازاری کی موجب ہوتی ہے۔

جب یہ صورت پیش آتی ہے قرض پر قابو رکھنے والے —— بینک —— کچھ گھبرانے

لگتے ہیں اور سوچنے لگتے ہیں کہ قرض کی مقدار اپنی حد سے آگے نکل گئی ہے۔ وہ کہنے لگتے ہیں کہ قدریں بہت بڑھ گئی ہیں۔ ان کے حوصلے پست ہو جاتے ہیں وہ نئے قرض دینا بند کر دیتے ہیں اور پچھلے قرض کی واپسی کا مطالبہ شروع کر دیتے ہیں لیکن قرض کی واپسی کارخانہ داروں کے بس میں نہیں ہوتی۔ ان کی اکثریت قرض کی رقم ادا نہیں کر پاتی ان کا روپیہ کاروبار میں لگا ہوتا ہے اور اس وقت تک وہ اتنا پیدا کر نہیں پاتے کہ بینک کی رقمیں واپس کر سکیں۔ جب وہ قرض ادا نہیں کر پاتے "دیوالیے" ہو جاتے ہیں۔ ان کے کارخانے بند ہو جاتے ہیں، ان کے ملازمین الگ ہو جاتے ہیں اور مصیبت آگے بڑھ کر ایک اور بڑے وسیع حلقے کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔ خام مال پیدا کرنے والے اپنے مال کی کوئی طلب نہیں پاتے اور جو مزدور کام سے الگ ہو جاتے ہیں وہ اپنی ضروریات کی چیزوں کی خریداری سے مجبور رہتے ہیں۔ پیداوار کی سست رفتاری، طلب کا خاتمہ اور قیمتوں کی غیر معمولی کمی قومی معاشیات کے پورے میدان پر وبا کی طرح چھا جاتی ہیں۔ لوگ سرمایہ لگاتے ہوئے ڈرتے ہیں۔ بینک قرض بانٹنے سے گھبراتے ہیں اس لئے بینکوں میں روپئے کے ڈھیر لگتے ہیں لیکن ان کو کوئی صنعت اور تجارت میں لگانے کی ہمت نہیں کرتا۔

معاشیات زر کے ماہرین کہتے ہیں کہ اگر تاجروں کو قیمتوں کے چڑھنے کی توقع نہ ہو تو وہ بینکوں سے اتنی بڑی مقدار میں قرض نہ لیں۔ کارخانہ دار لمبی شرح سود سے قرض صرف اس امید پر لیتے ہیں کہ قیمتوں میں کافی اضافہ ہوگا اور وہ اتنا لمبا سود ادا کر کے بھی کافی نفع کما لیں گے اگر قیمتیں اپنی جگہ پر پائداری سے قائم رہیں وہ اتنی دیوانگی سے پیداوار کی توسیع کی طرف نہ دوڑیں۔ ان تمام خرابیوں کے علاج کے لئے یہ ماہرین اقتصادیات تسلیم کرتے ہیں کہ زر کی اکائی کا ایک معیار، جو پیداوار کی نکاسی اور اس کی کمی بیشی سے مطابق رہے مقرر کر دیا جائے۔ ایلے (YALE) یونیورسٹی کے پروفیسر اروِنگ فشر (IRWING FISHER) نے ڈالر متوازن (COMPENSATED-DOLLAR) کی تجویز پیش کی ہے۔ اُس کا خیال ہے کہ اس تدبیر سے اس دشواری پر کامیابی حاصل کی جا سکے گی۔ اس سکے سے چیزوں سے بھری جو ٹوکری کل خریدی گئی تھی وہی آج اور کل بھی خریدی

جا سکے گی۔

فشر اور کینس کہتے ہیں کہ جب ایک مکمل نظامِ زر دریافت کیا جا سکتا ہے، ناقص نظام کے استعمال پر اڑے رہنا احمقانہ بھی ہے اور خطرناک بھی۔ پروفیسر کینس کہتا ہے :۔

"انفرادیت کی اس مہلک بیماری (قیمتوں کے گرم اور سرد بازاری کے زمانے میں گھٹنے اور بڑھنے) کا علاج یہی ہے کہ رائج الوقت سکّوں اور قرض پر قابو حاصل کیا جائے تاکہ کوئی ایسی یقینی توقع کہ قیمتیں بڑھنے جا رہی ہیں یا گھٹنے، قائم نہ کی جا سکے......... ہم قدر کے معیار کو ان چیزوں میں شامل کر کے نظر انداز نہیں کر سکتے، جن کی کم و بیش خصوصیات موسم، شرح اموات اور دستور میں پائی جاتی ہیں اور جن کے علاج کے لئے قدرتی اسباب، متعدد افراد کی علیحدہ علیحدہ جدوجہد یا انقلاب کی ضرورت پڑتی ہے۔"

دوسرے معاشیین یہ خیال نہیں کرتے کہ سکہ رائج الوقت کا ایسا مناسب استعمال جو اس کو پیداوار کی نکاسی کے مطابق کر دے، کوئی اچھی چیز ثابت ہوگا۔ پروفیسر ہے اک اختلاف کرتے ہوئے لکھتا ہے :۔

"یہ خیال جو عام طور سے پیش کیا جاتا ہے کہ پیداوار کی زیادتی یا کمی کے ساتھ سکہ رائج الوقت کو مطابقت پیدا کرنی چاہئے صحیح نہیں ہے۔ اس وقت جب پیداوار میں اضافہ ہو رہا ہو قیمتوں کا گرنا اور سکے کی مقدار کا اپنی جگہ پر قائم رہنا صرف غیر مضر ہی نہیں بلکہ بڑی حد تک پیداوار کو غلط راہ پر پڑنے سے بچانے کا ایک ذریعہ بھی ہے۔"

بحران کے متعلق ان تمام نظریات سے زیادہ جان اے، ہابسن (JOHN A. HOBSON) کا نظریہ عام طور سے پسند کیا گیا۔ وہ کہتا ہے کہ فارغ البالی کے دور میں سرمایے کا نفع جتنا بڑھتا ہے مزدوروں کی اجرت اتنی نہیں بڑھتی۔ دولت مندوں کی دولت ناقابلِ یقین حد تک بڑھ جاتی ہے ان کی آمدنی میں بھی اضافہ ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے اوپر کتنا ہی زیادہ خرچ کریں ان کی دولت میں کمی نہیں آتی۔ جو رقم وہ خرچ نہیں کر پاتے وہ جمع ہوتی رہتی ہے اور ان کی یہ بے اندازہ دولت

صنعت میں لگادی جاتی ہے۔ پیدائش کے سازوسامان اور پیداوار کی صلاحیت میں بڑا زبردست اضافہ ہوتا ہے تاکہ تجارتی مال پیدا کیا جاسکے، نیا اور اچھا سازوسامان اپنا کام کرتا ہے، تجارتی سامان کا ایک سیلاب کارخانوں سے امنڈکر بازاروں میں آجاتا ہے لیکن مزدوروں کو اتنی مزدوری نہیں ملتی کہ وہ اس بڑھی ہوئی پیداوار سے فائدہ اٹھاسکیں۔ یہ چیزیں نہیں بکتیں اور گوداموں اور اسٹاک کے کمروں میں بند پڑی رہتی ہیں قیمتیں تباہ کن حد تک گرجاتی ہیں اور پیداوار غیر نفع بخش ہوکر رہ جاتی ہے۔ جب یہ صورت حال پیدا ہوتی ہے پیداوار کی رفتار کم کردی جاتی ہے اور اس کے نتیجے میں بیکاری، کساد بازاری اور دولت مندوں کی آمدنیوں میں کمی پیدا ہوجاتی ہے، کل تک دولت کے جو ڈھیر اکٹھا ہوتے چلے جاتے تھے اب ان کا جمع ہونا رک جاتا ہے۔

رفتہ رفتہ ان اشیاء کے ڈھیروں تک استعمال کرنے والوں کے ہاتھ پہونچتے ہیں، جو کارخانے ابھی تک چلتے رہے ہیں وہ محسوس کرنے لگتے ہیں کہ ترقی یافتہ سازوسامان کے بغیر کام نہیں چلاسکتے رفتہ رفتہ پیداوار کی رفتار پھر تیز ہوجاتی ہے اور فارغ البالی، گرم بازاری، بحران اور کساد بازاری کا دور گھوم پھر کر پھر ہمارے سامنے آجاتا ہے۔

جو لوگ دولت اور غربت کے انتہائی فرق سے دل برداشتہ ہیں ان کو ہابسن کا یہ تجزیہ صحیح معلوم ہوگا۔ اس کے خیال کو "زیادہ بچت" (OVER SAVING) کے نظریے سے موسوم کیا جائے یا دوسرے نقطہ نظر سے اس کو "کم استعمال کا نظریہ" (UNDER-CONSUMPTION) کہا جائے گھوم پھر کر بات یہی سمجھ میں آتی ہے کہ دولت کی غیر مساوی تقسیم ان بحرانوں کا اصل سبب ہے۔ ہابسن کہتا ہے:۔

"ان زائد بچتوں پر کسی قسم کا ٹیکس نہیں لگایا جاتا ہے اور یہ ہمارے اقتصادی نظام میں ایک غیر معقول اور تباہ کن عامل کی حیثیت سے باقی رہتی ہے۔ یہ ایک ایسی آمدنی ہے جس کے جواز کے لئے کوئی اخلاقی یا معاشی دلیل نہیں پیش کی جاسکتی ہے۔ ان کے خرچ کی ضرورت نہ پڑنے کی وجہ سے یہ آمدنیاں جمع ہوتی رہتی ہیں اور کاروبار میں ضرورت نہ ہونے کے

باوجود لگادی جاتی ہیں۔ یہی نہ کمائی ہوئی بچت صنعتوں کے جمود، قیمتوں کی کمی اور بیکاری کا (جسے تجارتی کساد بازاری کا نام دیا گیا ہے) باعث ہے

"ان صنعتوں میں جو کساد بازاری اور بے روزگاری کی طرف مائل ہو رہی ہیں، مزدوروں اور عوام کی قوت خرید اور استعمال بڑھانے کے لئے فاضل آمدنی کا استعمال بہت ضروری ہے اگر مزدوروں اور عام لوگوں کی قوت خرید بڑھ جائے تو یہ عدم توازن جو مزمن ہو چکا ہے دور ہو سکتا ہے۔ جب مزدوروں اور عوام کی خریداری اور استعمال کی طاقت پوری طرح بڑھ جائے گی وہ ذرائع پیداوار کی وسعت کے ساتھ قدم بڑھا سکیں گے۔ عوام کی آمدنی مزدوری کی شرح بڑھا کر بھی بڑھائی جا سکتی ہے اور سماجی خدمات میں اضافہ کر کے بھی یہ خرابی دور کی جا سکتی ہے۔ بحران کے زمانے میں کساد بازاری اور بے روزگاری دور کرنے کی یہی تدبیر ہے۔"

ہابسن نے اپنے خیالات کی ترجمانی بہت اچھی طرح سے کی ہے۔ ہمارے چاروں طرف ایک عالم پریشان حالی پھیلی ہوئی ہے۔ یہ دردانگیز حالات ہم کو مجبور کرتے ہیں کہ ہم ہابسن کی بات مان لیں اور تسلیم کر لیں کہ اجرت کی بڑھی ہوئی شرح اور سماجی خدمت کے علتے کی توسیع سے حالات کی اصلاح ہو جائے گی لیکن ہابسن کی پوری بات ماننے کے لائق نہیں ہے۔ یہ حقیقت پیش نظر رہنی چاہیے کہ سرمایہ داری نظام میں منافع کے سوا پیداوار سے کچھ اور مقصود نہیں ہے۔ ہابسن کہتا ہے کہ چونکہ سرمایہ دار کاروبار میں بہت زیادہ سرمایہ لگا دیتے ہیں اور مزدوروں کو اتنا کافی معاوضہ نہیں ملتا کہ وہ بہت زیادہ سرمایے سے پیدا کی ہوئی مصنوعات خرید سکیں اس لئے منافع کی شرح گر جاتی ہے۔

پروفیسر ہے اک کے نزدیک ہابسن کا خیال صحیح نہیں ہے۔ اُس کا خیال ہے کہ چونکہ سرمایہ دار کافی سرمایہ نہیں لگاتے اس لئے نفع کی شرح گر جاتی ہے۔ وہ سماجی خدمات کی توسیع کا مخالف ہے وہ مزدوروں کے معاوضے کی شرح بھی بڑھانا نہیں چاہتا۔ وہ کہتا ہے :-

"حکومت کا مخصوص اقدام اشیائے پیداوار (PRODUCER'S GOODS) کے بجائے

اشیائے صرف (CONSUMERS GOODS) کی طلب بڑھا دیتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہو سکتا ہے کہ سرمایہ داری نظام پیداوار مسلسل تبدیلیوں کا شکار ہو جائے اور اس طرح بہت عرصے تک چھایا رہنے والا جمود طاری ہو جائے .... صارفین کو قرض دینے کا مسئلہ بڑے زور شور سے اٹھا ہے اور بہت وثوق سے کہا جا رہا ہے کہ کساد بازاری کے دور کرنے کی یہی واحد تدبیر ہے لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ اس تدبیر کا اثر بھی اُلٹا ہوگا۔ اشیائے صرف کی طلب میں اعتباری اضافہ حالات کو اور بھی خراب کر دے گا۔"

پروفیسر ہے اک کا نظریہ بہت الجھا ہوا ہے یہ ممکن نہیں ہے کہ چند صفحوں میں اُس کی تشریح کا حق ادا کیا جا سکے لیکن ہمارے لئے اتنا سمجھ لینا کافی ہے کہ ہابسن اور ہے اک دبحران کے زمانے میں) نفع گرنے کے وجوہ و اسباب کے بارے میں ایک دوسرے کے خلاف رائے رکھتے ہیں اور اس صورت حال کے علاج کے لئے بھی دونوں دو مختلف نسخے تجویز کرتے ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ وہ دونوں صحیح بات بھی کہتے ہیں اور غلط بھی۔ ہابسن کا یہ دعویٰ صحیح ہے کہ معاوضہ کی بڑھی ہوئی شرح اور سماجی خدمات کی توسیع سے تجارتی اشیاء کی بڑھی ہوئی رسد کے لئے بازار میں ضروری گنجائش پیدا ہو جائے گی لیکن اُس کا یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ اجرت کی شرح بڑھا کر پیداوار کے فوری نفع میں کوئی کمی کی جا سکے گی۔ ہے اک صحیح کہتا ہے کہ اجرت کی کم شرح اور سماجی خدمات کی تجدید پیداوار کا فوری نفع بڑھا دے گی لیکن اُس کا یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ مزدوری کی شرح میں کمی تجارتی اشیاء کی بڑھی ہوئی رسد کے بازار کو نقصان پہونچائے گی۔ ہابسن عوام کی قوت خرید بڑھا کر بازار کو نفع بخش انداز پر رونق بخشنا چاہتا ہے لیکن ہے اک عوام کی قوت خرید گھٹا کر (اجرت کی شرح میں کمی کر کے) منافع کا بازار سجانا چاہتا ہے۔

لیکن کارل مارکس کی تعلیمات کو صحیح سمجھنے والے سرمایہ داری کی اس دہری مشکل کا کوئی حل نہیں پاتے، وہ کہتے ہیں کہ سرمایہ داری ان دونوں شکلوں کو ساتھ ساتھ نباہ نہیں سکتی۔ وہ دعویٰ کرتے ہیں کہ بحران سرمایہ داری نظام کا لازمی نتیجہ ہے۔ دوسرے ماہرین معاشیات کے نزدیک ان

دشواریوں کی کوئی نہ کوئی وجہ ہے اور وہ مدعی ہیں کہ ان کی تجویزوں پر عمل کر کے ان دشواریوں پر قابو پایا جا سکتا ہے لیکن مارکس کہتا ہے کہ سرمایہ داری نظام کے اندر رہ کر ان پریشانیوں کا کوئی علاج نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے نزدیک ان الجھنوں سے نجات پانے کے لئے سرمایہ داری نظام سے چھٹکارا پانا ضروری ہے۔

مارکس نے بحران کا جو تجزیہ کیا ہے وہ اس کے پورے نظریہ کا ایک لازمی جزو ہے، اس کا سرمایہ داری پیداوار کا نظریہ اور اس کا وہ نظریہ جو اس نظام کی تباہی کے وجوہ و اسباب سے بحث کرتا ہے در اصل دونوں ایک ہیں اور دونوں ایک ہی بنیاد سے ابھرتے ہیں۔

سرمایہ داری نظام کی پیداوار کا خاص مقصد نفع کمانا ہے۔ مارکس نے یہ پتہ لگا لیا کہ خود اس نظام کے اندر نفع کے گرنے کے رجحانات پائے جاتے ہیں۔ اس صورت حال کا وقوع محض اتفاقی نہ ہوگا بلکہ ایسا ہونا بالکل یقینی ہے۔ سرمایہ داری نظام پیدائش کی ساخت ہی اس کا واحد سبب ہے آؤ ہم غور کریں کہ ایسا کیوں ہوگا؟ (بڑا اچھا ہو اگر مارکس کا محنت کا نظریہ قدر پھر غور سے پڑھ لیا جائے دیکھو باب "دنیا کے مزدور و ایک ہو جاؤ صفحہ ۳۰۸ تا صفحہ ۳۲۷)

مارکس سرمایے کو دو حصوں میں تقسیم کرتا ہے مستقل سرمایہ اور تغیر پذیر سرمایہ "مستقل سرمایہ" وہ سرمایہ ہے جو مشینوں، کلوں، اوزاروں اور خام مال پر صرف کیا جاتا ہے "تغیر پذیر سرمایہ" وہ سرمایہ ہے جو محنت کی خریداری پر صرف کیا جاتا ہے "مستقل سرمایہ" اس نام سے صرف اس وجہ سے پکارا جاتا ہے کہ پیداوار کے سلسلے میں اس کی قدر اپنی جگہ برقائم رہتی ہے اور پیداوار کی آخری منزل تک اس میں کوئی کمی بیشی نہیں ہوتی۔ تغیر پذیر سرمایے کے نام کی وجہ یہ ہے کہ پیداوار کے دوران میں اس کی قدر بدلتی رہتی ہے اور آخری منزل میں اس کی قدر اس کی ابتدائی قدر سے مختلف ہو جاتی ہے۔ مستقل سرمایہ عظیم ہے وہ پیداوار کے دوران میں کوئی نئی قدر نہیں پیدا کرتا لیکن تغیر پذیر سرمایہ بار آور ہے اور پیدائش کے دوران میں نئی قدروں کی تخلیق کا باعث ہوتا ہے۔ وہی تغیر پذیر سرمایہ ہے جو اپنی قیمت سے زیادہ قدر ("فاضل قدر") کی تخلیق کرتا ہے۔ یہی وہ تغیر پذیر سرمایہ

(محنت کی زندہ طاقت) ہے جس سے نفع حاصل کیا جاتا ہے۔

صنعت میں سرمایہ دارانہ سرمایہ اس طرح تقسیم ہوگا:-

ک (کل سرمایہ) = م (مستقل سرمایہ) + ت (تغیر پذیر سرمایہ) اب دیکھنا یہ ہے کہ ک کا کتنا حصہ م میں اور کتنا ت میں لگایا جائے گا۔ مارکس کے اس دعویٰ سے شاید کسی کو اختلاف نہ ہوگا کہ سرمایہ داری کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ ک (کل سرمایے) کا بڑا حصہ جو برابر بڑھتا رہتا ہے، م (مستقل سرمایہ) میں لگتا رہتا ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ موجودہ صنعت میں نئی اور اچھی مشینیں برابر استعمال میں آتی رہتی ہیں۔ یہ مشینیں، کوئی شبہ نہیں معجزہ کار ہوتی ہیں لیکن ان کی خریداری پر بڑی لمبی رقمیں خرچ ہوتی ہیں۔ یہ مشینیں مزدوروں کو بے دخل کر دیتی ہیں۔ اس کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ ت (تغیر پذیر سرمایہ) م (مستقل سرمایے) کے مقابلہ میں برابر گھٹتا جاتا ہے اور اس کے برعکس م (مستقل سرمایے) کا تناسب بڑھتا جاتا ہے۔

مختصراً یوں کہا جا سکتا ہے کہ $\frac{\text{ت}}{\text{ک}}$ گھٹتا ہے

جب کہ $\frac{\text{م}}{\text{ک}}$ بڑھتا ہے

یہ حقیقت کہ مستقل سرمایہ نسبتہً بڑھ رہا ہے اور تغیر پذیر سرمایہ گھٹ رہا ہے اپنی جگہ پر بہت اہم ہے۔ تم جانتے ہو کہ صرف ت ہی وہ سرمایہ ہے جو فاضل قدر ـــــ یعنی ـــــ منافع کا ذریعہ ہے۔ اس کا تو صاف مطلب یہی ہوا کہ جب ت گھٹے گا منافع کے گرنے کے رجحانات واضح ہو جائیں گے جب م کا تناسب بڑھ کر ک سے قریب تر ہو جائے گا۔ مارکس کے نزدیک اُس وقت فاضل قدر کی وہی شرح، محنت کی اُسی مقدار کے ساتھ بھی نفع کی شرح میں کمی کا باعث ہوگی۔ سرمایے کی ترکیب میں یہ تغیر پیداوار کے کسی ایک حلقے تک محدود نہیں رہتا ہے بلکہ کم و بیش ہر میدان میں یہی صورت پیش آتی رہتی ہے۔ اس لئے اگر فاضل قدر کی شرح نہیں بڑھتی اور مستقل سرمایے کا تناسب تغیر پذیر سرمایے کے مقابلے میں بڑھتا رہتا ہے تو رفتہ رفتہ منافع کی اوسط شرح ضرور گرتی جائے گی۔

منافع کی شرح کا گرنا بڑا پریشان کن مسئلہ ہے۔ سرمایہ داری کا مقصد اس کے سوا کچھ اور نہیں ہے کہ جہاں تک ہو سکے زیادہ سے زیادہ منافع بٹورا جائے۔ یہ صورت حال اس مقصد کے لئے بہت خطرناک ہے لیکن سرمایہ داروں کے لئے اس اُلجھن سے نکل بھاگنے کی ایک عارضی تدبیر ہے۔ وہ معلوم کر لیتے ہیں کہ اگرچہ نفع کی شرح گر رہی ہے لیکن نفع کی مقدار بڑھا لینے کی ایک شکل ممکن ہے۔ نیچے ایک مثال دی جاتی ہے (اس مثال میں فاضل قدر ف سے دکھائی گئی ہے۔ ہم یہ فرض کئے لیتے ہیں کہ فاضل قدر کی شرح ہر صورت میں سو فی صدی ہے:۔

ک	م	ت	ف
۱۵۰۰ ڈالر	۱۰۰۰	۵۰۰	۵۰۰
۴۰۰۰	۳۰۰۰	۱۰۰۰	۱۰۰۰

تغیر پذیر سرمایہ (ت) ہی فاضل قدر (ف) کی پیداوار کا باعث ہوتا ہے۔ اس لئے فاضل قدر ہی تغیر پذیر سرمایے کے ساتھ متلازم (ف/ت) ہوتی ہے۔ اور نفع اُسی مقدار سے حاصل ہوتا ہے جو مزدور کی اجرت (ت) پر خرچ کی گئی ہے لیکن سرمایہ دار اس منافع کو کل سرمایہ (ک) کا نفع (ف/ک) قرار دیتا ہے۔ جو مثال اوپر دی جا چکی ہے اُس میں منافع کی شرح ۵۰۰ ڈالر/۱۵۰۰ ڈالر یعنی ۳۳ ۱/۳ فی صدی ہے۔ دوسری مثال میں یہ نفع ۱۰۰۰ ڈالر/۴۰۰۰ ڈالر یعنی ۲۵ فیصدی ہو گیا ہے اگرچہ نفع کی شرح گر گئی ہے لیکن نفع کی مقدار ۵۰۰ ڈالر سے بڑھ کر ۱۰۰۰ ڈالر ہو گئی ہے۔

نفع کی مقدار بڑھانے کے لئے کیا تدبیر اختیار کرنی پڑی ہے؟ تغیر پذیر سرمایہ جو منافع کا باعث ہے دوگنا کیا گیا۔ پیداوار کی موجودہ تکنیک یہی ہے کہ مستقل سرمایے میں تغیر پذیر سرمایے کے مقابلے میں برابر اضافہ ہوتا رہے۔ اس لئے جب تغیر پذیر سرمایہ (ت) دُگنا کیا گیا، مستقل سرمایہ (م) تین گنا کر دیا گیا۔ اصل اُلجھن یہیں چھپی ہوئی ہے۔ منافع کی مقدار بڑھانے کے لئے سرمایے کی بڑی سے بڑی مقدار اکٹھا کرنی پڑتی ہے، اس معاملے میں وہ بالکل بے بس ہیں۔ سرمایے کا بڑھنا جیسے ہی رُکتا ہے منافع کی مقدار اور شرح دونوں گر جاتی ہیں۔ ہر سرمایہ دار اس حقیقت سے اچھی طرح واقف ہے

بازار کے مقابلے نے اس کو سکھا رکھا ہے کہ وہ یا تو شکست قبول کرے یا اپنا روپیہ بچا بچا کر پھر کاروبار میں لگاتا رہے۔ اُس کو لگاتار سرمایہ بڑھانے کی فکر میں لگا رہنا چاہئے تاکہ وہ گرتے ہوئے منافع کی شرح سے پیچھا چھڑا سکے۔

نیک نیت ماہرین معاشیات، جو مزدوری کی شرح بڑھا کر اس صورتِ حال کا علاج کرنا چاہتے اس نکتے کو نظر انداز کر گئے۔ سرمایہ دار خوب جانتا ہے کہ وہ اپنے مزدور کو جتنی زیادہ اجرت دے گا اُس کا منافع اُتنا ہی کم ہو جائے گا اور افزائش زر کی رفتار جس کو وہ اور تیز کرنے پر مجبور ہے، بڑھنے کے بجائے گھٹ جائے گی۔ اُس کے نقطۂ نظر سے یہ صورتِ حال پیش نہ آنی چاہئے ورنہ زر کی افزائش کے رُکتے ہی منافع بھی ختم ہو جائے گا۔

وہ اس الجھن کا حل یہی سمجھا ہے کہ جہاں تک ہو سکے مزدوری کی شرح گراتا جائے اسی صورت سے وہ برابر سرمایہ بڑھا بڑھا کر کاروبار میں لگاتے رہنے کی حکمت عملی پر عمل کر سکتا ہے لیکن سرمایے کے برابر بڑھتے رہنے کا نتیجہ تجارتی اشیاء کی نت نئی فراوانی کی صورت میں سامنے آتا ہے اور وہ ایک دلدل سے نکل کر معاشی تضاد کے دوسرے دلدل محنت کش طبقے کی قوت خرید کی کمی میں، جا پھنستا ہے۔ بازار میں چیزوں کا سیلاب ہوتا ہے لیکن آمدنی کم ہونے کی وجہ سے خریدنے والوں کی جیبیں خالی ہوتی ہیں اس لئے بازار میں مصنوعات کی کھپت نہیں ہوتی۔

مارکس اس تجربے کے بعد نتیجہ نکالتا ہے کہ سرمایہ دار اپنے منافع کی خاطر محنت کش طبقے کی مزدوری کی شرح بڑھنے نہ دیں گے اور اس طرح عوام کی قوتِ خرید جس پر ان کے نفع کا دار و مدار ہے بڑھنے نہ پائے گی صرف مزدوری کی شرح کی کمی ہی منافع کی زیادتی کا سبب ہو سکتی ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ مزدوری کی کمی اشیاء کی طلب بھی گھٹا دیتی ہے۔

یہ ایک ایسا تضاد ہے جس کا کوئی حل نہیں ہے۔

نوے سال پہلے کارلائل نے سرمایہ داری نظام کے اس بحران کی، جو اُس وقت پیش آ رہا تھا، نباضی کرتے ہوئے کہا تھا:-

"تمھاری ان بنائی ہوئی قمیصوں سے کیا حاصل ہے؟ ایک طرف لاکھوں نہ بکنے والی قمیصیں لٹک رہی ہیں اور دوسری طرف لاکھوں محنت کش جسم جو ان سے اپنا تن ڈھانک سکتے ہیں ننگے گھوم رہے ہیں! قمیصیں تو انسانی تنوں کے چھپانے کے کام آتی ہیں۔ اگر ان سے یہ کام نہ نکل سکے تو ان کا وجود ایک ناقابل برداشت طنز کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ تم اس مسئلہ کے حل سے گھبرا کر خطرناک حد تک راہ سے کترا گئے ہو"

اگر کارلائل کے زمانے میں "خطرناک حد تک اس مسئلہ کے حل سے کترا جانے کا الزام صحیح تھا تو آج جب دنیا تاریخ کے سب سے بڑے بحران کے چنگل میں پھنسی ہوئی ہے، یہ الزام کتنا صحیح ہوگا؟ دنیا کے ہر گوشے میں لوگ اس دشواری سے نکلنے کے لئے ہاتھ پیر مار رہے ہیں، سویٹ روس میں مارکسی طریقے سے سرمایہ داری نظام کو ہٹا کر یہ دشواری حل کر لینے کی کوشش کی جا رہی ہے دنیا کے دوسرے حصّوں میں سرمایہ داری نظام کے رخنے بند کر کے حالات پر قابو حاصل کرنے کی تدبیریں ہو رہی ہیں۔

رُوس ایک منصوبہ رکھتا ہے

انیسویں صدی عیسوی کے ختم ہونے سے سترہ سال پہلے کارل مارکس کی وفات ہوئی۔ بیسویں صدی عیسوی کے شروع ہونے کے سترہ سال کے بعد کارل مارکس نے پھر زندگی پائی۔

مارکس نے جو نظریہ دنیا کے سامنے پیش کیا تھا، لینن اور اُس کے دوسرے بالشویکی شاگردوں نے اقتدار حاصل کرنے کے بعد ۱۹۱۷ء میں اُس کو عملی شکل دینی شروع کی۔ اس سے پہلے مارکس کی تعلیمات کا حلقہ اُس کے چند مخصوص ہمدردوں تک محدود تھا لیکن اس وقت کے بعد اس کے نظریات پوری دنیا کی توجہات کا مرکز بن گئے۔ اُس سے پہلے تو کیمونسٹ صرف اتنا کہہ سکتے تھے کہ اگر ان کی تعلیمات پر عمل کیا جائے تو وہ ایک جہانِ نو کی تعمیر کی بشارت دے سکتے ہیں لیکن اب کیمونسٹ اس قابل ہو گئے تھے کہ سطح زمین کا چھٹا حصہ دکھا کر کہیں "دیکھو! جہانِ نو یہ ہے اور یہ کس خوبی سے چل رہا ہے!"

بالشویکوں نے اقتدار کس طرح حاصل کیا؟ آخر وہ کیا حالات تھے جن کی بناء پر انقلاب کامیاب ہوا؟ انقلاب کے متعلق یہ حقیقت ہم کو پیش نظر رکھنی چاہیئے کہ انقلاب کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس کو ہر شخص ہر زمانے میں کامیابی کے ساتھ اختتام تک پہونچا سکتا ہو، انقلاب ایک آرٹ ہے بالشویکوں کے رہنما لینن نے اس اہم حقیقت پر اس طرح روشنی ڈالی ہے:-

"انقلاب میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ بغاوت کی بنیاد نہ کسی سازش پر ہو اور نہ کسی جماعت پر اس کا انحصار ہو بلکہ اس کی حرکت کی ساری ذمہ داری ایک ترقی یافتہ طبقے پر ہو۔ بغاوت کی بنیاد تاریخ کے اُس فیصلہ کن لمحے میں رکھی جانی چاہیئے جب انقلاب کا مواد پوری طرح پک کر تیار ہو چکا ہو، جب عوام کے ہراول دستوں کا عمل اپنے

"شباب پر ہو، جب دشمنوں کی جماعتوں اور ان لوگوں کی صفوں میں تذبذب پیدا ہو چکا ہو جو اگرچہ انقلاب پسند ہیں لیکن کمزور اور ڈھلمل دل ہیں اور ابھی تک کسی نتیجے پر نہیں پہونچ سکے ہیں یہی باتیں کامیاب انقلاب کی لازمی شرطیں ہیں .... جب یہ تمام شرطیں پائی جائیں تو اُس وقت انقلاب کو آرٹ نہ سمجھ کر قدم پیچھے ہٹانا مارکسزم اور انقلاب کے ساتھ غداری کرنا ہے۔"

یہ سطریں بالشویکی انقلاب سے ایک مہینے پہلے لکھی گئی تھیں۔ لینن کے رفیقوں میں ایسے بہت سے لوگ موجود تھے جو اُس کے اس خیال سے متفق تھے کہ کسی انقلاب کی کامیابی کے لئے ضروری ہے کہ مذکورۂ بالا شرطیں انقلاب شروع ہونے سے پہلے پوری ہو چکی ہوں لیکن ان میں سے بہت سے لوگ اُس لمحہ کے تعین پر جب انقلاب کی تمام شرطیں موجود سمجھی جائیں متفق نہ تھے۔ اور ایسے ہی نازک وقت میں لینن کی فطری ذہانت نے رہنمائی کا صحیح فریضہ انجام دیا۔ اُس نے اُس لمحہ کا جب مواد پوری طرح پک گیا تھا، اور جب اقدام میں کامیابی اور تاخیر میں رسوائی کے سوا کچھ حاصل نہ تھا اندازہ کر لیا۔

اقتدار حاصل کرنے سے پہلے اُس نے اپنی تمام قوتیں اپنے دوستوں کو یہ یقین دلانے میں صرف کر دیں کہ اقدام کا وقت آ گیا ہے۔ اُس نے اکتوبر کے دوسرے ہفتے میں ایک مضمون "کیا بالشویک حکومت کی ذمہ داری سنبھال سکتے ہیں؟" لکھا تھا۔ اُس نے اس مضمون میں ان لوگوں کو جوابات دئے ہیں اور ایک ایک اعتراض کا تجزیہ کر کے دکھایا ہے کہ انقلاب کا لمحہ آ پہونچا ہے۔ ہم اُس کے ایک جواب کا اقتباس نیچے پیش کرتے ہیں:۔

"پانچویں دلیل یہ دی جاتی ہے کہ چونکہ حالات غیر معمولی حد تک پیچیدہ ہو گئے ہیں اس لئے بالشویک حکومت کی باگ ڈور سنبھال نہ سکیں گے۔"

"یہ لوگ چاہتے ہیں کہ انقلاب تو برپا کر لیا جائے لیکن غیر معمولی پیچیدہ حالات سے سابقہ نہ پڑے ایسے انقلابات کبھی نہیں آتے۔ ایسے انقلابوں کے لئے اپنے دلوں میں آرزوؤں کی پرورش کرنا رجعت پسند بورژوائی ارباب فکر کی ماتم گساریوں کی نقل کرنا ہے۔ اگر کوئی انقلاب ایسے

حالات میں شروع بھی ہو جاتا ہے جو بظاہر بہت پیچیدہ نہیں معلوم ہوتے تو یہی انقلاب آگے بڑھ کر ہمیشہ غیر معمولی پیچیدہ حالات پیدا کر دیتا ہے۔ ایک انقلاب، گہرا اور عوامی انقلاب مارکس کے الفاظ میں ماضی کے بوڑھے زمانے کی موت اور نئے سماجی نظام کی پیدائش کا حیرت انگیز طور پر پیچیدہ اور دردناک عمل ہے۔ کروڑوں آدمیوں کی زندگیوں کی ہم آہنگی کی مہم آسان نہیں ہے، انقلاب نام ہے تیز تر، خوفناک اور گھمسان کی خانہ جنگی اور کشاکش کا۔ دنیا کا کوئی بڑا انقلاب خانہ جنگی سے بچ نہیں سکا۔ ہر وہ شخص جو گولر کا بھنگا نہیں ہے اچھی طرح سمجھ سکتا ہے کہ کوئی خانہ جنگی "غیر معمولی پیچیدہ حالات" سے اپنا دامن بچا نہیں سکتی۔

"اگر غیر معمولی پیچیدہ حالات" نہ ہوتے تو کبھی انقلاب کا سوال پیدا ہی نہ ہوتا۔ اگر تم بھیڑیوں سے ڈرتے ہو تو جنگلوں کی طرف جانے کا خیال ہی کیوں کرتے ہو؟"

یہ ایک انقلاب پسند کی تحریر ہے۔ وہ ان حالات سے جو آئندہ پیش آنے والے تھے۔ بے خبر نہ تھا اُس کو اُس قیمت کا پورا اندازہ تھا جو اُسے انقلاب کے لئے ادا کرنی تھی لیکن وہ ان حالات سے خوفزدہ نہ تھا۔ ایک انقلابی جس نے ایک اشتراکی ریاست کو، جس میں محنت کش عوام کے لئے حکومت قائم کی جاتی اور جس میں محنت کش عوام ہی حکومت بھی کرتے، اپنا مقصد زندگی بنایا تھا، وہ ہر اُس قیمت کے لئے تیار تھا جو اپنے مقصد کے حصول کے لئے اُس کو ادا کرنی پڑتی۔ لینن انقلاب کے آرٹ سے واقف تھا اس لئے اُس نے انقلاب میں کامیابی حاصل کی۔

جان ریڈ (JOHN READ) نے وہ تمام واقعات جو کمیونسٹ روس میں پیش آ رہے تھے اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے۔ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ اتنے بڑے صحافی کی تحریر "دس روز جنھوں نے دنیا کو ہلا دیا" (TEN DAYS THAT SHOOK THE WORLD) ہماری نگاہ کے سامنے ہے۔ نومبر ۱۹۱۷ء میں سویت کانگریس کا ایک جلسہ پٹروگراڈ (PETRO GRAD) میں ہوا تھا۔ اس جلسے کی تصویر کھینچتے ہوئے ریڈ لکھتا ہے:۔

لینن میز کا کونا پکڑے کھڑا تھا، اس کی چھوٹی چھوٹی ٹمٹماتی ہوئی آنکھیں مجمع کا جائزہ

لے رہی تھیں۔ وہ کھڑا ہوا انتظار کر رہا تھا، اور نعرہ ہائے تحسین کے نہ ختم ہونے والے سلسلے سے جو کئی منٹ تک جاری رہا تھا، بظاہر غیر متاثر معلوم ہوتا تھا۔ جب یہ شور ختم ہوا اُس نے سادگی سے کہا: "اب ہم کو اشتراکی نظام کی تعمیر کا کام شروع کر دینا چاہیئے۔"

یہ سنہ ۱۹۱۷ء کی بات تھی لینن کے اس حیرت انگیز اعلان کے بعد جس میں اشتراکی نظام کی تعمیر کا پہلا پتھر رکھا گیا تھا۔ پندرہ سال گذر گئے۔ اور سنہ ۱۹۳۲ء میں والٹر ڈورانٹی (WALTER DURANTY) نے جو نیو یارک ٹائمس کا نامہ نگار تھا لکھا کہ اس نظامِ نو کی حد بندی ہو گئی ہے:۔

"سنہ ۱۹۳۲ء کو وہ سنہ کہا جا سکتا ہے جب اشتراکی نظام کا ڈھانچہ، جو انقلاب کا مقصد تھا تیار ہو گیا ہے۔

"تعمیر ابھی اپنی تکمیل کی منزل سے بہت دور ہے لیکن مشرقی افق کے پس منظر میں وہ بنیادیں نظر آنے لگی ہیں جن پر اشتراکیت کے ایوان کی تعمیر ہو گی۔ مالیات، صنعت، نقل و حمل، صحت عامہ، تفریحات، آرٹ، سائنس، تجارت اور زراعت یعنی قومی زندگی کی ہر شاخ اجتماعی محنتوں اور اجتماعی منافع کی ایک مثال ہے۔ اس اجتماعی محنت اور منفعت نے انفرادی اور انفرادی نفع کی جگہ لے لی ہے۔"

ڈاکٹر ڈورانٹی نے اپنے آخری جملے میں سویت لائحہ عمل کے ضروری حصے کی طرف اشارہ کر دیا ہے۔ اس جملہ سے پتہ چلتا ہے کہ اجتماعیت نے انفرادیت کی جگہ لے لی ہے۔ تم کو امید بھی یہی رہی ہو گی کہ کارل مارکس کے شاگردوں نے اشتراکی نظام کی تعمیر کے سلسلے میں ذرائع پیداوار کو سب سے پہلے نجی ملکیت کے تسلط سے آزاد کرایا ہو گا۔ بالکل یہی واقعہ پیش بھی آیا۔ اشتراکی سویت روس میں زمین، کارخانے، کانیں، ملیں، مشینیں، بینک اور ریلیں مختلف افراد کی ملکیت سے بالکل آزاد کر لی گئیں۔ حکومت نے ان تمام چیزوں کو یا تو اپنے ہاتھ میں لے لیا یا اُن جماعتوں کے سپرد کر دیا جو ان فرائض کی انجام دہی کے لئے حکومت کی طرف سے مقرر کی گئیں۔ ان جماعتوں نے حکومت ہی کی نگرانی میں اپنے فرائض انجام دینے شروع کئے۔

یہی دراصل بنیادی بات تھی۔

اس بنیادی تغیر کی معنویت کو سمجھنے کے لئے ہمیں اس کا مقابلہ سرمایہ داری سماج سے کرنا چاہئے روسیوں کے نزدیک اس تغیر کا نتیجہ یہ ہوا کہ اب کوئی شخص کسی دوسرے شخص کو لوٹ نہ سکے گا۔ ا ب ب کی محنت سے غاصبانہ نفع نہیں اٹھا سکتا۔ اس کا یہ مطلب ہے کہ اب کسی شخص کو اجازت نہ دی جائے گی کہ وہ دولت کی سیڑھی پر چڑھ کر جو مزدوروں کی پیٹھوں سے لگا دی گئی ہیں ترقی کے بام عروج پر پہنچ جائے اب کسی موٹر کے کارخانے کے مالک کے لیے ممکن نہیں رہا کہ وہ اخبارات میں ایک دن تو اعلان کرے کہ "اگر کسی شخص کو ملازمت کی ضرورت ہو تو وہ درخواست دے" اور دوسرے دن اپنا کارخانہ بند کر کے پندرہ ہزار مزدوروں کو بیکار کر دے۔ اب اس کے اختیار میں یہ بات نہیں رہی، اب مشینیں اس کی ملکیت نہ تھیں۔ وہ عوام کی اجتماعی ملکیت بن گئی تھیں۔ روس کے لوگ دعویٰ کرتے ہیں کہ طبقاتی امتیاز ان کی حدودِ سلطنت میں کہیں باقی نہیں رہا۔ مالک اور مزدور، سرمایہ دار اور محنت کش، امیر اور غریب کے انتہائی فرق ختم کر دیئے گئے۔ وہ لوگ جو اب تک دوسروں کو برباد کرتے تھے خود برباد کر دیئے گئے"

۲۲ اپریل ۱۹۳۶ء کے نیو یارک ٹائمس کے ماسکو کے نامہ نگار (HAROD DENNY) نے اپنے اخبار کو ایک بحری پیغام کے ذریعہ سے کمیونسٹوں کی یہ فخریہ لن ترانی بھیجی تھی۔

روسی سماجی طبقات کے خاتمے کو خوش آمدید کہتے ہیں

روس کے ابتدائی مقاصد پورے ہو گئے

انڈرلیف روسی جوانوں کو خطاب کرتا ہے

پیداوار کی مطلوبہ حد

پوری ہونے والی ہے

نجی صنعتیں اس سال (یونین کی پیداوار کے مقابلے میں) صرف ۵ر۱ فیصدی پیدا کر سکیں گی

از ہیرولڈ ڈینی

نیو یارک ٹائمس کے نام خاص بحریہ

ماسکو۔ ۲۱ اپریل۔ سویٹ روس نے بڑی حد تک کمیونزم کی راہ کی پہلی منزل طے کر لی آج اشتراکی جمہوریہ روس کی مرکزی کمیونسٹ پارٹی کے سکریٹری انڈریف نے نوجوانوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ ملک کی پیداوار کے قریب قریب تمام ذرائع اشتراکی بنائے جا چکے ہیں۔ انڈریف نے کہا کہ طبقاتی امتیازات بالکل ختم کر دیئے گئے ہیں۔ اس سال سویٹ روس نے ۹۸/۵ فی صدی چیزیں پیدا کی ہیں۔ صرف ۵/۱ فی صدی چیزیں چھوٹے چھوٹے دستکاروں نے پیدا کیں، جن میں عورتوں کے کپڑے سینے والے، کلاہ ساز اور جوتے بنانے والے شامل ہیں، پیدا کیں۔ مسٹر انڈریف نے یہ نہیں بتایا کہ یہ لوگ بھی امتناعی محصولوں کے ذریعہ سے، جو عائد کئے جا رہے ہیں، اپنے پیشے سے محروم کئے جا رہے ہیں۔"

مسٹر انڈریف نے کہا کہ صنعت اور زراعت کے اشتراکی بنا دینے سے اب روس میں صرف ایک طبقہ (محنت کرنے والا) باقی رہ گیا ہے۔"

وہ صنعت جو ابھی تک اشتراکی نہیں بنائی گئی تھی روس میں ۵/۱ فی صدی سے زیادہ نہ تھی۔ یہ صنعت بھی کسی طرح سرمایہ داری صنعت نہیں قرار دی جا سکتی تھی۔ اس صنعت میں جو لوگ لگے ہوئے تھے وہ کسی دوسرے سے کام لینے کے بجائے خود اپنے لئے محنت کرتے تھے، ملک کی پیداوار کے تمام آلات اجتماعی طور پر عوام کی ملکیت بن چکے تھے اور حکومت ان کی طرف سے اس کا انتظام کرتی تھی

ذرائع پیداوار کو پوری طرح سے اشتراکی بنانے کے بعد اب سویٹ روس کی اشتراکی حکومت ذرائع پیداوار کی مالک بن چکی تھی اور اب اُس کے سامنے یہ مسئلہ زیر غور تھا کہ وہ کیا پیدا کرے، کتنا پیدا کرے اور جو کچھ پیدا کرے وہ کس کو اور کس طرح دے، یہ وہ سوالات تھے جن کو پورے ملک کے اجتماعی مفاد کے پیش نظر حل کرنا باقی تھا۔ سرمایہ دار ملکوں میں بھی، ہر سرمایہ دار کسی کاروبار میں اپنا سرمایہ لگانے سے پہلے اس قسم کے مسائل پر غور کرتا ہے' وہ سوچتا ہے کہ وہ اپنا سرمایہ موٹر کی کمپنی میں لگائے یا اُس سے ریلیں بنوائے یا کپڑے کے کارخانے قائم کرے؟ کتنا پیدا کرے اور مزدوروں کو کتنا دے؛ اس طرح کے سیکڑوں چھوٹے چھوٹے فیصلوں کا مجموعہ پیداوار کی مجموعی مقدار کا موجب ہوتا ہے۔

لیکن اس قدر غور و فکر اور چھان بین کے بعد اس کی کوئی ضمانت نہیں لی جا سکتی کہ کاروبار کے تمام حصے اپنی جگہ پر کچھ اس طرح جم جائیں گے کہ آئندہ کوئی انتشار نہ پیدا ہو۔ ہم ہر سال دیکھتے رہتے ہیں کہ ان تمام صنعتوں میں منصوبوں کی بے آہنگی کی وجہ سے انتشار پیدا ہوتا رہتا ہے۔

اشتراکی ریاست میں حکومت سرمایہ دار کی حیثیت رکھتی ہے لیکن سرمایہ دار سے ہزاروں گنا زیادہ عظمت و شان کی مالک ہوتی ہے۔ حکومت کو اشتراکی نظام میں سرمایے پر پورا قابو ہوتا ہے اور اُس کو ہر قسم کے فیصلے کا پورا اختیار ہوتا ہے۔ اشتراکی حکومت پوری کوشش کرتی ہے کہ مختلف حصّوں کو کچھ اس طرح ہم آہنگ کرے کہ ہزاروں اُلجھے ہوئے معاشی سوالات اس طرح حل ہو جائیں کہ ان میں آپس میں کوئی ٹکراؤ باقی نہ رہے اور وہ آپس میں ایک دوسرے سے اس طرح مددگار ہو جائیں کہ پوری مشین صفائی کے ساتھ چلتی رہے۔ ان مقاصد کی تکمیل کے لیے:

رُوس نے ایک منصوبہ بنایا

"روسی کمیونزم کا اجتماعی طور پر جو بہت نتیجہ خیز رجحان ہے وہ یہ ہے کہ تمام اقوام کی پیداوار تقسیم اور مبادلے کے منصوبے کچھ اس طرح سوچ سمجھ کر بنائے جائیں کہ چند لوگوں کے منافع بڑھنے کے بجائے پوری قوم کو پیداوار کے استعمال کی زیادہ سے زیادہ سہولتیں نصیب ہوں۔"

"نجی ملکیت، اُس کے منافع طلب مقاصد اور ان کے بموجب اُس کی پیداوار کے نظام کے پوری طرح استیصال کے بعد اب یہ بہت ضروری ہو گیا ہے کہ ہر ادارے کو بتایا جائے کہ اُس کو کیا پیدا کرنا ہے۔ یہی وہ ضرورت ہے جو ایک ایسی ریاست کو جو اجتماعی مفاد کے لیے قائم ہے، مجبور کرتی ہے کہ وہ ایک قسم کی عام منصوبہ بندی کرے۔"

تم نے روس کے پنج سالہ پروگرام کے متعلق بارہا سنا ہوگا۔ جیسے ہی وہ اپنا ایک پہلا پنج سالہ پروگرام پورا کر لیتا ہے دوسرا پنج سالہ پروگرام شروع کر دیتا ہے۔ اس کی یہ منصوبہ بندی جب تک روس کی ریاست اشتراکی بنیادوں پر قائم ہے برابر چلتی رہے گی۔ جیسا کہ سڈنی (SIDNEY) اور بیٹرس وب (BEATRICE WEBB) نے اوپر کے اقتباس میں کہا ہے۔ ایک ایسی اجتماعی ریاست

جو نظریہ اشتراکیت کی ماننے والی ہے منصوبوں سے بے نیاز نہیں ہو سکتی۔ اشتراکی معاشیات کیلئے اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں ہے کہ وہ ایک طے کی ہوئی معاشیات (PLANNED ECONOM) ہو روس ہی دنیا میں ایک ایسا ملک ہے جس کی معاشیات منصوبہ بندی کی پابند ہے۔ یہ معلوم کرنے کے لئے کہ یہ معاشیات جس کا ڈھچر خاص منصوبے کے ماتحت تیار کیا گیا ہے کتنی کامیاب ہے، ہم کو روسی نمونوں پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔

اس منصوبے میں آخر ہوتا کیا ہے؟ جب ہم ایک منصوبہ بناتے ہیں یا ہماری جگہ پر کوئی دوسرا کوئی منصوبہ بناتا ہے تو اس کو اپنے منصوبے کے لازمی دو جزو رکھنے پڑتے ہیں۔ ایک جزو مقاصد کی تعیین کرتا ہے اور دوسرا جزو ان مقاصد کے حصول کے راستے طے کرتا ہے۔ اس منصوبہ بندی کی منزل مقصود ہمارے منصوبے کا ایک جزو ہوتی ہے اور اس تک پہونچنے کا راستہ ہمارے منصوبے کا دوسرا جزو ہوتا ہے۔

یہی بات اشتراکی منصوبہ بندی کے بارے میں بھی درست ہے۔ یہ منصوبہ بندی بھی ایک مقصد اور ایک طریقہ رکھتی ہے لیکن یہ حقیقت ابتدا ہی میں ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ اشتراکی منصوبہ بندی اس منصوبہ بندی سے، جو سرمایہ دار ملکوں میں کی جاتی ہے بنیادی طور پر بالکل مختلف ہے وبس (WEBBS) نے اشتراکی روس کا اچھی طرح سے مطالعہ کرنے کے بعد یہ بات "روسی کیمونزم" اور "ایک نئی تہذیب" میں بہت اچھی طرح پیش کی ہے۔

"ایک سرمایہ داری سماج میں کسی بڑی سرمایہ دارانہ تجارتی مہم کا مقصد اس کے سوا کچھ اور نہیں ہوتا کہ اس کے مالک یا حصہ داروں کے لئے زیادہ سے زیادہ مالی منفعت حاصل کی جائے۔ اشتراکی روس میں، جہاں محنت کش عوام (PROLITARIATE) کی آمریت قائم ہے، منصوبہ بندی بالکل دوسرے مقاصد کے ماتحت ہوتی ہے۔ روس میں نہ کوئی مالک ہے اور نہ حصہ دار جس کے انفرادی نفع کی فکر کرنی ہو۔ وہاں کسی شخص کے لئے مالی منفعت کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ خاص مقصد جو اس منصوبہ بندی میں ان کے

سامنے رہتا ہے، پوری قوم کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہونچانا ہوتا ہے۔

جہاں تک مقاصد کا تعلق ہے بہت اچھے ہیں اور بڑی وسیع بنیادوں پر عوامی نفع کا لحاظ رکھا گیا ہے لیکن ان کو عملی شکل بھی دینی ہے۔ اس لئے اپنی مطلوبہ منزل تک پہونچنے کے لئے خاص طریق کار اختیار کرنے کی ضرورت ہے لیکن جو بھی طریقہ اختیار کیا جائے اس کی بنیاد امکانات پر ہو لیکن امکان کا اندازہ لگانے کے لئے پورے ملک کی مکمل اور صحیح تصویر سامنے رکھنے کی ضرورت ہے۔

سویٹ روس کا منصوبہ بندی کا کمیشن یہی فریضہ انجام دیتا ہے۔

اس کو سب سے پہلے روس کی ہر چیز کے متعلق "کون" "کیا" "کہاں" "اور کیسے" کا پتہ لگانا پڑتا ہے۔ محنت کشوں کی تعداد کتنی ہے؟ اشتراکی مشینوں کی حالت کیا ہے؟ قدرتی ذرائع کیا ہیں؟ کیا ہو چکا ہے؟ کیا کیا جا سکتا ہے؟ کیا موجود ہے اور کن چیزوں کی ضرورت ہے؟

حقائق اور اعداد و شمار کی ہزاروں قسمیں اس منصوبہ بندی کمیشن کے زیر غور آتی ہے۔

اس وسیع ملک کے ہر ادارے، ہر کارخانے، فارم، مل، کان، شفاخانہ، اسکول، ریسرچ انسٹیٹیوٹ ٹریڈ یونین، کوآپریٹو سوسائٹی، تماشہ گاہ، ہر جگہ سے ان سوالات کے جوابات آتے ہیں، اس لمبے چوڑے ملک کا ہر حصہ، ملک کا ہر دور دراز گوشہ ان سوالات کے جوابات اس کمیشن کے پاس بھیجتا ہے:۔

تم نے پچھلے سال کیا کیا تھا؟

تم اس سال کیا کر رہے ہو؟

تم آئندہ سال کیا کرنا چاہتے ہو؟

تم کو کس مدد کی ضرورت ہے؟

تم کیا مدد دے سکتے ہو؟

یہ اور اسی طرح کے ہزاروں سوالات۔

ان سوالات کے جوابات منصوبہ بندی کمیشن کے دفتر میں آتے رہتے ہیں۔ یہ اکٹھا کئے جاتے ہیں، ترتیب سے رکھے جاتے ہیں اور ماہرین ان کو پڑھ کر اپنے منصوبوں کے لئے معلومات حاصل کرتے ہیں:۔

روسی حکومت کا پورا اسٹاف اس منصوبہ بندی کے کمیشن میں کام کرتا ہے اور تقریباً دو ہزار ماہرینِ اعداد و شمار کے علاوہ ہر طرح کے ماہرین فن محرروں کے اتنے ہی بڑے اسٹاف کے ساتھ، جو ہر طرح کے ضروری ساز و سامان سے آراستہ ہوتا ہے اور جو پوری دنیا میں اعداد و شمار کی تحقیقات کی سب سے اچھی مشین ہے کام کرتے ہیں۔"

ان معلومات کے چھانٹنے، مرتب کرنے، جانچنے اور اعداد و شمار کے اخذ کرنے کے بعد واقعات کی جو صحیح تصویر ہوتی ہے وہ ماہرین کے سامنے آجاتی ہے لیکن یہ ان کے فرائض کا صرف ایک جزو ہے۔ اب ان کو اپنی ذہنی صلاحیتوں کو اس فکر میں لگانا ہے کہ ان حالات کو اب کیا شکل اختیار کر لینی چاہیئے اس منزل پر پہونچنے کے بعد منصوبہ بنانے والوں کو حکومت کے مختلف شعبوں کے ذمہ دار عہدہ داروں سے ملنا چاہیئے" ریاست کے منصوبہ بندی کے کمیشن کے اخذ کئے ہوئے نتائج اور اس کے منصوبے حکومت کی توثیق اور تائید کے محتاج ہوتے ہیں منصوبہ بندی کے فرائض رہنمائی کے فرائض سے بالکل الگ ہوتے ہیں۔ رہنما منصوبہ بندی کے کمیشن کا ماتحت نہیں ہوتا۔"

منصوبہ بندی اس ضرورت سے کبھی قطع نظر نہیں کر سکتی کہ ریاست کی ایک خاص اور واضح پالیسی ہونی چاہئے اور کمیشن کو اسی پالیسی کو کامیاب بنانے کے لئے اپنے منصوبے تیار کرنے چاہئیں، حکومت کے ذمہ دار اعلیٰ ارکان پالیسی مقرر کرتے ہیں منصوبہ بندی کمیشن کے فرائض میں داخل ہے کہ وہ ایسے منصوبے بنائے جو حکومت کی پالیسی کو، ان اعداد و شمار کی روشنی میں، جو اس کو حاصل ہوئے ہیں کامیاب بنادیں منصوبہ بندی کمیشن اور حکومت کے اعلیٰ عہدہ داروں کے درمیان بحث و مباحثہ کے بعد منصوبے کا پہلا مسودہ سامنے آتا ہے۔

لیکن یہ منصوبے کا صرف پہلا مسودہ ہوتا ہے منصوبہ نہیں ہوتا۔ ایک اشتراکی معاشی نظام میں بہترین دماغوں کا تیار کیا ہوا منصوبہ بھی اپنی جگہ پر مکمل نہیں کہا جاسکتا۔ اس کو عوام کے سامنے بھی آنا چاہئے۔ پہلے مسودے کی تیاری کے بعد استصواب رائے عامہ کے لئے قدم اٹھتا ہے میسکی (MAISKI) نے جو انگلستان میں روس کی جانب سے سفیر تھا منصوبہ بندی کے اس دوسرے

درجے کی تصویر کھینچتے ہوئے لکھا ہے:-

" یہ چنانچہ بتائے ہوئے اعداد و شمار اور خاکے مختلف عوامی محکموں اور دوسرے مرکزی اداروں میں جو قومی دولت کی پیداوار سے تعلق رکھتے ہیں بھیج دئے جاتے ہیں، مثال کے طور پر تجارت، نقل و حمل، بیرونی تجارت اور بھاری اور ہلکی صنعتوں کے عوامی محکموں کا نام لیا جا سکتا ہے، ہر مرکزی ادارہ منصوبے کے مختلف حصے اپنے ماتحت اداروں کے پاس بھیجتا ہے اس طرح نیچے اُترتے اُترتے یہ منصوبہ فیکٹریوں اور فارموں تک پہونچ جاتا ہے۔ ہر منزل میں ان مجوزہ خاکوں کی چھان بین ہوتی ہے اور ان کے مختلف پہلوؤں پر غور و فکر کیا جاتا ہے۔ جب یہ منصوبے سفر کرتے ہوئے اپنی آخری منزل کارخانے یا فارم تک پہونچتے ہیں، تمام مزدور اور کسان بحث و مباحثے اور منصوبے پر غور و فکر میں حصہ لیتے ہیں اور غور و فکر کے بعد اپنی تجویزیں اور مشورے پیش کرتے ہیں۔ اس کے بعد یہ مجوزہ خاکے ان زینوں سے جن سے اتر کر وہ آئے تھے پھر چڑھتے ہوئے، اصلاحوں، مشوروں اور تجویزوں کے ساتھ منصوبہ بندی کے کمیشن تک پہونچ جاتے ہیں۔"

کارخانوں کے مزدور اور فارموں کے کسان منصوبے کی خوبیوں اور اچھائیوں کے متعلق اپنی آزادرائے کا اظہار کرتے ہیں۔ روسی نظام حکومت کی یہی وہ امتیازی تصویر ہے جس پر روسی بجا طور سے فخر کرتے ہیں۔ اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ کسی خاص جگہ کے مزدور اور کسان کمیشن کے منصوبوں سے اتفاق نہیں کرتے۔ اکثر وہ کمیشن کے منصوبے کے مقابلے میں اپنے منصوبے پیش کرتے ہیں اپنے منصوبوں میں وہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اگر ان کے منصوبے پر عمل کیا جائے تو پیداوار کی وہ مقدار جس کی ان سے توقع کی جاتی ہے اور بڑھ سکتی ہے۔ ان مباحثوں میں جو مجوزہ منصوبے کے متعلق ہوتے ہیں، روس کے کروڑوں باشندے، ملک کے ہر حصے میں حقیقی جمہوریت کا لطف اُٹھاتے ہیں۔ کوئی منصوبہ اوپر سے عوام پر ٹھونسا نہیں جاتا۔ مزدور اور کسان سب کو اس کے متعلق رائے دینے، اس کے قبول یا رد کرنے اور اس میں ترمیم اور اضافے کا پورا حق حاصل ہے۔ ان تمام باتوں کا نتیجہ کیا نکلتا ہے؟

اس سوال کا جواب ایک بالغ نظر مشاہد نے ان الفاظ میں دیا ہے۔

"تم روس کے جس حصے میں بھی ہو جاؤ (کم سے کم ان حصوں میں جو میں نے دیکھے ہیں) تم کو وہاں کے مزدور بڑے فخر سے یہ کہتے ہوئے ملیں گے "یہ ہماری فیکٹری ہے، یہ ہمارا شفاخانہ ہے، یہ ہمارا آرام گھر ہے"۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ انفرادی حیثیت سے ان چیزوں کے مالک ہیں بلکہ یہ تمام چیزیں براہِ راست ان کے نفع اور آرام کے لئے کام کر رہی ہیں اور پیدائش کا موجب ہو رہی ہیں۔ وہ اپنی اس ذمہ داری سے بھی خوب واقف ہیں کہ وہ دیکھتے ہیں کہ ان چیزوں کا کام معیار پر پورا اُترتا ہے یا نہیں۔"

منصوبے کی تیاری کے تیسرے درجے میں ان اعداد و شمار کی جو ان منصوبوں کے ساتھ شامل ہو کر آتے ہیں جانچ کی جاتی ہے۔ منصوبہ بندی کمیشن کے ارکان اور حکومت کے اعلیٰ عہدہ داران ان تجویزوں اور اصلاحی مشوروں پر غور کرتے ہیں اور ضروری تغیرات کے بعد منصوبہ کو آخری شکل دیتے ہیں۔ اب منصوبہ تیار ہو گیا۔

یہ منصوبہ ہر حصے کے مزدوروں اور کسانوں کے پاس بھیج دیا جاتا ہے۔ پوری قوم اپنی تمام صلاحیتوں کے ساتھ اس کام کی تکمیل میں لگ جاتی ہے اور اجتماعی محنتیں اور ان کے نتیجے میں اجتماعی منفعت ایک حقیقت بن کر نگاہوں کے سامنے آجاتی ہے۔

اجتماعی منفعت سے مراد کیا ہے؟ حکومت کے اعلیٰ عہدہ داران کس حکمت عملی کو سب سے زیادہ اہم سمجھتے تھے؟ بعض عام مقاصد دفعتہً خود بخود ان کے سامنے آگئے تھے۔ اشتراکی روس کے باشندوں کی بہت بڑی تعداد ان پڑھ تھی۔ اس لئے عوامی تعلیم کو اس منصوبہ میں خاص جگہ دی گئی تھی۔ ہر شخص کے لئے مفت تعلیم کا انتظام کیا گیا اور یونیورسٹیوں میں پڑھنے والے طالب علموں کی ضروریات زندگی کی کفالت حکومت نے اپنے ذمے لی۔ روسی آبادی کی بڑی اکثریت حفظانِ صحت کے ابتدائی اصولوں سے بھی واقف نہ تھی۔ اس لئے ایک عام مہم اس منصوبے میں شامل کی گئی تاکہ عوام کے معیارِ رہائش کو بلند کرایا جائے۔ اس غرض کی تکمیل کے لئے شفاخانوں، زچہ خانوں، پرورش گاہوں

اور ان کے چلانے کے لئے ماہر ڈاکٹروں، نرسوں اور ٹیچروں کا انتظام منصوبے میں شامل کیا گیا مزدوروں کے لئے آرام گھروں کا قیام، پارکوں، عجائب خانوں اور کلب گھروں کا انتظام بھی منصوبے کا جزو بنایا گیا۔ سائنٹفک تحقیقات کے لئے تجربہ گاہوں اور اداروں کا قیام بھی منصوبے کا ضروری حصہ سمجھا گیا۔ یہ اور اس طرح کی ہزاروں تجویزوں جو عوام کی کھلی ہوئی ضرورتوں سے متعلق تھیں منصوبے میں شامل کی گئیں لیکن تمام تفصیلات کے بعد بھی حسب ذیل سوالات اپنی جگہ پر باقی رہ گئے تھے، جن کے مناسب حل کے لئے حکومت کو دماغ سوزی کرنی تھی:۔

۱۔ کیا یہ ایک اچھی حکمت عملی ہوگی کہ کھانے پینے، پہننے اوڑھنے اور تفریحات کی چیزیں پیدا کرنے پر اپنی پوری طاقتیں لگا دی جائیں؟ یا یہ بہتر ہوگا کہ سب سے پہلے کارخانوں کے قیام مشینوں کی فراہمی اور ریلوں کی تعمیر پر اپنی پوری توجہ صرف کی جائے۔ اس آخری صورت میں لوگوں کو شروع میں تکلیفیں سہنی پڑیں گی اور عام ضروریات کی چیزیں کم تعداد میں میسر آسکیں گی لیکن آگے چل کر زیادہ آسانیاں ہوں گی۔ ایسی مشینیں نصب کرنا جو اشیائے صرف (CONSUMERS GOODS) پیدا کریں، آج کے آرام کا موجب ہیں لیکن ایسی مشینوں کا بندوبست کرنا جو اشیائے پیداوار کی ڈھلائی کا کام کریں، آئندہ کی فارغ البالی کا سبب ہوگا۔ اب سوال یہ تھا کہ ان دونوں باتوں میں سے کس بات کو ترجیح دی جائے؟

۲۔ کیا یہ کوئی اچھی پالیسی ہوگی کہ صرف وہ چیزیں پیدا کرنے پر اپنی پوری طاقتیں لگا دی جائیں جو اس ملک میں اچھی طرح پیدا ہوسکتی ہیں اور جو چیزیں پیدا نہیں ہورہی ہیں یا کم پیدا ہوتی ہیں ان کو غیر ملکوں سے درآمد کیا جائے؟ کیا یہ عقلمندی کی بات ہوگی کہ اپنی تمام صلاحیتیں اس پر صرف کر دی جائیں کہ اپنی ضرورت کی تمام چیزیں اپنے ملک ہی میں پیدا ہوں۔

سوویٹ روس نے ان سوالات کے جو جوابات سوچے وہ اپنی جگہ پر بڑی حد تک اٹل تھے۔ روس کو سرمایہ دار ممالک کے حملے کا اندیشہ تھا۔ اس کا یہ خطرہ محض وہم وگمان پر مبنی نہ تھا۔ یہ خطرہ پیش بھی آیا۔ ۱۹۱۸ء سے لے کر ۱۹۲۰ء تک دنیا کے تقریباً نصف درجن ملکوں نے جس میں ریاست ہائے

متحدہ امریکہ بھی شامل ہے۔ انتہائی کوششیں کیں کہ اپنی عسکری طاقتوں سے بالشویکی حکومت کا تختہ اُلٹ دیں، روسیوں کو خطرہ تھا کہ یہ حملے پھر ہوں گے اور اگر وہ اشتراکی بنیادوں پر حکومت کی تعمیر میں کامیاب ہوگئے تو یہ خطرہ اور بڑھ جائے گا۔ دوسرے سرمایہ دار ممالک برداشت نہ کر سکیں گے کہ روس میں ایک ایسی حکومت مضبوطی سے اپنے قدم جمالے جو دوسرے ملکوں کے محنت کشوں کے لئے سہارا بن سکے اور اُس کی مثال اپنے سامنے رکھ کر آگے قدم بڑھانے کی کوشش کریں تاکہ اپنے ملکوں میں بھی سرمایہ دار حکومتوں کا تختہ اُلٹ کر اقتدار اپنے ہاتھ میں لے سکیں۔

اس وجہ کے علاوہ اور بھی بہت سی وجہیں تھیں جو ان کے ان عزائم کا سبب ہو رہی تھیں۔ وہ خوب سمجھتے تھے کہ روس ایک زراعتی ملک ہے اور اُس کے لئے صنعتی ممالک کی طرح معیار رہائش کا بلند کرنا ممکن نہیں ہے اس لئے بھی انھوں نے اپنی انتہائی کوششیں اس بات پر صرف کیں کہ اپنے ملک کو زیادہ سے زیادہ صنعتی بنا دیں۔

یہ مہم آسان نہ تھی آنے والے کل کی فارغ البالی کے لئے آج کے آرام کو تج دینا ضروری تھا، ملک کے تمام وسائل کو مشینوں کی پیداوار کے لئے وقف کرنے کا مطلب یہ تھا کہ لوگ مستقبل قریب میں رہنے کے لئے گھر، کھانے کے لئے غذائیں اور پہننے کے کپڑے نہ پا سکیں گے۔ ایک ملک کے پاس محنت اور سرمایہ کی ایک خاص مقدار ہو سکتی ہے۔ یہ ہو سکتا ہے وہ یہ تمام ذرائع اینٹیں بنانے، مکانات تعمیر کرنے، گیہوں بونے، روٹیاں پکانے، کپاس کی تخم ریزی کرنے اور کپڑوں کے تیار کرنے پر صرف کردے، لوگوں کی روزمرہ کی ضرورت کی چیزیں بڑی کافی مقدار میں پیدا ہو جائیں گی لیکن یہ پیداوار اتنی ہی ہوگی جتنی اس وقت ہوتی ہے۔ اگر وہ چاہتا ہے کہ اپنی پیداوار بڑھائے تو اُس کو مشینیں ڈھالنے کے لئے اپنے مزدوروں کی ایک تعداد الگ کرنی پڑے گی، ریل کی پٹریاں ڈھالنے، بچھانے اور کارخانے چلانے کے لئے اپنی اس مجموعی طاقت کا ایک حصہ الگ کرنا پڑے گا۔ اور اس طرح اُن آلوں اور کلوں کے ڈھالنے کا بندوبست کرنا پڑے گا جو اشیائے صرف کی جگہ پر ان مشینوں اور کلوں کو ڈھالیں جو اُس کی ضرورت کی چیزوں

کی پیداوار میں اضافہ کرسکیں۔ اس طرح وہ دوسرے سال یا آئندہ آنے والے چند سالوں میں زیادہ روئی، کپڑا پیدا کرنے اور زیادہ گھر بنانے کے لائق ہوسکے گا۔ ہم اپنی طاقت کی جتنی زیادہ مقدار مستقبل کی ان مہموں میں لگادیں گے اُسی قدر ہم کو کھانے اور پہننے کی چیزوں کی کمی محسوس ہوگی۔ روس نے محسوس کیا کہ اُس کو گھروں کے گرم رکھنے کے لئے زیادہ کوئلے کی ضرورت ہے اور انجن کی بھٹیوں کا پیٹ بھرنے کے لئے بھی تاکہ وہ فولاد تیار کرسکیں کوئلے کی بڑی مقدار درکار ہے۔ اس فولاد سے وہ مشینیں ڈھالنی تھیں جو کرگھوں کو خودحرکی بناسکیں تاکہ کپڑے بہت جلد اور بہت بڑی مقدار میں تیار کئے جاسکیں لیکن یہ ممکن نہیں تھا کہ دونوں فائدے ایک ہی وقت میں ساتھ ہی ساتھ حاصل کئے جاتے۔ روسیوں نے دوسرے فائدے کو ترجیح دی۔ انھوں نے اشیائے پیدائش (PRODU-CERS GOODS) کو اشیائے صرف (CONSUMERS GOODS) کی پیدائش پر ترجیح دی اور اس طرح انھوں نے اپنے ملک کو صنعتی ارتقا کی راہ پر ڈالا۔ ان کی یہ منزل بھی کچھ آسان نہ تھی۔

جوزف اسٹالن نے پہلی مارچ ۱۹۳۶ء کو اسکرپس ہوورڈ پریس SCRIPPS-HOWARD-PRESS کے نمائندے سر رائے ہوورڈ (ROY HOWARD) کو ملاقات کا موقع دیا تھا۔ اسٹالن نے کہا کہ اگرچہ صنعتی ارتقا کی راہ بہت دشوار ہے لیکن:-

> "اگر تم کسی مکان کی تعمیر کا ارادہ کرتے ہو تو تم کو اپنے مصارف میں کمی کرنی پڑتی ہے اور اس مقصد کی تکمیل کے لئے قربانیاں بھی دینی پڑتی ہیں۔ اگر تم کسی نئے سماج کی تعمیر کا ارادہ کرو تو یہ حقیقت اور بڑھ چڑھ کر تمھارے سامنے آجائے گی"
>
> "اس لئے یہ ہمارے لئے بہت ضروری ہے کہ ہم عارضی طور پر اپنی طلب کم کردیں تاکہ ہم ضروری وسائل اکٹھا کرسکیں۔ ہم نے یہ قربانی صرف اس غرض سے دی ہے تاکہ ہم صحیح معنی میں حقیقی آزادی کو جنم دے سکیں"

وہ قربانیاں کیا تھیں جو روسیوں نے اس فیصلے کے بعد دی تھیں کہ "وہ اپنی فوری ضرورت کی چیزیں کم پیدا کرکے مشینی پیداوار بڑھائیں گے"؟ سب سے پہلی قربانی تو یہی تھی کہ روزمرہ کی ضرورت

کی چیزیں پیدا کرنے کے لئے محنت اور سرمایے کی ضروری مقدار باقی نہیں رہی تھی۔ روس میں روزمرہ کی ضرورت کی تمام چیزوں کا سخت قحط پڑ رہا تھا۔ غیر ہمدرد ممالک کے جو سیاح، روس کی سیاحت کے لئے آرہے تھے ان کی نگاہوں سے یہ صورتِ حال چھپی نہ رہ سکی اور انھوں نے یہ فیصلہ کرلیا کہ روس کو اُس کی روزمرہ کی ضرورت کی چیزیں برآمد نہ کی جائیں۔ اس زمانے میں روس کے لئے یہ تو آسان تھا کہ وہ دوسرے ملکوں سے ٹریکٹر لے لے لیکن اس ٹریکٹر کی جگہ پر وہ چائے دان نہیں پا سکتا تھا۔ ریل کی پٹریوں کے تختے تو اُس کو مل سکتے تھے لیکن ایک کمبل اُسے میسر نہیں آسکتا تھا۔ یہ روسیوں کی بدقسمتی تھی کہ ٹریکٹر میں چائے نہیں بنا سکتے تھے اور ریل کی پٹریوں کے تختوں سے اوڑھنے کا کام لینا نہیں جانتے تھے۔ اس لئے انھوں نے اپنا پیٹ کاٹ کر ٹریکٹروں، فیکٹریوں، انجنوں اور بجلی گھروں کی پیداوار اور تعمیر کا انتظام کیا۔

۲۷ مارچ ۱۹۳۶ء کے نیویارک ٹائمس نے بھی آخر وہ علامتیں دیکھ ہی لیں جو روسی شہریوں کے اچھے دنوں کی طرف اشارہ کر رہی تھیں:—

"انقلاب کے بعد پہلی مرتبہ روزمرہ کے استعمال کی چیزوں کی پیداوار پر ذرائع پیداوار کی افزائش سے زیادہ زور دیا جا رہا ہے۔ اشتراکی معاشیات کی تنظیم کے ابتدائی زمانے میں ذرائع پیداوار کی پیدائش کو روزمرہ کے استعمال کی چیزوں پر ترجیح دی جاتی تھی۔

اس سال کے منصوبے میں روزمرہ کے استعمال کی چیزوں میں ۲۳ فی صدی اضافہ کیا گیا ہے اور ذرائع پیداوار میں صرف ۲۲ فی صدی اضافہ ہوا ہے۔"

ایک بات ذہن میں رکھنی چاہیئے، اشتراکی روس نے اپنے ابتدائی عہد میں اشیائے پیدائش کو اشیائے صرف پر ترجیح دی تھی۔ یہ پالیسی قومی منصوبہ بندی کا لازمی اور دائمی جزو نہیں ہے۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ اگر اپنی قومی معاشیات کو اشتراکی ڈھنگ سے تنظیم کرے تو اس کو اس طرح کی حکمت عملی اختیار کرنے کی کوئی ضرورت نہ پڑے گی۔ روس کے خاص حالات کے لئے اس قسم کی حکمت عملی بہت ضروری تھی۔ امریکہ ایک دولتمند ملک ہے۔ یہاں پیدا کرنے والے ساز و سامان کی

کوئی کمی نہیں ہے اس لئے روسیوں کی طرح نہ اتنی گرم رفتاری کی حاجت ہوگی اور نہ کسی منصوبہ بند کی تکمیل کے لئے کسی خاص قربانی کی ضرورت پڑے گی۔

روس کے پاس ریلوں، مشینوں، کارخانوں اور ہر طرح کے مشینی سامان کی کمی تھی جنگ عظیم سے پہلے اس کے پاس جو کچھ سامان تھا وہ جنگ عظیم خانہ جنگی اور بیرونی طاقتوں کی مداخلت کے زمانے میں برباد ہو گیا۔ اس لئے انقلاب کے بعد روس کو عملی طور پر اٹھنا اور ویرانوں پر اپنی بستیاں بسانا پڑا۔ انگلینڈ، امریکہ اور جرمنی کا مقابلہ تو الگ رہا، اس کو اٹلی، سوئیڈن اور آسٹریلیا کی ہمسری کے لئے بھی ایک مدت درکار تھی۔ یہ سفر اتنا لمبا اور دشوار تھا کہ یہ کسی طرح ممکن ہی نہیں معلوم ہوتا تھا کہ روس کبھی اس قابل بھی ہو سکے گا کہ منزل پر پہونچ کر اپنی کمر سیدھی کر سکے لیکن روس نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ منزل مقصود تک پہونچے گا اور اپنے مقصد کے حصول میں زیادہ دیر بھی نہیں لگائے گا۔ وہ ابھی تک اپنا سفر بھی پورا نہیں کر سکا ہے لیکن ساری دنیا کے غیر جانبدار مشاہدین کی رائے ہے کہ وہ کامیابی سے اپنی منزل کی طرف بڑھ رہا ہے۔ کیمبرج کے ایک ممتاز ماہر اقتصادیات نے ۱۹۳۲ء میں لکھا تھا کہ جس رفتار سے روس چل رہا ہے وہ رفتار اس کو وقت مقررہ سے بہت پہلے منزل مقصود تک پہونچا دے گی۔ وہ لکھتا ہے:۔

"روس کے مقاصد حیرت انگیز حد تک عظیم الشان تھے اس لئے نفرت اور حقارت کے ساتھ پوری سرمایہ دار دنیا میں ان کا مذاق اڑایا گیا۔ سرمایہ دار ممالک میں کامیابی کے جو معیار قائم ہو چکے تھے، ان کے پیش نظر روسیوں کے عزائم خیالی جنت بنانے والوں کے دیوانے خواب معلوم ہوتے تھے۔ جنگ سے پہلے کا دولت مند انگلستان اپنی قومی آمدنی کا تقریباً جودہ فی صدی نئے سرمایے کے طور پر لگایا کرتا تھا لیکن پنج سالہ منصوبہ بندی کے تحت اشتراکی روس نے اپنی قومی آمدنی کا تیس فی صدی نئے سرمایے کے طور پر لگانا تجویز کیا۔ یہ سرمایہ نسبتاً ایک غریب ملک کے لئے بہت عظیم الشان تھا۔ سرمایہ دار ملکوں کی صنعتی پیداوار معمولی حالات میں اوسطاً صرف تین فی صدی بڑھا کرتی تھی۔ ۱۹۰۷ء سے لے کر ۱۹۱۳ء تک برطانیہ کی پیداوار کا سالانہ اضافہ ۱ فی صدی

سے زیادہ نہیں بڑھا۔ ۱۹۲۵ء سے لے کر ۱۹۲۹ء تک بہت تیزی سے آگے بڑھنے والے ممالک پولینڈ اور فرانس بھی نو فی صدی سے زیادہ اضافہ نہیں کرسکے اور امریکہ اور انگلستان کا اضافہ بھی چار فی صدی سے آگے نہیں بڑھا لیکن اشتراکی روس کے پنج سالہ منصوبہ نے حکومت کی بڑے پیمانے کی صنعت میں بیس فی صدی اضافہ اور دوسری تمام چھوٹی بڑی صنعتوں میں سترہ اٹھارہ فی صدی اضافہ تجویز کیا۔"

یہ حقیقت اور بھی نظر کے سامنے رکھنے کے لائق ہے کہ جس زمانے میں اشتراکی روس نے اپنے ملک میں صنعتی ترقی کی مہم چھیڑی تھی دوسرے ممالک اُس کو آسانی سے قرض نہیں دیتے تھے۔ دنیا کے تمام ممالک نے اپنی صنعتی ترقی کی مہم میں غیر ملکی سرمایے سے مدد پائی ہے اور وہ اسی غیر ملکی مدد کے بھروسے پر اس قابل ہوئے ہیں کہ فولاد اور مشینیں خرید سکیں اور پھر آگے چل کر ان چیزوں کی پیدائش کے لئے خود اپنے ملک میں بڑے بڑے کارخانے قائم کرسکیں۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے صنعتی ارتقا میں برطانیہ کے سرمایہ نے بہت بڑا حصہ لیا۔ جنوبی امریکہ نے اپنی صنعتی دوڑ میں برطانیہ، جرمنی اور امریکہ سے قرض کی مدد پائی۔ ہم انیسویں باب میں پڑھ آئے ہیں کہ دنیا کے ہر حصے کا فاضل سرمایہ نئے مقامات کی تلاش میں تھا لیکن ان نئے مقامات میں روس کا شمار نہ تھا۔ بداعمال بالشویکوں سے نہ سرمایہ داروں کو کوئی غرض تھی اور نہ ان کے لئے ان کے پاس روپیہ تھا۔ جب اشتراکی روس عدم تعاون کی اس آہنی دیوار میں کسی طرح رخنہ نہ پیدا کرسکا تو اُس کو کچھ ضروری مدد کے لئے بڑی کڑی شرطیں منظور کرنی پڑیں۔

دوسرے ملکوں سے ضروری سامان کس طرح آسکتا تھا؟ اور اس سامان کی قیمت کس طرح ادا کی جاسکتی تھی؟ اُس وقت روس کی صنعتی تعمیر کی اتنی بڑی مہم کے لئے سرمایے کی فراہمی کے وسائل کیا تھے؟ یہ بہت اہم سوال ہے اور اس کا جواب بھی سوال سے کم اہمیت نہیں رکھتا ہے۔

سرمایے کا ایک حصہ خود روسی صنعت نے پیش کیا۔

سرمایہ دار ملکوں میں سرمایہ جمع کرنے کا عمل بھی انفرادی ہی ہوتا ہے (یہاں فرد میں

جماعتیں بھی شامل ہیں جیسے کارپوریشنوں اور بینکوں کا محفوظ سرمایہ لیکن اشتراکی سماج میں دولت جمع کرنے کا عمل بھی (پیداوار کی طرح) اشتراکی بنیادوں ہی پر استوار ہوتا ہے۔ ہر صنعت کی پیداوار کا ایک خاص حصہ مرکزی مالیاتی ادارے کی طرف منتقل کیا جاتا ہے۔ یہی ادارہ ان تمام وسائل پر جو توسیع صنعت کے لیے ممکن ہو سکتے ہیں قابو رکھتا ہے۔ اشتراکی روس میں کوپن کلپر جو سرمایہ دارہی سماج میں بہت مانوس ہے اور جو ساری زندگی صنعت کے نفع سے اپنی زندگی وابستہ رکھتا ہے، کوئی جگہ نہیں رکھتا۔ سوویٹ یونین میں حکومت ہی تمام اقتصادی سرگرمیوں کا نفع اکٹھا کرتی ہے اور اس فنڈ کو جو اس طرح اکٹھا ہوتا ہے منصوبے کے بموجب ان شاخوں میں منتقل کرتی ہے جو اس سرمایے کا بہت مفید استعمال کر سکتی ہیں۔

"ہر صنعت کی توسیع کا ایک حصہ اپنی جگہ پر خود حرکی ہوتا ہے، اس کی ترقی میں نفع کا یہ حصہ جو یہ صنعت روک رکھتی ہے، خرچ ہوتا ہے، نفع کا باقی حصہ، دوسری صنعتوں کے باقی نفعوں کے ساتھ مرکزی فنڈ میں اکٹھا ہوتا ہے اور پورے نظام پیداوار اور تقسیم کی توسیع و ترقی پر خرچ کیا جاتا ہے۔ معاشی توسیع کی سربراہی اور نگرانی مرکزی منصوبہ بندی کے ادارے کے اہم فرائض میں داخل ہے"

اشتراکی روس میں تھوڑی بہت انفرادی بچت بھی ہوتی ہے لیکن چونکہ یہ بچت منافع سے حاصل ہوتی ہے اور انفرادی مفہوم میں وہاں کوئی منافع نہیں ہوتا اس لئے روس میں بچت بھی سرمایہ دار ملکوں کی بچت کی طرح پنجۂ غصب نہیں ثابت ہوتی ہے بلکہ قوم ہی کے مقاصد کی تکمیل کے کام آتی ہے۔

فراہمی سرمایہ کی ایک شکل اوپر کی سطروں میں بیان کی جا چکی ہے۔ دوسری اہم تدبیر جس کے ذریعہ سے ضروری صنعتی چیزیں فراہم کی جاتی تھیں، بیرونی تجارت تھی۔

روس کو خود مکتفی بننے کے لئے گیہوں، تیل، معدنیات، لکڑی اور پوستین کے مبادلے میں کاریں، ٹریکٹر، انجن اور مشینیں ڈھالنے والی مشینوں کے حاصل کرنے کی ضرورت تھی۔ توسیع صنعت کے یہ معنی نہ تھے کہ روس گیہوں کی پیداوار روک دیتا، یا تیل اور معدنیات کے حصول کے لئے زمین کی کھدائی بند کر دیتا، جنگلات کٹا کر لکڑی حاصل نہ کرتا یا ان جانوروں کے جال میں پکڑنے کی مہم

ملتوی کر دیتا، جن کی کھال پوستین کے طور پر استعمال ہوتی تھی۔ روس نے کوئی کام نہیں روکا بلکہ بڑے پیمانے پر ان کی توسیع کا بھی انتظام کیا۔ انیسویں صدی عیسوی کے دقیانوسی طریقوں کے بجائے بیسویں صدی کے نئے طریقوں کی آزمائش کی گئی۔ صنعت کی توسیع اور ترقی میں جو سائنٹفک اور میکانکی طریق کار اختیار کیا گیا، اُس نے زراعت اور معدنیات کی توسیع کا بھی کام کیا۔ اسی طرح ہر جگہ اور توسیع کی ہر شاخ میں ان کی صلاحیتیں پیداوار کے اضافہ کا کام کر رہی تھیں۔ روس نے اپنی قدرتی پیداوار برآمد کی اور اُس کے مبادلے میں اپنی صنعت کے لئے ضروری ساز و سامان کی درآمد کا امکان پیدا کر لیا۔

اس کا یہ مطلب ہوا کہ روس نے اپنی غیر ملکی تجارت پر بھی قابو کیا ہوگا اور اُس نے اس کو بھی اپنے منصوبے کا ایک ضروری جزو بنایا ہوگا۔ ہاں روس نے یہی کیا تھا۔

منصوبہ بندی کے مرکزی کمیشن نے یہ طے کر دیا تھا کہ دوسرے ملکوں سے جمہوریہ روس میں کیا چیزیں آئیں گی اور روس سے باہر کیا چیزیں جائیں گی۔ اگر اشتراکی فارم آزاد ہوتے کہ ریاستہائے متحدہ امریکہ سے اپنی ضرورت کی زراعتی مشینیں خرید لیں، اگر برقی صنعتیں آزادی سے جرمنی سے ضروری ساز و سامان منگا لیتیں۔ کاٹن ملیں اپنی مرضی سے انگلستان سے تکلے خرید لیتیں اور اس کاروبار میں مرکزی حکومت کی کسی ہدایت کی ضرورت نہ ہوتی تو پورا نظام لامرکزیت کی چٹانوں سے ٹکرا کر تباہ و برباد ہو گیا ہوتا۔ منصوبہ بندی کا مرکزی کمیشن اضافہ پیداوار کا ایک خاص پروگرام رکھتا تھا۔ بیرونی تجارت بھی اس پروگرام کا ایک جزو تھی۔ اس لئے یہ کیسے ممکن تھا کہ مختلف جماعتوں کو انفرادی طور پر، قومی معاشیات کا لحاظ کئے بغیر خرید و فروخت کی آزادی دیدی جاتی۔ اسی لئے جس طرح بینکوں، ریلوں اور پیداوار کے عام ذرائع کی نگرانی اور سربراہی حکومت کے فرائض میں داخل تھی اسی طرح بیرونی تجارت کا اجارہ بھی مرکزی حکومت کی حدود و اختیار سے باہر نہیں نکل سکتا تھا

اس حقیقت کا علم دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ ببیوف (BABEUF) نے انقلاب فرانس کے زمانے میں اشتمالی ریاست کا ایک خاکہ تیار کیا تھا۔ اس نے بھی اس خاکے میں ضرورت محسوس کی تھی کہ

مرکزی حکومت ہی کو بیرونی تجارت کا اجارہ دار قرار دیا جائے :۔

"دوسرے ملکوں سے تمام آزاد تجارتیں ممنوع قرار دی جاتی ہیں۔ جو سامان تجارت اس قانون کی پرواہ کئے بغیر ملک کے اندر داخل ہوگا۔ قومی معاشیات کے مفاد کے پیش نظر ضبط کر لیا جائے گا ـــــــ جمہوریہ وہ تمام چیزیں جن کی ضرورت قوم کو ہوگی، اپنی زائد پیداوار کے مبادلے میں بیرونی ممالک سے درآمد کرے گی"

بیرونی تجارت کا اجارہ روس کی منصوبہ بند اشتراکی معاشیات کا ایک بنیادی جزو ہے لیکن روس کی حکومت اس تدبیر کے بعد بھی درآمد اور برآمد کی اقسام اور مقدار پر پوری طرح قابو نہ پا سکی جب تک اُس کو ان ممالک سے تجارتی کاروبار کرنا ہے جو اپنا معاشی نظام کسی منصوبے کے ماتحت نہیں چلا رہے ہیں، یہ صورت حال ضرور باقی رہے گی۔ روسی اپنے ملک کے حالات پر قابو پا سکتے تھے لیکن دنیا کے دوسرے ملکوں میں جو کچھ پیش آ رہا تھا اُس پر قابو کرنا اُن کے بس سے باہر تھا اس دشواری کا ان کو اُس وقت اعتراف کرنا پڑا جب اُن کا پنج سالہ پروگرام اپنی عملی منزلیں پوری کر رہا تھا۔

روس کے منصوبہ بندی کے مرکزی کمیشن (GOSPLAN) نے یہ فیصلہ کیا کہ وہ بیرونی ممالک سے کچھ خاص مشینیں درآمد کرے گا۔ اُس نے اُس وقت ان ممالک کو اُس وقت کی مروجہ قیمتوں پر خریداری کے لئے فرمائش بھیجی اور اُس نے اپنے ملک کی پیداوار کا ایک خاص حصہ چند سالوں کے لئے ان مشینوں کی قیمتوں کی ادائگی کے لئے خاص کر دیا۔

جہاں تک ان تدبیروں کا تعلق ہے وہ اپنی جگہ پر بالکل ٹھیک تھیں۔ انھوں نے ان اشیاء کے لئے جن کی ان کو ضرورت تھی معاہدہ بھی کر لیا، اور اس معاہدہ کے بموجب مطلوبہ رقم کی ادائگی کی تدبیریں بھی مکمل کر لیں۔ ہر بات بظاہر بہت ہی امید افزا معلوم ہوتی تھی۔

لیکن ۱۹۲۹ء میں دنیا کے سرمایہ دار ملکوں میں بحرانی دور (CRISIS) شروع ہو گیا روس نے ان ملکوں سے جو معاہدہ کیا تھا وہ ابھی تک باقی تھا۔ بیرونی ممالک میں ان چیزوں کی

قیمتیں جو روس کو برآمد کرنی تھیں بہت کم ہوگئیں۔ فرض کرو روس کو اس مشینری کے لئے، جس کی فرمائش اس نے بھیجی تھی، ایک کروڑ ڈالر ادا کرنے تھے۔ یہ بھی فرض کرلو کہ منصوبہ بندی کے مرکزی کمیشن (GOSPLAN) نے فیصلہ کیا تھا کہ اس مشینری کے مبادلے میں حسب ذیل چیزیں حسب ذیل شرح سے برآمد کرے گا:-

۲۰۰۰۰۰۰ بشل[1] گیہوں	ایک ڈالر فی بشل کی شرح سے =	۲۰۰۰۰۰۰ ڈالر
۱۰۰۰۰۰۰ پوستین	تین ڈالر فی پوستین کی شرح سے =	۳۰۰۰۰۰۰ ڈالر
۲۵۰۰۰۰۰ پیپے تیل	دو ڈالر فی پیپے کی شرح سے =	۵۰۰۰۰۰۰ ڈالر
	میزان =	۱۰۰۰۰۰۰۰ ڈالر

اب اس بحرانی دور میں گیہوں کی قیمت گر کر پچاس سنٹ فی بشل ہوگئی۔ پوستین بھی مٹی کے مول بکنے لگی اور تیل کی شرح بھی گر کر اتنی کم ہوگئی جو کبھی سننے میں نہ آئی تھی۔ اب سویٹ روس کے لئے کیا چارۂ کار باقی تھا؟ اس کو مشینری کی بہر صورت ضرورت تھی اور اس کو اس کی قیمت بھی اپنے مالِ برآمدی سے ادا کرنی تھی (اگر ان مشینوں کی خریداری کے لئے سابقہ اونچی قیمتوں پر معاہدہ نہ ہوا ہوتا تب بھی صورتِ حال میں کوئی تبدیلی نہ ہوتی۔ مصنوعات کی قیمتیں نہ اتنی جلد گریں اور نہ اتنی زیادہ کم ہوئیں جتنی روسی پیداوار کی قیمتیں بہت کم مدت میں گریں اور گر کر اپنی انتہا کو پہونچ گئیں) روس کو اب اپنے منصوبے کے مقابلے میں دونی پیداوار برآمد کرنی پڑتی تھی۔ اب اس کو اپنے عوام کو یہ کہہ کر سمجھانا پڑتا تھا:-

"تم کو کچھ اور کفایت شعاری سے کام لینا چاہیے۔ دنیا کے سرمایہ دار ملکوں نے کچھ ایسی ابتری پھیلا رکھی ہے کہ دنیا میں قیمتیں اچانک کم ہوگئی ہیں اور اب ہم کو اس گیہوں کے لئے جو ہم اب تک بھیجا کرتے تھے صرف آدھی رقم ملے گی اس لئے ہم کو اپنا حساب بیباق کرنے کے لئے اب دوگنا گیہوں برآمد کرنا پڑے گا۔"

---

[1] BUSHEL غلے کا ایک پیمانہ جو آٹھ گیلن (۲۹ سیر) ہوتا ہے)

جو کچھ پیش آ رہا تھا یہ اُس کی ایک دھندلی سی تصویر ہے۔ روس نے اپنی حدود مملکت میں بحران سے بچنے کا منصوبہ مکمل کر لیا تھا لیکن سرمایہ دار ملکوں میں جو کچھ پیش آ رہا تھا اُس کا اثر اُس کے اوپر بھی پڑ رہا تھا۔ بیرونی ملکوں کا بحران ایک ایسا بیرونی عامل تھا جو منصوبے کے توازن کو بری طرح بگاڑ رہا تھا۔

کچھ اور ابتریاں بھی جو بعض اندرونی عوامل کی وجہ سے پیدا ہو رہی تھیں کچھ کم اہم نہ تھیں ان میں سے بعض اسباب ایسے تھے جن پر قابو حاصل کیا جا سکتا تھا لیکن کچھ ایسے بھی تھے جن پر قابو پانا ممکن نہ تھا۔ تمام معاشی اعمال کی اجتماعی منصوبہ بندی میں جو بہت غور و فکر کے بعد کی گئی ہو بعض اجزا بعض اجزا پر منحصر اور ان سے جڑے ہوئے ہوتے ہیں۔ اگر اس مشین کے ایک پہیئے کے کسی ایک دانت کو توڑ دو تو دوسرے پہیئے اس سے ضرور متاثر ہوں گے۔ فرض کرو، کپاس کی فصل کا بڑا حصہ کیڑے تباہ کر دیتے ہیں فصل کی اس تباہی کا اثر پارچہ بافی کے کارخانوں پر فوراً پڑ جائے گا اور اگر منصوبے میں سوتی کپڑے کی برآمد بھی شامل ہو گی تو بیرونی تجارت بھی اس نقصان کی زد سے نہ بچ سکے گی۔ اگر بازار میں سوتی چیزیں اُس مقدار میں موجود نہ ہوں گی جس کی توقع کی جاتی تھی تو اجرت اور اشیا کی قیمتوں کے رشتے پر بھی اثر پڑے گا۔ روس کے ماہرین اقتصادیات نے اپنے تجربے سے معلوم کیا کہ:-

> "قومی معاشیات کے تمام اجزا آپس میں ایک دوسرے سے مربوط ہیں۔ اس لئے اگر کسی ایک گوشے میں کوئی حصہ ٹوٹ جائے تو دوسرے حصوں میں اثر پڑ جاتا ہے۔ اگر کسی ایک شعبے میں منصوبے کے بموجب قدم نہ بڑھایا جائے تو دوسرے بہت سے شعبے خواہ وہ اپنی جگہ پر کتنا ہی اچھا کام کر رہے ہوں اس ایک شعبے کی پسماندگی سے ضرور متاثر ہوتے ہیں منصوبے سے کسی ایک جگہ قدم ہٹانے کا مطلب یہ ہے کہ دوسری جگہوں پر بھی ایسے ہی اقدام کئے جائیں جو باہمی ربط اور نظم میں کوئی ابتری نہ ہونے دیں"

خطرہ اور خطرے سے بچنے کی تدبیر دونوں ساتھ ساتھ موجود ہیں منصوبہ بنانے والوں کے پاس کچھ ایسا محفوظ سامان بھی ہونا چاہیئے جو ناگہانی مصیبتوں کے حملوں کا رُخ پھیر سکے، ان کو اپنے

منصوبوں میں ناگہانی حادثوں کی رعایت بھی رکھنی چاہیئے۔ ان کو وہ اعداد و شمار مہیا کرنے چاہئیں جو بتائیں کہ گذشتہ زمانوں میں زیادہ سے زیادہ اور کم سے کم کیا واقعات پیش آئے تھے اور ان معلومات کی بنیاد پر ان کو یہ رائے قائم کرنی چاہیئے کہ آئندہ کیا پیش آنے کے امکانات ہیں لیکن صرف اتنا ہی کافی نہیں ہے۔ ان کو اس کے لئے بھی تیار رہنا چاہیئے کہ اگر وہ امکانات ظہور پذیر نہ ہوں تو وہ ایسی شکلیں اختیار کر سکیں جو ان کے منصوبے کے ربط و نظم کو غیر متوقع حالات کی زد سے بچا سکیں۔

ربط و نظم پیدا کرنے والی تدبیروں کا کاغذ پر اختیار کرنا بہت آسان ہے لیکن عملی طور پر ان تدبیروں کو بروئے کار لانا بہت مشکل ہے۔ روسیوں نے کئی مرتبہ اپنی ان بے تدبیریوں کا خمیازہ بھگتا ہے۔ وبس (WEBBS) سے ہم کو اس طرح کے ایک واقعہ کا علم ہوتا ہے :-

> (موٹر سازی کے) ایک کارخانے کے افتتاح کا (جو گورکی میں کھلنے والا تھا) یکم مئی ۱۹۳۲ء کو ایک عام اعلان کیا گیا۔ لیکن پوری مہم اپنی جگہ پر جم کر رہ گئی۔ زبردست عمارتیں جو ڈٹرائٹ (DETROIT) کے فورڈ کے کارخانے کے نمونے پر بنائی گئی تھیں قیمتی مشینوں سے بھری پڑی تھیں ہزاروں مزدوروں کے نام تنخواہ کے رجسٹر پر چڑھے ہوئے تھے لیکن کنویر (CONVEYOR) نے اپنی جگہ سے جنبش کرنے کا نام نہ لیا۔ وہ جگہ جہاں وہ نصب کیا گیا تھا غیر محفوظ بنیاد ہونے کی وجہ سے کئی مقامات پر دب گئی تھی۔......... اگر کنویر (CONVEYOR) کسی طرح جنبش میں آ بھی جاتا تو دوسرے ایسے پرزوں کی کمی محسوس ہوتی جو ایک دوسرے کے ساتھ مل کر اسے چلاتے ہیں۔"

یہ کارکردگی کے فقدان، رہنمائی اور باہمی ربط و نظام کی کمی کی بڑی زبردست مثال ہے لیکن کیا اس کا الزام بھی قومی منصوبہ بندی کے سر تھوپنا مناسب ہوگا؟ کیا اس کی وجہ روسیوں کی صنعتی ناتجربہ کاری نہ تھی؟ وبس (WEBBS) ہی کے بیان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ روسیوں نے تھوڑے ہی عرصے میں تجربہ حاصل کر لیا اور اب روس میں نئے کارخانے بھی پہلے ہی دن سے کام شروع کر دیتے ہیں۔ اگر قومی منصوبہ بندی ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں رواج پاتی تو بلا خوف تردید

کہا جا سکتا ہے کہ یہاں ربط و تنظیم کی صلاحیت میں کسی قسم کی کمی کی شکایت نہ ہوتی۔ فارچون (FORTUNE) کے اڈیٹروں نے جو بیان شائع کیا ہے اُس سے پتہ چلتا ہے کہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی اسٹیل کارپوریشن کی صرف دو لوہے کی کمپنیاں ا۔۔

"اتنا لوہا پیدا کر سکتی ہیں جتنا جرمنی اور انگلستان نے ۱۹۳۷ء میں مجموعی طور پر پیدا کیا تھا"

اگر ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی اسٹیل کارپوریشن میں ربط و تنظیم کی وہ صلاحیت نہ ہوتی جس کی صنعتی تنظیم کے اہم مسائل کے حل کرنے کے لئے ضرورت پڑتی ہے تو وہاں فولاد کی اتنی بڑی مقدار کبھی پیدا نہ کی جا سکتی۔ اس لئے یہ کہنا کہ تمام ضروری اجزا کا اکٹھا کرنا بہت مشکل کام ہے اس لئے قومی منصوبہ بندی کا کوئی امکان نہیں ہے اپنی جگہ پر صحیح نہیں ہے۔

کچھ اور دلائل بھی پیش کئے جاتے ہیں۔ ایک دلیل سے اشتراکی قومی معاشیات (SOCIALISED-NATIONAL PLANNING) کے پہلے لفظ اشتراکی پر حملہ کیا جاتا ہے اور دوسری دلیل سے قومی منصوبہ بندی کے لفظ پر زد لگائی جاتی ہے۔ یہ دعویٰ بھی کیا جاتا ہے کہ اشتراکیت کبھی کامیاب نہ ہوگی دلیل یہ دی جاتی ہے کہ چونکہ اس نظام میں منافع ایک محرک کی حیثیت سے مقصود نہیں ہوتا اس لئے کام کرنے والے اس محرک کی عدم موجودگی میں جی لگا کر کام نہ کریں گے۔ نہ وہ اپنی انتہائی صلاحیتیں صرف کریں گے اور نہ اپنے نتائج کے حصول کے لئے نئی تدبیریں عمل میں لائیں گے اور نہ اپنی مسلسل جد و جہد میں کسی قسم کا خطرہ برداشت کرنے کے لئے تیار ہوں گے۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ معاشی زندگی ہر حرکت سے محروم ہو کر اپنی جگہ پر جم کر رہ جائے گی۔

روسی اس طرزِ استدلال کو احمقانہ خیال کرتے ہیں۔ وہ جواب دیتے ہیں کہ سرمایہ داری سماج میں سارا کام وہ لوگ کرتے ہیں جن کو کسی منافع کی امید نہیں ہوتی۔ وہ دن رات صرف اپنی اجرت کے لئے پسینہ بہاتے ہیں۔ وہ صرف اپنی روزی کمانے کے لئے محنت کرتے ہیں اس لئے نفع کی امید نہ ہونے سے کوئی خاص صورت حال نہ پیدا ہوگی بلکہ جس طرح دوسرے سرمایہ دار ملکوں میں کام ہوتا ہے اُسی طرح روس میں بھی ہوگا۔ روس میں ایک بات اور بھی ہوگی سماجی دباؤ، سماجی احترام اور

غیر معمولی اعزاز جو اچھے کارکنوں کو نصیب ہوتا ہے، یہ سب وہ محرکات ہیں جو سرمایہ داری ملکوں کے محرکات کے مقابلے میں زیادہ پیداوار کے موجب ہوتے ہیں۔ روسی بہت فخر کے ساتھ جس کے وہ ہر طرح مستحق ہیں ان محنت کشوں کے رضاکارانہ جذبات کی طرف اشارہ کرتے ہیں جو اپنا کام ختم کر کے کسی معاوضے کے لالچ کے بغیر ان معاشی محاذوں پر جہاں کام کی رفتار سست ہوتی ہے، جا پہونچتے ہیں لینن کے ۱۹۱۹ء میں سباٹنکس (SUBBOTNIKS) سے بہت متاثر ہو کر لکھا تھا:-

"کمیونسٹ سباٹنکس بڑی زبردست تاریخی اہمیت کے مالک ہیں۔ آخری تجزیئے میں یہ ثابت ہو گیا ہے کہ نئے سماجی نظام کی تخلیق کے لئے محنت کی بارآوری ایک زبردست اور اہم عامل کی حیثیت رکھتی ہے۔ سرمایہ داری نظام نے محنت کی بارآوری اس منزل میں پہونچا دی جو سرفوں میں ناپید تھی۔ سرمایہ داری نظام بھی اپنے انجام کو پہونچنے والا ہے اور اشتراکیت محنت کی انتہائی بارآوری کی تخلیق کر کے سرمایہ داری نظام کے خاتمے کی موجب ہو گی۔ یہ کام بہت دشوار ہے اور اپنی تکمیل کے لئے بڑی طویل مدت کا محتاج ہے۔ کمیونزم نام ہے محنت کی انتہائی بارآوری کا جو سرمایہ داری نظام کے تجربے میں کبھی نہیں آسکی ہے۔ محنت کی یہ انتہائی بارآوری رضاکار محنت کشوں میں پائی جائے گی۔ جو بیدار اور متحد ہوں گے اور جو نئے اور ترقی یافتہ طریقوں سے کام لیں گے۔"

اشتراکی مقابلہ (SOCIALIST COMPETITIONS) بھی محنت کی بارآوری بڑھانے کا ایک طریقہ ہے۔ مزدوروں کی ٹولیاں ان دوستانہ مقابلوں میں ایک دوسرے سے سبقت لیجانے کی کوششیں کرتی ہیں اور ان کی یہ کوشش پیداوار بڑھانے کا سبب ہوتی ہیں۔ جب مقابلہ ختم ہو جاتا ہے جیتنے والا وہ کرتا ہے جو کسی دوسرے مقابلے کے میدان میں دیکھنے میں نہیں آتا۔ وہ ہارنے والوں کے پاس جاتا ہے، ان کی مدد کرتا ہے اور انھیں بتاتا ہے کہ مقابلہ جیتنے کے گر کیا ہیں تاکہ یہ ہارنے والے بھی آئندہ مقابلے میں کسی سے پیچھے نہ رہیں۔ روسی یہ بھی کہتے ہیں کہ اشتراکی منصوبہ بند معاشیات میں بھی اچھے کام کرنے والوں کی حوصلہ افزائی کے لئے انعام و اکرام اور بامعاوضہ

چھٹیوں کی گنجائش ہے اور روسیوں کی معاشی زندگی میں یہ باتیں بھی عام ہیں۔

مانچسٹر گارجین نے بھی کم سے کم اتنا تو تسلیم کرلیا ہے کہ روسی نفع کے کسی محرک کے بغیر بھی اپنے آدمیوں سے کام لینے میں پوری طرح کامیاب ہو گئے ہیں۔ ۲۰ رفروری ۱۹۳۶ء کے اداریتی مقالے میں اس اخبار نے لکھا ہے :-

"وہ دنیا جو ابھی تک اجتماعی ملکیت (COLLECTIVE OWNERSHIP) کی کامیابی کو شک و شبہ کی نگاہ سے دیکھتی رہی ہے، یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہو رہی ہے کہ اجتماعی ملکیت زندگی کی قوتیں حاصل کر رہی ہے اور اس نے حب وطن کے نئے تصورات اور محنت کے نئے محرکات پیدا کرلئے ہیں، یہ آباؤ اجداد اور پیغمبروں کی اشتراکیت نہ سہی لیکن یہ کامیاب ضرور ہو رہی ہے"

اس اعتراض کے جواب میں کہ مقابلے کی عدم موجودگی میں کوئی ایسا محرک نہ ہوگا جو کسی نئے تجربے پر آمادہ کرسکے اور نئے طریقوں کی دریافت کی خاطر خطرات کے مقابلے کا حوصلہ دلا سکے، روسی بڑی سادگی سے کہتے ہیں "ریکارڈ دیکھو" وہ کہتے ہیں کہ دنیا میں کہیں زندگی کی ہر شاخ پر نہ اتنے تجربات کئے جا رہے ہیں اور نہ اتنا روپیہ خرچ کیا جا رہا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ان کو اپنی معاشی زندگی پر پورا قابو حاصل ہے اور وہ ہر نئے نظریے اور طریقے کا آزادی سے پورا تجربہ کرسکتے ہیں اپنے سرمایہ دار ملکوں کی صنعتیں جو ایک دوسرے سے نبرد آزما ہیں، اس طرح کے کسی اقدام کی ہمت نہیں کرسکتیں۔ ان کے اس دعویٰ کو ویبس (WEBBS) کی تائید حاصل ہے۔

بڑے معاملات ہوں یا چھوٹے آگے قدم بڑھانے کے حوصلے کی کسی قسم کی کوئی کمی نہیں ہے نئی ترقی کے میدان میں کوئی خطرات کے مقابلے سے نہ گھبراتا ہے اور نہ پہلو تہی کرتا ہے۔ روسی اشتمالیت زندگی کی ہر شاخ میں انتہائی پیش قدمی کا جوہر رکھتی ہے۔ .... سوویٹ روس کی تاریخ کا کوئی طالب علم یہ دیکھ کر متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ صنعت، سائنس، آرٹ اور سماجی اداروں کی مختلف شاخوں میں تبدیلی کی زبردست خواہش پائی جاتی ہے اور نئے تجربوں کے لئے خطرات برداشت کرنے کا حوصلہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے مقابلے میں

کہیں زیادہ مشاہدے میں آتا ہے۔"

قومی منصوبہ بندی پر ماہرین معاشیات نے ایک دوسرے انداز سے اعتراض کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ جہاں قومی منصوبہ بندی کا تسلط ہوتا ہے وہاں بازار آزاد نہیں ہوتے اور بازاروں کی آزادی کے بغیر قیمتوں کا نظام قائم نہیں ہو پاتا اور جب قیمتوں کا نظام درہم برہم ہو جائے تو قومی معاشیات کو بڑا زبردست دھکا لگتا ہے اور قیمتوں کے بغیر اشیا کی اضافی کمی کا، جو طلب کی نسبت سے معلوم ہوتی رہتی ہے علم نہیں ہو سکتا۔ اس لئے اشیا کی پیداوار من مانی، بے قاعدہ، اور غیر معاشی ہوگی۔ اور ذرائع پیداوار ایسی چیزوں کی پیدائش پر صرف ہو جائیں گے جن کی اس وقت زیادہ حاجت نہ ہوگی اور وہ چیزیں رہ جائیں گی جن کے پیدا کرنے کی اس وقت بہت ضرورت ہوگی۔ اگر قیمتیں ہوتیں تو اس گمراہی کی نوبت نہ آتی سرمایہ داری نظام میں بازار کی قیمت ہی چڑھ اتر کر پیداوار کی راہ متعین کرتی ہے۔ قیمتوں کی زیادتی کسی چیز کی بڑھی ہوئی طلب کا پتہ دیتی ہے اور قیمتوں کی کمی سے اس چیز کی طلب کی کمی کا علم ہوتا ہے۔ ہم کو قیمتوں کے اس اتار چڑھاؤ سے پتہ چل جاتا ہے کہ ہم کو عوام کی ضروریات کے مطابق کیا چیزیں بنانی اور کیا نہ بنانی چاہئیں۔ قیمتوں کے اس قسم کے نظام کی عدم موجودگی میں ماہرین معاشیات دریافت کرتے ہیں کہ تم کس طرح فیصلہ کرو گے کہ عوام کی ضروریات کی تسکین کے لئے تم کو اپنا سرمایہ کہاں لگانا چاہیئے؟

قومی منصوبہ بندی کے ماہرین (NATIONAL PLANNERS) اس اعتراض کے جواب میں کہتے ہیں کہ یہ خیال ہی غلط ہے کہ قیمتوں کا نظام اس قسم کی کوئی خدمت انجام دیتا ہے وہ کہتے ہیں کہ قیمتیں درحقیقت لوگوں کی طلب کے بموجب جنبش نہیں کرتی ہیں بلکہ بڑی حد تک کچھ لوگوں کی قوت خریداران کو حرکت میں لانے کا موجب ہوتی ہے۔ ان کے نزدیک قیمتوں کے نظام کا صرف اتنا ہی فرض ہے کہ وہ صرف ان لوگوں کی ضرورتیں پوری کرتا رہے جن کے پاس اپنی ضرورتوں کی تشفی کے لئے روپیہ ہے اور وہ اس روپیہ کو اپنی ضرورت کی چیزوں کی خریداری

بر صرف بھی کر سکتے ہیں۔

قومی منصوبہ بندی کے ماہرین کہتے ہیں کہ بازار کی قیمت جو سرمایے کے معقول استعمال کے لئے بڑی اچھی مشیر بتائی جاتی ہے سرمایہ داری نظام میں بڑی ابتریوں کا شکار ہوتی رہتی ہے اور حفاظتی محصول، خاص ٹیکس اور اجارے ان قیمتوں کو اپنی اصل اور قدرتی جگہ سے ہٹاتے رہتے ہیں۔ اس لئے ایسا سرمایہ داری نظام، جہاں ہر چیز نظامِ قیمت کے ماتحت ٹھکانے سے پوری طرح کام کرتی رہے، بورژوا ماہرین معاشیات کی کتابوں کے سوا اور کہیں موجود نہیں ہے۔ اگر یہ نظام اتنی اچھی طرح کام کر سکتا تو یہ بحرانی دوروں کا شکار کیوں ہوتا رہتا!

یہ تو دوسروں کے اعتراضات کے جوابات تھے۔ قومی منصوبہ بندی کے ماہرین دعویٰ کرتے ہیں کہ ہم بھی رسد اور طلب میں مطابقت قائم رکھنے کا ایک طریقہ جانتے ہیں منصوبہ بندی کا مرکزی کمیشن ہر مہینے، ہر ہفتے اور روزانہ ملک کے ہر حصے سے رپورٹیں وصول کرتا رہتا ہے اور ان رپورٹوں سے یہ پتہ چلتا رہتا ہے کہ لوگوں کو کن چیزوں کی طلب ہے اور ان کو کیا چیزیں پہونچائی جا رہی ہیں۔ فرض کرو منصوبے میں یہ طے کیا گیا تھا کہ دو ملین جوڑ جوتے اور ڈیڑھ ملین گھر تیار کئے جائیں گے لیکن رپورٹ ملتی ہے کہ جوتے کافی نہیں ہیں اور لوگوں کو نئے گھروں میں منتقل ہونے کی کوئی زیادہ فکر نہیں ہے، منصوبے میں لوگوں کی ضروریات پوری کرنے کی بڑی گنجائش ہوتی ہے اس لئے اس کو سختی سے اپنے فیصلوں پر اڑنے کی ضرورت نہیں ہوتی محنت اور سرمایہ دونوں تعمیر مکان کی مد سے ہٹا کر جوتے بنانے پر لگائے جا سکتے ہیں۔ کوئی شبہ نہیں یہ تغیر فوراً نہ ہو سکے گا لیکن اس تغیر میں اس سے زیادہ دیر نہ لگے گی جتنی سرمایہ دار سماج میں لگتی۔

سرمایہ دار ناقدین ایک اور سوال اُٹھاتے ہیں۔ وہ پوچھتے ہیں کہ منصوبہ بندی کمیشن کس طرح فیصلہ کرے گا کہ کوئلہ کاٹنے والی برقی مشین چالو کی جائے یا خود حرکتی کرگھوں کو رواج دیا جائے جبکہ اس کے پاس دونوں کے لئے کافی سرمایہ موجود نہیں ہے؟ مرکزی با اختیار طاقت کو ان کاموں پر، جو ایک دوسرے سے ٹکراتے ہیں اپنا محدود سرمایہ تقسیم کرنا ہوگا۔ روسی اپنی

اس مجبوری کا اعتراف کرتے ہیں لیکن وہ کہتے ہیں کہ اگرچہ ہم اشتراکی قومی منصوبہ بندی (SOCIALIST NATIONAL PLANNING) اور آزاد بازار دونوں سے ساتھ فائدہ نہیں اُٹھا سکتے" اور آزاد بازار کی قیمت ہم کو ہمارے سرمایہ کا پورا معاشی فائدہ نہیں پہونچاتی لیکن پھر بھی وہ ہم کو بہت سی چیزیں دیتی ہے۔ وہ ان بہت سی چیزوں میں لوٹ کھسوٹ سے نجات، مساوات اور سکون کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ان نعمتوں کو اُس نفع پر ترجیح حاصل ہے جو اگرچہ بے انتہا ہو لیکن صرف چند آدمیوں کو حاصل ہوتا ہو۔ وہ دولت کی تقسیم کو جو زیادہ سے زیادہ مساویانہ ہو "دو قوموں" کے وجود سے اچھا سمجھتے ہیں۔ وہ محفوظ، بے لوث اور منظم روزی کو جو ایک سوچے اور سمجھے ہوئے نظام (PLANNED SYSTEM) کے ماتحت حاصل ہو غیر منصوبہ بند معاشیات (UNPLANNED ECONOMY) کے بحران اور تجارتی گرم بازاری سے بہتر سمجھتے ہیں۔

۱۹۲۹ء میں جو کساد بازاری پھیلی تھی وہ اکثر ایک عالمگیر بحران کے نام سے پکاری گئی ہے۔ ہم کو بتایا گیا ہے کہ پیداوار نے مفلوج ہو کر عام بے روزگاری اور پریشانی سے ساتھ مل کر دنیا کے ہر گوشے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا لیکن روسی کہتے ہیں کہ یہ بیان صحیح نہیں ہے۔ کوئی شبہ نہیں بحران نے ایک طوفانی لہر کی طرح تمام ملکوں کو چھاپ لیا تھا لیکن ایک ملک ایسا بھی تھا جس کی سرحد سے سر پھوڑ کر یہ موج لوٹ گئی تھی یہ ملک سویٹ روس کے سوا کوئی دوسرا نہ تھا۔ روسی اس بحران سے اپنی اشتراکی منصوبہ بند معاشیات (SOCIALIST PLANNED ECONOMY) کے سہارے صاف بچ گئے تھے۔

جب یہ باب لکھا جا رہا تھا سویٹ روس کے نئے دستور کی تکمیل کی اطلاع آئی۔ اس نئے دستور پر فوراً عمل نہیں کیا گیا۔ اس کو سب سے پہلے پوری سویٹ یونین کے عوام کے سامنے پیش ہونا تھا تاکہ وہ اس پر بحث کر سکیں، اُس کے اچھے اور بُرے پہلوؤں پر نظر ڈال سکیں اور اپنی ترمیمیں پیش کر سکیں۔ پہلے مسودہ کی بعض اہم باتیں نیچے دی جا رہی ہیں:۔

دفعہ ۱:۔ سویٹ روس کی اشتراکی جمہوریت مزدوروں اور کسانوں کی اشتراکی ریاست ہے

دفعہ ۴: یو۔ ایس۔ ایس۔ آر (یونین آف سوویٹ سوشلسٹ ری پبلک) کی معاشی بنیاد پیداوار کے ذرائع اور ساز و سامان کی اشتراکی ملکیت پر مشتمل ہے۔ یہ بنیاد سرمایہ داری معاشیات پیداوار کے ذرائع اور آلات کی نجی ملکیت اور ایک آدمی کے دوسرے آدمی کو لوٹنے کھسوٹنے کے حق کو مکمل طریقہ سے ختم کر کے مضبوطی سے قائم کی گئی ہے۔

دفعہ ۱۱: یو۔ ایس۔ ایس۔ آر کی معاشی زندگی کے متعلق فیصلے اور رہنمائی کا کام قومی معاشی ریاستی منصوبے" (NATIONAL ECONOMIC STATE PLAN) کے بموجب انجام پائے گا۔ یہ منصوبہ عوامی دولت کے اضافے، محنت کشوں کے مادی اور تمدنی معیار کی منظم بلندی یو۔ ایس۔ ایس آر کی آزاد ریاست کی مضبوطی اور پائداری اور اس کی قوت مدافعت کے استحکام کی غرض سے بنایا جائے گا

دفعہ ۱۱۸: یو۔ ایس۔ ایس۔ آر کے باشندے کام کرنے کا حق رکھتے ہیں اور ان کو حق ہے کہ وہ ایسا کام جس کی ضمانت کی گئی ہو لیں اور اپنے کام کی مقدار اور نوعیت کے لحاظ سے معاوضہ بھی وصول کریں۔

"قومی معاشیات کے اشتراکی نظام، سوویٹ برادری میں پیداوار کی طاقتوں کے یکساں اور باقاعدہ نمو، معاشی بحران کی طرف سے پورے اطمینان اور بے روزگاری کے خاتمے نے کام کرنے کے حق کی پوری ذمہ داری لی ہے۔"

کیا وہ شکر سے دست بردار ہو جائیں گے؟

مغربی دنیا افراط کے باوجود غربت کی مصیبت سے دوچار تھی
آخر اس پریشانی کا حل کیا تھا؟

کچھ تو ہونا چاہیے تھا تاکہ سرمایہ داری کی تباہی نے جو ابتری پیدا کر دی تھی اُس سے نجات حاصل کی جاتی۔ تباہی اپنی جگہ پر بالکل مکمل تھی۔ قرض کے نظام کا پورا ڈھانچہ ٹوٹ پھوٹ گیا تھا صنعت مفلوج ہو گئی تھی۔ لاکھوں آدمی بیکار ہو چکے تھے۔ کسانوں کی حالت تباہ تھی۔ غربت نے افراط کے آغوش میں اپنا ٹھکانا بنایا تھا —— ہاں —— بلاشبہ کچھ ہونا چاہیے تھا۔ پرانے نظام کی بنیاد "عدم مداخلت" (LAISSEZ-FAIRE) پر قائم تھی لیکن پرانا نظام تباہ ہو چکا تھا۔ اب تغیرات کی ضرورت تھی۔ اور "عدم مداخلت" کی حکمت عملی کے بجائے اب منظم ترتیب قائم کرنے اور باقاعدہ قابو کرنے کی ضرورت تھی۔ ایک آزاد معاشی زندگی کا نتیجہ تباہی کی شکل میں نکلا تھا۔ اب اس کو بے عنانی سے بچانا تھا اس لئے اب اس کو قابو میں رکھنا اور اُس کی رہنمائی کا فرض انجام دینا تھا۔

"اب ہم کو منصوبہ بنانا چاہیے"

مغربی دنیا بھی، جو افراط کے باوجود غربت کی مصیبت میں گرفتار تھی، روس کی طرح منصوبہ بندی کی طرف مائل ہوئی لیکن ان دونوں میں ایک فرق بھی تھا۔

سویٹ روس میں چیزیں استعمال کرنے کے لئے پیدا کی جاتی ہیں لیکن سرمایہ دار ملکوں میں پیداوار کا مقصد نفع کمانا ہے سویٹ روس میں ذرائع پیداوار کی نجی ملکیت کا خاتمہ کر دیا گیا ہے

لیکن سرمایہ دار ملکوں میں ذرائع پیداوار کی نجی ملکیت مقدس ہے اور اُس کو کوئی ہاتھ نہیں لگا سکتا۔ سویٹ روس میں منصوبہ بندی ہمہ گیر ہوتی ہے اور معاشی سرگرمی کے ہر میدان پر اس کا اقتدار قائم ہوتا ہے لیکن سرمایہ دار ملکوں کی منصوبہ بندی جزوی ہوتی ہے اور وہ معاشی زندگی کے ایک پہلو پر تو قابو کرتی ہے لیکن دوسرے پہلوؤں کو بالکل نظر انداز کر دیتی ہے۔ سویٹ یونین میں استعمال کرنے والے استعمال کرنے والوں کے لئے منصوبہ بناتے ہیں لیکن سرمایہ دار ملکوں میں پیدا کرنے والے پیدا کرنے والوں کے لئے منصوبہ بندی کرتے ہیں۔

افراط میں غربت کے تضادے سے تنگ آکر سرمایہ دار ملکوں نے اس مشکل سے نجات پانے کے لئے منصوبہ بنایا۔

یہ منصوبہ "افراط ختم کرنے کے لئے" بنایا گیا تھا۔

تم کو یہ سرخیاں بھولی نہ ہوں گی "کپاس کی کاشت کم کی گئی"۔ "سوروں کے ہزاروں بچے ذبح کر دئے گئے"۔ "گنے کی کاشت گھٹا دی گئی"۔ یہ تمام تدبیریں اسی معاشی منصوبے کے بموجب اختیار کی گئی تھیں۔ توازنِ زراعت کے محکمے (THE AGRICULTURAL ADJUSTMENT ADMINISTRATION) نے امریکہ کے کپاس، گیہوں، جوار، سور، تمباکو اور گنا پیدا کرنے والوں سے معاہدے کئے اور ان لوگوں کو جنھوں نے اپنی پیداوار گھٹانے کا وعدہ کیا معاوضے دئے گئے۔ تقلیل پیداوار کی اس مہم کا مقصد اس کے سوا کچھ اور نہ تھا کہ "افراط کا خاتمہ" کیا جاتا۔

دوسرے ملکوں میں بھی اسی طرح کے "منصوبوں" کے ماتحت پیداوار کی تباہی اور تجدید کا عمل جاری تھا۔ نیویارک ٹائمس نے ۳ رجولائی ۱۹۳۶ء کی اشاعت میں جنوبی امریکہ کی حسب ذیل داستان شائع کی تھی:-

"برازیل نے کافی کی تیس[۳۰] فی صدی پیداوار ضائع کر دی کاشتکاروں کو چھیاسٹھ[۶۶] لاکھ بوروں کا معاوضہ جو حکومت نے لے لئے ۵ ملریس[۱] فی بورے کے حساب سے دیا گیا"

[۱] پرتگالی طلائی سکہ جو ۴ شلنگ ۸ پنس کے برابر ہے۔

"ریوڈی جنیرو۔ ۲ر جولائی ۱۹۳۶ء کی کافی کی فصل کے دو کروڑ بیس لاکھ بوروں اور گزشتہ سال کے بچے ہوئے تقریباً چالیس پچاس لاکھ بوروں کی مجموعی تعداد کا ۴۲ فی صدی نیشنل کافی ڈپارٹمنٹ نے برباد کر دیا ہے۔ اور پیدا کرنے والوں کو پانچ ملریس (MILREIS) فی بورے کے حساب سے اُس کافی کا معاوضہ جو برباد کی گئی ہے، ادا کر دیا ہے۔"

سمندر پار براعظم یورپ سے بھی اسی قسم کی خبریں آ رہی تھیں حسب ذیل خبر جو انگلستان سے آئی تھی، پہلے صفحے پر شائع ہوئی تھی:۔

برطانیہ بھی ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے انداز پر اپنی پیداوار میں کمی کر رہا ہے
ایک قانون جو قیمتیں بڑھانے کے لئے سوتی مصنوعات کی پیداوار پر پابندی عائد کرے گا

از چارلس اے سلڈن

"لندن۔ ۴ر فروری۔ برطانیہ عظمیٰ نے بھی آج رات کو دارالعوام میں ایک قانون کی دوسری خواندگی ختم کی ہے۔ اس قانون کے بموجب تمام ضرورت سے زائد تکلے ختم کر دئیے جائیں گے۔ برطانیہ نے یہ قدم اُٹھا کر صدر روزولٹ کی حکمت عملی پر عمل کیا ہے تاکہ قانوناً پیداوار گھٹا کر اشیا کی اچھی قیمتیں حاصل کی جا سکیں...... اس ملک میں فاضل پیداوار کی مصیبت سے نجات پانے کی غرض سے دوسری صنعتوں میں بھی (مثلاً جہاز رانی اور کوئلے کی صنعتوں میں) کچھ تدبیریں اختیار کی گئی تھیں لیکن یہ ابتدائی کوششیں اپنی تائید میں کوئی آئینی قوت نہیں رکھتی تھیں لیکن اب روئی کے تکلوں کے قانون (COTTON SPINDLES BILL) نے یہ کمی پوری کر دی ہے۔ اس قانون کے بموجب حکومت ایک بورڈ قائم کرے گی جس کو معاوضہ دے کر زائد تکلے خرید لینے کا اختیار ہو گا تاکہ سوتی کپڑے کی صنعت کے بہترین مفاد کو مجموعی حیثیت سے بچایا جا سکے......... ایک آزمائشی تخمینے کے بموجب تقریباً ایک کروڑ تکلے یا جتنے تکلے اس وقت استعمال ہو رہے ہیں ان کی

مجموعی تعداد کے تقریباً چوتھائی برباد کردئے جائیں گے۔۔۔۔۔۔ لنکا شائر کے کارخانہ داروں کی بڑی تعداد اس قانون کو پسند کر رہی ہے لیکن مزدوروں اور پارلیمنٹ کی مزدور پارٹی کے ممبروں کی جانب سے اس کی مخالفت ہو رہی ہے۔ یہ مخالفین کہتے ہیں کہ اس قانون میں ان لوگوں کے مفاد کا، جو اس قانون کے نفاذ سے بے روزگار ہو جائیں گے، کوئی لحاظ نہیں کیا گیا ہے"۔

آخر ان کا لحاظ کیوں نہیں رکھا گیا؟

افراط کے ختم کرنے والے ان منصوبوں کا مقصد کیا ہے؟ تم کو یاد ہوگا "عدم مداخلت" (LAISS-EZ-FAIRE) کا نعرہ لگانے والی سرمایہ داری کا مقصد نفع کمانے کے سوا کچھ اور نہ تھا۔ یہ سرمایہ داری تباہ ہو گئی اور منصوبہ بندی کی آزمائش شروع کی گئی۔ اس منصوبہ بند سرمایہ داری کا مقصد بھی نفع کمانے کے سوا کچھ اور نہیں ہے۔ ایسے معاشی نظام میں جہاں پیداوار کی زیادتی ہو اور جہاں پیداوار استعمال کی گنجائش سے بھی کہیں آگے نکل گئی ہو پیداوار کی رسد گھٹانے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں ہے۔ استعمال کے لئے جتنی زیادہ چیزیں پیدا کی جائیں گی قیمتیں اتنی ہی گرتی چلی جائیں لیکن اگر پیداوار پر قابو پالیا جائے اور رسد گھٹا دی جائے تو قیمتیں چڑھ جائیں گی اور نفع بڑھ جائے گا۔ اس لئے سرمایہ داری کی منصوبہ بندی بھی اپنے نتیجے کے اعتبار سے تقلیل کی منصوبہ بندی ہو کر رہ جاتی ہے۔

نیوڈیل (NEW DEAL) میں اسٹالبرگ (STOLBERG) اور ونٹن (VINTON) نے جو پھبتی کسی تھی وہ اس حقیقت کی روشنی میں حق بجانب معلوم ہوتی ہے۔ وہ کہتے ہیں:-

"نیوڈیل نے جو کچھ کیا ہے وہ کوئی ایسی بات نہیں ہے جسے کوئی زلزلہ اس سے بہتر طریقے سے نہ کر سکتا ہو، ایک اعلیٰ درجہ کا زلزلہ سمندر کے اس ساحل سے لے کر اُس ساحل تک بڑی کامیابی سے پیداوار کا خاتمہ کر سکتا ہے تاکہ جو لوگ بچ جائیں وہ تجارت عظمیٰ کی روز افزوں عظمت و شان کے لئے زیادہ چستی سے لیکن نیوڈیل سے کہیں کم ہنگامہ برپا کرکے، سرگرم عمل ہو سکیں"۔

سرمایہ داری منصوبہ بندی کی ایک اور بھی امتیازی خصوصیت ہے۔ یہ منصوبہ بندی

جز وی ہوتی ہے۔

امریکن گارجین کے ذہین اڈیٹر آسکر امیرنجر (OSCAR AMERINGER) کے متعلق ایک قصے نے بہت شہرت پائی ہے۔ یہ قصہ بہت سبق آموز اور دلچسپ ہے۔ جب امریکہ میں منصوبہ بندی کا کام ہو رہا تھا۔ آسکر امیرنجر ایک دلچسپی لینے والے ناظر کی حیثیت سے ایک خاص افسر کے دفتر میں صبح کا کام دیکھنے جایا کرتا تھا۔ وہ صنعت کے مالکوں کے ایک مسلسل سیلاب کا مشاہدہ کیا کرتا تھا جو صنعت کی تباہی کی داستانوں سے لبریز آتے تھے۔ وہ اُن منصوبوں کو بھی سنتا تھا جو مردہ صنعتوں میں جان ڈالنے کے لئے بنائے جاتے تھے۔ وہ خاموشی سے چند گھنٹوں تک یہ تماشہ دیکھتا رہا لیکن آخر کار اُس کا پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا اور وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ اُس نے منصوبہ بنانے والے افسر سے چلّا کر کہا :-

"مریض چیچک میں مبتلا ہے اور تم اُس کے ہر ہر دانے کا الگ الگ علاج کر رہے ہو"

امیرنجر پوری قومی معاشیات کے سنبھالنے کے لئے ایک ہمہ گیر منصوبہ کی ضرورت محسوس کرتا تھا۔ لیکن اُس نے دیکھا کہ ایک ہمہ گیر منصوبے کے بجائے جہاز رانی کی صنعت کے لئے ایک علیحدہ منصوبہ بن رہا تھا، کسانوں کی مدد کے لئے ایک دوسرا منصوبہ زیر غور تھا اور مزدوروں کی قوتِ خرید بڑھانے کے لئے ان دونوں منصوبوں سے بالکل الگ ایک تیسرا منصوبہ بنایا جا رہا تھا۔

امریکہ یا کسی دوسرے ملک میں کوئی ایسی منصوبہ بندی نہ تھی جو روس کی منصوبہ بندی سے دور کی بھی مشابہت رکھتی اور جس کی ہمہ گیری اپنے دامن میں ملک کی ہزاروں معاشی سرگرمیوں کیلئے یکساں گنجائش رکھتی۔

روس میں ذرائع پیداوار کی نجی ملکیت کے خاتمے نے ہمہ گیر منصوبہ بندی کے لئے راستہ صاف کر دیا۔ جس ملک میں منصوبہ بندی کے افسروں کے اختیارات محدود ہوں اور وہ بعض قدم صرف اس وجہ سے نہ اٹھا سکیں کہ ایسا کرنے سے وہ نجی ملکیت کے حدود میں مداخلتِ بے جا کے مجرم ٹھہریں گے، وہاں کسی ہمہ گیر منصوبہ بندی کا خواب بھی نہیں دیکھا جا سکتا۔ روس میں گوسپلان

(منصوبہ بندی کے مرکزی کمیشن) کا فیصلہ نافذ ہو جاتا ہے۔ اس کی وجہ اس کے سوا کچھ اور نہیں ہے کہ وہ ایک منظم جماعت کا نمائندہ ہے اور وہ پورے روس کے قومی نظامِ معاشی کی طرف سے جس کا پورے ملک میں کوئی رقیب نہیں ہے، فیصلہ کرتا ہے۔

ایک سرمایہ دار ملک میں منصوبہ بند افسروں کا فیصلہ غیر موثر رہتا ہے، اگر وہ ملکیت رکھنے والے ایک گروہ کے حق میں کوئی فیصلہ کرتے ہیں تو دوسری ملکیت رکھنے والی جماعتیں اُن کے فیصلے کے خلاف آواز اُٹھاتی ہیں۔ کیوبا سے شکر برآمد کرنے والوں کی مثال سامنے رکھو۔ اگر ان کے حق میں کوئی فیصلہ کیا جائے تو امریکہ کی شکر پیدا کرنے والی جماعتیں آواز اُٹھائیں گی۔ حکومت کے ذمہ دار عہدہ دار کو یہ اختیار نہیں ہے کہ وہ کسی کو اپنی اطاعت پر آمادہ کر سکے اس لئے اُس کے فیصلے ڈانواں ڈول رہتے ہیں۔ وہ کبھی ایک جماعت کو کوئی لقمہ دے کر خوش کرتا ہے اور کبھی دوسری جماعت کو ایک ٹکڑا اپھڑا کر راضی کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

مسز باربارا ووٹن (MRS. BARBARA WOOTTON) نے اپنی کتاب "منصوبہ یا کوئی منصوبہ نہیں" (PLAN OR NO PLAN) میں بتایا ہے کہ ذرائع پیداوار پر نجی ملکیت کا قبضہ ہوتا ہے تو منصوبہ بندی کا کیا حشر ہوتا ہے:-

"جب تک پیداوار کے آلوں اور ان کی پیداوار پر نجی ملکیت رکھنے والوں کا، جو ان آلوں کی حرکت اور ان اشیاء کی فروخت کے مالی نتائج سے دلچسپی رکھتے ہیں، قبضہ ہے، بڑے بڑے معاشی فیصلے اُسی نقطۂ نظر سے کئے جائیں گے جن کو یہ لوگ اپنی صنعت و کارخانے کے لئے زیادہ مفید اور نفع بخش سمجھیں گے ...."

"فولاد کی پیداوار کی منصوبہ بندی فولاد کی مشینوں کے لئے جنت بنائے گی۔ جو کی شراب کی پیداوار شراب بنانے والوں کے لئے فردوس کی تعمیر کرے گی۔ تصویروں کی پیداوار فنکاروں کے لئے ایوان فلک کو زمین پر اتارنے کا منصوبہ بنائے گی۔ آخر میں ماحصل دیکھ کر یہی کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ اس منصوبہ بندی نے سماج کو ہر منصوبے سے دور کر دیا ہے۔"

نجی ملکیت اُس وقت بھی مرکزی منصوبہ بندی کی راہ میں روڑا اٹکاتی ہے جب اُس میں سرمایہ داروں ہی کا فائدہ ہوتا ہے لیکن نجی ملکیت کا جوش مخالفت اُس وقت اور بڑھ جاتا ہے جب اس منصوبہ بندی سے پوری قوم کو فائدہ پہونچنے والا ہوتا ہے۔ مزدوروں کی آبادیوں کی تنگ و تاریک گلیوں کی صفائی کا مسئلہ مثال کے طور پر سامنے رکھ کر غور کیا جا سکتا ہے۔ اس سے کسی شخص کو اختلاف نہیں کہ ان تنگ و تاریک جھونپڑوں اور گلیوں کو ختم ہو جانا چاہئے۔ پھر آخر ایسا کیوں نہیں ہوتا ہے؟ آخر وہ کیا چیز ہے جو عوام کی اس بدیہی ضرورت کی راہ روک کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ جواب بالکل صاف ہے ——— نجی ملکیت ——— انفرادی منافع۔ کچھ ایسے مالکانِ مکان ہیں جو ان تنگ و تاریک محلوں کے مکانوں کو کرائے پر اٹھا کر نفع کماتے ہیں۔ کچھ اور زمیندار بھی ہیں جو یہ سوچتے ہیں اگر ان تنگ و تاریک جھونپڑوں کے رہنے والوں کے لئے نئے اور بہتر مکانات بن گئے تو ان کو کرایہ کہاں سے ملے گا؟ یہی وجوہ ہیں جو ان تنگ و تاریک گلیوں کی قسمت نہیں پلٹنے دیتے۔ اگر کبھی یہ کام شروع بھی ہوتا ہے تو اس کی رفتار بہت سست ہوتی ہے، رُک رُک کر قدم اُٹھتے ہیں اور کبھی اس کی تکمیل کی نوبت نہیں آتی۔ اس طرح پوری جماعت کے فائدہ کا کام نجی ملکیت کی وجہ سے پورا نہیں ہونے پاتا۔

لیکن اشتراکی سماج میں منصوبہ بند معاشیات بالکل دوسری رفتار سے کام کرتی ہے۔ منصوبہ بنانے والوں کے سامنے ایک شہر کا نقشہ ہوتا ہے، اس نقشے کے ایک حصے پر ایک ہلکا سا رنگ پھرا ہوا نظر آتا ہے۔ یہ وہ تنگ و تاریک محلے ہیں جن کے غیر صحت بخش جھونپڑوں میں کچھ بدقسمت لوگ رہتے ہیں ان کے لئے کیا ہونا چاہئے؟ یہ تنگ و تاریک محلے ختم کر دئے جائیں۔ بالکل ٹھیک ہے۔ نقشے کے اس حصے پر سرخ پنسل پھیر دو۔ اسے بالکل کاٹ دو جہنم میں جائیں یہ تنگ و تاریک گلیاں! کام فوراً شروع ہوتا ہے، جہاں نجی ملکیت راہ روکنے کے لئے موجود نہیں ہوتی۔ ضرورت کے محسوس ہوتے ہی عملی اقدام شروع ہو جاتا ہے اور منصوبے تیار کر لئے جاتے ہیں

جہاں نجی ملکیت راہ کا پتھر ہوتی ہے، وہاں جو کچھ اس کے مفاد میں ہوتا ہے وہی پہلے ہوتا ہے

اور قوم کا اجتماعی مفاد پس پشت ڈال دیا جاتا ہے۔ لندن ٹائمز نے اپنی ۲۸ اگست ۱۹۳۵ء کی اشاعت میں اس صورت حال پر افسوس کیا ہے۔ ٹائمز یہ دیکھ کر بہت رنجیدہ ہے کہ شمالی انگلستان کے صنعتی کارخانے بے روزگاروں کی ایک بڑی تعداد کو چھوڑ کر جنوبی انگلستان کی طرف جا رہے ہیں۔ وہ ڈرتا ہے کہ ان نئے کارخانوں کے جنوبی انگلستان کے کھیتوں، فارموں اور جنگلوں پر حملہ آور ہونے کی وجہ سے وہاں کے دیہاتی مناظر تباہ ہو جائیں گے۔ ٹائمز نے اس صورت حال کا ان الفاظ میں ماتم کیا ہے:۔

"جب کچھ صنعتی جگہیں اور آبادیاں معاشی طور پر ویران ہو جاتی ہیں اور کچھ جگہیں اور آبادیاں نئی صنعتوں کی وجہ سے بڑھنے اور دولتمند ہونے لگتی ہیں اس وقت کسی ایسے نقطۂ اتصال کے پتہ لگانے کا امکان نہیں رہتا جہاں یہ کہا جا سکے کہ بنیادی قومی مفاد، خواہ وہ کتنا ہی موہوم کیوں نہ ہو، چھپا ہوا ہے۔

"اگر ذہانت مخترعہ شرائط پیداوار کے تقاضوں کا لحاظ کئے بغیر کسی خاص مقام کی پابندی سے بے نیاز ہو کر ایسی جگہ صنعت کو فروغ دینا چاہے جہاں لوگوں کی بڑی تعداد کے روزگار کا مسئلہ حل ہو سکے تو ایسی صنعت کو اپنے قیام کے لئے پسماندہ مقامات کا انتخاب کرنا ہوگا اور ایسی صورت میں وہ بڑے سماجی منافع کا موجب ہوگی لیکن حقیقت یہ ہے کہ صنعتوں کے قائم کرنے اور چلانے والوں کے نزدیک سماجی منافع کوئی وزن نہیں رکھتے اس لئے یہ جائے قیام کے انتخاب میں وہ ان سماجی مصالح کا کوئی لحاظ نہیں کرتے۔"

اصل دشواری یہی ہے۔ عوام کے نفع کی جو بات ہے وہ نجی ملکیت کے مفاد کے خلاف ہے بعض لوگوں کے نزدیک اس میں کوئی حرج کی بات نہیں ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ نجی ملکیت اور ذرائع پیداوار پر نجی ملکیت کے قبضہ میں نقصان سے زیادہ فائدہ ہے۔ ڈیڑھ سو برس میں سرمایہ داری نظام نے جو حیرت انگیز کامیابی دکھلائی ہے یہ اسی کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ اس عرصے میں اشیاء کی بے شمار قسمیں بہت بڑی مقدار میں پیدا کی گئیں اور عوام کی بہت بڑی تعداد کا معیار رہائش خاص طور سے ریاست ہائے متحدہ (امریکہ میں) اتنا بلند ہو گیا کہ اس کی مثال کسی پچھلے زمانے میں

نہیں ملتی جسب ذیل اعلان میں امریکہ کے مالکان کارخانہ جات کی قومی انجمن نے اپنا بھیرا نجی ملکیت کے پرچم کے ساتھ باندھ دیا ہے :۔

"خیال کیا جاتا ہے کہ نجی ملکیت، معاش اور پیداوار کی آسانیوں اور اس کی تقسیم پر قابو انفرادی آزادی اور اس کی ترقی کے لئے بہت ضروری ہے۔ ان سہولتوں پر حکومت کا تسلط اور قابو منصوبہ بند معاشیات کا موجب ہوتا ہے اور ایک غیر متحرک اور مطلق العنان سماج کی تخلیق کا سبب بنتا ہے ....

"حکومت قومی معاشی منصوبہ بندی کے ذریعہ سے پیداوار اور استعمال میں توازن قائم رکھنا چاہتی ہے اور اس غرض کی تکمیل کے لئے چند لوگوں کے ہاتھوں میں تمام اختیارات سونپ دیتی ہے۔"

"جب انفرادی فیصلوں کی غیر محدود تعداد کسی مہم کی رہنمائی کرتی ہے تو اقتصادی اور سماجی ترقی کی رفتار بہت تیز ہو جاتی ہے اور اس طرح تمام لوگوں کی مہارت، ذہانت اور قابلیت سے فائدہ اٹھانے کا موقع ملتا ہے۔ لوگوں کی بہت چھوٹی تعداد عقل دوراندیشی اور قوتِ امتیاز سے اتنی بہرہ ور نہیں ہو سکتی کہ وہ تمام قوم کی سرگرمیوں کو کسی منصوبہ کے ماتحت لے آئے اور کامیابی سے اس کے جذبۂ عمل کو حرکت بھی دیتی رہے ...."

یہ دیکھ کر ہماری حیرت کی کوئی انتہا نہیں رہتی کہ یہ آخری جملہ ان مالکان کارخانہ جات کے قلم سے نکلا ہے جو اپنی صنعتوں میں شاید دنیا کے سب سے بڑے منصوبہ بنانے والے تسلیم کئے جاتے ہیں یہ وہ صنعت کے رہنما ہیں جنھوں نے کاروبار میں تنظیم اور منصوبہ بندی کا اعجاز دکھا دیا ہے۔ ان میں سے ہر ایک کے پاس اتنا سرمایہ ہے جو دنیا کی بہت سی قوموں کے پاس نہ ہوگا۔ ان کے کاروبار کی شاخیں پورے کرۂ ارض پر پھیلی ہوئی ہیں۔ بڑے سربرآوردہ سرمایہ دار ملکوں کے یہی سربرآوردہ ماہرین منصوبہ بندی دنیا کی تمام اقوام کی صنعتوں کے لئے ان باتوں کی شدت سے مخالفت کرتے ہیں، جن کو وہ بڑی مہارت سے اپنی صنعتوں کے لئے عمل میں لا چکے ہیں

آخر سرمایہ دار قومی منصوبہ بند معاشیات کی اتنی مخالفت کیوں کرتے ہیں؟ وہ خوب سمجھتے ہیں کہ قومی منصوبہ بند معاشیات نجی ملکیت کے خاتمے کی موجب ہوگی اور ان کی ذاتی ملکیت بھی اس کی زد سے نہ بچ سکے گی۔ یہی احساس ان کو اس کی مخالفت پر آمادہ کرتا ہے۔

جی۔ ڈی۔ ایچ۔ کول (G. D. H. COLE) نے اپنی کتاب "معاشی منصوبہ بندی کے اصول" (THE PRINCIPLES OF ECONOMIC PLANNING) میں لکھا ہے:-

"بہت سے سرمایہ دار اپنے ساتھی سرمایہ داروں کو، جو ایک منصوبہ بند نظام کی تبلیغ کرتے ہیں، بدعتی سمجھتے ہیں۔ بہت سے صاف گو سرمایہ دار رہنما بڑے جوش و خروش سے ایسی معاشیات کی جو کوئی منصوبہ نہیں رکھتی حمایت کرتے ہیں۔ وہ اس کو، اس کی تمام خرابیوں کے باوجود ملکیت کے حق کی حفاظت کا قابل اعتماد ذریعہ سمجھتے ہیں۔"

اسٹالبرگ (STOLBERG) اور ونٹن (VINTON) نے اپنے طنزیہ اندازِ بیان میں یہی حقیقت ذہن نشیں کرائی ہے۔ وہ کہتے ہیں:-

"یہ بڑی ملکیتیں صنعتوں پر اپنا غیر سماجی قابو رکھنا چاہتی ہیں تاکہ وہ اپنے مفاد کی خاطر ہمارے خلاف فیصلے کرنے میں بالکل آزاد رہیں۔ یہی ایک غرض ہے جس کی وجہ سے وہ سماج کو اپنی گرفت سے آزاد کرنا نہیں چاہتیں۔ ویرس (THE WEIRS) ٹیگلس (THE TEAGLES) اور سلونس (THE SLOANS) سماجی منصوبہ کی ہر کوشش کو، خواہ وہ اپنی جگہ پر کتنی ہی اچھی ہوئی کیوں نہ ہو بیکار کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ وہ اپنی سماجی حیوانیت اور معاشی جہالت کی وجہ سے بجا طور پر یہ محسوس کرتے ہیں کہ ایک قابل اعتبار سماجی منصوبہ بندی سماجی تعمیر کی تو موجب ہوگی لیکن سرمایہ داری کی "بحالی" کا سبب نہ ہوگی۔"

قومی منصوبہ بندی کے خلاف سرمایہ داروں کی صف آرائی کی دوسری وجہ غالباً یہ ہے کہ ایسی منصوبہ بندی آمدنی کی تقسیم کے سوال کو ایک زوردار مطالبے کی شکل میں سامنے لے آئے گی۔ سرمایہ داری نظریے کے بموجب آمدنی کی تقسیم خواہ وہ کتنی ہی غیر مساوی کیوں نہ ہو "قدرتی قانون"

(NATU (AL LAW کا نتیجہ ہوتی ہے۔ پروفیسر جان بیٹس کلارک (JOHN BATES CLARK)
نے، جو ایک مشہور امریکی ماہر معاشیات ہے اپنی مشہور کتاب "تقسیم دولت THE DISTRIBUTION
OF WEALTH) کے دیباچے میں ہم کو یقین دلایا ہے کہ:۔

"اس کتاب کے لکھنے کی غرض یہ ہے کہ یہ ثابت کیا جائے کہ سماج کی آمدنی کی تقسیم ایک قدرتی قانون کے بموجب عمل میں آتی ہے۔ اگر یہ قانون کسی مزاحمت کے بغیر عمل کر سکے تو پیداوار کا ہر عامل دولت کی اتنی مقدار پا جائے جو وہ پیدا کرتا ہے........ آزادو مقابلہ مزدور کو جو کچھ وہ پیدا کرتا ہے اور سرمایہ دار کو، جو کچھ اُس کا سرمایہ پیدا کرتا ہے، دیتا ہے۔ کاروبار کا ناظم بھی جو کچھ اُس کے ضبط و نظام کی قابلیت پیدا کرتی ہے پاتی ہے۔ ہر عامل پیداوار میں اپنا نمایاں حصہ پاتا ہے۔ تقسیم کا یہی قدرتی قانون ہے۔"

اس اعتراض کے جواب میں کہ آمدنی کی تقسیم بہت منصفانہ ہے، سرمایہ دار ناک بھوں چڑھا کر کہتے ہیں کہ "ہم سے کیوں اُلجھتے ہو۔ ہر شخص جتنا پیدا کرتا ہے اُتنا پاتا ہے، یہ ایک قدرتی قانون ہے"۔ لیکن قومی منصوبہ بندی میں آمدنی کی تقسیم کا سوال اتنی آسانی اور سادگی سے نظر انداز نہیں کر دیا جاتا بلکہ یہ مسئلہ بڑی گرم بحثوں کا موجب ہوتا ہے۔ اس اہم مسئلہ پر لاشخصی طاقتوں کے غور و خوض کے بجائے ایک مرکزی با اختیار جماعت جو ربط و نظام کے قیام کی ذمہ دار ہوتی ہے غور و خوض کرتی ہے۔ ایک جمہوری ملک میں جہاں اس با اختیار جماعت پر عوام کے احساسات و جذبات کا اثر پڑتا ہے آمدنی کا وہ فرق جو آج کل کی تقسیم کی وجہ سے پیدا ہو جاتا ہے باقی نہیں رہ سکتا۔ اس منصوبہ بندی کے موجب عوام کو زیادہ آمدنی ملے گی اور سرمایہ داروں کو کم۔ اس لئے اگر سرمایہ دار اس قسم کے کسی اقدام کی مخالفت میں پیش پیش ہیں تو کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔

لیکن بعض خاص ممالک میں سرمایہ دار اپنی مدد آپ نہ کر سکے۔ معاشی زندگی کی ابتری ہر طرف پھیل گئی۔ محنت کش طبقے کی پیش قدمی نے سخت خطرات پیدا کر دیئے اور سرمایہ داروں نے بھی ایک با اختیار مرکزی جماعت کی، جو ربط و نظام پیدا کر سکے ضرورت محسوس کرنی شروع کی لیکن انھوں نے

اس کا خیال رکھا کہ یہ مرکزی جماعت ان کے اقتدار سے آزاد نہ ہو اور ان ہی کے مفاد کے لئے کام کرے۔ لیکن محنت کش طبقوں کی عسکری طاقتوں کو کچلے بغیر یہ مقصد حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔ اس لئے سرمایہ داروں نے فسطائیت (FASCISM) کے دامن میں پناہ لی۔

روس میں محنت کشوں کا انقلاب کامیاب ہو گیا۔ لیکن جنگ عالمگیر نے فریب کے بہت سے پردے چاک کر دئے تھے اور قحط اور مصائب نے، جو جنگ کے پیچھے پیچھے قدم بڑھائے چلے آرہے تھے ہر جگہ بہت سے لوگوں کو انقلاب پسند بنا دیا۔ اپنی حالت سدھارنے کے مواقع بہت تیزی سے کم ہوتے جا رہے تھے۔ اس لئے متوسط طبقوں کی بے چینی بھی بہت بڑھ گئی تھی۔ حکومت کا نظام اگرچہ ختم نہیں کیا جا سکا تھا لیکن اُس کی بنیادیں یقیناً ہل گئی تھیں۔ خاص طور سے اٹلی اور جرمنی کی صورت حال یہی تھی۔ ان ملکوں میں محنت کش طبقوں کی انقلابی سرگرمیاں سرمایہ دار جماعتوں کے اقتدار کے لئے خطرہ بنی ہوئی تھیں۔ اس لئے انھوں نے مسولینی کے سیاہ قمیص والوں اور ہٹلر کے خاکی قمیص والوں کو روپیہ اور مدد دینا شروع کیا تاکہ ان کی ہمدردیاں خرید سکیں۔ ان سرمایہ داروں کے ساتھ سب سے بڑی ہمدردی یہی تھی کہ محنت کش طبقوں کی تنظیم کا خاتمہ کر دیا جاتا۔ ان دونوں قائدوں نے سرمایہ داروں کی مدد میں کوئی کوتاہی نہیں کی۔ اٹلی کی فسطائیت (FASCISM) اور جرمنی کی قومی اشتراکیت (NATIONAL SOCIALISM) دونوں ایسی تحریکیں تھیں جو انقلاب کی پیش قدمی پر قابو حاصل کرنے کے لئے چلائی گئی تھیں۔ سرمایہ داری نظام جو ان ملکوں پر مسلط تھا، اپنی پوری طاقت کے ساتھ اپنی جگہ پر جما ہوا اپنے حقوق کی حفاظت کرتا رہا۔ لیکن انقلاب کے دھارے کا رُخ بدلنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ عوام کے اشتراکی دماغوں کے طرزِ فکر کو بدلنے کے لئے بڑے لطیف پروپگنڈے کی ضرورت تھی۔ یہ کام بھی پوری مہارت سے کیا گیا۔ جرمنی کے قومی اور سماجی کارکنوں کی پارٹی (NATIONAL-SOCIAL GERMAN WORKER'S PARTY) کے پھسلانے کے لئے اشتراکیت کے چلتے ہوئے فقروں کی رشوت دی گئی اور انھیں اپنے جال میں پھنسایا گیا۔ مثال کے طور پر نازی پارٹی کے مشہور پچیس نکاتی پروگرام کے تین نکتے دئے جاتے ہیں:۔

نکتہ ۱۱۔ ان آمدنیوں کا خاتمہ جو بغیر کام کئے ہوئے پیدا کی جائیں

نکتہ ۱۲۔ جنگ کے مالِ غنیمت کی جابرانہ ضبطی

نکتہ ۱۳۔ ہم ان کاروباروں کو قومی بنانا (NATIONALISATION) چاہتے ہیں جنھوں نے اپنی تنظیم کرکے کمپنیوں (TRUSTS) کی شکل اختیار کرلی ہے۔

یہ دعوے تھے لیکن ان پر عمل کہاں تک ہوا؟ ہم کو اس سوال کے جواب کے لئے لندن کے اخبار اکنامسٹ (THE ECONOMIST) کے ایک مراسلے کا مطالعہ کرنا ہوگا جو اس کے برلن کے نامہ نگار نے یکم فروری ۱۹۳۶ء کے اخبار میں شائع کرایا تھا۔ یہ نامہ نگار لکھتا ہے۔

"پچھلے سال کا امن وسکون پارٹی کے پروگرام کو بڑی ہوشیاری سے نظرانداز کرکے قائم رکھا گیا اگر اس پروگرام پر مستعدی سے عمل کیا جاتا تو مختلف جماعتوں کے درمیان خطرناک کشاکش شروع ہوجاتی۔ سرمایہ داری کے بجائے اشتراکیت کے پیغام نے ان لوگوں کی بڑی تعداد کو جن کے پاس کچھ نہیں ہے اپنی طرف کھینچ لیا تھا لیکن اب یہی پیغام چند بے معنی چلتے ہوئے فقروں تک محدود ہوکر رہ گیا ہے۔ ایک طرف یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ اشتراکیت آرہی ہے (اس ہفتے میں تو سرکاری طور پر یہ بھی اعلان کردیا گیا ہے کہ اس نے سرمایہ داری کی جگہ حاصل کرلی ہے) دوسری طرف یہ بھی زور دیا جارہا ہے کہ زمینوں اور صنعتوں کی سرمایہ داری کو نہ صرف باقی رکھا جائے بلکہ اس کو نفع کمانے کا ذریعہ بنایا جائے۔"

نازی عہد حکومت کی صفائی میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان وعدوں کی تکمیل اور پروگرام پر پوری طرح عمل کرنے کے لئے تین سال کی مدت بہت کم تھی۔ یہ بات اپنی جگہ پر صحیح ہے لیکن اس کھلے ہوئے انحراف کے لئے جو پارٹی کے پروگرام سے کیا گیا، کیا کہا جائے گا؟ نازی تین سال میں پروگرام پر تو عمل نہ کرسکے لیکن اقتدار کی اس تھوڑی سی مدت میں انھوں نے ٹریڈ یونینوں کا خاتمہ کردیا۔ ان کا روپیہ ضبط کرلیا اور ان کے رہنماؤں کو قید خانوں میں بند کردیا۔ نازی پارٹی کو ان تین سالوں میں وعدوں کی تکمیل کا تو موقع نہ ملا لیکن انھوں نے مزدوروں کی اُجرت گھٹادی۔ سماجی خدمتوں کا خاتمہ کردیا

اور قومی آمدنی کو اس طرح تقسیم کردیا جس طرح "بڑے بڑے کاروبار" (BIG BUSINESS) چاہتے تھے۔

اٹلی کی داستان بھی جرمنی سے کچھ مختلف نہ تھی۔ مسولینی نے بھی فسطائیت کے گن گاتے ہوئے اعلان کیا:-

"اس معاشی نظام میں مزدور بھی سرمایے کے حصہ دار بن جائیں گے اور ان کو بھی برابر حقوق ملیں گے اور برابر فرائض انجام دینے ہوں گے۔"

یہ تو صرف دعویٰ تھا لیکن اس دعویٰ کی حقیقت کیا تھی؟ جان گنتھر (JOHN GANTHER) کی کتاب "اندرونِ یورپ" (INSIDE EUROPE) سے پتہ چلتا ہے کہ:-

"کوئی شبہ نہیں حکومت کی اس اجتماعی ہیئت میں ہم کو بظاہر ایسے اثر ڈالنے والے عناصر کی جو سرمایہ داری کے خلاف ہیں، ایک لمبی فہرست ملتی ہے ——— کوئی مالک کسی مزدور کو حکومت کی منظوری کے بغیر علیحدہ نہیں کرسکتا۔ کوئی سرمایہ دار حکومت سے اجازت لئے بغیر معمولی سے معمولی کام (مثلاً اپنے کارخانہ کی توسیع) نہیں کرسکتا۔ مزدوری کی شرح حکومت مقرر کرتی ہے۔ کارخانوں کا کوئی مالک حکومت کی منظوری کے بغیر اپنا کارخانہ ختم نہیں کرسکتا۔ حکومت ہی قرض کے ذرائع برقابو کرتی ہے اور اس کی آمدنی کا بڑا حصہ بڑے سخت گیر محصولوں پر مشتمل ہے۔"

"دوسری طرف ایسی باتیں جو مزدوروں کے مفاد کے خلاف ہوں فاشستی نظام میں بکثرت اور بہت ظالمانہ شکل میں پائی جاتی ہیں۔ مزدوروں کو اپنی مزدوری کی شرح طے کرنے کا حق نہیں ہے۔ ان کی ٹریڈ یونینیں توڑ دی گئی ہیں۔ ان کی اجرتیں کم ہوسکتی ہیں اور رفتہ رفتہ بڑی بے رحمی سے کم بھی کردی گئی ہیں۔ اُن سے ہڑتال کا حق چھین لیا گیا ہے۔ دوسری طرف سرمایہ دار کو اس کی دشواریوں کے باوجود نفع کمانے کا پورا حق حاصل ہے۔ مسولینی نے غالباً سرمایہ داری کو فروغ دینے کے لئے جان بوجھ کر فسطائی نظام نہیں قائم کیا تھا لیکن اس کا یہ اثر ضرور ہوا۔ سرمایہ داروں نے سرمایہ داری نظام پر پابندی برداشت کرلی۔ اس کے عوض میں انھوں نے حکومت سے مزدوروں کے مطالبات کے خلاف حفاظت کا حق بھی حاصل کرلیا۔ فسطائی انقلاب اپنی رفتار اور طرز کے لحاظ سے روس سے بہت پیچھے ہے۔"

مسولینی نے چلا چلا کر برابر حقوق اور برابر فرائض" کا ڈھول پیٹا لیکن گنتھر نے واقعی حالات کی جو تصویر کھینچی ہے وہ کوئی اور حکایت بیان کرتی ہے۔ کوئی شبہ نہیں سرمایہ داروں کے حقوق کچھ کم کر دیے گئے لیکن نفع کمانے کا بنیادی حق بدستور باقی ہے۔ لیکن مزدوروں کی ٹریڈ یونینیں توڑ دی گئیں ان سے ہڑتال کا حق چھین لیا گیا اور ان کی اجرت بھی گھٹا دی گئی ہے۔

یہ ظاہر ہے کہ اٹلی اور جرمنی میں سرمایہ اور محنت دونوں کے ساتھ کچھ خاص صورتیں پیش آ رہی ہیں۔ دونوں ملکوں میں زبردست با اختیار شخصیتیں سرمایہ داروں پر اپنے من مانے احکام کا ایسے انداز سے جس کا کبھی دستور نہیں رہا ہے، نفاذ کر رہی ہیں۔ اگرچہ نجی ملکیت کا خاتمہ نہیں کیا گیا اور صنعتیں بدستور نفع کی غرض سے چلائی جا رہی ہیں لیکن سرمایہ داروں کے بازو بڑی حد تک قلم کر دیے گئے ہیں

سرمایہ داری کے حقوق پر پابندی عائد کرنے کی غرض کیا ہے؟ زراعت کو مدد پہونچانے کی تحریک کے پیچھے کیا جذبہ کام کر رہا ہے؟ درآمد پر زبردست قابو اور برآمد کے لیے امدادی رقموں کی منظوری، خود مکتفی بننے کی مہم اور بینکوں کے سرمایوں پر تسلط جو دونوں ملکوں میں جاری ہے۔ آخر کس نیت سے عمل میں لایا جا رہا ہے؟ جواب بہت مختصر اور ہولناک ہے ——— صرف "جنگ" کے لئے۔

یہ بات تو بالکل صاف ہے کہ حکومت کی بڑھی ہوئی سرگرمیوں کی غرض اسلحہ بندی اور جنگ کے سوا کچھ اور نہیں ہے۔ ان فسطائی حکومت کے رہناؤں نے بھی اپنی نیتوں پر کوئی پردہ نہیں ڈالا ہے بلکہ وہ چلا چلا کر اپنے مقاصد کا اظہار کرتے رہتے ہیں

مسولینی اور ہٹلر نے جنگ کے مبلغ کی حیثیت سے بڑی شہرت حاصل کر لی ہے۔ مسولینی جنگ کی تبلیغ کرتے ہوئے کہتا ہے:-

> فسطائیت دائمی امن کے امکان اور اس کی افادیت کی قائل نہیں ہے۔ صرف جنگ وہ محرک ہے جو انسان کی قوت عمل کو اپنے شباب کے نقطۂ عروج تک پہونچا دیتا ہے۔ اور جو لوگ جنگ کے مقابلے کی ہمت رکھتے ہیں ان کے کردار پر شرافت کی مہر لگا دیتا ہے۔ اس لئے وہ تعلیم جس کی بنیاد امن کے ضرر رساں اصول پر رکھی جاتی ہے فسطائیت کی سخت دشمن ہے۔

یہ تو صرف الفاظ ہیں۔ ہم ان کی تحریروں پر اعتبار نہ کرنے کے عادی ہو چکے ہیں۔ اس لئے آؤ دیکھیں ان کے دعووں کی عملی شکل کیا ہے۔

مذکورہ بالا تحریر ۱۹۳۳ء میں لکھی گئی تھی۔ ۳۶-۱۹۳۵ء میں فسطائی فوجیں حبش پر حملہ آور ہو رہی تھیں۔ کم سے کم اپنے اس "دعویٰ" میں یہ فسطائی رہنما پورے اترے۔

ہٹلر نے بھی اس موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا:۔

"دائمی جنگ وجدل کے ذریعہ سے انسان عظمت حاصل کرتا ہے لیکن دائمی امن انسانی نسل کی تباہی کا سبب ہوگا۔"

جس وقت یہ تحریر لکھی گئی ہے جرمن فوجیں کسی ملک پر یلغار نہیں کر رہی ہیں لیکن یہ بات ہر شخص کو معلوم ہے کہ وہ بہت جلد میدانِ جنگ میں داخل ہونے والی ہیں۔ جرمنی اسلحہ بندی کی مہم میں اپنی انتہائی کوششیں صرف کر رہا ہے اور اپنی زندگی کے ہر شعبے میں اسی مقصد کے ماتحت زیادہ سے زیادہ درد انگیز قربانیاں برداشت کر رہا ہے۔ یہ ساری تیاریاں اس جنگ کے لئے ہو رہی ہیں جو بہت جلد چھیڑی جانے والی ہے۔ "نیو یارک ٹائمز" کے نامہ نگار نے ۲۲ مارچ ۱۹۳۶ء کے مراسلے میں ان تمام سرگرمیوں کا خلاصہ ان الفاظ میں پیش کیا ہے:۔

"بنیادی طور پر جرمنی کی معاشی حالت اسی خیال پر منحصر ہے کہ اسلحہ بندی پر کس طرح روپیہ خرچ کیا جائے۔"

فسطائیت کا مطلب جنگ ہے۔

لڑائی کی وجہ یہ نہیں ہے کہ ان دونوں ملکوں کے فسطائی رہنما لڑنا پسند کرتے ہیں۔ لڑائی کی وجہ صرف یہ ہے کہ فسطائی معاشیات دراصل سرمایہ داری معاشیات ہے اور اس کو بھی اپنی توسیع کے لئے بازاروں کی تلاش ہے۔ سرمایہ داری دور میں پہونچ کر سرمایہ دار نظام نے بھی یہی امتیازی خصوصیت اختیار کر لی ہے۔

جب سرمایہ داری معاشیات اپنی تباہی کی منزل میں داخل ہو جاتی ہے اور محنت کش

طبقے اقتدار کی باگ اپنے ہاتھوں میں لینے کے لئے آگے بڑھتے ہیں۔ اس وقت سرمایہ داری کوئی چارہ کار نہ دیکھ کر فسطائیت کی شکل اختیار کرلیتی ہے لیکن فسطائیت ان کی دشواریوں کا کوئی علاج نہیں کرسکتی۔ اس نظام میں بھی معاشی نقطۂ نظر سے کوئی بنیادی تغیر نہیں ہوتا ہے۔ فسطائی معاشیات میں بھی سرمایہ داری معاشیات کی طرح ذرائع پیداوار نجی ملکیت میں شامل ہوتے ہیں اور انفرادی منافع ہی بنیادی طور پر معاشی سرگرمی کا موجب ہوتا ہے۔

کیا سرمایہ دار آرتھر مارگن کی کہانی سے کوئی سبق لیں گے؟ اس کہانی میں بتایا گیا ہے کہ شرق ہند کے رہنے والے بندر کس طرح پکڑتے ہیں۔ یہ لوگ ناریل کے گولے میں اتنا بڑا سوراخ جس میں بندر کا صرف خالی ہاتھ کسی طرح جا سکے، بنا دیتے ہیں اور اس میں شکر کے ڈلے ڈال کر کسی درخت سے باندھ کر لٹکا دیتے ہیں۔ بندر اس میں اپنا ہاتھ کسی طرح ڈال دیتا ہے اور شکر کا ڈلا اپنے ہاتھ میں لے کر بھری ہوئی مٹھی باہر نکالنا چاہتا ہے لیکن سوراخ میں اتنی گنجائش نہیں ہوتی کہ اس کی بھری ہوئی مٹھی باہر نکل سکے۔ لالچ ہی اس کی ہلاکت کا سبب ہے۔ لیکن وہ کبھی شکر سے دست بردار نہ ہوگا۔"